UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224213
UNIVERSAL
LIBRARY

جنوری ۱۹۴۲ء | جلد ۶ — عدد ۱
فروری ۱۹۴۲ء | جلد ۶ — عدد ۲

۷۸۶

اشاعت خاص

شرح جاوید نامہ

ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا مخزن

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔ اے

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چار روپے — قیمت پرچہ ہذا بارہ

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے | روساسے چھ روپے

پیغامِ حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۶ | جنوری و فروری ۱۹۴۲ء | عدد ۱، ۲

سخنہائے گفتنی	سید محمد شاہ ایم اے	۲
فقہ اسلامی میں اجتہاد	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۶
شرح جاوید نامۂ اقبال	سید صبغۃ اللہ بختیاری عمرآباد دکن	۱۷
اقبال اور ہندوستان	لطیف احمد صاحب شیروانی لاہور	۵۳
زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست (نظم)	ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ	۶۴
خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام (نظم)	ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ	۶۵
حکمت قرآنی اور اصلاحِ تمدن	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۶۶
صراطِ مستقیم	مولوی عبدالحکیم صاحب قصوری	۷۶
مطالب القرآن	سید محمد شاہ ایم اے	از صفحہ ۱ تا ۱۶

سید محمد شاہ پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغامِ حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

پیغام حق مارچ ۱۹۳۶ء میں جاری کیا گیا تھا مگر ایڈیٹر کی مسلسل علالت اور بعض دیگر مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں صرف چار پرچے نکل سکے۔ ۱۹۳۸ء میں تین اور ۱۹۳۹ء میں دو۔ بفضل خدا اب دو اڑھائی سال سے رو بصحت ہوں اور جنوری ۱۹۴۰ء سے پیغام حق مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ الحمد للہ کہ اس دوران میں ایک پرچہ کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔ ہاں، اس قدر ضرور ہوا کہ کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے جنوری و فروری کا پرچہ قدرے تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ خدا کو منظور ہوا تو آئندہ حسب سابق بروقت شائع ہوتا رہے گا۔

پیغام حق کا مقصد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے اس مقصد کو بر لانے کے لئے کبھی تو علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکارِ قرآنیہ کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے اور کبھی براہِ راست قرآن و حدیث کے بعض مطالب پر مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ پیغام حق کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس ادارہ کی مساعی استحسان کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہیں۔

اس پرچہ میں مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری شیخ الحدیث جامعہ دار السلام عمر آباد (مدراس) کا ایک فاضلانہ مضمون جاوید نامہ کی شرح پر شائع کیا جا رہا ہے۔ جاوید نامہ حضرت علامہ ڈاکٹر اقبال کی ایک قیمتی فارسی کتاب ہے۔ اس کی شرح کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی خدا کا شکر ہے کہ سید صاحب موصوف نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ شرح کا ایک حصہ اس پرچہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بقایا انشاء اللہ العزیز دو قسطوں میں چھپ جائے گا۔ اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے دو مضمون بھی اس پرچہ میں دیئے جا رہے ہیں۔ اُن کا مطالعہ انشاء اللہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔

اس پرچہ سے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ قرآنِ مجید کے مطالب مسلسل بیان کرنے شروع کریں۔ راقم الحروف نے آج

سے چند سال پہلے قرآنِ مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ لکھا تھا اور مطالب کو واضح کرنے کے لئے حاشیہ پر تفسیری نوٹ لکھے تھے۔ اس ترجمہ کو "مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے لاہور کی مشہور بلاک ساز کمپنی پیکو آرٹ پریس نے شائع کیا ہے چونکہ تفسیری نوٹ بالکل آسان اور سادہ اردو میں لکھے گئے تھے اور تسلسل مضامین اور ربطِ آیات کو پیشِ نظر رکھنے کی بہت کوشش کی گئی تھی اس لئے یہ کوشش بہت حد تک کامیاب سمجھی گئی۔ مگر کمپنی نے اس نسخۂ قرآن کا ہدیہ پینتالیس ۴۵ اور پچیس ۲۵ روپے رکھ دیا جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی حاصل کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود ہزارہا کی تعداد میں یہ نسخۂ قرآن پاک لوگوں کے گھروں میں پہنچ گیا ہے۔

کچھ عرصہ سے راقم الحروف کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو قرآنِ مجید کے لفظی تراجم کی ضرورت نہیں بلکہ مطالب قرآن کی ضرورت ہے۔ نیز اپنا تجربہ بھی یہ بتا رہا ہے کہ قرآنِ مجید کا ایک ایسا لفظی ترجمہ جو روحِ قرآنی کو بلا کم و کاست ظاہر کردے تقریباً ناممکن ہے۔ اردو زبان میں لکھنے والے علمائے کرام میں سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے جید عالم ہیں جن کو اردو اور عربی دونوں زبانوں پر ایک جیسا عبور ہے فی الحقیقت اُن کا ادبی ذوق اتنا بلند ہے کہ برصغیر ہند میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے اس کے باوجود اُنہوں نے قرآنِ مجید کا جو ترجمہ لکھا ہے وہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا تفسیری بامحاورہ ترجمہ ہے اور حق یہ ہے کہ آج تک اُردو زبان میں جس قدر تراجم شائع ہو چکے ہیں ادبی لحاظ سے یہ اُن سب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید کے اُردو تراجم لفظی اور بامحاورہ بہت شائع ہو چکے ہیں۔ جو حضرات اُن سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں وہ بآسانی اُٹھا سکتے ہیں اور اٹھا رہے ہیں۔ مگر میرے علم میں مطالب قرآن کو بیان کرنے کی غرض سے اب تک آزاد ترجمہ (FREE TRANSLATION) شائع نہیں ہوا جس کے مطالعہ سے وہ حضرات بھی فائدہ اُٹھا سکیں جو عربی زبان نہیں جانتے یا وہ جو مسلمان نہیں ہیں۔ اس وقت ہم مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ایسی بھی ہے جن کو قرآنِ کریم کے نفسِ مضمون (TEXT) ہی کا علم نہیں ہے۔ وہ اتنا تو جانتے ہیں کہ قرآن پاک ایک الہامی کتاب ہے۔ خدا کا کلام ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک

پہنچا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کے اندر کیا لکھا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ایسے بھائیوں کو اُن کی اپنی زبان میں یہ بتا دوں کہ قرآن کے اندر کیا ہے۔ علاوہ ازیں میرے علم میں غیر مسلمانوں میں بھی ایک بڑی اکثریت ایسی ہے جو یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ قرآن کہتا کیا ہے مگر اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو اس قدر آسان زبان میں لکھی گئی ہو جو غیر مسلم حضرات پڑھ سکتے ہوں اور وہ قرآن پاک کے مطالب کو پیش کرتی ہو۔ اس ضرورت کے پیش نظر میں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے اس پرچہ سے سولہ صفحے "مطالب القرآن" کے پیغام حق میں شائع کرنے شروع کروں گا۔

یہ مطالب القرآن اُس مطالب الفرقان سے بالکل جدا چیز ہے جو میں نے پیکو آرٹ پریس کو لکھ کر دیا تھا۔ اس میں لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کے مطالب ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کا عربی متن بھی نہیں دیا گیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ رسالہ میں عربی متن کی اشاعت سے قرآن مجید کے احترام میں کچھ فرق آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر غیر مسلموں تک یہ چیز پہنچانا مقصود ہے تو اُن کے لئے عربی متن کی ضرورت نہیں۔ تاہم جو حضرات عربی متن کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیں اُن کی سہولت کے لئے آیات کے نمبر گول دائرہ میں لکھ دیئے ہیں۔ نیز رکوع وغیرہ کے نشانات بھی قائم رکھے ہیں۔

میں نے اپنی حد تک مطالب قرآنیہ کو سمجھنے اور اُن کے واضح کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات میری سمجھ میں آئے ہی نہ ہوں اور بعض کو میں نے غلط سمجھا ہو۔ اس کے لئے میں اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اُس سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے اس ناچیز بندے کو اپنے کلام پاک کے سمجھنے کی توفیق عطا کرے اور صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت و جرأت ارزانی کرے۔ "وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا"

جن بھائیوں کو میرے اغلاط اور میری تحریر کے اسقام نظر آئیں اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ مجھے ان سے مطلع فرمائیں تاکہ جب یہ "مطالب القرآن" کتابی شکل میں شائع ہو تو اُس وقت اس میں کوئی سقم باقی نہ ہو۔ میں ایسے تمام ہمدردوں اور محسنوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں گا۔

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش

اے کہ زمن فزودہِ گرمئ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

با دلِ ما چہا کنی! تو کہ ببادۂ حیات
مستئ شوق مے دہی آب و گلِ پیالہ را

غنچۂ دلِ گرفتہ را از نفسم گرہ کشاے
تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

می گذرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری!
تو بہ کمیں چہ خفتۂ، صید کن ایں غزالہ را

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

(زبور عجم) (اقبال)

فقہ اسلامی میں اجتہاد

اسلامی قانون کوئی ساکن اور منجمد قانون نہیں ہے کہ ایک خاص زمانہ اور خاص حالات کے لیے اس کو جس صورت پر مرتب و مدوّن کیا گیا ہو، اُسی صورت پر وہ ہمیشہ قائم رہے، اور حالات، مقامات اور زمانہ کے بدل جانے پر بھی اُس صورت میں کوئی تغیر نہ کیا جا سکے۔ جو لوگ اس قانون کو ایسا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ وہ اسلامی قانون کی روح ہی کو نہیں سمجھے ہیں۔ اسلام میں دراصل شریعت کی بنیاد حکمت (WISDOM) اور عدل (JUSTICE) پر رکھی گئی ہے۔ تشریع (قانون سازی) کا اصل مقصد بندگانِ خدا کے باہمی معاملات اور تعلقات کی تنظیم اس طور پر کرنا ہے کہ ان کے درمیان مزاحمت اور مقابلہ کے بجائے تعاون اور امداد باہمی اور ہمدردانہ اشتراکِ عمل ہو۔ ایک دوسرے کے متعلق ان کے فرائض اور حقوق ٹھیک ٹھیک عدل اور توازن کے ساتھ مقرر کر دیے جائیں۔ اور اجتماعی زندگی میں نہ صرف یہ کہ ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے کے پورے مواقع ملیں، بلکہ وہ دوسروں کی شخصیت کے نشو و نما میں بھی مددگار ہو، یا کم از کم دوسروں کی ترقی میں مانع و مزاحم بن کر موجبِ فساد نہ بن جائے۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسانی اور حقائق اشیاء کے اُس علم کی بنا پر، جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں چند ہدایات دی ہیں، اور اس کے رسول نے اسی کے دیے ہوئے علم سے اُن ہدایات کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ہمارے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ ہدایات اگرچہ ایک خاص زمانے اور خاص حالات میں دی گئی تھیں اور ان کو ایک خاص سوسائٹی کے اندر نافذ کرایا گیا تھا، لیکن ان کے الفاظ سے، اور اُن طریقوں سے جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عمل کا جامہ پہنانے میں اختیار فرمائے تھے، قانون کے چند ایسے وسیع اور ہمہ گیر اصول نکلتے ہیں جو ہر زمانے اور ہر حالت میں انسانی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کے لیے یکساں مفید اور قابلِ عمل ہیں، اسلام میں جو چیز ثابت (PERMANENT) اور ناقابل تغیر و تبدل ہے وہ یہی اصول ہیں۔ اب یہ ہر زمانے کے مجتہدین کا کام ہے کہ عملی زندگی میں جیسے جیسے حالات اور حوادث پیش آتے جائیں، ان کے لیے شریعت کے اصولوں سے احکام نکالتے چلے جائیں، اور معاملات میں اُن کو اِس طور پر نافذ کریں کہ شارع کا اصل مقصد پورا ہو۔ شریعت کے اصول جس طرح ثابت اور غیر متبدل ہیں اُس طرح وہ قوانین ثابت اور غیر متبدل نہیں ہیں جن کو انسانوں نے اُن اصولوں پر متفرع کیا ہے، کیونکہ وہ اصول خدا نے بنائے ہیں، اور یہ قوانین انسانوں نے مرتب کیے ہیں، وہ تمام ازمنہ و امکنہ اور احوال و حوادث کے لیے ہیں، اور یہ خاص حالات اور خاص حوادث کے لیے۔

تجدید کے لیے چند ضروری شرطیں پس اسلام میں اس امر کی پوری وسعت رکھی گئی ہے کہ تغیرِ احوال اور خصوصیاتِ حوادث کے لحاظ سے احکام میں اصول شرع کے تحت تغیر کیا جا سکے، اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں اُن کو پورا کرنے کے لیے قوانین مرتب کیے جا سکیں۔ اس معاملے میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مجتہدین کو اپنے زمانی اور مکانی حالات کے لحاظ سے استنباطِ احکام اور تفریعِ مسائل کے پورے اختیارات حاصل ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی خاص دور کے اہل علم کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لیے وضع قانون کا چارٹر دے کر دوسروں کے اختیارات کو سلب کر لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو اپنے منشا اور اپنی اہواء کے مطابق احکام کو بدل ڈالنے اور اصول کو توڑ مروڑ کر اُن کی الٹی سیدھی تاویلیں کرنے، اور قوانین کو شارع کے اصل مقصد سے پھیر دینے کی آزادی حاصل ہو۔ اس کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ چند شرائط پر مشتمل ہے۔

پہلی شرط فروعی قوانین مدوّن کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ

مزاجِ شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے[۱] ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہو گی وہ شریعت کا مزاج شناس ہو جائے گا، اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتا دے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ اس شریعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے، اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل کیا جائے گا وہ نہ صرف مناسب اور معتدل ہو گا، بلکہ اپنے محلِ خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اتنا ہی بجا ہو گا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عمر کا یہ حکم کہ دورانِ جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے، اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانے میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شارع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مُزَینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے

---

[۱] یہاں اشارۃً یہ کہدینا بیجا نہ ہو گا کہ اس زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ خارج ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کے کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لے لی ہے اور یہ تعلیم بھی اس طرح دیجاتی ہے کہ ابتدا ہی سے خدا و رسول کے منصوص احکام اور ائمہ کے اجتہادات کے درمیان حقیقی فرق و امتیاز طالب علم کے پیش نظر نہیں رہتا۔ حالانکہ کوئی شخص جب تک حکیمانہ طریق پر قرآن میں بصیرت حاصل نہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا بغور مطالعہ نہ کرے، اسلام کے مزاج اور اسلامی قانون کے اصول کو نہیں سمجھ سکتا۔ اجتہاد کے لیے یہ چیز ضروری ہے اور تمام عمر فقہ کی کتابیں پڑھتے رہنے سے بھی یہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا، پھر فوراً ہی آپ کو تنبّہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھائے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ یہ کہہ کر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقاتِ ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا وہ عہد رسالت کے عملدرآمد سے مختلف تھا، مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کیے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف ان کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کرتا ہے اور مُفضی الی الفساد ہو جاتا ہے۔

دوسری شرط | مزاج شریعت کو سمجھنے کے بعد دوسری اہم شرط یہ ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں قانون بنانے کی ضرورت ہو اس کے متعلق شارع کے جملہ احکام پر نظر ڈالی جائے اور ان میں غور و فکر کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ ان سے شارع کا مقصد کیا ہے، شارع کس نقشہ پر اس شعبہ کی تنظیم کرنا چاہتا ہے، اسلامی زندگی کی وسیع تر اسکیم میں اس شعبۂ خاص کا کیا مقام ہے، اور اس مقام کی مناسبت سے اس شعبہ میں شارع نے کیا پالیسی اختیار کی ہے۔ اس چیز کو سمجھے بغیر جو قانون بنایا جائے گا، یا پچھلے قانون میں جو حذف و اضافہ کیا جائے گا وہ مقصود شارع کے مطابق نہ ہوگا اور اس سے قانون کا رخ اپنے مرکز سے منحرف ہو جائے گا۔ قانون اسلامی میں ظواہر احکام کی اہمیت اُتنی نہیں ہے جتنی مقاصد احکام کی ہے۔ فقیہ کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ شارع کے مقصد اور اس کی حکمت و مصلحت پر نظر رکھے۔ بعض خاص مواقع ایسے آتے ہیں جن میں اگر ظواہر احکام پر (جو عام حالات کو مدنظر رکھ کر دیے گئے تھے) عمل کیا جائے تو اصل مقصد فوت ہو جائے۔ ایسے وقت میں ظاہر کو چھوڑ کر اُس طریق پر عمل کرنا ضروری ہے جس سے شارع کا مقصد پورا ہوتا ہو۔ قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جیسی کچھ تاکید کی گئی ہے، معلوم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود آ... ظالم و جابر امراء کے مقابلہ میں خروج سے منع فرما دیا کیونکہ شارع

کا اصل مقصد تو فساد کو صلاح سے بدلنا ہے۔ جب کسی فعل سے اور زیادہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور صلاح کی امید نہ ہو تو اس سے احتراز بہتر ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کے حالات میں ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ایک گروہ پر ان کا گذر ہوا جو شراب و کباب میں مشغول تھا۔ علامہ کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو شراب سے منع کرنا چاہا۔ مگر علامہ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اللہ نے شراب کو فتنہ و فساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے حرام کیا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ شراب ان ظالموں کو ایک بڑے فتنے یعنی قتلِ نفوس اور نہب اموال سے روکے ہوئے ہے۔ لہذا ایسی حالت میں ان کو شراب سے روکنا مقصودِ شارع کے خلاف ہے ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کی خصوصیات کے لحاظ سے احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر تغیر ایسا ہونا چاہیے جس سے شارع کا اصل مقصد پورا ہو نہ کہ الٹا فوت ہو جائے۔

اسی طرح بعض احکام ایسے ہیں جو خاص حالات کی رعایت سے خاص الفاظ میں دیے گئے تھے اب فقیہ کا کام یہ نہیں ہے کہ تغیر احوال کے باوجود انہی الفاظ کی پابندی کرے۔ بلکہ اس کو ان الفاظ سے شارع کے اصل مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے حالات کے لحاظ سے مناسب احکام وضع کرنے چاہئیں۔ مثلاً حضور نے صدقۂ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، یا ایک صاع کشمش دینے کا حکم فرمایا تھا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس وقت مدینہ میں جو صاع رائج تھا اور یہ اجناس جن کا حضور نے ذکر فرمایا یہی بعینہ منصوص ہیں۔ شارع کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عید کے روز ہر مستطیع شخص اتنا صدقہ دے کہ اس کا ایک غیر مستطیع بھائی اس صدقہ میں اپنے بال بچوں کے ساتھ کم از کم عید کا زمانہ خوشی کے ساتھ گذار سکے۔ اس مقصد کو کسی دوسری صورت سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے جو شارع کی تجویز کردہ صورت سے اقرب ہو۔

تیسری شرط پھر یہ بھی ضروری ہے کہ شارع کے اصول تشریع اور طرز قانون سازی کو خوب سمجھ لیا جائے تاکہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام وضع کرنے میں انہی اصولوں کی پیروی اور اسی طرز کی تقلید کی

جا سکے۔ یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان مجموعی طور پر شریعت کی ساخت اور پھر فرداً فرداً اس کے احکام کی خصوصیات پر غور نہ کرلے۔ شارع نے کس طرح احکام میں عدل اور توازن قائم کیا ہے۔ کس کس طرح اس نے انسانی فطرت کی رعایت کی ہے۔ دفع مفاسد اور جلب مصالح کے لیے اس نے کیا طریقے اختیار کیے ہیں۔ کس ڈھنگ پر وہ انسانی معاملات کی تنظیم اور اُن میں انضباط پیدا کرتا ہے۔ کس طریقہ سے وہ انسان کو اپنے بلند مقاصد کی طرف لے جاتا ہے اور پھر ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اس کے راستہ میں مناسب سہولتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب امور تفکر و تدبّر کے محتاج ہیں اور ان کے لیے نصوص قرآنی کی لفظی و معنوی دلالتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی حکمتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اس علم اور تفقّہ سے بہرہ ور ہو وہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام میں جزوی تغیر و تبدل بھی کر سکتا ہے اور جن معاملات کے حق میں نصوص موجود نہیں ان کے لیے نئے قوانین بھی وضع کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص قانون سازی میں جو طریقہ اختیار کرے گا وہ اسلام کے اصول تشریع سے منحرف نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے مگر اجتہاد سے کام لے کر صحابہ نے اس حکم کو عجم کے مجوسیوں، ہندوستان کے بت پرستوں اور افریقہ کے بربری باشندوں پر بھی وسیع کر دیا۔ اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جب ممالک فتح ہوئے تو غیر قوموں کے ساتھ بکثرت ایسے معاملات پیش آئے جن کے متعلق کتاب و سنت میں صریح احکام موجود نہ تھے ـــــ صحابہ کرام نے ان کے لیے خود ہی قوانین مدون کیے اور وہ اسلامی شریعت کی اسپرٹ اور اس کے اصول سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔

چوتھی شرط | احوال اور حوادث کے جو تغیرات، احکام میں تغیر، یا جدید قانون سازی کے مقتضی ہوں ان کو دو حیثیتوں سے جانچنا ضروری ہے۔ ایک یہ حیثیت کہ وہ حالات بجائے خود کس قسم کے ہیں ان کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کے اندر کونسی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ دوسری یہ حیثیت کہ اسلامی قانون کے

نقطۂ نظر سے ان میں کس کس نوع کے تغیرات ہوئے ہیں اور ہر نوع کا تغیر احکام میں کس طرح کا تغیر چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر اسی سود کے مسئلہ کو لیجیے جو اس وقت زیرِ بحث ہے معاشی قوانین کی تدوین جدید کے لیے سب سے پہلے زمانۂ حال کی معاشی دنیا کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم گہری نظر سے معاشیات، مالیات اور لین دین کے جدید طریقوں کا مطالعہ کریں گے۔ معاشی زندگی کے باطن میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھیں گے۔ ان کے نظریات اور اصول سے واقفیت حاصل کریں گے، اور اُن اصول و نظریات کا ظہور جن عملی صورتوں میں ہو رہا ہے ان پر اطلاع حاصل کریں گے۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ زمانۂ سابق کی بہ نسبت ان معاملات میں جو تغیر ہوئے ہیں ان کو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے کن اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے، اور ہر قسم پر شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد اور اصول تشریع کی مناسبت سے کس طرح کے احکام جاری ہونے چاہئیں۔

جزئیات سے قطع نظر کر کے، اصولاً ان تغیرات کو ہم دو قسموں پر منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ تغیرات جو درحقیقت تمدنی احوال کے بدل جانے سے رونما ہوئے ہیں اور جو دراصل انسان کے علمی و عقلی نشوو ارتقا، اور خزائنِ الٰہی کے مزید انکشافات، اور مادی اسباب و وسائل کی ترقی، اور حمل و نقل اور مخابرات (CAMMUNICATIONS) کی سہولتوں، اور بین الاقوامی تعلقات کی وسعتوں کے طبعی نتائج ہیں۔ ایسے تغیرات اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طبعی اور حقیقی تغیرات ہیں۔ ان کو نہ تو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ مٹانا مطلوب ہے، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے اثر سے معاشی احوال اور مالی معاملات اور تجارتی لین دین کی جو نئی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں، ان کے لیے اصولِ شریعت کے تحت نئے احکام وضع کیے جائیں تاکہ ان لائے ہوئے حالات میں مسلمان اپنے عمل کو ٹھیک ٹھیک اسلامی طرز پر ڈھال سکیں۔

(۲) وہ تغیرات جو دراصل تمدنی ترقی کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ دنیا کے معاشی نظام اور مالی معاملات پر ظالم سرمایہ داروں کے حاوی ہوجانے کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ وہی ظالمانہ سرمایہ داری جو عہدِ جاہلیت میں پائی جاتی تھی، اور جس کو اسلام نے صدیوں تک مغلوب کیے رکھا تھا، اب دوبارہ معاشی دنیا پر غالب آگئی ہے، اور تمدن کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے کام لے کر اس نے اپنے انہی پرانے نظریات کو نت نئی صورتوں سے معاشی زندگی کے مختلف معاملات میں پھیلا دیا ہے۔ سرمایہ داری کے اس غلبہ سے جو تغیرات واقع ہوئے ہیں وہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حقیقی اور طبیعی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ جعلی تغیرات ہیں جنھیں قوت سے مٹایا جاسکتا ہے، اور جن کا مٹا دیا جانا نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ مسلمان کا اصلی فرض یہ ہے کہ اپنی پوری قوت ان کے مٹانے میں صرف کردے اور معاشی نظام کو اسلامی اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنے کا فرض کمیونسٹ سے بڑھ کر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ کمیونسٹ کے سامنے محض روٹی کا سوال ہے، اور مسلمان کے سامنے دین و اخلاق کا سوال۔ کمیونسٹ محض صعالیک (PROLETARIATES) کی خاطر جنگ کرنا چاہتا ہے، اور مسلمان تمام نوع بشری کے حقیقی فائدے کے لیے جنگ کرتا ہے جس میں خود سرمایہ دار بھی شامل ہیں۔ کمیونسٹ کی جنگ خود غرضی پر مبنی ہے اور مسلمان کی جنگ للّٰہیت پر۔ لہٰذا مسلمان تو موجودہ ظالمانہ سرمایہ داری نظام سے کبھی مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ مسلم ہے اور اسلام کا پابند ہے تو اس کے خدا کی طرف سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس ظالمانہ نظام کو مٹانے کی کوشش کرے، اور اس جنگ میں جو ممکن نقصان اس کو پہنچ سکتا ہو اسے مردانہ وار برداشت کرے۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں اسلام جو قانون بھی بنائے گا اس کی غرض یہ ہرگز نہ ہوگی کہ مسلمانوں کے لیے سرمایہ داری نظام میں جذب ہونے اور اس کے ادارات میں حصہ لینے اور اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے میں سہولتیں پیدا کی جائیں، بلکہ اس کی واحد غرض یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو اس

گندگی سے محفوظ رکھا جائے، اور تمام اُن دروازوں کو بند کیا جائے جو مسلمان کو ناجائز سرمایہ داری کی طرف لے جاتے ہیں۔

<u>تخفیفات کے عام اصول</u> اسلامی قانون میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام کی سختی کو نرم کرنے کی بھی کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ فقہ کے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات اور المشقۃ تجلب التیسیر[۱] قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بھی متعدد موقع پر شریعت کے اس قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۴۰) — اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲۳) — اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج۔ ۱۰) — اس نے تم پر دین میں سختی نہیں کی ہے۔

وفی الحدیث: احب الدین الی اللہ تعالیٰ الحنفیۃ السمحۃ۔ — اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا سادھا اور نرم ہو۔

ولا ضرر ولا ضرار فی الاسلام۔ — اسلام میں ضرر اور ضرار نہیں ہے۔

پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کر دی جائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر خیالی اور وہمی ضرورت پر شریعت کے احکام اور خدا کی مقرر کردہ حدود کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ اس کے لیے بھی چند اصول اور ضوابط ہیں جو شریعت کی تخفیفات

---

[۱] ضرورتوں کی بنا پر بعض ناجائز چیزیں جائز ہو جاتی ہیں، اور جہاں شریعت کے کسی حکم پر عمل کرنے میں مشقت ہو وہاں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔

پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اولاً یہ دیکھنا چاہیے کہ مشقت کس درجہ کی ہے مطلقاً ہر مشقت پر تو تکلیف شرعی رفع نہیں کی جاسکتی، ورنہ سرے سے کوئی قانون ہی باقی نہ رہے گا۔ جاڑے میں وضو کی تکلیف، گرمی میں روزے کی تکلیف، سفر حج اور جہاد کی تکالیف، یقیناً یہ سب مشقت کی تعریف میں آتی ہیں۔ مگر یہ ایسی مشقتیں نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے تکلیفات ہی کو سرے سے ساقط کر دیا جائے۔ تخفیف یا اسقاط کے لیے مشقت ایسی ہونی چاہیے جو موجب ضرر ہو، مثلاً سفر کی مشکلات، مرض کی حالت، کسی ظالم کا جبر و اکراہ، تنگ دستی، کوئی غیر معمولی مصیبت، فتنۂ عام، یا کوئی جسمانی نقص۔ ایسے مخصوص حالات میں شریعت نے بہت سے احکام میں تخفیفات کی ہیں اور ان پر دوسری تخفیفات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً تخفیف اسی درجہ کی ہونی چاہیے جس درجہ کی مشقت اور مجبوری ہے۔ مثلاً جو شخص بیماری میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اس کے لیے لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔ جس بیماری کے لیے رمضان میں دس روزوں کا قضا کرنا کافی ہے اس کے لیے گیارہواں روزہ قضا کرنا درست نہیں۔ جس شخص کی جان شراب کا ایک چلو پی کر یا حرام چیز کے ایک دو لقمے کھا کر بچ سکتی ہے، وہ اس حقیقی ضرورت سے بڑھ کر کچھ پینے یا کھانے کا مجاز نہیں۔ اسی طرح طبیب کے لیے جسم کے پوشیدہ حصوں میں سے جتنا دیکھنا واقعی ضروری ہے اس سے زیادہ دیکھنا جائز نہیں۔ یہی قاعدہ تمام ان صورتوں میں جاری ہوگا جن میں مشقت اور ضرورت کی بنا پر احکام میں تخفیف کرنی مطلوب ہو۔

ثالثاً کسی ضرر کو دفع کرنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہیں کی جاسکتی جس میں اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضرر ہو۔ بلکہ صرف ایسی تدبیر کی ضرورت ہے جس کا ضرر نسبتاً کم ہو۔ اسی کے قریب قریب یہ قاعدہ بھی ہے کہ کسی مفسدہ سے بچنے کے لیے اس سے بڑے یا اس کے برابر کے مفسدہ میں مبتلا ہونا جائز نہیں۔ البتہ یہ جائز ہے کہ جب انسان دو مفسدوں میں گھر جائے تو بڑے مفسدہ کو دفع کرنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو اختیار کر لے۔

رابعاً جلب مصالح پر دفع مفاسد ہر حال میں مقدم رکھا جائے گا۔ شریعت کی نگاہ میں بھلائیوں کے حصول کی بہ نسبت برائیوں کو دور کرنا، اور ماموارت و واجبات کو ادا کرنے کی بہ نسبت حرام سے بچنا اور فسائد کو دفع کرنا زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے وہ مشقت کے موقع پر ماموارت کی تخفیف میں جتنی فیاضی دکھاتی ہے، اتنی فیاضی ممنوعات اور منہیات کی اجازت دینے میں نہیں دکھاتی۔ مثلاً سفر اور مرض کی حالت میں نماز روزے اور دوسرے واجبات کے معاملہ میں جتنی تخفیف کی گئی ہے اتنی تخفیف نجس اور حرام چیزوں کے استعمال میں نہیں کی گئی۔

خامساً مشقت اور ضرر کے زائل ہوتے ہی تخفیف بھی ساقط ہو جاتی ہے، مثلاً بیماری رفع ہو جانے کے بعد تیمم کی اجازت باقی نہیں رہتی۔

یہ چند اہم اصول ہیں جن کو اجتہاد اور تفریع احکام میں ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۵۵ھ۔ اپریل ۱۹۳۶ء)

شرح جاوید نامۂ اقبال

مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری عمر آباد (دکن)

علامہ اقبال مرحوم کی تمام کتابوں میں سے جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں آن کا مطالعہ قرآن زیادہ نمایاں ہے اس شاہکار میں "جاہلیت جدیدہ" کی تمام علمی و عملی گمراہیوں پر ناقدانہ روشنی ڈالتے ہوئے ایک بہترین تبصرہ کیا گیا ہے، دورِ حاضر کی تمام غلط کاریوں، غلط نگاریوں، اور گوناگون خام خیالیوں کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور باطل کے ان تمام پردوں کو چاک کر ڈالا ہے جو غیر اسلامی ذہنیت نے دماغوں پر ڈال رکھے تھے، اس تخریب کے بعد تعمیر کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور اسلامیات کی سچی تفسیر کرتے ہوئے اُن معنوی تحریفات کے خلاف زبردست احتجاجی آواز بلند کی ہے جو ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرف سے مغرب زدگی کی بنا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں یا ان علمائے سو کی جانب سے نمودار ہوتی ہیں جو اسلامی عقاید، اسلامی افکار اور اسلامی حقائق کی بلندی کو اپنی کوتاہ علمی کے باعث حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور اپنی خیرہ نگاہوں کے باعث اس کی سچی روشنی سے فیض یاب نہیں ہو سکتے در حقیقت "جاوید نامہ" دہریت، مادہ پرستی یا جدید اعتزال کے زہر قاتل کا ایک بے مثل تریاق ہے اقبال نے اس کے ذریعہ اسلامی زندگی کی جدید تشکیل کا سامان فراہم کر کے ہماری نئی نسل کو غیر اسلامی انداز فکر و نظر اور غیر اسلامی کردار و عمل دونوں سے بچانے کی زبردست کوشش کی ہے ہم مسلمان نوجوانوں سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ ضرور اقبالیات کا مطالعہ کریں خصوصیت سے "جاوید نامہ" ضرور پڑھیں۔

جاوید نامہ کی ابتدا ایک عجیب مناجات سے ہوتی ہے جس میں "صاحب شکوہ" نے اپنی شکوہ سنجی کی پوری شان باقی رکھی ہے۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست؟ ایں سپہر نیلگوں حیران کیست؟

اس شعر میں آیۂ تسخیر سے مراد قرآن عزیز کا وہ حصّہ ہے جس میں انسان کے لئے قوائے عالم کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ اس کو قرآن نے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ۝ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	اللہ نے مسخر کر دیا جو کچھ آسمان و زمین میں ہے تمہارے فائدے کے لئے غور و فکر کرنے والے لوگوں کے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	اور اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے مینہ برسایا اور اُس سے تمہارے کھانے کو میوے پیدا کئے۔
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝	اور جہاز تمہارے تابع کر دیئے ہیں تاکہ وہ سمندروں میں اس کے حکم سے چلتے رہیں اور اسی خدا نے تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کر دیا ہے اور سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں (کہ ایک خاص نظام کے تحت گردش کرتے ہیں) اور رات دن کا الٹ پھیر بھی تمہارے فائدہ کے لئے ہے اور تمہیں اُس

خدا نے وہ سب چیزیں عطا کر دی ہیں جو تم نے اُس سے مانگیں اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو ہرگز گن نہ سکو گے۔

ان دو آیتوں کے علاوہ بے شمار آیتیں اس مضمون کی نکل سکتی ہیں جن سے تسخیر کی حقیقت معلوم ہوگی مگر مزید تفصیل کے لئے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تسخیر کا لفظ ایک جامع مفہوم ادا کر رہا ہے جس کے تحت ہر چیز

کا طوعاً وکرھاً، ہر طرح سے تابع و مسخر ہونا ضروری ہے انسان کی کائنات وما فیہا کے ساتھ جو خاص نسبت ہے اس کو واضح کرنے کے لئے اس سے اعلیٰ تعبیر ممکن ہی نہیں قرآن مجید کی ان صراحتوں سے پیشتر انسانی عظمت کا تصور اس سے کہیں کم تر تھا اور تمام مذاہب و اقوام کا تصورِ انسان کے متعلق نہایت ناقص تھا لیکن قرآن مجید نے انسان کے لئے "تسخیرِ کائنات" کا اعلان کر کے نہ صرف اس کی عظمت کا اعلان فرمادیا بلکہ انسانی عقل کے لئے ایک بلند ترین نصب العین بھی متعین کر دیا اسی میں تمام کائنات کی قوتوں اور ان پر تصرف کا مفہوم مضمر ہے آگ، بجلی، پانی وغیرہ پر جو انسان کی حکمرانی ہے وہ اسی تسخیر کا توفیض عام ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ کائنات کے کون کون سے راز ہائے سربستہ کھلنے والے ہیں۔

· سَتُبْدِي لَكَ الْاَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلاً　　وَيَأْتِيْكَ بِالْاَخْبَارِ مَا لَمْ تُزَوِّدِ

آگے چل کر اقبال اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ مغربی قوموں کے انکشافات پر جو لوگ سر دھن رہے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ "حکمتِ اشیا" فرنگی زاد نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت "لذتِ ایجاد" ہے جو خدا نے انسان میں ودیعت کر دی ہے۔

راز دانِ عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ کہ بود؟　　مستِ آں ساقی و آں صہبا کہ بود؟
بر گزیدی از ہمہ عالم کرا؟　　کردی از رازِ دروں محرم کرا؟
اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت　　حرف "ادعونی" کہ گفت و با کہ گفت؟

ان اشعار میں اُن قرآنی آیتوں کی طرف اشارات کئے گئے ہیں جن میں خلافتِ آدم کا تذکرہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو منصب "خلافتِ الٰہیہ" سے نوازنا چاہا تو فرشتوں سے برسبیل تذکرہ فرمادیا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں فرشتوں نے نیازمندانہ طور پر عرض کیا کہ سابقہ خدمتیں برابر انجام دی جا رہی ہیں، تسبیح و تقدیس و تحمید وغیرہ میں ہم برابر مصروف ہیں یہ نئی خدمت بھی ہمارے سپرد کر دی جائے ہم ہر طرح حاضر ہیں اس پر ارشاد باری ہوا کہ "تکوینی اسرار" کا علم تم کو نہیں اور وہ مصالح جو آدم کی تخلیق اور اس کی

خلافت ارضی سے متعلق ہیں تمہارے بس کی بات نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر آدم کی برتری وخصوصیت جتلائی اور تعلیم اسما یعنی "حقائق اشیا" کی تعلیم فطری دے کر فرشتوں سے دریافت کیا کہ بتلاؤ "اسمائے مسمیات" کیا ہیں؟ فرشتوں نے صاف عرض کر دیا کہ نہیں تو اسی قدر علم ہے جس قدر تو نے عطا فرمایا ہے اور وہ ہماری فطری استعداد کے مطابق ہے پھر آدم نے حکم الٰہی سے ان کو سب کچھ بتلا دیا جب فرشتوں کا اور آدم کا تکوینی فرق واضح ہوگیا تو ارشاد ہوا "سجدہ کرو" سب نے سر نیاز جھکا دیا مگر ابلیس نے سرکشی کی اور سجدہ سے انکار کر دیا اُسے درگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا بہرحال مذکورہ اشعار میں "تعلیم اسما" کی طرف اشارہ ہے جس سے مراد کائنات مادی کے وہ تمام حقائق ہیں جن کو دریافت کرنے کی صلاحیت واستعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی تھی ادراک عقل، احساسات، دنیا کی مفید ومضر چیزوں کی خاصیتیں انسانی زندگی کے وہ تمام لوازم جو انسان اپنی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فراہم کرتا جائے گا سب اس میں داخل ہیں دوسرے شعر میں ان آیات کریمہ کے مضمون کی طرف راہنمائی کی گئی ہے جن میں انسانی شرافت وفضیلت کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات اور کائنات کی ساری چیزوں پر انسان ہی کو خلیفۃ اللہ بنا کر فضیلت دی گئی ہے تیسرے شعر میں ایک خاص انداز کے ساتھ دریافت کیا جاتا ہے کہ "حرف" ادعونی "کس سے کہا گیا ہے، اور ان آیات کریمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

فَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ	پس اے پیغمبر اسلام! جب تم سے میرے متعلق میرے بندے دریافت کریں
قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا	تو کہدو کہ بے شک میں قریب ہوں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں پس
دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ	انہیں میری باتیں مان لینی چاہئیں اور مجھ پر ایمان لانا چاہئے تاکہ وہ لوگ
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (سورہ بقر)	رشد وہدایت پائیں،

اس کے بعد پوری حقیقت چند لفظوں میں بے نقاب کر ڈالی کہ تیرا ہی روئے زیبا میرا ایمان اور میرا قرآن ہے لیکن میری جان نازک تو نے اپنے جلوہ سے محروم رکھا ہے!

روئے تو ایمان من قرآن من جلوۂ داری دریغ از جان من

لیکن اس کے باوجود اقبالؒ نے انسانی بے بسی کو بھی اس طرح ظاہر کیا ہے کہ آج زیر گردون "خلیفۃ اللہ" ہونے کے باوجود اپنے وجود کو غربت میں محسوس کر رہا ہوں پس تو پھر "اِنِّیْ قَرِیْب" کہکر میری مہجوری و دوری کو ختم فرمائے اور مجھے اپنی بے پایاں رحمت سے قریب کرے۔

زیر گردوں خویش را یابم غریب زاں سوئے گردون بہ گو "اِنِّیْ قَرِیْب"

مناجات کے بعد تمہید آسمانی شروع ہو جاتی ہے جس میں "حقائق عزیبہ" بتلانے کے بعد کہا جاتا ہے

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را اوست سید جملہ موجودات را

یعنی جو جمال ذات الٰہی کے عشق و محبت کا متوالا ہو جاتا ہے وہ تمام موجودات کا سردار کہلاتا ہے یعنی ساری کائنات اس کے آگے سربسجود رہتی ہے اور وہ ان سے خدمت لینے لگتا ہے، مقصود یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جانا چاہیے چونکہ غیر اللہ کی تمام قوتیں اس کی خادم ہیں ان میں سے کسی کے آگے اس کو اپنا سر نیاز جھکا کر خود کو ذلیل کرنا نہیں چاہیے یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے پیش کیا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ تمام جنوں اور انسانوں کو میں نے اپنی "عبادت" ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

پھر تمہید آسمانی کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے جس میں عارف رومی کی روح آشکارا ہو کر "اسرار معراج" کی دل پذیر شرح کرتی ہے اور "زندہ رود" ساز رومی سے مست ہو کر بے اختیار ایک غزل گانے لگتا ہے پھر وہی رومی اور "زندہ رود کی" گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس میں موجود و ناموجود اور شواہد ثلثہ، اور مقام تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے حقائق واضح کئے جاتے ہیں اور بتایا جاتا کہ جب سلطان (چارٹر) تمہارے قبضہ میں آ جائے گا تو زمین کیا چیز ہے آسمان کو بھی توڑ سکتے ہو پھر ایک عجیب غریب دل فروز و جاں نواز نکتہ بتایا جاتا ہے

نکتہ الا بسلطان یاد گیر ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر

یعنی قرآن کی تعلیم

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُوْنَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ۔

اے جن و انس کے گروہ! اگر تم آسمان و زمین کے کناروں سے نکل بھاگنے کی قدرت رکھتے ہو تو بھاگ جاؤ مگر سلطان (خدائی چارٹر) کے بغیر بھاگ ہی نہ سکو گے۔

کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی وسیع سلطنت کی حدود سے کہیں نہیں بھاگ سکتا جب یہ حقیقت آشکارا ہو گئی تو انسان کو اپنے خالق حاکم اور مالک حقیقی سے پورا وابستہ ہو جانا چاہیئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو مور و ملخ کی طرح دنیاوی زندگی ختم کر کے مرجانا پڑے گا اور مجازات کے روحانی عالم میں "یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا" کہہ کر حسرت و ندامت سے مادی زندگی کے برباد ہونے پر اور روحانی زندگی کی محرومی اور ناکامی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔

ان حقائق کے بعد عارف رومی کی روح نے زندگی کی تفسیر کی ہے اور عقل و عشق کا موازنہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ آدمی وہی ہے جس میں "دید دوست" کی تمنائے بے پایاں ہو جو اس کو سراپا نظر بنا دے اور زمان و مکان کو اپنے احوال جان کر سمجھنے لگے پھر جسم و جان کی حقیقت آشکارا کی گئی ہے زمان و مکان کی روح زرواں" مسافر کو عالم علوی کی سیاحت پر لے جاتی ہے اور انجم کی زمزمہ سنجیاں شروع ہو جاتی ہیں اور زمزمہ انجم کی تان اس پر ٹوٹ جاتی ہے۔

ضرب قلندری بیار سد سکندری شکن رسم کلیم تازہ کن رونق ساحری شکن

فلک قمر میں پہنچ کر بہت سے عجیب و غریب غار نظر آتے ہیں ایک غار میں وہ عارف ہندی خلوت گرفتہ ہے جس کو ہندوستان والے "جہاں دوست" کہتے ہیں" جہاں دوست" رومی سے دریافت کرتے ہیں تمہارے ساتھ کون شخص ہے رومی اپنے ساتھی کا تعارف ایک انوکھے انداز میں کراتے ہیں پھر جہاں دوست

اور رومی میں مکالمہ شروع ہوجاتا ہے عارف ہندی اپنی نو باتیں پیش کرتے ہیں اور جلوہ سروش" کی جلوہ فرمائی کے بعد" نوائے سروش" کی نغمہ سنجیاں شروع ہوجاتی ہیں" نوائے سروش" میں اقبال نے قرآن کے فہم و تدبر کا دہ بے مثل نمونہ پیش کر دیا ہے جس کو خود انہوں نے آزمالیا ہے جن لوگوں کو قرآن کے علوم و حقائق کا صحیح ذوق ہے وہ ضرور اس سے لطف اندوز ہوں گے مگر جو شخص حجابوں کی دنیا میں زندہ ہا وہ اسی طرح حجابوں کے آغوش میں مرکر فنا ہو جائے گا۔ دنیا کی مادی زندگی اور عقبیٰ کی روحانی زندگی دونوں تیرے لئے حجابات بن گئے ہیں حالانکہ چاہئے تھا کہ اپنی دنیا دی زندگی میں تو حجاباتِ نظر کو اٹھا دیتا اور آخرت میں خود بخود تیری مادی نظر کے حجابات اٹھ جاتے اور تیری نگاہیں روحانی مناظر کے لطف سے محفوظ ہوتیں، اس کے بعد اقبال نے اپنے فہم قرآن کا حال بتایا ہے کہ،

چوں سر رہ رازی را از دیدہ فرو شستم　　تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

یعنی جب میں نے پیچ و تاب رازی سے نجات پائی، متکلمانہ قیل و قال اور لفظیوں کے جنگ و جدال سے نکل کر قرآن عزیز اور اس کے فطری اسلوبِ استدلال کو سمجھنا شروع کیا تو مجھ پر یہ رازِ حقیقت آشکارا ہوگیا کہ قرآن میں تقدیر امم پوشیدہ ہے اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سی قوموں کو رفعت و سربلندی عطا فرماتا ہے اور اسی کی وجہ سے سینکڑوں ایسی حضیض ذلت میں جا گرتی ہیں یعنی جن قوموں نے اپنے خود ساختہ طریق فکر و عمل کو چھوڑ کر اللہ کی کتاب کو اپنی اجتماعی زندگی کا پروگرام بنالیا وہ کامیاب و کامران ہوئیں اور جنہوں نے فطرت کے اصول حقہ سے انحراف کیا وہ خائب و خاسر ہوئیں،

اس دور میں اور ہر دور میں قرآن کی پیش کی ہوئی حقیقتوں سے دور رہنے کا سبب جس نے قرآن کے عملی پہلو سے لوگوں کو دور رکھا ہے یہ ہے کہ عام طور پر عہد نبوت، عہد صحابہ، اور عہد تابعین کے بعد لوگوں نے قرآن کے فہم کے لئے ایک پست معیار قائم کر لیا اور یہ چیز قرآن کے محاورات، اس کی ترکیبوں اور معانی و مطالب کے فہم تک میں قائم ہوگئی، اور عہد سلف کے بعد سے جتنے "مفسرین قرآن" پیدا ہوئے ان کا فکری معیار ایک

رو بہ تنزل طریق کے طرف جاتا رہا نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ جب براہ راست قرآن کا فہم و تدبر متروک ہوگیا اور " خام فلسفیت " یا اعتزال کی وجہ سے مسلمان معقولین پر اس دور کے " عقلی علوم " کا تسلط ہوگیا تو انہوں نے قرآن کی سیدھی سادھی بے میل فطری تعلیمات کو بھی معقولیانہ انداز سے دیکھنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کو انسانی علوم پر ڈھالا جانے لگا جب " ارباب اعتزال " نے یہ ہنگامہ آرائیاں برپا کیں تو ان کے مقابلہ میں پہلے دو جماعتیں پیدا ہوئیں پہلے گروہ نے سلفیت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، اور دوسرے گروہ نے مدافعت اسلامی کے نام پر ارباب اعتزال سے ردوکد اور بحث مناظرہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں کے طرز استدلال کو قبول کر کے اعتزال سے پیدا ہونے والے شبہات کا جواب دینا شروع کیا اور اپنے عقاید تو سلفیانہ رکھے مگر اس کے لئے طرز تعبیر میں ان فلسفیانہ موشگافیوں کو استعمال کیا جن کے باعث " جدلیات " کا ایک وافر حصہ اسلامی لٹریچر میں پیدا ہوگیا یہ گروہ جب اپنے ذاتی عقائد کا اظہار کرتا تو اپنا مسلک سلفی بتلاتا اور جب سلفی عقاید پر اعتراضات ہوتے تو معترضین کا جواب دینے کے لئے غیر شعوری طور پر ان اصول استدلال کو تسلیم کر لیتا جو روح قرآن سے کلی طور پر اپنے مزاج طبعی کے لحاظ سے الگ تھلگ تھے ۔ اس لئے اس طبقہ نے جس قدر غیروں کے شکوک و شبہات کو فنی و علمی شکل دے دی ہے اس قدر جوابات کی " دنیائے نو " کی تعبیر نہیں کی اور بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی الجھاؤ بڑھتا ہی گیا اور اس چیز کا پورا استیصال ان سے نہ ہو سکا جس کے لئے انہوں نے کمر ہمت باندھی تھی اسی طبقہ کو متکلمین کا گروہ کہتے ہیں اور ان کے سب سے بڑے نمائندے علامہ فخر الدین رازی ہیں ان دو طبقوں کے بعد عالم اسلامی میں ایک تیسرا ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے متکلمین کے اصول ان کے مسلمہ کلیات اور تمام عقلی ضوابط پر ایک زبردست تنقیدی نظر ڈالی اور ان کو کانٹ چھانٹ کر از سر نو ایک " جدید فلسفہ " کی بنیاد رکھی پھر ان تمام شکوک و شبہات کو جو متکلمین کے یہاں زبردست سمجھے جاتے تھے حل کر کے رکھ دیا اور یونانی عقلی علوم کی ذہنی مرعوبیت کا طلسم ٹوٹ گیا اس طبقہ میں " منصب تجدید " امام ابن تیمیہ کو حاصل ہے یہ چند سطریں ناگزیر تھیں تاکہ

"چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر"

کو سمجھ لیا جائے اب شعر کا مطلب سمجھئے، علامہ اقبال اپنے "تکلم" سے "سلفیت" اور عرفان حقیقت کی طرف آنے کا نتیجہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب متکلمین کے وضعی طریقوں کو چھوڑ کر قرآن کے فطری طرزِ استدلال پر تدبر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں "تقدیرِ امم" پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد وادی "یرغمید" کی طرف حرکت ہوتی ہے جس کو فرشتے "وادی طواسین" کے نام سے یاد کرتے ہیں یہاں عارف رومی شعر کی حقیقت پر کلام فرماتے ہیں کہ اس کی کونسی قسم مفید ہے اور کونسی غیر مفید و مضر ہے۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اس کے بعد اقبال عارف رومی سے "پیغمبری" کی حقیقت دریافت کرتا ہے اور وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

گفتم از پیغمبری ہم باز گوئے سرّ او با مردِ محرم باز گوئے
گفت اقوام و ملل آیات اوست عصر ہائے ما ز مخلوقات اوست
از دم او ناطق آمد سنگ و خشت ما ہمہ مانند حاصل او چو کشت
پاک سازد استخوان و ریشہ را بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات از لب او نور و نجم و نازعات
آفتابش را زوالے نیست نیست منکر او را کمالے نیست نیست
رحمتِ حق صحبتِ احرار او قہر یزداں ضربتِ کرار او
گرچہ باشی عقل کل از وے حرم زانکہ او بیند تن و جاں را بہم

عارف رومی سے اقبال نے پیغمبری کی حقیقت دریافت کی عارف رومی نے کہا کہ قومیں اور ملتیں پیغمبری کی نشانیاں ہیں ہمارے تمام زمانے پیغمبری ہی سے بنے ہوئے ہیں، پیغمبری وہ چیز ہے کہ سنگ و خشت بھی اس کے دم سے ناطق بن جاتے ہیں، پیغمبری لہلہاتی ہوئی کھیتی ہے اور انسانیت اس کا حاصل، پیغمبری

استخوان وریشہ کو پاک کر دیتی ہے اور فکر و اندیشہ کو "بال جبریل" عطا کرتی ہے کائنات میں یہ سب کچھ ہادی پیغمبری ہی کے طفیل سے ہے نجم، نور، اور نازعات کی تعلیمات بھی پیغمبری ہی سے ملتی ہیں اس شعر میں بتایا گیا ہے کہ قرآنی تعلیمات رسول ہی کی زبانی انسانوں تک پہنچتی ہیں جس سے کائنات کے اندر ہنگامہ آرائیاں نظر آتی ہیں مثلاً سورہ نجم اگرچہ ایک مختصر سی مکی سورت ہے مگر اس میں نبوت اور نبوت محمدی کی حقیقت کو ایک دل نشیں طریقہ پہ سمجھایا گیا ہے اور اسی طرح سورۂ نور میں بتایا گیا ہے کہ قرآن عزیز کی فطری تعلیم سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو رذائل سے مجتنب ہو کر فضائل سے آراستہ ہو جانا چاہئے تاکہ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی بارگاہ قدس تک پہنچنا آسان ہو اور "نازعات" میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی محض مادی زندگی ہی نہیں بلکہ یہ مادی زندگی ایک روحانی زندگی کا پیش خیمہ ہے یہاں اعمال انسانی میں جو کچھ بھی خیر و شر ہوگا آخرت کی روحانی زندگی میں اس کی جزا ملے گی اور مجازات اعمال کو ثابت کرنے کے لئے قوموں کے عروج و زوال سے استشہاد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس فطری تعلیم کے انکار کے باعث فرعون اور فرعونیوں کو ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔

پیغمبری کا آفتاب جہاں تاب کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا پیغمبری کا منکر درجۂ کمال پر نہیں پہنچ سکتا صاحب رسالت کے فیضان محبت سے مستفید ہونے والوں کی محبت رحمت حق ہے اور پیغمبر کی ضرب اللہ کا قہر و غضب ہے اگر انسان عقل کل بھی بن جائے پھر بھی نبوت کی راہ نمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ تن و جان کو بہم دیکھنا اور روحانیت و مادیت میں ایک مناسب امتزاج پیدا کرنا جس سے انسان کی خودی ترقی یافتہ ہو جائے انہیں کا کام ہے اس کے بعد "طواسین رسل" کے نام سے مہاتما گوتم بدھ، زردشت، حضرت مسیح، اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں یہاں گوتم اور زردشت کو نبی قرار دیا گیا ہے اس لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالےٰ نے ہر زمان و مکان، ہر قوم و ملک، ہر خطہ زمین پر اپنی طرف سے حق کا پیغام پہنچانے والوں

اپنے رسولوں اور نبیوں کو بھیجا ہے جنہوں نے انسان کو، اللہ کی ذات و صفات کی توحید، اعمال انسانی کی مجازات، اس مادی دنیا کے بعد ایک روحانی اخروی زندگی کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ انسانی تخلیق و تکوین کا مقصد محض حیوانی خواہشات اور نفسانی جذبات کی تسکین ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبے میں ایسی پاکیزہ عملی حالت پیدا کر لیتی ہے جو اللہ کی خوشنودی کا باعث ہو اور اس کے لئے خود اسی نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ انسانی زندگی کا دستور العمل دے دیا ہے تاکہ انسان اپنی انفرادی، اجتماعی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی، ہر حالت میں عدل و قسط کا پابند ہو جائے چنانچہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی تھے جن پر دین اسلامی کی تکمیل اور نعمت الٰہی کا اتمام ہو چکا اور قیامت تک اقوام و ملل اور ممالک و دول کے لئے آپ کی تعلیمات خضر راہ ہیں۔ باقی جو کچھ ہے وہ صرف سراب زندگی ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (النساء ع ۲۳)

اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا ہے جن میں سے بعض کا قصہ تم کو سنایا اور بعض کا نہیں۔ رسولوں کو خوش خبری سنانے والے اور اعمال کے بُرے نتائج سے ڈرانے والے بنا کر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ لوگوں پر اللہ کی حجت باقی نہ رہے (اللہ کی عزت و حکمت کا تقاضا ہی یہ تھا) کیوں کہ وہ عزیز و حکیم ہے، ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے ایسے رسولوں کو بھیجا ہے جن کا قصہ تم کو سنا دیا ہے اور بعضوں کا نہیں سنایا، کسی رسول کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی آیت لاسکے۔ جب اللہ کا حکم آ چکتا ہے تو حق کے

بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (مومن ع ۸) ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اہل باطل اس موقع پر ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایک جگہ اس طرح فرمایا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ "اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا اور حکم دیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی اطاعت سے اجتناب کرو"

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے،

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ۔ "اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی اللہ کا رسول نہ آچکا ہو"

ان تمام قرآنی صراحتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسولوں کی دو قسمیں ہیں، بعض کا ذکر قرآن عزیز نے کر دیا ہے خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی اور بعض وہ ہیں جن کا قرآن نے ذکر نہیں کیا، مگر یہ صاف فرما دیا ہے کہ ہر امت میں اللہ کا رسول بھیجا گیا ہے کیونکہ رسولوں کو بھیجنے کے بعد ہی اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجت تمام ہو سکتی ہے، جن رسولوں، اور نبیوں کی تفصیلی حالت قرآن نے بیان کی ہے ان پر اسی تفصیل کے مطابق ایمان لانا چاہیے اور جن کا کوئی ذکر اجمالی بھی نہیں کیا گیا ہے ان پر مطلق ایمان لانا چاہیے کہ ہر جگہ اللہ کے نبی آچکے ہیں، مگر ہمیں یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ جس علم کی تفصیل سے اللہ نے ہمیں بے بہرہ رکھا ہم اس کی راز کشائی کے درپے ہو جائیں اور محض تاریخی طور پر حکم لگائیں کہ فلاں نبی تھے فلاں رسول تھے، جیسا کہ مہاتما گوتم بدھ، اور زرتشت کے متعلق ہم صاف طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی تھے کیونکہ ان کی تصریح قرآن نے نہیں کی، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ برے تھے ممکن ہے کہ وہ نبی ہی ہوں، یا کسی نبی کی امت کے صلحاء ہوں، کیونکہ ان کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سچائی اور نیکی کی تعلیم دی تھی ایمان، عمل صالح،

اور مجازات اعمال پر زور دیا تھا، بہر حال جو لوگ ان کو نبی کہتے ہیں وہ مجرد زعم ہے، محض تاریخ کی شہادت کافی نہیں ہے اور وہ بھی بہت سے اختلافات میں الجھی ہوئی ہے، زردشت کے متعلق خود ان کی ہستی، اور ان کے ظہور کا زمانہ بھی ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گیا ہے، بعضوں نے تو اس تاریخی ہستی ہی کا انکار کر دیا ہے اور بعض نے شاہ نامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا ہے بعضوں نے ان کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا، بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس تک بڑھا دی، اس طرح محل کی تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا، اور شمالی ایران قرار دیا، اسی طرح اور شخصوں کا بھی حال ہے۔ لہٰذا ہم کو ان حضرات کی نبوت و رسالت پر حکم لگانا آسان نہیں ہے اور عقاید کے باب میں قطعی دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

ہاں بعض صوفیا کرام کے مکاشفات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نبی تھے محض کشف کوئی دلیل و حجت نہیں بلکہ اگر شرعی دلائل کے معارض ہو تو چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا رجحان بعض صوفیا کے مکاشفات اور مؤرخین کے رجحانات کی طرف ہے مگر حقیقت حال وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔

"طاسین مسیح" میں مصلح روس، حکیم طالسطائی کا ایک خواب ذکر کیا گیا ہے جس میں امت مسیح کی شکایت کی گئی ہے پھر طاسین محمد میں روح ابو جہل کا حرم کعبہ میں نوحہ ایک عجیب پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے اسلامی تحریک کا مزاج طبعی اور اس کا ابتدائی اٹھان معلوم ہو جاتا ہے۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ   از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاک قیصر و کسریٰ سرود   نوجوانان را ز دست ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است   ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری است
تا بساط دین آبا در نورد   با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

پاش پاش از ضربتش لات و منات — انتقام از وے بگیرائے کائنات!
دل بغائب بست و از حاضر گسست — نقش حاضر را فسونِ او شکست
دیدِ بر غائب فرو بستن خطا است — آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا است
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری است — دینِ نو کور است و کوری دوری است
خم شدن پیشِ خدائے بے جہات — بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت
مذہب او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمران با اسودان آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلماں مزدکیست
ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است
عترتِ ہاشم ز خود مہجور گشت — از دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت

ان اشعار میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن اور حاملِ قرآن کی وجہ سے سرزمین عرب میں ظاہر ہوا اور پھر انسانیت کی ایک جدید تشکیل کی کہ جس میں جامد و متحرک ہر قسم کے بتوں کی فرمانروائی ختم کردی گئی اور ایک خدائے حکیم و قدیر کے ساتھ انسانیت کو وابستہ کردیا۔ انسانیت کا فضل و شرف ملک و نسب سے ہٹا کر اللہ کی وابستگی پر رکھا اور تمام انسانوں میں توحیدِ الٰہی کی بنیاد رکھی کہ "احرارِ عرب" اور "کلفتانِ حبش" دونوں مل جل کر بھائی بھائی ہوگئے جس کی وجہ سے انسانیت ہلاکت سے نکل کر کامیابی کے راستہ پر پڑ گئی چنانچہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا "تمام مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو اور جدا جدا

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔

مت ہو جاؤ اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے پس اُس نے تمہیں ہلاکت سے بچا لیا اللہ اسی طرح تم سے اپنی آیتیں بیان کر دیتا ہے تاکہ تم لوگ ہدایت پر آجاؤ۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے اس "کلمہ جامعہ" کا ذکر فرمایا ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ نے انسانیت پر احسان فرمایا اور اس کی عداوتوں کو مٹایا اور دلوں میں الفت پیدا کر دی جس سے اخوت کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور اخوت سے پہلے جو خطرناک حالت پیدا ہو گئی تھی اس سے بچا لیا۔

اسی طرح قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فضیلت تقویٰ پر ہے اور اس کے سوا کسی چیز پر نہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعوب و قبائل پر بنایا ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لو۔ بے شک اللہ کے ہاں تم میں بزرگ وہی ہے جو تم سب سے زیادہ متقی ہو، یقیناً اللہ علم والا، خبردار ہے۔

یہاں صاف صاف اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ "شعوب و قبائل" محض باہمی تعارف کا ذریعہ ہیں اور اللہ کے نزدیک بزرگی و برتری صرف صاحب تقویٰ کو حاصل ہے اسلام نے ہر قسم کی قومیتیں خواہ وطنی ہوں یا نسلی ہوں سب کو مٹا کر ایک نئی "بین الاقوامی انقلابی جماعت" پیدا کی

ہے جس کا کام قرآن کے انقلابی جہانی نظریہ کو انسانیت کی فلاح کے لئے رائج کرنا ہے اس لئے ضروری تھا کہ جاہلیت کے تمام تصورات سے الگ اپنی تعمیر کا نقشہ پیش کیا جائے اب پھر ایک مرتبہ اشعار مذکورہ پڑھو کہ کس طرح روح ابوجہل آج بھی نوحہ خواں ہے، اور اس "مساوات اسلامی" کی حقیقت کے بے نقاب ہونے سے کسی طرح آج زرپرست، اور زرپسند انسان گھبرا رہے ہیں، اور دنیا کے موجودہ غیر اطمینان بخش دور میں اگر اس "اسلامی مساوات" کو پیش کیا جائے تو کیا دنیا اپنی سیرابی کا سامان اس آب حیات کے ذریعہ نہیں کر سکتی؟ اب وقت نہیں ہے کہ اسلامی مساوات، اخوت اور اس پر قائم ہونے والی اجتماعی فلسفہ، وتمدن کی عمارت کو اس وقت تک موخر کر دیا جائے جب تک کہ "نسلی مسلمان" سدھر نہ جائے بلکہ اب پھر سے "ہیئت اجتماعیۂ اسلامیہ" کی دعوت عام طور پر دیتے رہنا چاہئے جن لوگوں کے دلوں میں استعداد و قابلیت ہوگی وہ ادھر کھینچ کر آئیں گے، خواہ موجودہ "نسلی مسلمان" ہو یا دوسری "غیر مسلمان قوموں" کے سعید و صالح افراد، مگر کتنی افسوس ناک ہے یہ حالت کہ وہ جس کے پاس یہ "آب حیات" موجود ہے وہ اقوام عالم کی امامت کے بجائے غیروں کی امامت میں دوڑے چلا جا رہا ہے، اور شعوری یا غیر شعوری کسی نہ کسی طرح اس کو درست بھی سمجھتا ہے، لیکن امید ہے کہ اسلام کا عمومی پیام پھر ایک بار اسی طرح زندگی بخش ثابت ہوگا جس طرح پہلے ہو چکا ہے اور وہ تمام سعید روحیں آملیں گی جن کے اندر اسلامی انقلاب کی تڑپ موجود ہے۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　　　بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

جب زندہ رود کو اس کا رہنما فلک عطارد میں لے جاتا ہے، تو وہاں سید السادات مولانا سید جمال الدین افغانی اور ترکوں کے بہترین سپہ سالار حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقاتیں نصیب ہوتی ہیں "رومی" زندہ رود کا تعارف دونوں سے کراتے ہیں، زندہ رود سے حضرت افغانی دنیائے جدید بالخصوص مسلمان ملکوں کے حالات دریافت فرماتے ہیں، پھر علامہ افغانی جواب دیتے ہیں اور "دین" و "وطن" کا مفہوم

سمجھاتے ہیں، "اشتراکیت" و "ملوکیت" کے طلسم کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اس کے بعد "زندہ رود" سعد حلیم پاشا سے ہم کلام ہوتا ہے اغازی مرحوم اہل شرق و اہل غرب کے اختلافات اور نفسیاتی رجحانات پر نہایت دل افروز تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افرنگیوں کا شعلہ "نم خوردہ" ہو چکا ہے ان کی آنکھیں اگرچہ تیز ہیں مگر پہلو میں دل مردہ ہو چکے ہیں کمال اتاترک نے یورپین قوموں کی تقلید و نقالی کر کے جو "تجدد" کا ثبوت دیا ہے اس کی پوری اصلیت آشکارا کر دی جاتی ہے کہ ترکوں نے جس کو "جدید" سمجھا حقیقت میں وہ ایک بالکل "ضلال قدیم" ہے اس تقلید کے باعث ترکیہ اپنے مرکز اصلی "اتحاد اسلامی" سے ہٹ گئی ہاں! پھر سے "ملت ترکیہ" کے "تجدد" کی نہیں "تجدید" کی اگر ضرورت ہو تو ان خیر خواہی کی باتوں کو محفوظ رکھو، اور سوچو کہ کب تک دوسروں پر تکیہ کرو گے؟

چو مسلمانان اگر داری جگر! ۔۔۔ در ضمیر خویش و در قرآن نگر!
صد جہانِ تازہ در آیاتِ او ۔۔۔ عصرہا پیچیدہ در آیاتِ او
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است ۔۔۔ گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است ۔۔۔ ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش ۔۔۔ می دہد قرآن جہانے دیگرش

اگر تم مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو تم اپنے ضمیر اور قرآن ان ہی دو چیزوں کو ٹٹول کر دیکھو یعنی اپنے فطری انداز سے غور کرو کہ تم میں اور قرآن میں کیوں لگاؤ نہیں ہے قرآنی ہدایات کے علمی و عملی پہلو کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے کہ تمہاری حیات اجتماعی پر غیر اسلامی نظریات و افکار نہ صرف خارجی طور پر مسلط ہو چکے ہیں بلکہ ذہن و دماغ کی پوری فکری صلاحیت مفقود ہو چکی ہے جو کچھ سوچا جاتا ہے، اپنے ضمیر کی روشنی میں نہیں بلکہ دوسروں کے مستعار فکر سے سوچا جاتا ہے بس اس کو چھوڑ دو اس ضمیر سے سوچو جو اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہو، پھر قرآن سے وابستہ ہو جاؤ یہ تمہاری زندگی میں کامیابی

ہے۔ قرآن کو "اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" یا دستور کہن" نہ سمجھ لو اس کی آیتوں میں سینکڑوں نئے نئے جہاں آباد ہیں اس کی آیتوں میں بہت سے زمانے پیچیدہ ہیں جن میں اگر ایک "عصر قرآنی" بھی پالو تو "عصر حاضر" کی کرب دبے چینی اور اجتماعی پریشانی کو رفع کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ تمہارے سینہ میں اگر معنی رس دل موجود ہے تو ان حقائق پر غور دخوض کرو۔

مومن کی حقیقت کیا ہے؟

وہ خدائے تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے اس کا وجود "خلافت الہیہ" کے نیام کا ضامن ہے ہر دور زندگی اس کے لئے ایک لباس کی طرح عارضی چیز ہے جس زمانے میں جو لباس چاہئے استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ ہر دور میں اس کو نئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے "یعنی مومن" کے اندر اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایمانی قوت سے ہر زمانے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے زمانیات سے وابستہ ہوتا ہے اور جب چاہتا ہے زمانیات کی چادر اتار پھینک دیتا ہے یعنی وہ زمانے پر حکمران ہوتا ہے زمانہ اس پر حاکم و آمر نہیں بن سکتا۔ اگر ایک زمانہ پرانا ہو جاتا ہے تو چوں کہ مومن قرآن سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے ہر دم اس کو قرآنی علوم سے نیا نیا زمانہ ملتا رہتا ہے۔

سید جمال الدین افغانی سے گفتگو

اس کے بعد "زندہ رود" سید افغانی سے گفتگو شروع کرتا ہے اور سوال کرتا ہے۔

زورق ما خاکیاں بے ناخدا است   کس نداند عالمِ قرآن کجا است

نہ تو ہم خاکدانِ فانی پر رہنے والوں کی کشتی کا کوئی ناخدا ہے۔ اور نہ ہمیں قرآنی عوالم میں سے کسی کی خبر ہے؟ اور کوئی یہ جاننے والا تک نہیں کہ "عالم قرآن" ہے کیا؟

اس پر سید افغانی" زندہ رود" سے مخاطب ہو کر فرمانے لگتے ہیں اور عالم قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔

وہ عالم ابھی تک ہمارے سینوں میں گم ہے اور "قم" کی انتظار میں ہے اس عالم میں خون و رنگ کا امتیاز نہ ہوگا

اس کی شام صبح فرنگ سے زیادہ روشن ہوگی اس میں بادشاہوں اور غلاموں کی تفریق ناپید ہوگی اور اس کی وسعت مومن کے دل کی طرح بے پایاں ہوگی وہ عالم رعنا ایسا ہوگا کہ اس کا فیض یک نظر" جاودانی عمر" میں تخم انگنی کرے گا وہ عالم ایک لایزال عالم ہوگا اس کے واردات نو بہ نو ہوں گے اس کے محکم برگ و بار بھی تازہ تازہ ہوں گے اس کا باطن ہر تغیر سے بے غم اور اس کا ظاہر ہر دم انقلاب ہی انقلاب ہوگا یہ عالم تم پوچھتے ہو کہ کہاں پوشیدہ ہے سن لو کہ یہ عالم خود تمہارے اندر پنہاں ہے آؤ اب اس کے محکمات کی تشریح بھی سن لو۔

(۱) پہلے خلافت آدم کو لو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور اس کا وجود اسرار عشق میں سے ایک بھید ہے اور کسی قسم کے حدود میں وہ محدود نہیں ہو سکتا اور اس کی پوری حقیقت۔

حرف اِنّی جَاعِلٌ تقدیر او — از زمین تا آسمان تفسیر او

یعنی آدم کی خلافت اور اس کا مقصد تسخیر کائنات کے ذریعہ عرفان الٰہی ہے" اِنّی جَاعِلٌ" کی شرح کسی قدر اوپر ہو چکی ہے مزید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ آدم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا البتہ تمام عالم مادی اس میں سما سکتا ہے آدم کا مرتبہ تمام کائنات اور اس کی اشیاء سے برتر ہے اس کا آخر دم" اصل تہذیب" ہے غرض آدم کی حقیقت کے لئے عشق اور علم دو باتوں کو سمجھ لینا چاہیے اور زندگی اسی سے عبارت ہے اور خلافت آدم کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات کا خالق، مالک اور مربی خدائے تعالیٰ ہی ہے انسان صرف اس کی طرف سے بہ طور نائب اور خلیفہ کے ان چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے اور وہ بھی صرف انہیں چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے جن کی اجازت مالک حقیقی نے دے رکھی ہے، اور استعمال بھی مالک کے منشاء و مقصد کے خلاف نہ ہونا چاہیے اگر ایسا نہ ہوا تو "خلیفۃ اللہ" کے بجائے وہ غاصب ہوگا اور اس سے بازپرس کی جائے گی مگر جب تک "خلیفۃ اللہ" کے لئے احکام الٰہی کی تنفیذ کا موقع نہ ہو اس کی خلافت کا راز سربستہ آشکارا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ دوسری چیز حکومت الٰہی ہے یعنی تمام

کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی مملوک ہے انسان کو حکومت الٰہی کے قیام کے سوا دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے اور جب انسان اپنی ظاہری و باطنی تربیت کے بعد اس مقصد کے قیام کے لئے مستعد ہو جاتا ہے تو بندۂ حق بن جاتا ہے اور "مقامات" سے بے نیاز ہوتا ہے اور اس میں حریت و آزادی اس درجہ آجاتی ہے کہ وہ نہ تو کسی غیر اللہ کی طاقت کے آگے سر جھکاتا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی اس کا غلام بن کر اس کے آگے سرنیاز خم کرے بلکہ مساوات انسانی کا دنیا میں عملی پیغام پیش کر دیتا ہے ساری زمین اس کا ملک اور اس کے ملک کا آئین "خداداد" ہوتا ہے اس کی رسم و راہ، اس کا دین و آئین اس کا زشت و خوب سب کچھ خدائے تعالیٰ ہی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس میں سے وہ "عقل خود بیں" نکل جاتی ہے جو صرف اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے دوسروں کے آرام کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے اس مرد حق کا آئین خداداد یعنی "وحی حق" (قرآن عزیز) تمام نوع انسانی کے سود و بہبود کا دیکھنے والا ہوتا ہے اور تمام انسانوں کے فوائد بحیثیت مجموعی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں اور "مرد حق" اس آئین خداداد سے وابستہ ہو کر صلح ہو یا جنگ ہر حال میں عادل ہوتا ہے اور اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ اس کے سامنے رہتا ہے اور عین حالتِ جنگ میں بھی اس کو حکم ہے کہ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ اب ذرا اس آئین خداداد "قرآن" کے مقابلہ میں انسانی ملوک و سلاطین کے آئین کا "موازنہ کرو" ے

حاصل آئین و دستورِ ملوک ده خدایاں فربه و دہقاں چو دوک

آئین ملوکیت کی وجہ سے انسانیت طبقوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک طبقہ زمین داروں کا پیدا ہو جاتا ہے جو جائز و ناجائز اموال کھا کھا کر موٹا تازہ ہوتا ہے تو دوسرا طبقہ نادار کسانوں کا ہے جو صرف ایک "دھواں" بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ انسانی طبقات کی غیر فطری تقسیم ملوکیت کے غیر معتدل نظام کا نتیجہ ہے اگرچہ یہی ملوکیت ذرا ترقی پاتے پاتے اپنی ظاہری شکل میں بہت کچھ طمطراق پیدا کرتی ہے اور "دستور جمہور" کا خوش کن نام اس کو مل جاتا ہے اور حقیقت میں شاطران ملوکیت "ہر زمانہ میں اپنی عجیب عجیب

کمین گاہیں بنا لیتے ہیں اور یہ سب کچھ جمہوریت ایک "سترِ دلبراں" ہے کہ جس کی تہ میں "انسانیت" متاعِ سوگراں بن جاتی ہے اس جمہوریت نے بھی رنگ بہ رنگ کے چولے بدلے ہیں مگر اس سے عبرت کے سوائے کچھ حاصل نہیں بلکہ اس کی تقلید سے آزاد ہو جانا ہی سب سے بڑھ کر دنیائے انسانی کے لئے آزادی ہے اور اس نام نہاد جمہوریت سے آزادی دامن قرآنی سے وابستگی کے بغیر ناممکن ہے ؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو دامن قرآن بگیر آزاد شو

افسوس ہے ان لوگوں پر جو دامن قرآن، سے وابستگی کے بغیر آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں، خواہ ہندوستانی جمہور کی مغربیت نواز جمہوریت والی آزادی ہو یا "مسلمان" نامی قوم کی قومی جمہوریت ہو جس میں دامن قرآنی سے کوئی لگاؤ نہ ہو، آپ اس کا خواہ کوئی نام رکھ لیں جب تک اس کی بنیاد قرآن کے نظریہ سیاسی پر نہ ہوگی وہ مسلمانوں کے لئے تو ان کے مرض کا علاج نہیں البتہ ممکن ہے چند سرمایہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جائے جو "اسلامی حکومت" اسلامی حکومت "پکار رہے ہیں ان کو سب سے پہلے اس کی جامع تشکیل کر دینی چاہیئے پھر اس کے قیام کے لئے وہی ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جس کے نتیجہ لازمہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آجائے ورنہ یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

(۳) ارض ملک خدا ہے یعنی جس طرح پہلے جمہوریت و ملوکیت کی پردہ دری کی گئی ہے اور کسانوں اور ناداروں کی حمایت میں آواز اٹھائی گئی ہے ٹھیک اسی طرح پر یہاں زمین کا مسئلہ حل کر دیا جاتا ہے جو موجودہ دور کی سب سے بڑی ہنگامہ خیز تحریک اشتراکیت کی جان ہے یعنی زمیندار اور کسان کی کش مکش دور کرنے کے لئے اشتراکی زاویۂ نگاہ غیر مفید ہے بلکہ قرآنی زاویۂ نگاہ پیش نظر ہونا چاہیئے۔

قرآن عزیز نے زمین اور زمین کی تمام چیزوں کو "متاع" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے یعنی یہ تمہارے استعمال کی چیز ہے اس کو تم استعمال کر سکتے ہو اور ملکیت تو صرف خدائے واحد ہی کی ہے تمہارے نفع کے لئے اس نے اپنی ملکیت کی تمہیں اجازت دی ہے۔

حق زمیں را جز متاع ما نہ گفت این متاع بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتہ از من بگیر رزق و گور از او بگیر او را مگیر

زمین کو حق تعالیٰ نے جب صرف متاع فرمایا ہے تو اس کو برتنا ضرور چاہیئے مگر اس پر "ملکیت" قائم کر کے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کسی طرح روا نہیں البتہ اپنا رزق اور اپنی "قبر" دو ضرورتوں کی تکمیل اس زمین سے کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ یہاں اشتراکیت اور اسلام کا جوہری فرق معلوم کیا جا سکتا ہے اشتراکیت مساوات انسان کی بنیاد صرف "مادیت خالصہ" پر رکھتی ہے اور ایک ظلم کو رفع کر کے دوسرے ظلم کو اس کے قائم مقام بنا دیتی ہے برخلاف اس کے قرآنی نظریہ ہے جو انسانیت کو ایک بلند اجتماعی، مادی اور مابعد الطبعیاتی نصب العین عطا کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں پوری کائنات مادی اور اس کا نظام کون و فساد ایک برتر و اعلیٰ ہستی کے ساتھ وابستہ قرار دیتا ہے اور اس طرح زمین داروں کو کسانوں پر ظلم کرنے سے روک دیتا ہے اس جوہری فرق کے بعد ان لوگوں کی غلط کاری واضح ہو گئی جو اسلامیات کو اشتراکیت پر چسپاں کرتے ہیں اور اپنی جگہ خوش ہو رہے ہیں کہ "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" حالانکہ انہوں نے دو متضاد چیزوں کو ایک کر کے فساد پیدا کر دیا ہے اور افسوس کہ ان کو اس کا شعور و احساس تک نہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

زمین کے متعلق قرآنی نظریہ واضح ہو چکا۔ جو اس حقیقت سے انکار کرے گا وہ کفر کی حقیقت سے ہم کنار ہو گا، اس واسطے کہ کفر "من یبغ غیر الاسلام دینا" کے سوائے کچھ نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اشتراکی بھی، افسوس ہے کہ ایک عجیب تضاد میں مبتلا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اشتراکیت محض کسی جزوی نظام انسانی کا نام ہے یا ایک "کلی اجتماعی نظام" کا اگر پہلی صورت ہوتی تو خیر ایک حد تک لوگوں کو معذور سمجھا جاتا مگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسری صورت ہے یعنی اشتراکی حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیائے انسانیت کی فلاح و صلاح اور اس کی کامیابی کے لئے ایک جامع و مکمل نظام

"اشتراکیت ہے جو انسانیت کی ہیئت اجتماعیہ کی ایک خاص تشکیل کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف اقتصادی نظام ہے بلکہ اخلاقی سیاسی اور عمرانی پروگرام بھی ہے اور تمام اجزا میں پورا پورا منطقی ربط و تعلق ہے صرف اس کو اقتصادی نظام قرار دینا اور "مذہب" سے غیر متصادم سمجھنا نظر و فکر کی ایسی پراگندگی ہے کہ جس کا علاج بہ ظاہر مشکل ہے اشتراکیت کا نقطۂ آغاز و کائنات کے سراسر مادی تصور اور اس کے مظہر اتم "شکم پروری" سے شروع ہوتا ہے اور اختتام ایک غیر دینی جمہوری انسانی مساوات پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صاف کہنا پڑتا ہے۔

باطن الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

اب سمجھ میں آگیا کہ کافر کا لفظ ٹھیک اپنے معنی میں بولا گیا جو اسلام کے چند رسوم کی پابندی کے ساتھ ساتھ کفر کی طاقتوں اور ان کے سیاسی نظریوں سے اتحاد ذہنی یا خارجی رکھتے ہیں وہ حقیقت میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اور "ادخلوا فی السلم کافۃ" کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں اور قرآن کی زبان میں "وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ" کے مصداق ہیں اسلام کے فلسفۂ اقتصاد کا بعض نظریات میں بظاہر اشتراکیت سے مشابہ ہو جانا ہرگز اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اسلام اور اشتراکیت باہم دیگر ہم آہنگ ہیں اور جس طرح ملوکیت پسندانہ ذہنیت رکھنے والوں نے اسلام کو اپنے معبودان باطلہ اور الٰہہ کاذبہ کی مرضیات کے مطابق ڈھالا ہے اور جب سے آقایان فرنگ کا مفاد جمہوریت کی چیخ و پکار میں مرکوز ہو گیا ہے تو اب اسلام کی جمہوریت کا بھی راگ خوب الاپا جا رہا ہے اسی طرح "اشتراکیت" کو ایک ہنگامہ خیز تحریک انقلاب سمجھ کر اسلام کو اس سے ہم آہنگ کر دینے کی غلط روش اختیار کی گئی ہے، ان سے اقبال کہتے ہیں،

بر کش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل است اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

الحاصل اشتراکیت کا نظریہ زمین کے متعلق بالکل غلط اور غیر فطری امر ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مادی اشیاء اور اس کی طبعی قدروں سے ناواقف ہیں اور مادیات سے مجرد ہو جانے

کا جو گیانہ مشورہ دے رہے ہیں۔

اسی لیے سید افغانی نظریہ قرآنی "الارض للہ" کو واضح فرماتے ہوئے صاف کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اس "کاخ و کوے" سے علیحدہ ہو جانا چاہیے بلکہ جہان رنگ و بو کو اپنی ہی دولت سمجھو مگر آذری طریقہ کو چھوڑ کر اپنی مراد پر یعنی مراد قرآنی پر ایک "جہان نو" ضرور آباد کرو چونکہ دل "حریم قرآنی" ہے اس کو کسی غیر کے حوالہ ہرگز نہ کرنا چاہیے اور اس کی ضرورت ہے کہ "لاالہ" کو از بر کر لیا جائے تاکہ ایک عالم کو اپنے اندر گم کر دیا جائے تاکہ "فقر سلطانی" اور "فقر رہبانی" کا فرق ظاہر ہو جائے۔

چوتھی چیز جس کو سید افغانی محکمات قرآنی سے تعبیر فرما رہے ہیں وہ "خیر کثیر" ہے

گفت حکمت را خدا خیر کثیر   ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

یہاں "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" پر راہنمائی کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حکمت خیر کثیر ہے اس کو ہر طرح پا لینا چاہیے وہ ہمارا ہی حق ہے آپ نے پہلے خلافت آدم حکومت الٰہی دونوں کی اجمالی حقیقت معلوم کر لی ہے۔ "خیر کثیر" کو سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں وہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضروریات زندگی کے لیے کائنات میں فراہم کر دی ہیں وہ سب اس کے حق میں خیر کثیر ہیں اور تمام تکونیات کی تحقیق و تدقیق اس کو خالق کائنات سے ہی ہم کنار کرتی جائے گی اور جو حکمت ان چیزوں میں ممد و معاون ہے وہی خیر کثیر ہے اور جب یہ حاصل ہو جائے گی تو پھر عجیب کیفیت ہو گی۔

چشم او بر واردات کائنات   تا بہ بیند محکمات کائنات

کائنات کی محکمات نظر آنے لگیں گی اور سُبْحَانَکَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ کی زمزمہ سنجیوں سے زبان شاد کام اور روح مسرور ہو گی مگر کائنات اور اس کے واردات کی تحلیل کی دو بنیادیں ہوں گی ایک تو وجود باری اور اس کی وحدت کے انکار پر دوسری

اس کے اقرار اور لوازم اقرار پر۔ پہلی صورت میں کافرانہ انداز ہو گا جس میں اپنی بدقسمتی سے اس وقت مادّہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والا یورپ عام طور پر مبتلا ہے اور اس کو تمام قوموں میں دماغی راہنمائی کا وہ مقام حاصل ہے کہ اس کا ہر "انکشاف" دنیائے جدید کے لئے وحی کا حکم رکھتا ہے۔ اے کاش مسلمان قرآنی علوم میں سے "علم تذکیر بآلا اللہ" کی حقیقت کو اس دور میں معلوم کرتے اور ایجادات واختراعات کی اہمیت کو سمجھتے! اور قرآن کے "امور کونیہ" پر بھی اپنی کوششیں صرف کرتے تو انہیں یہ حقیقت بے نقاب ہو کر نظر آتی۔ غرض حکمت اور سائنس اور اسرار کائنات کی تحقیق و تدقیق کی بنا "دین" کے نقطۂ آغاز سے ہو تو "پیغمبرانہ" کام ہے ورنہ سوائے کافری کے کچھ بھی نہیں!

دل اگر بندد بر حق، پیغمبری است		ور ز حق بیگانہ گردد کافری است

اگر حکمت اس معیار پر نہ ہو تو خیر کثیر کی بجائے "شرِ کثیر" بن جاتی ہے ؎

علم را بے سوز دل خوانی شر است		نور او تاریکیٔ بحر و بر است

اس چیز کے سمجھنے کے لئے اس خونی ڈرامہ کا مطالعہ کافی ہے جو اس وقت یورپ کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے کہ کس طرح "سینۂ افرنگ" کے لئے "بے سوزی" مہیا کی گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کے باعث ابلیس کو اپنی کارفرمائیوں کا خوب موقع مل جاتا ہے مگر ابلیس اور اس کی کارفرما قوتوں کا ختم کر دینا بھی غایۃ درجہ مشکل ہے یعنی انسان کے اندر خود جب قوت بھیمیہ موجود ہے جو اس کا مظہر اتم ہے تو اس "ابلیس" کو بالکل ختم کر دینا تو نہیں ہو سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ابلیسی قوت یا بہیمیت کو "مسلمان" کرے یعنی اس درجہ اصلاح یافتہ کر دے کہ وہ مقید بن جائے اور اس کی مضرت رسانی جاتی رہے۔

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی		کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

یعنی ابلیسی قوتوں کو قرآن کی شمشیر سے کشتہ بنا دو تو پھر وہ مسلمان ہو جائیں گی اور اسی

کے ساتھ ساتھ ضرورت ہے "علم با عشق" کی جو "لاہوتیوں" کی نشانی ہے نہ کہ "علم بے عشق" جو طاغوتیوں کی علامت جلی ہے جس کے بعد "ابولہب" کو بھی "حیدر کرار" کہا جا سکتا ہے۔

اس محکمات قرآنی کی شرح کو سن کر "زندہ رود" چلا اٹھتا ہے کہ

محکماتش وانمودی از کتاب ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب

اگرچہ آپ نے قرآن کے محکمات کو ہویدا کر دیا ہے مگر اب تک وہ عالم حجاب ہی میں ہے حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا کر صاف چہرہ کشائی کیوں نہیں کی جاتی اور وہ عالم ہمارے ضمیر سے کیوں نمودار نہیں ہو جاتا! اس عالم قرآن کے بجائے ہمارے سامنے ایک ایسا فرسودہ عالم ہے جس کی خاک میں ملتِ اسلامیہ آسودہ ہے تمام مسلمانوں کے سینوں سے "سوز" جاتا رہا کیا ہم یہ سمجھیں کہ مسلمان مر گئے یا قرآن مر گیا! قرآن تو بہر حال حیّ و قیوم کا کلام ہے اور "انا لہ لحافظون" کا وعدہ اس کی حفاظت کا ضامن ہے البتہ مسلمان قومیں مر چکی ہیں گو بظاہر ان میں کچھ زندگی نظر آ رہی ہے۔

پرنس سعید حلیم پاشا سے گفتگو

سید افغانی کے بعد پرنس سعید حلیم پاشا ترکی دنیا کی داستان غم سناتے ہیں جو کم و بیش تمام مسلمانوں کو معلوم ہے دین حق کافری سے بھی زیادہ رسوا ہو گیا ہے چونکہ "علمائے سو" اور ملاؤں نے کفر گری شروع کر رکھی ہے ان لوگوں کی قرآن فروشی سے روح الامین کو خود میں نے بھی نالاں پایا ہے۔

از شکر فیہائے آں قرآن فروش دیدہ ام روح الامین را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ نزد او ام الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمت دینِ نبی آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال واقوالش فرد فرد

ان اشعار میں "علمائے شرار" کی پوری حقیقت کھول دی گئی ہے یعنی ان کو کائنات

علوی سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی قرآن عزیز ان کے نزدیک ایک افسانہ کی سی حیثیت رکھتا ہے دین محمدی کی حکمت سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں ان کا آسمان بے کوکبی سے تیرہ و تاریک ہوتا ہے ان کی کم نگاہی کور ذوقی ہرزہ گردی اور ان کے "حال و اقوال" سے ملت اسلامیہ پارہ پارہ ہوگئی ہے۔

"علمائے سو" اور "علمائے خیر" کی اگر تفصیل مطلوب ہو تو احیاء العلوم امام غزالیؒ کی پڑھو یا تذکرہ مولانا ابوالکلام" (وفقہ اللہ لما یحب و یرضیٰ) میں اکبری دور کے " علمائے سو" کے حالات کا مطالعہ کرو یا کم از کم اپنے دور کے ان علمائے سو کو دیکھو جو اب تک عقائد میں غیر ضروری باتوں پر اصرار کر رہے ہیں رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب ثابت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور سینکڑوں ایسی باتیں گھڑ رکھی ہیں جن کا کوئی ثبوت اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے نہیں بجائے قرآن کی تعلیم و تبلیغ کے وہ لوگ بے معنی جھگڑوں میں مبتلا ہیں اور اس طرح ان غیر حقیقی مسائل میں الجھ کر قرآن کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے" نزد او ام الکتاب افسانہ" اس لئے ایسے " علماء سو" اور ان کی درسگاہوں کا وجود سب کچھ بے کار ہیں اس واسطے کہ ان کو اسلامی خدمت اور قرآنی تبلیغ کا اہتمام ہی نہیں ہے اور ان کی مثال "کور مادر زاد" اور " نور آفتاب" کی سی ہے۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب　　　کور مادر زاد و نور آفتاب

اب ذرا مرد حق کی بھی کچھ علامتیں سن لو جو علمائے خیار میں سے ہوتا ہے کہ وہ جہان چار سو کی جان ہوتا ہے اس کے افکار مومن کے لئے اسباب زندگی ہوتے ہیں اس کی ہر ہر سانس ملت اسلامیہ کے لئے ثبات کا سبب بن جاتی ہے مختصر یہ کہ قرآن عظیم کی حفاظت اس کا آئین اور حق بات کو کھلم کھلا کہہ دینا ہی اس کا دین ہوتا ہے۔

حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست　　　حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست

یعنی قرآن عظیم کے علم و عمل کی حفاظت ہی اس کی زندگی کا مقصد وحید بن جاتا ہے اور ہر

وقت حق و صداقت ہی کے لئے اس کی زبان وقف ہو جاتی ہے اس کی طرف حدیث نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک طبقہ میری امت میں ضرور ایسا رہے گا جو حق پر ثابت قدم رہ کر منصور ہوگا اور اس کا کام اسلام کو ہر دور میں "جاہلیت" سے ممتاز کرکے پیش کرتے رہنا ہوگا۔

ذرا اس مرد حق کے اوصاف جمیلہ بھی سن لیجئے۔

مرد حق از کس نگیرد رنگ و بو	مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو

ہر زماں اندر تنش جانے دگر	ہر زماں اورا چوں حق شانے دگر

راز ہا با مرد مومن باز گوئے	شرح "رمز" کل یوم" باز گوئے

مرد حق کا کام حق سے ہی رنگ و بو حاصل کرنا ہے وہ کسی دوسرے سے اثر پذیر نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی شئوں و تجلیات کا ہر دم مظہر بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وقت اس کی ایک نئی شان ہوتی ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی صفت "کل یوم ھُوَ فِی شَان" کا نمونہ ہوتا ہے اور "تخلق باخلاق اللہ" کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ پھر سید افغانی سلسلہ کلام شروع کرتے ہیں کہ تم کو حدیث مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم یاد ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ "دین حق" پھر دنیا میں غریب ہو گیا ہے یعنی جس طرح اسلام ابتدائے بعثت نبوی میں "غربت" کی حالت میں شروع ہوا اسی طرح آج دین پر غربت طاری ہو گئی ہے ذرا "غربت" کا مفہوم بھی ذہن نشین کر لو اور سمجھ لو کہ ہر زمانہ کی "غربت" الگ الگ ہوتی ہے اگر تم اس دور کی "غربت دین حق" کو صحیح طور پر معلوم کر لوگے تو "عصر نو" کو دام میں لاسکتے ہو مگر افسوس ہے کہ آج مشرق و مغرب دونوں پیچ و تاب میں ہیں کوئی بھی اسرار قرآن سے واقف نہیں اگرچہ روسیوں نے "نقش نوی" کی طرح ڈال دی ہے مگر "آب و نان" ہی کے دام میں الجھ کر رہ گئے اور دین کو فراموش کر دیا ہے میری طرف سے ملت روسیہ کو یہ پیغام پہنچا دو۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است	رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

در دل او آتشِ سوزندہ نیست	مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

یعنی آج کے مسلمان کو دیکھ کر دین حق کو نہ سمجھ کیوں کہ آج کے مسلمان اور اس کی منزل مقصود قرآن سے علیحدہ ہے اور قرآن کے علاوہ ہر دوسری چیز مسلمان کا رسم و آئین بن چکی ہے آج کے مسلمان کے دل میں وہ محبت نبوی کی آتش سوزاں نہیں ہے جس کے باعث آج کا بندۂ مومن قرآن کے ثمرات سے محروم ہے اسی لئے بالکل تہی پیمانہ بن گیا ہے یہی مومن ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے طلسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر افسوس کہ خود ہی پھر تخت ملوکیت پر بیٹھ گیا یہاں تک کہ جوں جوں اس کی سلطنت قوی ہوتی گئی دین کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی اور ملوکیت کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے اور خلافت اسلامیہ نے "منہاج نبوت" سے ہٹ کر "ملک عضوض" کی شکل اختیار کر لی - یہی وجہ ہے کہ ملوکیت نے زاویۂ نگاہ، عقل و ہوش اور رسم و راہ سب ہی کچھ بدل دیا ہے اب اے ملت روسیہ! تو نے دستور کہن سے دل برداشتہ ہو کر ایک طرح دیگر ڈالی ہے اور قیصریت کی ہڈیاں چور چور کر دی ہیں تو تجھے چاہیئے کہ اپنے ضمیر میں نورانیت بھی پیدا کرے اور ہماری سرگذشت سے عبرت حاصل کرے اب تجھے اس "لات و ہبل"، "قیصریت و کسرائیت"، ملوکیت سرمایہ داری کے بتوں کی طرف دوبارہ متوجہ نہ ہونا چاہیئے اب اس "دنیائے پیر" کو ایک ایسی ملت کی ضرورت ہے "جو بشیر و نذیر" دونوں صفتوں سے متصف ہو فرنگ کے آئین اور دین دونوں پرانی چیزیں ہو چکی ہیں اب "دیر کہن" کی طرف نہ جا! ہاں تیرے کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ جہاں تو نے خداوندان کہن کا کام تمام کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے محض اس شکست و ریخت پر ہی بھروسہ نہ کرے بلکہ اس کے بعد تعمیر نو کی بھی ضرورت ہے اس لئے تجھ کو "لا" سے "الا" کی طرف آجانا چاہیئے تاکہ تو نفی سے گذر کر راہ اثبات کو حاصل کرے اور زندہ جاوید ہو جائے اگرچہ تو ایک "نظام عالم" کی تڑپ ضرور رکھتی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے لئے کسی "اساس محکم" کی تلاش نہیں ہے، اب سن ہم بتاتے ہیں کہ وہ "اساس محکم" کیا ہے۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از ام الکتاب

اگر تو نے اے ملت روسیہ! داستان کہن کو دھو دیا ہے اور دماغ سے محو کر دیا ہے تو اپنی قوت فکریہ کو قرآن سے روشن کرے، یہی وہ کتاب ہے جس نے سیہ فام دنیا کو ید بیضا دے کر" لاقیصر و لاکسریٰ" کا مژدہ سنایا تھا۔ اگر اہل مغرب کے مکر سے آگاہی حاصل ہو تو" روبہی" چھوڑ" اور" شیری" اختیار کر اور" روبہی و شیری" کا فرق کیا ہے؟

جز بہ قرآں ضیغمی رُوباہی است   فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر   فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

قرآن کے بغیر اگر انسان کو ضیغمی اور شیری مل بھی جائے تو حقیقت میں روباہی اور مکر و فریب ہی کا ایک مظاہرہ ہوگا نفر قرآنی کو نفر رہبانی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ شاہنشاہی کی اصل دبنیاد ہے اور "فقر قرآنی" جو گیانہ طرز زندگی ہے اور نہ اس کی ریاضتیں اور معاہدے اتنے دشوار ہیں اور نہ وہ محض فلسفیانہ کاوشوں کی تصوری دنیا ہے جو کبھی میدان عمل میں شرمندۂ تشکیل نہ ہوسکے بلکہ قرآن عزیز نے جو فقر پیش کیا ہے وہ شاہنشی کی اصل ہے چوں کہ اس کی حقیقت نہ محض فکر ہے اور نہ محض ذکر ہے بلکہ ذکر و فکر کا اختلاط ہے یہاں" ذکر اور فکر" دو تعبیریں سمجھنے کے قابل ہیں علامہ اقبال کی اصطلاح میں ذکر سے مراد عملی پہلو اور فکر سے مراد علمی پہلو ہے یعنی جب تک انسان دونوں علمی و عملی قوتوں کا جامع نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی زندگی قرآنی منشا کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی پس ضرورت ہے کہ" ذہنی آزادی" پہلے حاصل کی جائے تاکہ خارجی آزادی حاصل ہو اور جب یہ بات حاصل ہوگی تو نفر قرآنی سے انسان ہم کنار ہو کر دنیا کی حکمرانی اور خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا جو لوگ سیاسی آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں ان کو پہلے ایمانیات اور عملیات دونوں میں قرآنی ہدایات کا پابند ہو جانا چاہیے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ   اللہ تم میں سے ایمان اور نیک اعمال سے آراستہ ہونے والوں سے وعدہ فرماتا ہے کہ وہ نہیں زمین کی خلافت عطا

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔	فرمائے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو "خلیفۃ الارض" بنایا تھا تاکہ ان کے لئے ان کے پسندیدہ دین پر پورا پورا قابو ہو جائے اور اللہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

فقر قرآنی کی حقیقت کی تشریح کر چلنے کے بعد قرآن اور اس کے پیغام کی ایک دل آویز تعبیر کی جاتی ہے،

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ — دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن — کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ — آدمی درّندہ بے دندان و چنگ
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امینِ حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ — دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

ان اشعار میں حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے ہیں ضروری ہے کہ مختصر سی شرح کر دی جائے
قرآن کیا ہے؟ تمام جابرانہ قوتوں، غیر فطری بندشوں اور ظالمانہ سرمایہ دار طبقوں کو موت کا پیغام ہے اور کمزوروں، مزدوروں، مفلسوں اور تمام غریبوں کے لئے دست گیری کرنے والا ہے اور قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ بھلائی اور نیکی اپنی محبوب چیزیں خرچ کرنے ہی میں مضمر ہے اربا اور سود خواری سے سوائے فتنوں کے اور کیا ہو سکتا ہے اسی واسطے کہ اس

بدترین ذریعہ سے گو شخصی طور پر ثروت کے آثار ہوتے ہیں مگر اجتماعی طور پر برابر فقر و مسکنت چھائی ہوئی رہتی ہے، برخلاف اس کے جس قوم میں اسلامی طرز پر "اقتصادی نظام" کی زندگی ہوگی اور انسانوں کو ضرورت پر قرضۂ حسنہ ملتا رہے گا۔ وہاں حقیقی طور پر لذت حاصل ہوگی اور طبقاتی کش مکش کا خاتمہ ہو جائے گا اور سود خوار انسانوں کی حالت ایک درندہ کی سی ہو جاتی ہے کہ اپنے قرضداروں کو ہر طرح پھاڑ کھانے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کرختگی اور شدت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی افتاد طبیعت بالکل درشت ہو جاتی ہے اور اس میں سے روحانی نور رخصت ہو کر اس کی جان تیرو تاریک بن جاتی ہے یہاں تک تو "سرمایہ دارانہ نظام" پر تنقید فرمائی گئی، اب آگے ذرا "اسلامی نظام" کی چند خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے پہلے بھی گذر چکا ہے کہ قرآن عزیز نے زمین کو انسان کے لئے "متاعا لکم" فرمادیا ہے اور یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کہ زمین کا مالک حقیقی زمین دار ہی ہے اس کو ہر طرح کسان پر جبر و زبردستی کا حق ہوتا ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں اشتراکی نظریہ کہ سب کچھ زمین کی ملکیت کا اختیار مساوی طور پر انسان کو حاصل ہونا چاہیئے، غرض ان دونوں متضاد نظریوں کے درمیان اسلام نے ایک اعتدالی صورت پیدا کر دی اور فیصلہ کر دیا کہ زمین، سرمایہ اور کائنات کی ہر چیز اور خود انسان بھی اپنی ذات کا آپ مالک نہیں بلکہ تمام اللہ تعالیٰ کے مملوک میں البتہ مالک حقیقی نے انسان کو اپنی مہربانی سے تصرف کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی ہے پھر اس کے بعد ملوکیت کے پردے چاک کر دیئے جاتے ہیں کہ ملوکیت کیا ہے اس کی شوکت و حکومت سے حق کا پرچم سرنگوں ہونے لگتا ہے، تمام انسانی آبادیاں برباد ہو جاتی ہیں اور ایک "جادوگری" ہوتی ہے جس سے اقوام غالب کمزوروں کو فنا کر دیتی ہے قرآن عزیز نے خاص طور پر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا	بے شک ملوک "جب کسی آبادی میں داخل ہو جاتے ہیں
وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ	تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے عزت مندوں کو

ذلیل کرتے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں۔

پھر انسانی مساوات کی حقیقت اس طرح سمجھائی جاتی ہے کہ تمام انسان جب زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس کی غذائیں کھاتے ہیں تو گویا "نفس واحد" کی طرح ہیں ان میں افتراق اور پراگندگی پیدا کرنا مناسب نہیں چاہئے کہ تمام انسان ایک ہی خدائے واحد کے پرستار ہو کر وطن، نسل، رنگ بو کے تمام بتوں کو توڑ ڈالیں۔ زندگی اسی میں مضمر ہے

ذرا اور سنئے قرآنی پیغام کیا ہے؟ اور اس نے دنیائے انسانی میں اپنے انقلابی پروگرام کے ذریعہ کیا تحریک اٹھائی ہے۔

نقش قرآن تا دریں عالم نشست   نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یعنی جب قرآنی علوم اور ان کے عملی نتائج کا دنیا نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور صفحۂ ہستی پر قرآن کے نقش و نگار ابھرنے لگے تو عالم پاپائیت کا افسوں باطل ہو گیا اس قرآنی انقلاب کو دیکھ کر صاف کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے باعث دنیا کی کایا پلٹ گئی اور زیادہ کیا بتایا جائے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن عزیز ایک زندہ پائندہ اور ناطق کتاب ہے اور حق تعالیٰ کی طرح "پیدا" اور "پنہاں" ہے مشرق و مغرب کی تقدیریں اس میں پوشیدہ ہیں کاش اس کا خیال پیدا ہو جائے دور حاضر کے مسلمان کو پیغام یہ ہے کہ وہ اب میدان عمل میں سرگرم کار ہو جائے سر کو ہتھیلی پر رکھ کر دنیا کی "لیسا حاسیاست" پر نمودار ہو جائے اور قرآن عزیز کا اجتماعی پروگرام دنیا کے آگے رکھدے اور قرآنی تعلیم "یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو" (کیا خرچ کیا جائے، لوگ دریافت کرتے ہیں صاف کہہ دو کہ حاجت سے زیادہ جو ہو خرچ کر دو) کو دنیا کے گوش ہوش تک پہنچا دیا جائے۔ پھر مسلمان کا اصلی کام یاد دلاتے ہیں۔

آفریدی شرح و آئین دگر   اندکے با نور قرآنش نگر

از بم و زیر حیات آگہ شوی ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

تم نے ایک نئی شریعت نیا آئین اگرچہ گھڑ لیا ہے مگر ذرا قرآنی نور بصیرت کی روشنی میں اس پر تنقیدی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہو گا کہ تم زندگی کے زیر و بم سے واقف ہو چکے ہو اور تقدیر حیات تم پر ظاہر ہو گئی ہے اس کے بعد مسلمانوں کے موجودہ ماحول پر کس قدر عمدہ بات کہی ہے۔

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآن را نوا ہا باقی است

ہم مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نہ تو وہ شراب قرآنی ہے اور نہ کوئی ایسا ساقی ہے جس سے ہم کو قرآنی شراب ملتی ہے اگرچہ قرآنی علوم کی تدوین و ترتیب اس کی تفسیر و تشریح میں مسلمانوں نے کافی کاوشیں اٹھائی ہیں تاہم ابھی تک اس کے بے شمار گوشے باقی ہیں اور جوں جوں انسانی فہم و عقل ترقی کرتے جائیں گے اور عقل انسانی کے حجابات اٹھتے جائیں گے۔ قرآنی نغمے انسان کو مسرور کرتے جائیں گے ایک حدیث نبوی میں وارد ہے کہ "قرآنی عجائبات" کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں" سچ ہے اللہ تعالیٰ نے بھی صاف فرما دیا ہے۔ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (کہف)

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ قرآن (ذکر حق) کے لئے کسی قوم کی کسی زمانہ اور کسی جگہ کی کوئی احتیاج نہیں ہے اگر اس کو ایک قوم چھوڑ دے گی تو دوسری قوم کے حوالے کر دیا جائے گا اب مسلمانوں کی قرآن سے بے پرواہی اور اس کے بجائے تقلید و ظن کی پیروی سے میری روح لرزتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ مسلمانوں کو پوری طرح محروم کر کے دوسری کسی قوم کو یہ دولت گراں مایہ سونپ دی جائے۔

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتش خود بر دل دیگر زنند!

اس کے بعد "پیر رومی" اپنے زندہ رود کو شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں، اور سید افغانی کی طرف

دیکھ کر بعض حقائق وا شگاف کئے جاتے ہیں جس کے اندر خاص طور پر یہ بات بتائی گئی ہے ۔

در گذر مثل کلیم از رود نیل   سوئے آتش گام زن مثل خلیل

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست   ملتے را می برد تا کوئے دوست

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح " رود نیل " سے گذر جانا چاہئیے یعنی جب فرعون اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کیا تو حضرت موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی سمندر پر ماری جس سے سمندر میں ایک صاف راستہ نکل آیا اور پھر فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا یہ واقعہ قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر مختلف بلاغت پرور اسالیب سے پیش فرمایا ہے ۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ آج بھی ضرورت ہے کہ " ضرب کلیم " کے ذریعہ باطل کے " رود نیل " کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور اس میں سے خیر و خوبی کے ساتھ سلامتی سے پار ہو جائیں اور آنے والے فرعونیانِ وقت کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا جائے چنانچہ ہم آج اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جن کی ضرب میں کلیمی قوت ہے وہ وقت کی تمام فرعونی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ہر اس تحریک سے نہایت دانائی سے نکل جاتے ہیں جو اسلام و فطرت کے خلاف ہوتی ہے اور جن میں " موسوی " صداقت نہیں ہوتی وہ باطل کے " رود نیل " میں نذر موج ہو کر فنا ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے مصرعہ میں بھی اس قرآنی داستانِ عبرت کی طرف نہایت بلیغ کنایہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم، وطن، اور برادری کے تمام غیر فطری نظریات کا انکار کر دیا تو ان کے سامنے دو چیزیں پیش کی گئیں یا تو اپنی فطری وجدان کی صدائے حق سے دست بردار ہو جائیں، توحید کے دعظ چھوڑ دیں اور غیر اللہ کی پرستش قبول کر لیں یا " آگ میں جلنا " اور مصائب و تکالیف کا جھیلنا گوارا کریں حضرت ابراہیم نے اپنی خدا داد فہم و بصیرت اور نور نبوت کے مطابق " آتش نمرود " کو پسند فرمایا اور بے خطر آگ میں کود جانا گوارا فرمایا اسی طرح آج بھی دورا ہیں دنیائے انسانی کے آگے آئی ہیں یا تو حق کا اعتراف و اقرار کر کے وقت کی تمام نمرودی طاقتوں کا حکم قبول کیا جائے یا انکار کر

کے ابراہیمی سنت کی پیروی کی جائے مگر جس مردِ مومن میں ابراہیمی ایمان خلیلی ایقان کی روشنی ہو گی وہ حق و صداقت کی راہ میں آفات و مصائب کو برداشت کرنا آسان سمجھے گا اور انکارِ حق کی راہ کبھی نہ اختیار کرے گا۔ اس کے لئے "آتش نمرود" اسی طرح سرد ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم کے حق میں ہوئی تھی اور اس" ابراہیمی مرد" کے "نفحہ" سے "بوئے دوست" آنے لگے گی اور اس کے نتیجہ میں ایک "ملت" کی تشکیل ہو گی جس کو وہ کوئے دوست کی طرف لے جائے گا یعنی ابراہیمیت اختیار کرنے کے بعد تمام نمرودی طاقتیں سرنگوں ہو جائیں گی اور اس کو مقامِ "خلت" اور "امامت کبریٰ" کا جلیل القدر منصب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو گا گو عارضی طور پر اس کو ابراہیمی ابتلا کے ماحول سے گذرنا پڑے گا، اس کے بعد زندہ رود غزل سنانے لگتا ہے جس میں لطیف پیرایہ کے ساتھ موجودہ دور کے مدعیان دینِ حنیف کی شکوہ سنجی اور نالائقی پر ماتم کیا جاتا ہے ایک شعر سن لیجئے۔

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند
اہل توحید یک اندیش و دو دو نیم اند ہمہ

اس کے بعد فلک عطارد ختم ہوتا ہے اور فلک زہرہ میں پہنچتے ہیں،

(باقی)

اقبالؒ اور ہندوستان

(از جناب لطیف احمد صاحب شیروانی)

ہر چند کہ اقبال جیسی عالمگیر شخصیت کو وطن کی چار دیواری میں محدود کرنا اور اس کے وسیع خیالات کو وطن پرستی کی زنجیروں میں جکڑنا ایک سعی لاحاصل سی معلوم ہوتی ہے تاہم اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اقبالؒ سرزمینِ ہند میں ہی پیدا ہوا، اسی ملک میں تربیت پائی اور عمر کا بیشتر حصہ نہ صرف یہیں بسر کیا بلکہ ملک کی سیاست میں بھی لبا اوقات پیش پیش رہے۔ لہذا فطری طور پر اس ملک کی فضا اور پیچ در پیچ مسائل نے اقبال کی شاعری پر ضرور بالضرور اثر چھوڑا ہوگا۔ سطور ذیل میں اقبال مرحوم کو ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن شروع میں ہی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اقبال عوام الناس کے نظریہ کے مطابق وطن پرست نہ تھے کیونکہ جہاں علامہ مرحوم نے یہ فرمایا ہے کہ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

وہاں ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ گئے ہیں۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور مطالعہ یورپ نے یہ امر علامہ مرحوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ وہ نام نہاد وطن پرستی جو عوام کا مطمح نظر بنی ہوئی ہے ہمہ گیر تہذیب عالم کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ شاعر مشرق کے الفاظ میں اس قسم کی وطن پرستی آذر تہذیب کے ترشوائے ہوئے اصنام میں سب سے بڑا خدا ہے۔ اور اس کے

تباہ کن اثرات کو علامہ صاحب ذیل کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے   اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے   خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے

کسی خاص ملک کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دیگر کمزور ممالک پر ہر قسم کا جور و ستم روا رکھنا اقبال کے نظریہ کے مطابق ایک ایسی غلطی ہے جس کا خمیازہ ظالم ملک کو بالآخر بھگتنا پڑتا ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اللہ اللہ یہ پیش گوئی جو علامہ مرحوم نے ۱۹۰۷ء میں کی صرف سات ہی سال بعد جنگِ عظیم کی صورت میں پوری ہو گئی۔ اس جنگ سے تہذیب عالم کو بالعموم اور تمدن یورپ کو بالخصوص کتنا بڑا صدمہ پہنچا روز روشن کی طرح واضح ہے طرفہ تر یہ کہ اُس جنگ کے اثرات ہنوز اچھی طرح زائل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اسی سرزمین یورپ کو بیس سال بعد ہی پھر اگر اس سے بھی زیادہ تباہ کن جنگ سے دوچار ہونا پڑا جو اس قلیل عرصے میں دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ چکی ہے۔

اقبالؒ کو اس قسم کے جذبۂ وطنیت سے سخت نفرت ہے جس کا نتیجہ ملک کے لئے تعمیر کے بجائے تخریب کی صورت میں رُونما ہو۔

ہم سطور ذیل میں واقعات اور خود علامہ مرحوم کے کلام کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ مرحوم نے اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی اپنے وطن عزیز کو فراموش نہیں کیا اور یہ کہنا کہ انہیں ہندستان سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی سراسر غلط اور بے بنیاد ہے اور کسی شخص کے اوصاف حمیدہ کو صرف اس لئے

نہ سراہنا کہ وہ کسی خاص فرقہ، جماعت یا خطہ سے متعلق ہے انصاف کے قطعی منافی اور انتہا درجہ کی پست خیالی اور غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ اقبالؒ مرحوم کے معترضین کی تردید تو سر عبد القادر نے ہی بانگ درا کے دیباچہ میں بوجہ احسن کردی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اقبال مرحوم یہ نہ محسوس کرتے کہ ان کی شاعری سے ان کی "درماندہ قوم" اور ان کے "بدنصیب" ملک کے امراض کا علاج ہو سکتا ہے تو شاید وہ شاعری کو بالکل ہی ترک کر دیتے۔

وہ نظمیں جو اقبال نے اوائل عمر میں لکھیں ایک نظریہ سے جان کیٹس[۵۱] کی یاد دلاتی ہیں یعنی شاعر دنیا کی مختلف اشیا پر نظر ڈالتا ہے اور اس مطالعہ فطرت سے وہ نقوش جو اس کے دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں انہیں سیدھے، سیدھے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ فلسفہ کی گوناگون گہرائیوں سے ان نظموں کو دور کا بھی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں اقبال کی اپنے اجڑے دیار سے محبت بہت ہی واضح الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مثلاً بانگ درا کی بسم اللہ ہی حب الوطنی کے اشعار سے ہوتی ہے:-

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں　　تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

علیٰ ہذا القیاس ترانہ ہندی کی ابتدا ملاحظہ ہو:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں　　سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

---

۵۱ انگریزی زبان کا مشہور شاعر۔

شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے جذبۂ وطنیت کو اُن سے زیادہ شاندار اور پرخلوص الفاظ میں پیش کیا ہو:۔

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا ۔۔۔ سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ۔۔۔ ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے ۔ میرا وطن وہی ہے

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند ۔۔۔ سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر ۔۔۔ رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت ۔۔۔ مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

سبحان اللہ! کاش اقبال کی حب الوطنی پر انگشت نمائی کرنے والے تعصب کا چشمہ اتار کر مندرجہ بالا اشعار کو پڑھیں۔

بعد ازاں جب اقبال مرحوم نے ہندوستان کی طرف بہ نظر فکر و تدبر دیکھا تو یہی خیالات الفاظ ذیل میں ہمارے سامنے آئے ہیں:۔

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو ۔۔۔ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

آہستہ آہستہ اقبال کے اشعار پر فلسفہ کا رنگ غالب آتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس

کرنا شروع کیا کہ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مصلح رریفارمر) بھی ہے اور یہی وہی نظریہ ہے جو ورڈز ورتھ[۵۶] اور شیلے[۵۶] کے پیش نظر تھا۔ ورڈزورتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا اس کی طرف اس طرح دیکھے گویا کہ وہ کوئی استاد ہے۔ شیلے نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ اس کو ناصحانہ شاعری سے نفرت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا کی حالت کو سدھارنے کا سب سے بڑا مدعی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی اوائل عمر کے علاوہ باقی تقریباً تمام نظمیں ناصحانہ اور اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اقبال مرحوم کا سب سے موثر اور مشہور پیغام خودی کا ہے اور اس ضمن میں نقاد حضرات نے اس چیز پہ بار بار زور دیا ہے کہ اس تخیل کے لئے علامہ مرحوم نطشے[۵۷] اور گوئٹے کے مرہون منت ہیں۔ ہمیں اس نظریہ سے کلی طور پر اختلاف نہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کے وسیع فلسفہ سے اقبال مرحوم کو یہی پہلو کیوں اس قدر پسند آیا کہ وہ تمام عمر اسی کا راگ الاپتا رہا۔ ہماری رائے میں اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال نے اپنے ملک کی ابتر حالت دیکھ کر اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی اور وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم اپنی خودی کو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہندوستان کی ہر چیز سے نفرت ہے اور یورپ کی ہر چیز سے محبت :۔

علم غیر آموختی اندوختی — روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری — من ندانم تو توئی یا دیگری
عقل تو زنجیری افکار غیر — در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار — در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ — سرو ہایت را قبا ہا خواستہ

---

۵۶ مشہور انگریزی شاعر۔ ۵۷ مشہور جرمن فلاسفر۔

بادہ می گیری بہ جام از دیگران جام ہم گیری مدام از دیگران

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جہاں ایک طرف اقبال نے اپنے تخیلات کا بیش قیمت حصہ یورپ سے حاصل کیا وہاں دوسری طرف وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کو صاف صاف بتلاتے ہیں کہ وہ یورپ کے اصولوں کو اپنے لئے باعث افتخار نہ سمجھیں اور ولایتی سونے کو ہندوستانی کسوٹی پر نہ پرکھیں نئی روشنی کے نوجوانوں کو اقبال کا یہ نظریہ خاص طور پر دعوت فکر دیتا ہے۔ ہم میں سے بعض منطقی دماغ یہ فلسفہ چھانٹتے ہیں کہ ہمیں کم از کم یورپ سے اچھی چیزیں حاصل کر لینی چاہئیں اور بری چیزوں کو چھوڑ دینا چاہئیے۔ منطق اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے لیکن عملی زندگی میں دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب انسان بہت سی اچھی بری چیزوں میں سے صرف اچھی چیزیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو ان اچھی چیزوں کے ساتھ چند ایک بری چیزیں بھی خود بخود ضرور چلی آتی ہیں۔ مثلاً ہم یورپ سے اشتراکیت لیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ الحاد اور بلادینی کا آنا بھی یقینی ہے اور اقبال کے زاویۂ نگاہ سے تو یورپ میں سرے سے کوئی اچھی چیز ہے ہی نہیں:۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

بال جبریل میں وہ مغربی تہذیب کی کم مائگی اور اس میں صحیح الخیالی کے نقدان کا بھانڈا ان الفاظ میں پھوڑتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اسی طرح شاعر مشرق ضرب کلیم میں "ابی سینیا" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال غارتگری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برہ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسا[1] یہ حقیقت ہے دل خراش

"مغربی تہذیب" کے زیر عنوان شاعر مشرق فرماتے ہیں:۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

پیام مشرق میں بھی یورپی تہذیب کا خاکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار بادہ خواران را نگاہِ ساقیش پیغمبر است
جلوہ او بے کلیم و شعلہ او بے خلیل عقل نا پروا متاع عشق را غارتگر است
در ہوایش گرمیٔ یک آہ بیتابانہ نیست رمز ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

(میخانہ فرنگ)

دوش رفتم بہ تماشائے خرابات فرنگ شوخ گفتار رندے[2] دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیر میش آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

(خرابات فرنگ)

اقبال مرحوم کے لئے ہندوستان میں سب سے زیادہ افسوسناک امر اس ملک کی محکومی تھی۔ ان

---

[1] پوپ کی طرف اشارہ ہے [2] نطشے کی طرف اشارہ ہے

کے عقیدہ کے مطابق آزادی ہر فرد اور ہر ملک کا پیدائشی حق ہے۔ جہاں علامہ مرحوم کو اپنے مقصد کی رفعت کا احساس ہے وہاں انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایسے غلام ملک کا فرد ہے جہاں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہیں کی جاتی۔

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں مرغان سحر نواں میری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

علمی، اقتصادی اور سیاسی رہنما موجود ہیں لیکن چونکہ خود ان کی ذہنیت غلامانہ ہے لہذا وہ عوام کو بھی یہی سبق دیتے ہیں:-

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی، حکما بھی خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر اک ہر اک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
"بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو" باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

محکومی اقبال کے نزدیک ایک اس قسم کی برائی ہے جس سے لازمی طور پر ہمہ قسم کی دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں:-

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

در غلامی تن زجاں گردد تہی از تن بے جاں چہ امید بہی
ذوق ایجاد و نمود از دل رود آدمی از خویشتن غافل رود

محکومی کے برے اثرات کو اقبال نے مزید وضاحت سے بیان کیا ہے "پنجاب کے پیرزادوں سے" کے زیر عنوان شیخ مجدد کی لحد پر علامہ مرحوم فرماتے ہیں:-

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو — آنکھیں مری بینا ہیں لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلہ فقر ہوا بند — ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں — پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق — طروں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

یہ صرف غلامی ہی کی لعنت ہے کہ صحیح معنوں میں علم ہندوستان میں نایاب ہے۔ علامہ مرحوم نے ان خیالات کو ایک نہایت اچھوتے پیرائے میں اپنی مشہور نظم پیر و مرید میں پیش کیا ہے۔ اپنے وسیع مطالعہ کے باوجود مرید ہندی کو اقبال کرنا پڑتا ہے کہ

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب — روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

اور پھر ذیل کی قسم کے استفسارات اپنے پیر سے کرنے پر مجبور ہے:۔

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد — کھول مجھ پر نکتہ حکم جہاد
سر آدم سے مجھے آگاہ کر — خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر
گرچہ بے رونق ہے بازار وجود — کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود
کس طرح قابو میں آئے آب و گل — کس طرح پیدا ہو سینے میں دل
علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ — کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

مرید ہندی کو آخر کار یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز — اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

حضرت علامہ اقبال مرحوم تو سرے سے اس امکان ہی سے منحرف ہیں کہ محکومی انسان کو قابل قبول بھی ہو سکتی ہے جبکہ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے:۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد — گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است　　من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

خوشحالی کا انحصار بھی آزادی پر ہی ہے۔ ہر وہ ملک اور قوم جو غلامی کی زنجیروں میں پابستہ ہے۔ علمی، اقتصادی سیاسی غرضیکہ ہر دنیوی پہلو سے ترقی کے میدان میں آزاد قوموں سے پیچھے رہنے پر مجبور ہے۔

آزادی کی اک آن ہے محکوم کا اک سال　　کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت　　محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور　　محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامت کا ہے سودا　　ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام　　ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے　　غارتگر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

مادر وطن کی اس زار و زبوں و درماندہ حالت پر شاعر مشرق بار بار آنسو بہاتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں ارشاد ہوتا ہے

باز گو از ہند و از ہندوستان　　آنکہ با کاہش نیرزد بوستان
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد　　آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم　　آنکہ یادش را بہ جان پروردہ ایم
از غم ما کن غم او را قیاس　　آہ ازاں معشوقِ عاشق ناشناس

اس درماندگی کا علاج قوت حاصل کر کے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ہر ہندوستانی کو چاہیئے کہ باہمی تفرقات کو دور کر کے ایک منظم اور مضبوط قوم بنائے۔ ورنہ طوقِ غلامی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی گردن میں پڑا رہے گا۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے کہ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مشہور و معروف مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق میں "اشکے چند بر افتراق ہندیاں" کے زیر عنوان علامہ مرحوم لکھتے ہیں:-

اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

پیر مرداں از فراست بے نصیب نوجواناں از محبت بے نصیب

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر خشت ما سرمایہ تعمیر غیر

زندگانی بر مراد دیگراں جاوداں مرگ است نے خواب گراں

ہندیاں با یک دگر آویختند فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

تا فرنگی قومے از مغرب زمین ثالث آمد در نزاع کفر و دین

کس نداند جلوہ آب از سراب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب

یہ اشعار خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہیں کہ یہ حضرت علامہ نے اپنے وصال سے صرف تین چار سال پیشتر کہے اور اس طرح یہ اشعار اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی جبکہ ان کی شاعری پر اُن کے مذہب کا رنگ غالب تھا اپنے ملک کو فراموش نہیں کیا۔

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست قوّتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر گشاد عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد!
کلّۂ نمرود بے ضربے شکست لشکرِ فرعون بے حربے شکست!
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است کار او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبیں ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لازمان و دوش و فردائے ازو لامکان و زیر و بالائے ازو
چوں خودی را از خدا طالب شود جملہ عالم مرکبِ او راکب شود
آشکارا تر مقامِ دل ازو جذبِ ایں دیرِ کہن باطل ازو
عاشقاں خود را بیزداں می دہند عقلِ تاویلی بقرباں می دہند

عاشقی؟ از سُو بہ بے سوئی خرام
مرگ را بر خویشتن گرداں حرام

(جاوید نامۂ اقبال)

خیز چو سروِ بلند، اے بعمل نرم گام

زندگی سوز و ساز، بہ ز سکونِ دوام — فاختہ شاہین شود، از تپشِ زیرِ دام
ہیچ نیاید ز تو غیرِ سجودِ نیاز — خیز چو سروِ بلند، اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد، از تو نشاطِ عمل — گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہمِ خداوندِ تست — لذتِ کردار گیر، گام بنہ جوئے کام
خیز کہ بنمائمت مملکتِ تازۂ — چشمِ جہاں بیں کشا، بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایۂ، گوہرِ تابندہ شو — از سرِ گردوں بیفت، گیر بدریا مقام
تیغِ درخشندۂ، جانِ جہانے گسل — جوہرِ خود را نما، آے بروں از نیام
بازوئے شاہیں کشا، خونِ تدرواں بریز — مرگ بود باز را، زیستن اندر کنام

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

("پیام مشرق" اقبالؒ)

حکمتِ قرآنی اور اصلاحِ تمدن

ایک صاحب سوال کرتے ہیں :۔

"سورۂ آل عمران میں تیرہویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک جنگ احد پر مسلسل تبصرہ کیا گیا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیرہویں رکوع میں جنگ احد پر تمہیدی تقریر ابھی شروع ہی کی تھی کہ یکایک بیچ میں سود کی حرمت کا ذکر آگیا چنانچہ چودہویں رکوع کا بیشتر حصہ اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد آیت وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے پھر جنگ احد پر کلام شروع کیا گیا ہے۔ اس موقع پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا اپنے ماقبل اور مابعد سے کیا ربط ہے؟ ایک جنگ کے واقعات پر کلام کرتے ہوئے بیچ میں یہ بحث آخر کس تعلق سے چھیڑ دی گئی؟

(۲) اس موقع پر خاص طور سے سود در سود یا بڑھا چڑھا کر سود لینے کو منع و تحریم کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟

جو لوگ قرآن مجید کی تعلیمات کو مدبرانہ اور محققانہ انداز میں سمجھنے کا شوق رکھتے ہوں ان کیلیے من جملہ دوسرے امور کے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کے تاریخی پس منظر (HISTORICAL BACK GROUND) کو سامنے رکھیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ آیات کا باہمی ربط سمجھنا ان کے لیے آسان ہوگا، بلکہ وہ اس حکمت تشریع کو بھی سمجھ سکیں گے جسے احکام کے تدریجی ارتقا میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، قرآن مجید نے ابتدا ہی میں ان کا صاف صاف بے کم وکاست اعلان کر دیا تھا، اور آخر وقت تک ان میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا۔ یہ کہ مخلوقات کا الٰہ بجز اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے اور کوئی نہیں، یہ کہ عبادت اور استعانت اس ایک الٰہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، یہ کہ ہر ہر انسان اسی ایک حاکم اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہے اور بالآخر اپنے پورے کارنامۂ حیات کے ساتھ اس کی عدالت میں پیش ہونے والا ہے، یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے اور صراطِ مستقیم بجز "اسلام" کے اور کوئی نہیں، یہ تمام باتیں دعوتِ محمدی صلعم کی ابتدا میں جس طرح کہی گئی تھیں، اسی طرح آخر وقت تک کہی جاتی رہیں۔ ان میں کوئی ارتقاء نہیں۔ جو دعویٰ اوّل دن کیا گیا تھا وہی آخر تک قائم رہا۔ فرق جو کچھ ہوا وہ صرف اتنا تھا کہ کبھی اسے تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا اور کبھی اختصار کے ساتھ۔

بخلاف اس کے تمدنی اصلاح (SOCIAL REFORM) کے باب میں قرآن نے تدریج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ابتدا میں تمام تر زور ایمان کو مستحکم کرنے پر صرف کیا گیا، اور اس کے ساتھ مدنیت صالحہ کے وہ اصول ذہن نشین کرائے جاتے رہے جن پر آگے چل کر نئی تہذیب کی عمارت تیار کرنی تھی۔ مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تمام تر انہی دو باتوں تک محدود تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں جب عملاً نئی تہذیب کی تعمیر شروع کی گئی، اور وقت آیا کہ مدنیت صالحہ کے ان مجرد اصولوں (ABSTRACT PRINCIPALS) کو جنھیں مکہ میں پیش کیا گیا تھا متعین صورت (CONCRERE FORM) میں اجتماعی زندگی کے اندر نافذ کیا جائے، تو اس کام میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا گیا کہ پورے اصلاحی پروگرام کو یک لخت عملی جامہ پہنا دیا جاتا، بلکہ تدریجی عمل کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ نئی سوسائٹی جیسے جیسے بنتی گئی، جیسے جیسے مواقع پیش آتے گئے ان کے لیے قانون بنایا جاتا رہا۔ ہر نئے اصلاحی قدم کے لیے آمادگی نفس کے موقع (PSYCHOLOGICAL MOMENT) کا انتظار کیا جاتا، اور جب وہ موقع آتا تو ایسے مؤثر انداز میں حکم سنایا جاتا کہ سیدھا

دلوں کی تہوں میں اتر جاتا اور وہاں سے کامل اطاعت بن کر عملی دنیا میں نمودار ہوتا۔

تمدن کی اصلاح کے لیے قرآن کے پیش نظر جو پروگرام تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ معاشی معاملات میں سے سود کے عنصر کو بالکلیہ خارج کر دیا جائے، اور اس کی جگہ انسان اور انسان کے معاشی تعلقات کو فیضی فراخدلی اور امداد باہمی کی روح پر قائم کیا جائے۔ اس دفعہ کو نافذ کرنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ مکۂ معظمہ میں سود کی حرمت کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا، بلکہ محض اس نئے معاشی نظر کو پیش کرنے اور دماغوں میں اتارنے کی کوشش کی گئی کہ انفرادی سرمایہ داری (INDIVIDUALISTIC CAPTALISM) اگر خود غرضی اور تنگ نظری پر مبنی ہو — جو سود خواری کی اصلی بنیاد ہے — تو اس کا نتیجہ اجتماعی نقصان ہے، اور جو فرد یہ جماعت دشمنی کا (ANTI SOCIAL) شیوہ اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ بظاہر پھلتا پھولتا نظر آتا ہے، مگر آخر کار دنیا اور آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر اسی انفرادی سرمایہ داری کی بنیاد جماعتی حقوق کے صحیح احساس پر مبنی ہو تو اس سے بظاہر فرد کی دولت گھٹتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ بڑھتی ہے، کیونکہ جو فرد اجتماعی خوشحالی میں مددگار رہتا ہے وہ نتیجۃً دنیا میں بھی اپنی دولت بڑھاتا ہے اور آخرت میں بھی۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا	کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے فراخی کیساتھ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ یقیناً اس میں ایمان لانے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں لہذا تو اپنے رشتہ دار کو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے۔ یہ فعل ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور یہ لوگ آخر وہی فلاح پانے والے ہیں اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ بعض لوگوں کے مال میں

فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ — بڑھوتری ہو تو اللہ کے نزدیک تو اس سے مال نہیں بڑھتا
وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ — البتہ مال ان کا بڑھتا ہے جو خدا کی خوشنودی کے لیے
اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم۔۴) — زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مکہ معظمہ کی زندگی میں اُس نئی معاشی پالیسی کے لیے جسے آگے چل کر نافذ کرنا تھا، دوسرے پہلوؤں سے بھی زمین تیار کی جاتی رہی۔ انسان کی حقیقی ضروریات سے جو دولت بچ جائے اسے جمع کرنے کی سخت مذمت کی گئی کیونکہ خود غرضانہ سرمایہ داری کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک طرف تجارتی کاروبار کی ہمت افزائی کی گئی اور دوسری طرف بار بار یہ امر ذہن نشین کیا گیا کہ جو کچھ تم کماؤ اس میں تمہاری جماعت کے کم نصیب افراد کا حق ہے۔ وَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ۔

اتنا کام مکہ معظمہ میں کیا جا چکا تھا۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر جب نئی اجتماعی زندگی کی بنا رکھی گئی تو اس معاشی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کیا جانے لگا۔ ہجرت کے تیسرے سال جب جنگ احد واقع ہوئی تو وہ موقع آگیا۔ جنگِ احد میں مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب مال کا لالچ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور اپنی ڈیوٹی سے ہٹ کر جماعت کے وجود کو خطرے میں ڈالا جیسا کہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں، غزوۂ احد میں آنحضرت صلعم نے تین ہزار مشرکین کے بالمقابل اپنی سات سو کی مختصر جمعیت کو بہترین جنگی موقف (STRATEGICAL POSITION) پر رکھا تھا، یعنی احد کی پہاڑی آپ کی پشت پر تھی اور دشمن کے لیے گھیر اڈالنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ احد کی جانب سے مشرکین کے لیے عقبی حملہ کرنے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر حضور نے عبد اللہ بن جبیر کے تحت ۵۰ تیر اندازوں کا ایک مضبوط دستہ بٹھا دیا تھا تاکہ اگر دشمن اس طرف سے حملہ کرنا چاہے تو یہ دستہ روک دے

سے اس کو تیروں پر رکھ لے۔ اس جنگی نقشہ کی کامیابی کا تمام تر دارومدار اس امر پر تھا کہ تیراندازوں کا یہ دستہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ چنانچہ حضور نے ان کو سخت تاکیدی حکم دیا کہ اگر ہمیں شکست ہو اور تم دیکھو کہ شکاری پرندے ہمیں اچک لیے جا رہے ہیں تب بھی ہماری مدد کو نہ آنا، اور اگر ہم فتحیاب ہوں اور تم دیکھو کہ دنیا کی دولت لٹ رہی ہے تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا"۔ لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور بہادرانِ اسلام نے مار مار کر مشرکین کے منہ پھیر دیے اور شکست خوردہ دشمن کے لشکر میں لوٹ شروع ہوئی تو تیراندازوں کی یہ جماعت اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ پچاس میں سے ۴۰ آدمی اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت پر جا گری اور مشرکین کو موقع مل گیا کہ پشت کے درے کی طرف سے حملہ کر کے مسلمانوں کو گھیر لیں۔ اسی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی، ان کے بہترین آدمی شہید ہوئے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے، اور ایسا سخت وقت آ گیا کہ اگر مشرکین کی عقل نہ ماری گئی ہوتی اور وہ بلا کسی معقول وجہ کے خود بخود پسپا نہ ہو گئے ہوتے تو مدینہ کی بھی خیر نہ تھی۔

یہ تھا وہ نفسیاتی موقع جس کو معاشی اصلاح کا پہلا قدم اٹھانے کے لیے چن لیا گیا۔ احد سے واپس مدینہ پہنچتے ہی سورۂ آلِ عمران کی وہ آیات نازل ہوئیں جن کا ذکر سائل نے اپنے سوال میں کیا ہے۔ ان آیات میں غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے شکست کا اصلی سبب جو مشخص کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ تم میں سے بہت سے لوگ مال کی محبت میں مبتلا ہیں اور یہ زرپرستی تمھیں نافرمانی پر آمادہ کر دیتی ہے نیز یہ کہ تم میں صبر و تقویٰ کی جگہ وھن اور فشل (ضعف) پایا جاتا ہے جو نتیجہ ہے حبِ دنیا کا:۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ	اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تھا یعنی یہ کہ
تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ	اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمھیں فتح ہو گی چنانچہ
وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ	جنگ کے ابتدائی حصہ میں تم ہی ان کو مار رہے تھے مگر جب
مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ	اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھائی جو تمھیں محبوب ہے یعنی مالِ غنیمت

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ۔

اور اسے دیکھ کر تم میں کمزوری آگئی اور تم نے (اپنے امیر عبداللہ بن جبیر سے) حکم میں جھگڑا کیا اور (رسول کی نافرمانی کی (تو وہ وعدہ ختم ہوگیا) تم میں سے بعض دنیا چاہتے ہیں اور بعض آخرت۔ پس اللہ نے تم کو کفار کے مقابلہ سے پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔

جب شکست کا اصل سبب یہ تشخیص ہوا تو اس کا علاج بھی یہی تجویز ہونا چاہیے تھا کہ دلوں میں مال کی محبت کا سرچشمہ جس جگہ واقع ہے اس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ ٹھیک اسی مقام پر انگلی رکھ دی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

اے ایمان والو! بہت بڑھا چڑھا کر سود نہ کھایا کرو۔ اور اللہ سے ڈرو کہ اسی طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

مطلب یہ ہوا کہ یہ مال کی محبت جو تمھارے دلوں میں جائز فطری حد سے بڑھ گئی ہے اور جس کی وجہ سے تمھاری روح میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے، اس کے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ تم مدتوں سے سودخواری کے خوگر ہو جس نے تمھارے قلب کے ریشہ ریشہ میں مال کی محبت پیوست کر دی ہے۔ تم جب اپنے کسی حاجت مند بھائی کو کچھ مال دیتے ہو تو ایک ایک دن گن گن کر اس پر اپنے فائدے کا حساب لگاتے چلے جاتے ہو۔ اس عادت اور خصلت سے بڑھ کر اور کونسی چیز عشقِ زر کی بیماری پیدا کرنے والی ہو سکتی ہے۔ لہذا اس کا علاج یہ ہے کہ کم از کم سود در سود اور ہر سال بڑھتا چڑھتا سود[۱] تو آج ہی سے چھوڑ دو۔

---

[۱] اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً، سود کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو مثلاً ایک سال کے وعدے پر روپیہ قرض دیا اور اس کی ایک شرح سود مقرر ہو گئی۔ دوسرے سال کے آغاز میں اگر قرض ادا نہ ہوا تو پھر ایک سال کی مہلت دی اور شرح سود پہلے سے بڑھا دی گئی۔ اس طرح ہر سال شرح سود میں اضافہ کیا جاتا رہتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کافی مدت تک اگر سود نہ ادا ہوتا تو سود کی رقم کو اصل میں شامل کر کے اس پر پھر سود لگا دیا جاتا۔

یہ محض مشورہ نہ تھا بلکہ حکم تھا اور ایسا سخت تاکیدی حکم تھا کہ اس کے بعد ہی وہ تہدیدی فقرہ ارشاد ہوا جسے سن کر سارے مسلمان کانپ اٹھے۔ فرمایا:

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

مسلمان، اور اس آگ میں ڈالا جائے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہو! اس سے بڑھ کر ایک سچے مسلمان کے لیے خوفناک بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ اسی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ ڈراونی آیت ہے، کیونکہ اس میں مسلمان کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اس نے اللہ کی حرام کی ہوئی چیز سے پرہیز نہ کیا تو اسے وہ سزا دی جائے گی جو کافروں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ عشقِ مال اور بندگیِ زر کی جگہ مسلمان میں کیا صفات ہونی چاہئیں اور وہ تقویٰ کیا ہے جس کے متعلق ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ "اگر تم میں صبر اور تقویٰ ہو تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اور دوڑو اپنے رب کے دامن رحمت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کی وسعتوں جیسا ہے، جو متقیوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ (کون متقی؟) وہ جو تنگ حالی اور خوش حالی دونوں حالتوں میں (اپنے مقدور بھر راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور انسانوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی محسنوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔

اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥

(اور متقی کون ہیں؟) وہ جو کبھی اگر کوئی برا کام یا اپنے نفس پر ظلم (یعنی گناہ) کرتے بھی ہیں تو فوراً انہیں خدا کا خیال آجاتا ہے جس کے اثر سے وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کا معاف کرنے والا ہو؟ (یہ متقی) اپنے فعل پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتا دیا کہ اگر مشرکین اور کفّار کے مقابلہ میں غلبہ اور فتح چاہتے ہو تو اپنے اندر سے دنیا طلبی، زرپرستی، نفسانی خواہشات کی بندگی نکال ڈالو اور ان کی جگہ یہ ایجابی (Positive) خوبیاں پیدا کرو، تاکہ تمہارا اخلاقی مرتبہ ان سے بلند ہو جائے، اور تم زمین پر خدا کی نیابت کے اہل بن جاؤ۔ ورنہ اگر تم بھی اخلاقی حیثیت سے ویسے ہی رہے جیسے کفار و مشرکین ہیں، تو آخر تم سے اللہ کا کیا رشتہ ہے، اور کفّار قریش سے کیا دشمنی ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں تمہاری نصرت و حمایت کرے؟

دیکھیے! یہاں قرآنی حکمت (Wisdom) اور انسانی حکمت کا فرق کیسا حیرت انگیز ہے۔ اگر کوئی انسان، جس کی نگاہ محض اسباب دنیا پر ہوتی، جنگ احد کے حالات پر نگاہ ڈالتا اور مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب کی تشخیص کرتا، تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ کفار کی مالی حالت بہت اچھی تھی، قریش کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل اور مدینہ کے یہودی سرمایہ دار ان کی پشت پر تھے، ان کے پاس دو سو سواروں کا رسالہ تھا، ان کے بیشتر آدمی زرہ پوش تھے، ان کے اسلحہ زیادہ اچھے تھے۔ برعکس اس کے مسلمان صرف پچاس سواروں کا رسالہ لاسکے تھے۔ ان کے پاس بمشکل ۱۰۰ آدمی زرہ پوش تھے۔ ان کی بے سروسامانی کا حال یہ تھا کہ اپنے مقتولوں کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ کر سکے تھے۔ اس وجہ سے کفّار کا پلّہ بھاری رہا اور مسلمانوں نے نقصان اٹھایا۔ کمزوری کا یہ سبب تشخیص کرنے کے بعد وہ اگر کوئی علاج تجویز کرتا تو یہ کرتا کہ مسلمانوں کو اپنی مالی

حالت درست کرنی چاہیئے۔ جو لوگ ان میں سود نہیں کھاتے انہیں بھی سود خواری شروع کر دینی چاہیئے۔ شرح سود پہلے سے زیادہ بڑھا دینی چاہیئے۔ غرض ہر ممکن طریقہ سے اپنی جماعت کی دولت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ مگر خدائی حکمت ملاحظہ ہو کہ کمزوری کا سبب مال کی کمی کو نہیں بلکہ مال کی محبت کو ٹھیرایا جاتا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس عشقِ مال کی بیماری کو دور کرنے کے لئے شرح سود میں تو فوراً تخفیف کرنی چاہیئے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مرحلہ پر صرف شرح سود (RATE OF INTEREST) کی تخفیف پر کیوں اکتفا کیا گیا؟ سود کو قطعی بند کیوں نہ کر دیا گیا؟ تو اس کا جواب وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اسلام محض اخلاقی اصول بیان کرنے والی حکمت ہی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں عملاً اپنے اصولوں کو نافذ کرنے والا تدبُّر (STATESMANSHIP) بھی ہے۔ ایک ملک کے معاشی نظام کو یکایک بدل ڈالنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر جبر اور خونریزی سے اس کی کوشش بھی کی جائے تب بھی سابق نظام کے اثرات فوراً نہیں مٹ سکتے۔ اس لیے اسلام نے اپنی جدید معاشی پالیسی پر رفتہ رفتہ عمل کیا۔ ۳ھ ہجری میں جیسا کہ ابھی بیان ہوا، جنگ احد کے بعد پہلا قدم شرح سود کی تخفیف کی صورت میں اٹھایا گیا۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور اجناس کے کاروبار میں سٹہ (SPECULATION) کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلہ میں کمی وبیشی کو سود قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے مبادلۂ نقد (EXCHANGE) کی طرف توجہ فرمائی اور سونے چاندی بصورت جنس (BULLION) یا بصورت زر (MONEY) دونوں کے مبادلہ میں ناجائز نفع بازی (PROFITEERING) کا دروازہ بند کر دیا۔ آخری ضرب اور فیصلہ کن ضرب فتح مکہ کے بعد لگائی گئی جبکہ قریب قریب پورا عرب اسلام کا سیاسی اقتدار قبول کر چکا تھا۔ اس وقت پورے زور کے ساتھ حکم دیا گیا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔

"اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے" اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا "اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود تمہارا لوگوں کے ذمہ باقی ہے اسے چھوڑ دو" فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ "اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے ساتھ اعلان جنگ ہے" اس وقت اسلام یہ طاقت رکھتا تھا کہ بزور سود کو بند کر دے اور پورے ملک کے معاشی معاملات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرے، اس لیے اس نے نہ صرف تحریم سود کا اعلان کیا بلکہ اس اعلان کو بجبر منوا کر چھوڑا۔ سودی معاملات کرنے والے قبائل کو دھمکی دی گئی کہ اس کاروبار کو نہ چھوڑو گے تو تم پر چڑھائی کی جائے گی نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا گیا کہ سودی کاروبار بند کر دیں ورنہ اسلامی حکومت ان کی حفاظت سے بری الذمہ ہے۔

مُطالعۂ کُتب!

اگر آپ کو بُلند پایہ علمی اور دینی کتب کے مطالعہ کا شوق ہے تو "اقبال اکیڈمی" کی فہرست کُتب ایک آنہ کے ٹکٹ بھیج کر مُفت طلب کریں۔

مینجر "اقبال اکیڈمی" ظفر منزل

تاج پورہ۔ لاہور

صراط مستقیم

(مولوی عبدالحکیم صاحب قصوری)

خداوند تعالیٰ نے ہر مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ نماز میں صراط مستقیم (سیدھے راستے) پر ثابت قدم رہنے کیلئے دعا مانگے اب ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ کونسا صراط مستقیم ہے جس پر گامزن ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہیں۔

لغوی معنی | اَلصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ هُوَ الطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ الَّذِیْ لَا اعْوِجَاجَ فِیْهِ۔ وہ صاف اور کھلا راستہ جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو) اس تعریف پر تمام لغت عرب متفق ہے۔ استشہاد کے لئے جریر بن عطیہ خطفی کا شعر ملاحظہ ہو:۔

امیر المومنین علیٰ صراط   اذا اعوج الموارد مستقیم

شرعی معنی | گو مفسرین کی عبارتیں اس کی تعریف میں مختلف ہیں لیکن سب کا مآل اور خلاصہ ایک ہی ہے اَلْمُتَابَعَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ (اللہ اور اُسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت) جیسے فرمایا قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ کہہ دیجئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم نے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

نتیجہ | اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت اس کی وضاحت کر رہی ہے۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا۔ "جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے پس تحقیق اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے اُس میں ہمیشہ رہنا ہو گا"

قرآن و حدیث میں صراط مستقیم کی وضاحت | (۱) وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (ترجمہ) اور تحقیق یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو تم کو اُس کی راہ سے متفرق کر دیں گے۔ اس بات کے متعلق اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے تاکہ تم بچو۔

ربط آیت | اس آیت سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی اور بتایا کہ شرک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اپنی اولاد کو غربت کی وجہ سے قتل نہ کرو ظاہری و باطنی بے حیائیوں سے بچو کسی جان کو بلا وجہ قتل مت کرو۔ یتیم کے مال کی احسن طریقے سے کفالت کرو۔ ترازو اور پیمانہ پورا تول کر دو جب بات کرو تو انصاف سے کرو۔ پھر فرمایا وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا۔ اللہ کا عہد پورا کرو (یعنی جو اللہ نے حکم دیا ہے اُسے کرو اور جس سے روکا ہے رک جاؤ) پھر اعلان کیا۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ یہی چیز ہے جس کے متعلق خدا نے وصیت کی تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ سے ایفاءِ عہد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا نام صراط مستقیم ہے میرے اس معنی کی تائید امام ابن جریر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

وَبِوَصِیَّةِ اللّٰهِ الَّتِیْ اَوْصَاكُمْ بِهَا فَاَوْفُوْا۔ وَاِيْفَاءُ ذٰلِكَ بِاَنْ تُطِيْعُوْهُ فِيْمَا اَمَرَكُمْ وَتَنْتَهُوْا عَمَّا نَهَاكُمْ وَتَعْمَلُوْا بِكِتَابِهٖ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْوَفَاءُ بِعَهْدِ اللّٰهِ یعنی جس وصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اُسے پورا کرو۔ اس کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اُسے پورا کرو اور جس سے روکا ہے رک جاؤ۔ اور اللہ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنت پر عمل کرو۔

عہد اللہ اور صراط مستقیم ایک ہی چیز ہے | دلیل وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اور صراط مستقیم کی اتباع کے متعلق حکم دینے کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد اللہ اور صراط مستقیم ایک ہی چیز ہے۔

(۲) قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

(ترجمہ) آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے مجھ کو ایک سیدھا رستہ بتلا دیا ہے کہ وہ ایک مستحکم دین ہے ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ (نکتہ) صراط مستقیم ملت ابراہیم ہے سے روگردانی کرنے والے بیوقوف ہوتے ہیں جیسے فرمایا وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔

عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو تحقیق میرا رب اور تمہارا رب اللہ ہے پس اُس کی عبادت کرو یہ سیدھا رستہ ہے

ہود علیہ السلام فرماتے ہیں اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ تحقیق میرا رب سیدھے راستہ پر ہے (یعنی کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق سورہ والصّٰفّٰت میں وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر احسان کیا اور اُن کو واضح کتاب دی اور اُن کو سیدھے راستے کی ہدایت دی۔

اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کا لفظ اپنی ذات کے لئے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کیلئے عیسیٰ علیہ السلام کیلئے ابراہیم علیہ السلام کے لئے پھر خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والسلام کیلئے استعمال کیا۔ اور یہ الفاظ اعلان کیا کہ اگر یہ لوگ رہی، جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کرتے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا اور اس حالت میں ہم خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت فرماتے ہم اُن کو صراط مستقیم (سیدھا راستہ) بتلاتے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ اَجْرًا عَظِيْمًا وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔

چونکہ صراط مستقیم اللہ اور اُس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا نام تھا اس لئے صراط مستقیم کے متصل فرمایا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا۔ اور جو شخص اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو ایسے اشخاص اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ بہت ہی اچھے رفیق ہیں۔ اس آیت سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں (۱) جو شخص اللہ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم پر آجاتا ہے جیسے فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (اور جو لوگ ہمارے بارہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستے ضرور بتا دیتے ہیں (۲) صراط مستقیم اللہ اور اُس کے رسول صلعم کی اطاعت ہی کو کہتے ہیں اسی لئے صراط مستقیم و من یطع اللہ والرسول فرمایا۔

صراط مستقیم کی نبوی تفسیر | قرآن مجید کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا۔ هُوَ صِرَاطُ اللّٰهِ الْمُسْتَقِيْمُ وَحَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ۔ وہ (قرآن مجید) اللہ کا سیدھا راستہ ہے اور اللہ کی مضبوط رسی ہے اور ذکر حکیم ہے۔ (مشکوٰۃ

نواس بن سمعان نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم (سیدھے راستے) کی مثال یوں سمجھائی ہے کہ ایک سیدھا راستہ ہے اور اس کے ادہر اُدہر دو دیواریں ہیں اُن دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اُن دروازوں پر پردے پڑے ہیں اور رستے کے سرے پر ایک شخص کھڑا ہوا آواز بلند پکار رہا ہے۔ کہ اے لوگو سب ملکر صراط مستقیم میں داخل ہو جاؤ اور متفرق نہ ہو جاؤ۔ اور ایک شخص کہہ رہا ہے۔ دیکھو ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ نہ کھولنا ورنہ سیدھے راستے سے بہک جاؤ گے۔ پس سیدھا راستہ اسلام ہے اور دیواریں خدا تعالیٰ کی حدیں ہیں (جو اُس نے شریعت میں قائم کی ہیں) اور دروازے شرعی ممنوعات ہیں اور رستے کے سر پر بلانیوالا قرآن شریف ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا اللہ تعالیٰ کی وہ نصیحت ہے جس کا اثر ہر مسلمان کے دل میں پہنچتا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر | ابان بن عثمانؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن مسعودؓ سے صراط مستقیم کی تفسیر دریافت کی تو جواب دیا کہ جس راستہ پر ہمیں محمد صلعم چھوڑ گئے ہیں اور یہ جنت میں لے جائے گا اس کے دائیں بائیں اور راستے ہیں جن کی طرف بلانے والے بہت سے آدمی ہیں۔ جو شخص اُن راستوں پر چلا وہ دوزخ میں جائے گا پھر یہ آیت پڑھی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ۔

صراط مستقیم اور دنیوی کامرانیاں | اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو شخص بھی صراط مستقیم پر آیا وہ دنیا میں تاج و تخت کا مالک ہوا دنیاوی کامرانیوں نے اُس کی قدمبوسی کی۔ ارشاد باری ملاحظہ ہو اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ۔ اور اللہ نے ابراہیم کو صراط مستقیم پر چلایا۔ پھر ہم نے دنیا میں تمام قسم کی بھلائیاں دیں اور تحقیق وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔

دوسری آیت میں فرمایا۔ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ اس آیت میں دو چیزیں بتائیں ایک تو صراط مستقیم پر چلنے والوں کو بہشت ملے گا۔ دوسرا۔ خدا تعالیٰ اُن کا ولی ہوگا۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دنیا میں ان کا حافظ و ناصر اور مدد و معاون ہوگا۔ جیسے فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

یہ تو میرا قرآنی استدلال تھا لیکن اسلام کی مکمل تاریخ اس کی کافی شہادت ہے۔

صراط مستقیم اور اُخروی فوائد | دنیوی فوائد بطور نمونہ پیش ہو چکے ہیں اب آخروی فوائد ملاحظہ فرمائیں فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَمَنْ[1] يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ آپ مجھے میری اپنی جان سے اور اہل وعیال سے بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو بے چین اور بیقرار ہو جاتا ہوں یہانتک کہ آپکے پاس آتا ہوں اور آپکو دیکھ لیتا ہوں۔ (پھر اطمینان ہوتا ہے) اور جب میں اپنی اور آپ کی موت یاد کرتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آپ جب جنت میں چلے جائیں گے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بلند مراتب حاصل کریں گے۔ اور اگر میں جنت میں گیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے نظر نہ آئیں۔ اس پر آنحضرت صلعم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ دوسری روایت میں ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ امانت دار اور سچا بیوپاری ربروز قیامت نبیوں صدیقوں شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہو گا۔

صراط مستقیم اور شیطان | صراط مستقیم چونکہ جنت میں لے جانے والا راستہ تھا اس لئے شیطان نے اُس پر قبضہ کیا اور کہا اے مولا! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (اس لئے اب میرا یہ کام ہوگا) کہ میں تیرے صراط مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا۔ پھر اُن پر حملہ کروں گا اُن کے آگے سے اور اُن کے پیچھے سے اور اُن کے دائیں اور بائیں سے اور ان میں سے اکثر لوگوں کو تو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے بن گئے ہیں صراط مستقیم کا کسی کو بھی خیال نہیں۔ جو شخص صراط مستقیم پر گامزن ہو گا اُس پر اور ایسے تمام حضرات پر شیطان کا وار یقیناً نہیں چل سکے گا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ تحقیق میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں۔

---

[1] یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کریگا وہ نبیوں، راست باز لوگوں، شہیدوں اور نیکوکار لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو گا۔

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ - لاہور

جلد ۶ | مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | عدد ۳

سخنہائے گفتنی	جناب پروفیسر سلیم چشتی۔	۲
ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت (مترجمہ)	جناب ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔بی۔بی ایس لاہور	۹
مطالب القرآن	سید محمد شاہ ایم اے	از صفحہ ۱۷ تا ۳۲

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق"
ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

پیغام حق کا اجراء ۱۹۳۹ء میں جب عمل میں آیا تو میرے محترم دوست پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مجھ سے پورا پورا تعاون کرنے کا یقین دلایا تھا مگر افسوس کہ ۱۹۴۰ء سے ادھر وہ اپنے مواعید کو پورا نہ کر سکے۔ الحمدللہ کہ اب انہوں نے ہمت کرکے پھر پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ "پیغام حق" کا پیغام مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا ہے جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین ہے۔ آئندہ سے انشاء اللہ العزیز یہ سخنہائے گفتنی لازمی طور پر پروفیسر صاحب موصوف ہی لکھا کریں گے۔ (محمد شاہ)

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسٹر گاندھی "نور نہانی" کی بدولت، فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو چکے ہیں اور اسی لئے اُن کے "بھگت" انہیں "مہاتما" کے شاندار لقب سے پکارتے ہیں لیکن سعی بلیغ کے باوجود ہمیں آج تک مسٹر موصوف کی زندگی میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جس سے "بوئے کچوری" نہ آتی ہو۔ موصوف اپنی رفتار اور گفتار، افکار اور کردار غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں خالص ہندو اور سخت متعصب ہندو نظر آتے ہیں۔

سوال ہو گا کہ پھر وہ کیا شے ہے جو گاندھی جی کو مونجے سے جدا کر سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مونجے اور ساورکر دغیرہما کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہیں۔ وہ جس طرح دل سے مسلمانوں کے دشمن ہیں، اس طرح زبان سے بھی دشمنی کا اعلان کرتے ہیں، لیکن مسٹر موصوف چونکہ "مہاتما" ہیں اس لئے دل میں کچھ اور رکھتے ہیں اور زبان پر کچھ اور لاتے ہیں۔ دراصل اسلام دشمنی میں آپ کسی مالویہ، مونجے یا ساورکر سے کمتر نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام دوستی کا اقرار کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مسلمان جو موجودہ زمانہ میں قوموں کی بنیاد اوطان پر رکھتے ہیں، یہ کہکر اپنے نفوس

کو فریب دے سکیں کہ مہاتما جی مسلمانوں کے دوست ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب الہ آباد کے ایک مشہور کشمیری برہمن کی لڑکی نے، ایک مسلمان سے شادی کرنے کا ارادہ کیا (یہ بدقسمت نوجوان اُس انگریزی اخبار کا اڈیٹر تھا جسے لڑکی کے باپ نے اپنے روپیہ سے جاری کیا تھا) تو مسٹر گاندھی نے علی برادران سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے اس "گئو ھتیا" کو نہ روکا تو دھرتی اور آکاش دونوں میں تصادم واقع ہو جائے گا اور ہندو مسلم اتحاد، جس پر سوراج کا انحصار ہے، گو گرد احمر کی صورت اختیار کر لیگا۔

لیکن جب سنہ ۱۹۳۵ء میں عباس طیب جی کی پوتی نے شنکر لعل کے فرزند سے پریم دیوتا کی آگیا انوسار، خالص ویدک ریتی کے انداز میں "وِواہ" کر لیا تو اُسی گاندھی نے اس پوتر جوڑے کو اپنی آشیرواد سے بھرپور کر دیا۔

محترمی ظفر علی خاں صاحب نے اِس واقعہ کو چند اشعار میں نظم کیا تھا جنہیں ناظرین کی عبرت اندوزی کے لئے درج کرنا چاہتا ہوں ؎

مسلماں ہو کے شنکر لعل کے بیٹے کے گھر آئی　　دیا ایشر کی ہے عباس طیب جی کی پوتی پہ
مسلماں کا پھٹا تہمد نہ کچھ بھی اُس کے کام آیا　　نچھاور ہو گئی شرع نبیؐ زنّار دھوتی پر
حسین احمد سے کہتے ہیں مدینہ کے خزف ریزے　　کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر کوئی ہندو لڑکی، کسی مسلمان سے شادی کا ارادہ کرے تو مہاپاپ ہے اور اگر کوئی مسلمان لڑکی، کسی ہندو سے شادی کرلے تو مہاپُن ہے!

کیا گاندھی جی کی فرقہ پرستی کو ثابت کرنے کے لئے کسی اور مثال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو تازہ ترین مثال ۱۵ مارچ کے ٹریبیون سے مل سکتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا، مالابار میں، ایک کانگرسی ہندو نوجوان گوپالن نمبیار نامی نے، ایک سیاسی جلسہ میں، عوام کو بھڑکایا کہ پولیس

سب انسپکٹر کو، جو اس جلسہ میں موجود ہے، قتل کر دو چنانچہ عوام کالانعام نے، اس مہاپرش کے فرمان کے مطابق، اس سرکاری افسر کا اُسی جگہ خاتمہ بالخیر کر دیا۔ یعنی دیش بھگتی بذریعہ تشدد!

عدالت عالیہ مدراس نے مسمّی گوپالن نمبیار مذکور کو، بجا طور پر پھانسی کی سزا دی تاکہ قانون کا منشار پورا ہو سکے اور آئندہ کسی شخص کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ عوام کو قتل و غارت پر برانگیختہ کر سکے:۔

لیکن مسٹر گاندھی کو، جو فرقہ پرستی سے بالاتر ہیں آہنسا کے دیوتا ہیں، اور نظریۂ عدم تشدد کے پجاری ہیں ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ ایک آنکھ نہ بھایا:۔ چنانچہ موصوف نے ۵ / مارچ کے "ہریجن" میں لکھا ہے کہ

"گوپالن نمبیار ایک محبِّ وطن نوجوان ہے، اس نے جوش میں آکر مجمع کو سب انسپکٹر پولیس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی چنانچہ اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسر مذکور ہلاک ہو گیا۔ مدراس ہائیکورٹ نے، نوجوان مذکور کو پھانسی کی سزا دی ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ بربنائے شہادت یہ سزا درست ہے لیکن اس جرم کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ حکومت کو اس سزا میں تخفیف کر دینی چاہئے ملزم نمبیار نے بیشک افسر کو قتل کرنے کی ترغیب دی لیکن، ذرا حالات حاضرہ پر بھی تو نگاہ کرو! ہم لوگ آج ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ قتل کا کاروبار ہول سیل پیمانہ پر ہو رہا ہے، اور روزانہ قتل کے صدہا واقعات ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں، جو قانون کی دسترس سے بالاتر ہیں پس میری رائے میں، ایک نوجوان کو، ایک ایسے جرم کی پاداش میں، جس کے ارتکاب میں ذاتی دشمنی اور عداوت (MALICE) کا نام و نشان تک نہ ہو، پھانسی کی سزا دینا، قانون کے ساتھ سراسر استہزار کرنا ہے۔ اندریں حالات میں بہت خوش ہوں کہ اخبارات اور رہنمایاں رائے عامہ دونوں اس امر میں کوشاں ہیں کہ سزا میں تخفیف ہو جائے۔" (بحوالہ ٹریبیون ۱۷ مارچ ۱۹۴۷ء)

یہ ہیں وہ جذبات اور خیالات جو مسٹر گاندھی نے، ایک قاتل سے متعلق، بذریعہ الفاظ سپردِ قلم کئے ہیں، ہمیں اس وقت اس بحث نہیں کہ یہ وکالت یا حمایت، بجا ہے یا بیجا سوال یہ ہے کہ جب ۱۹۲۹ء میں میاں علم الدین شہیدؒ نے ایک شاتمِ رسولؐ کو قتل کیا تھا تو اس وقت مسٹر گاندھی کے دل میں اس مرحوم کے لئے ہمدردی کا جذبہ کیوں پیدا نہ ہوا؟ مرحوم نے بھی، راجپال کو کسی ذاتی دشمنی یا عداوت کی بنا پر قتل نہیں کیا تھا۔ مزید براں یہ کہ گوپالن نمبیار نے ایک ایسے شخص کو قتل کرایا، جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، اور شہید موصوف نے ایسے شخص کو قتل کیا تھا جس نے اتنا بڑا جرم کیا کہ ایک مسلمان کی نظر میں اس سے بڑا اور کوئی

جرم متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس نے مسلمانانِ عالم کی دل آزاری کی تھی۔

علم الدین کی حمایت تو کجا، مسٹر گاندھی نے راجپال کے اس فعل پر اس کی مذمت تک نہیں کی۔ اس کے معنی صاف یہ نکلتے ہیں کہ مسٹر گاندھی اپنے درجہ کے فرقہ پرست ہیں۔ افسوس گاندھی جی کی اس ذہنیت پر نہیں کیونکہ ہندو بہرحال ہندو یعنی دشمن ملت ہے افسوس اگر ہے تو اُن مسلمانوں پر جو ان حقائق ثابتہ کی موجودگی میں بھی گاندھی جی کو "روحانیت کا بادشاہ" کہتے ہیں اور ان کی رہنمائی پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔

چہ گویمت ز مسلمان نامسلمانے — جز اینکہ پور خلیل است و آذری داند (اقبالؒ)

جاوید نامہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی وہ تصنیف ہے جس کا شمار ادبیات عالم میں ہوتا ہے اور بلاشبہ اس کتاب میں اُن کا فلسفیانہ تخیل کمال کے اس نقطہ پر پہنچ گیا ہے جس سے بالاتر مقام باعتبار فن کسی غیر نبی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا کہ اس لازوال اور عدیم المثال علمی کارنامہ کو مسلمانوں سے روشناس کرایا جائے الحمدللہ کہ اس ضرورت کو ایک ایسے بزرگ نے پورا کر دیا، جن کو دینی علوم سے بھی بہرۂ وافر حاصل ہے اور جن کے دل میں ملت کا درد بھی موجود ہے۔ میری مراد مولینا مولوی محمد صبغۃ اللہ صاحب بختیاری مدظلہ سے ہے جو جامعہ دارالسلام عمرآباد (مدراس) میں شیخ الحدیث ہیں، اور حکیم الامت کے کلام سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شرح جاوید نامہ کو سریع الفہم بنا دینے کے علاوہ، اقبال کے پیغام کو متعارف بھی کر سکے گی۔ جنوری کے پرچہ میں اس کا ابتدائی حصہ شائع ہو چکا ہے۔ باقی انشاء اللہ العزیز آئندہ درج کیا جائے گا

ناظرین، اُس پاکیزہ تحریک سے ناواقف نہ ہوں گے، جو حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ نے ۱۸۲۱ء میں شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصد وہی تھا جس کے حصول کے لئے، آج بھی ہر سچے مسلمان کا دل نعل در آتش بنا ہوا ہے۔

زمانہ کی ستم ظریفی اور مسلمانوں کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ حُقہ بازانِ فرنگ کی سحر کاریوں کی بدولت، حضرت مجددؒ کی شخصیت اور ان کی تحریک دونوں، عامۃ المسلمین کی نظر میں، قابل اجتناب بن کر رہ گئیں اور جاہل مسلمان آپ اور

آپ کی تحریک سے واقف نہ ہوسکے۔ برطانی مصنفین نے حضرت موصوف اور ان کی اسلامی تحریک کو نہایت مکروہ انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگرچہ اب ہمارے زمانہ میں، یہ طلسم باطل ہوچکا ہے اور خاک پاک بالاکوٹ کے ذرات نے بذریعہ لاسلکی، اپنا پیغام نوجوانوں کو پہنچانا شروع کردیا ہے تاہم ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی مشہور کتاب " دی انڈین مسلمانز اینڈ دی برٹش گورنمنٹ" کے مضامین کا ترجمہ شائع کرنا بے محل نہ ہوگا، تاکہ اگر ایک طرف ناظرین کو یہ معلوم ہوسکے کہ انگریز، اس تحریک کو کیا سمجھتے تھے، تو دوسری طرف گزشتہ صدی کے مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہو سکے کہ اُن کی خودی، چونکہ اس وقت تک تعلیم کے تیزاب میں نہیں ڈالی گئی تھی اس لئے اسلام کی محبت اُن کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے جو بنگال میں انڈین سول سروس کے ایک معزز رکن تھے ۱۸۷۰ء میں سول سروس والوں کی رہنمائی کے لئے لکھی تھی۔ چونکہ اس کتاب میں ایسی معلومات ہیں جن سے ہم مسلمان بھی بہت کچھ درس عبرت حاصل کرسکتے ہیں اس لئے اس کا اُردو ترجمہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔ بی۔ بی ایس لاہور نے لکھا ہے اس کتاب میں چار باب ہیں پہلے باب میں مجاہدین سرحد کی مختصر تاریخ اور اُن کے حالات درج ہیں۔ اگرچہ مجاہدین کے لئے ولیم ہنٹر نے باغی کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اس باب میں مجاہدین کی مساعیٔ جمیلہ کے صحیح صحیح حالات بہت حد تک آگئے ہیں۔ اس پرچہ میں صرف باب اول درج کیا جاتا ہے۔ آئندہ ماہ انشاءاللہ العزیز باب دوم درج کریں گے۔

میرے رفیق کار اور محترم دوست سید محمد شاہ صاحب نے کچھ عرصہ ہوا قرآن مجید کا ترجمہ لکھا تھا، جو ہیکو لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ بفضلِ خدا بہت مقبول ہوا، اور میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اس ترجمہ کی بدولت اکثر مسلمانوں کو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا۔ لیکن سید صاحب موصوف، نے مسلسل مطالعہ کی بنا پر یہ محسوس کیا کہ دراصل کلام اللہ کا لفظی ترجمہ تقریباً ناممکن ہے اور اس خیال نے انہیں مجبور کیا کہ، افضال الٰہی کے اس بحر بے پایاں میں دوبارہ غوطہ لگائیں اور حقائق و معانی کے آبدار موتی، تہ سے

نکال کر لائیں۔ یعنی قرآن مجید کی آیات کے مفہوم کو، اپنی بساط کے مطابق، اپنے الفاظ میں ادا کر دیں۔

راقم الحروف نے پہلے پارہ کا ترجمہ دیکھا ہے، اس میں تین خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔

اولاً ترجمہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ہے کسی جگہ یہ کوشش نہیں کی گئی ہے کہ کلام اللہ کو اپنے مزعومات کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔

ثانیاً عبارت نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے، اس لئے اُس کا مفہوم بآسانی ذہن نشین ہوتا جاتا ہے اور آگے پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

ثالثاً کلام اللہ کا مفہوم اس نہج پر پیش کیا گیا ہے کہ نہ صرف متن کا منشار مفہوم واضح ہو جاتا ہے بلکہ پڑھنے والا، تفسیروں کے مطالعے سے بھی، بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے

میں اس اہم نکتہ کو، مثال دے کر واضح کر دوں۔

عام طور سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "سب تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار سب جہانوں کا ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہے" لیکن شاہ صاحب نے یوں لکھا ہے "تمام حمد و ثنا اور ہر قسم کی تعریف و توصیف کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کیونکہ صرف وہی تمام مخلوقات کا رازق اور مربی اور نگہبان ہے۔ اس کے انعامات و اکرامات اور فیضان و رحمت کا حلقہ اس قدر وسیع ہے جس کی انتہا نہیں ہے۔ وہ ہر لحظہ اور ہر آن، تازہ بتازہ نو بنو، احسانات کرتا رہتا ہے اور یہ انعامات و اکرامات عارضی نہیں، بلکہ مستقل اور دائمی ہیں"

یعنی اس ترجمہ سے رب۔ رحمٰن اور رحیم تینوں اہم اسمائے صفات کا مفہوم واضح ہو گیا۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ کلام اللہ کے مطالعہ میں، ذوق و سرور اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جبکہ قاری، مفہوم سے آگاہ ہو سکے۔

التزام یہ کیا گیا ہے کہ اس ترجمہ یعنی "مطالب القرآن" کو بالاقساط، پیغام حق میں شائع کیا جائے۔ اس پرچہ میں اس ترجمہ کی دوسری قسط ہدیۂ ناظرین ہے پہلی قسط جنوری و فروری ۱۹۴۲ء کے مشترکہ پرچہ میں ملاحظہ

فرمائیں امید ہے کہ ناظرین اس قیمتی ترجمہ سے کما حقہٗ استفادہ کریں گے۔ سردست بہت مختصر حواشی پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن میرا ارادہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ترجمہ مکمل ہو جائے گا، تو میں شاہ صاحب سے ضروری اور اہم مقامات پر تفسیری نوٹ لکھوا دوں گا تاکہ یہ چیز اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ سے رسالہ میں باب التقریظ والانتقاد کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا جائے۔ اس باب میں، ہر ماہ کسی ایک مشہور علمی کتاب پر تفصیلی تبصرہ لکھا کروں گا۔ یہ تبصرہ "ریویو" سے مختلف چیز ہوگی۔ جیسا کہ ناظرین کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ جو پبلشر حضرات اپنی کتابوں پر تبصرہ کے خواہشمند ہوں وہ بخوشی اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب بھیجنے کا پتہ:۔ (پروفیسر سلیم چشتی ۴۷ ٹمپل روڈ لاہور)

ندوۃ العلماء کے ایک قابل احترام پروفیسر سید ابوالحسن علی صاحب نے جو سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں، ایک کتاب موصوف کے حالات اور سیرت میں "سیرت سید احمد شہید" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ ہمارے خیال میں جو حضرات سید موصوف اور اُن کے مجاہد متبعین کے کارناموں سے واقف ہونا چاہیں اُنہیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ سید صاحب ممدوح کے حالات آج اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی معلوم نہیں۔ یہ کتاب دفتر اقبال اکیڈیمی سے بھی مل سکتی ہے۔ قیمت ۲ روپے محصول ڈاک ۵ر

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت

(از ڈبلیو۔ ڈبلیو، ہنٹر)

باب اوّل

[مجاہدین سرحد کی مختصر تاریخ۔ سید احمد بریلوی کی مساعی، اور ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی حکومت سے غیر مطمئن ہونا]

بنگال کے مسلمان ایک دفعہ پھر عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ سالہا سال سے سرحد کے مجاہدین کی آبادی ہماری سرحد پر چھاپے مار رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ متعصب لوگوں کے گروہ بھیج دیتی ہے جو ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور ہمارے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری فوج کو اُن کے ساتھ تین تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں۔ اس مخالف نو آبادی کے لئے نہایت ہی منظم طریقہ پر بنگال میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف سازشی مقدمات سے یہ بات بایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ سازش کا یہ جال ہمارے تمام صوبوں میں پھیلا ہوا ہے اور پنجاب سے پرے کا غیر آباد کوہستانی علاقہ گرم ملک کی اُن دلدلوں سے جہاں پر دریائے گنگا سمندر میں جا گرتا ہے اس قسم کے مسلسل سازشی اداروں سے ملا ہوا ہے۔ اُن سے ایسے سازشی اداروں کا پتہ بھی چلا ہے جو گنگا کے دہانے[۵] سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ روپیہ اور آدمی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ہماری جرنیلی سڑک پر منزل بمنزل گزارتے ہوئے باغی کیمپ میں پہنچا دیتے ہیں جو یہاں سے دو ہزار میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں۔ روپیہ پہنچانے کے

---

[۵] یعنی جنوبی بنگال۔

طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک نہایت ہی خطرناک کام ہے کمال ہشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا گیا ہے۔

جو مسلمان زیادہ متعصب ہیں وہ تو کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہے ہیں اور باقی تمام مسلمان علانیہ جہاد کی فرضیت پر بحث میں مصروف ہیں۔ گذشتہ نو ماہ سے بنگال کے سرکردہ اخبارات نے اِس بحث پر کالم کے کالم سیاہ کر دیئے ہیں کہ مسلمانوں پر ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کا فرض عاید ہوتا ہے یا نہیں سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے علمار کا متفقہ فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد بنگال کے مسلمانوں نے اِس موضوع پر ایک رسالہ شائع کیا۔ اور شیعہ جماعت بھی جو ہندوستان میں بہت ہی اقلیت میں ہے کچھ نہ کچھ شائع کرنے سے گریز نہ کر سکی۔ کچھ مہینے تو ہمارے انگلو انڈین اخبارات اُن چند وفادار مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے رہے جو بڑی سرگرمی سے اِس سوال کا جواب تلاش کرنے میں سرگردان تھے کہ اگر ہم نے ملکہ کے خلاف بغاوت نہ کی تو کیا ہم اپنی روح کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ مگر علمار اور فقہاء کے متفقہ فتوے کی تمام اشاعت کے بعد ہمارے ہموطنوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ یہ مسئلہ مذاق ہی مذاق نہیں بلکہ ایک خطرناک پہلو بھی رکھتا ہے۔ وہ متعلقہ کاغذات جو خود مسلمانوں نے شائع کئے ہیں اس بات کا صاف صاف پتہ دے رہے ہیں کہ اس وقت ہماری ہندوستانی سلطنت ایک نہایت ہی خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔

اس شائع شدہ مواد سے ہر عقلمند آدمی کو اِس بات کا یقین ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا نڈر طبقہ تو کئی سال سے کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہا ہے اور باقی تمام قوم ایک نہایت ہی اہم ملکی مسئلہ میں پریشان ہو رہی ہے "بغاوت کے فرض" کو باقاعدہ طور پر اور علی الاعلان شریعت اسلامی کا ایک اہم قانونی مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے عقیدہ کا اظہار کرے اور اپنے ہم مذہبوں کے سامنے کھلم کھلا بتلائے کہ وہ سرحد پار کے باغی کیمپ میں کچھ نہ کچھ حصہ لیگا یا نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے متعلق قطعی فیصلہ کرے کہ آیا اسے ایک سچے مجاہد مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنا ہے یا ملکہ معظمہ کی پُرامن رعایا کی حیثیت سے مسلمانوں نے کسی قطعی فیصلہ پر

پہنچنے کے لئے صرف ہندوستان کے علما رہی کے فتووں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ مکہ معظمہ کے علما تک بھی پہنچے ہیں اور کچھ مہینوں تک تو مسلمانان ہندوستان پر بغاوت کرنے یا نہ کرنے کے فرض کا تصفیہ مکہ معظمہ کے تین اہل سنت وجماعت علما رکے فتوے پر منحصر رہا۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر اپنی مسلمان رعایا کی اس مضطربانہ کیفیت سے بحث کروں جس نے تین صورتیں اختیار کر رکھی ہیں

میں اُن واقعات کا جن کی وجہ سے ہماری سرحد پر باغیوں کی نوآبادی قائم ہوئی اور اُن خوفناک نقصانات میں سے بعض کو بھی جو اس کی وجہ سے سلطنت برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے قارئین کے سامنے مجملاً بیان کروں گا۔ اور دوسرے باب میں باغیوں کی اس تنظیم کا ذکر کروں گا جس کے ذریعہ سے باغی کیمپ نے ہماری سلطنت کے اندرونی اضلاع سے آدمی اور روپیہ مسلسل طور پر حاصل کیا۔ پھر میں اُن شرعی مباحث کی تفصیل بیان کروں گا جن کی بنا پر تشویشناک حالات رونما ہوئے۔ یہ وہ مباحث تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عام طبقہ کس پرجوش طریقہ پر باغی پیشواؤں کی زہرآلود تعلیم سے متاثر ہو رہا ہے اور کس طرح مسلمانوں کا ایک طبقہ جو تعداد میں بہت ہی کم ہے فرض جہاد سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے شریعت مقدسہ میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کر رہا ہے۔ لیکن اگر میں صرف اسی پر بس کر دوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ میں نے پوری بات بیان نہیں کی۔ مسلمانان ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہے اور اُن تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چوتھے باب میں مسلمانوں کی اُن شکایات کو جو انہیں انگریزی عہد حکومت میں پیدا ہوئی ہیں معلوم کروں اور اُن کی واقعی شکایات کو بیان کروں اور ساتھ ہی اُن کے رفع کرنے کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالوں۔

سرحد پر باغی کیمپ کے بانی مبانی سید احمد[1] تھے۔ وہ ان بیباک اور باہمت نوجوانوں میں سے تھے جو نصف صدی قبل پنڈاری قوت کے استیصال کے بعد تمام ہندوستان میں بکھر گئے تھے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی اُس مشہور لٹیرے[2] کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے شروع کی جس نے مالوہ کے افیم پیدا کرنے والے دیہات کو مدتوں تک تاخت و تاراج کیا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی قوت نے جس سختی کے ساتھ اپنے مسلمان ہمسایوں کو دبائے رکھا اُس سے مسلمان لٹیروں کا کام بہت ہی خطرناک اور غیر منفعت بخش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مہاراجہ مذکور کے ہندوانہ مذہبی تعصب نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے جوش و خروش کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا۔ انہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر دیا اور ۱۸۱۶ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لیے دہلی جا کر ایک جید عالم[3] کی شاگردی قبول کی۔ اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ حیثیت کے بعد ایک مبلغ کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے پُرزور طریقہ پر اُن بدعات کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانانِ ہند کے اسلامی عقائد میں داخل ہو چکی تھیں اور اس طرح پُر جوش اور حوصلہ مند لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا۔ اُن کی تبلیغ کا پہلا مرکز رُہیلوں کی قوم تھی[4] جن کو صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے لیے ہم نے محض دولت کے لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کو دے دی تھیں۔ اور جس کی افسوسناک تاریخ وارن ہیسٹنگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما داغ ہے۔ اُن کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اس کا انتقام لیتی چلی آ رہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اُس کے بہترین شمشیر زن مہیا کر رہی ہے۔ روہیلوں کے معاملہ میں بھی اور ہندستان میں جہاں کہیں بھی ہم نے مظالم کیے ہیں ہم نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹا ہے

۱۸۲۲ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مُرید اُن کی روحانی فضیلت کو

---

[1] آپ رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء کے مقدس مہینہ محرم میں پیدا ہوئے۔ [2] امیر خاں پنڈاری نواب آف ٹانک۔ مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ ہر محب وطن اور آزادی خواہ کو پہلے لٹیرے کے ہی لقب سے یاد کرتی ہیں۔ مترجم)

[3] شاہ عبدالعزیز صاحب۔ [4] روہیلکھنڈ میں رام پور کے قریب فیض اللہ خاں کی جاگیریں۔

تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنےٰ سے ادنےٰ کام کو بخوشی سرانجام دیتے۔ اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمتگاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھنے لگے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد ان کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آگئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کئے تاکہ ہر اس شہر سے جو اُن کے رستے پر پڑتا ہو تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے مقرر کئے[۵۱] یعنی روحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اس کے لئے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت جاری کیا کرتے تھے۔ اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انہوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ رستے میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اس قدر ہجوم جمع ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لئے مشکل تھا بالآخر انہیں اپنی پگڑی کو کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصہ کو چھوئے گا وہ اُن کا مرید ہو جائے گا۔ ۱۸۲۲ء میں وہ حج کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے اور اس طرح پر اپنی گذشتہ سوانح حیات کو جو بحیثیت ایک قزاق کے گزاری تھی حاجی[۵۲] کے مقدس لباس میں چھپا کر اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی وارد ہوئے۔ یہاں پر بھی آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی۔ مگر اس لٹیرے دل کے لئے انگریزی علاقہ کے پُرامن شہریوں کے بجائے ایک اور زیادہ موزوں میدان موجود تھا انہوں نے شمالی ہند کو واپس ہوتے ہوئے اپنے وطن مالوف ضلع رائے بریلی میں بہت سے سرکشوں کو اپنا مرید بنالیا۔[۵۳] اور ۱۸۲۴ء میں سرحد پشاور کے وحشی اور پہاڑی قبیلوں میں آ نمودار ہوئے یہاں انہوں نے سکھ

---

۵۱ مولوی ولایت علی۔ مولوی عنایت علی۔ مولوی محرم علی اور مولوی فرحت حسین اور شاہ محمد حسین کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔

۵۲ انگریز مصنفین ایسے ایسے ناپاک اور گمراہ کن الفاظ جگہ بجگہ موزوں کر کے اپنی گندی ذہنیت کا ثبوت دینے کے عادی ہیں۔

۵۳ ان کو اُن کے قاضی القضاۃ شاہ محمد حسین نے مرید کیا تھا جو ہمیشہ آپ کو روپیہ اور رنگروٹوں سے مدد دیتا رہا۔

سلطنت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی تبلیغ شروع کر دی۔

پٹھانوں کے قبائل نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اُن کی دعوت پر لبیک کہی۔ اسلامی قبائل میں جو زیادہ پُرجوش اور توہم پرست تھے وہ اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ اُن کو اپنے ہندو ہمسایوں کو لوٹنے کے لئے ایک مذہبی بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ امام صاحب نے اُن لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ جو شخص غازی ہوگا وہ مال غنیمت سے مالا مال ہو کر لوٹے گا اور جو میدان جنگ میں کام آئے گا وہ سیدھا جنت کو سدھارے گا۔ اور شہادت کا درجہ پائے گا۔ انہوں نے کابل اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور جہاں کہیں بھی گئے ملک کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لئے مختلف قبیلوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا۔[۵] انہوں نے اُن کو لوٹ مار کا لالچ دیا اور ان کا دین یہ کہہ کر خرید لیا کہ میں تمام دنیا کے مشرکین یعنی سکھوں سے لے کر چینیوں تک کی بیخ کنی کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوں۔ انہوں نے کوہستان کے سمجھدار سیاسی لیڈروں اور قبائل کے دنیادار سرداروں کو ہمسایہ سکھ قوم کی بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کی طرف توجہ دلائی۔ راجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی پرانی نفرت و حقارت ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی۔ اس طرح پر مذہبی احکام کی کامیابی کے لئے راستہ صاف کرنے کے بعد اُنہوں نے خدا کے نام پر ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جس میں تمام سچے مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس عجیب و غریب دستاویز کو اس طرح شروع کیا گیا تھا۔

"سکھ قوم نے مدت سے لاہور اور دیگر علاقوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اُن کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا ہے اور ہزاروں کو بے عزت اور بدنام کیا گیا ہے۔ انہوں نے

---

[۵] یوسف زئی اور بارک زئی آپ کے وفادار حامیوں میں سے تھے پنجتار کا نواب (فتح خاں) بھی اُن کے ساتھ مل گیا تھا۔ بعد میں سوات کی طاقتور ریاست بھی اُن کے ساتھ ہو گئی۔ انہوں نے اپنا اقتدار ریاست امب میں بھی پیدا کر لیا تھا۔ نواب ٹونک جو ان کا گذشتہ لیڈر تھا ہمیشہ روپے اور رنگروٹوں سے اُن کی مدد کرتا رہا۔

مساجد میں اذان کا دینا بند کر رکھا ہے اور گاؤکشی کی قطعی ممانعت کر دی ہے۔ آخر کار جب اُن کا ظلم و تعدی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گیا تو سید احمد علیہ الرحمۃ نے صرف اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کہ دین اسلام کی حفاظت کی جائے اپنے ساتھ چند مخلص مسلمانوں کو لے کر کابل اور پشاور کی راہ لی۔ اور وہاں پر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور اُن میں جرأت و ہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہزاروں مسلمانوں نے اُن کی دعوت پر لبیک کہی اور خدا کے راستے میں قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ پس ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہو جائے گا"

اس اثنا میں امام صاحب کے قاصدوں نے اس اعلان کو شمالی ہندوستان کے اُن بڑے بڑے شہروں میں پہنچا دیا جہاں پر انہوں نے اپنے مرید بنائے ہوئے تھے۔ یہ اعلان اُس رسالہ سے لیا گیا ہے جو صوبہ اودھ کے ایک دور افتادہ مقام سے شائع ہوا۔[۵۱]

اس کے بعد سکھوں کے خلاف مذہبی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں کبھی ایک فریق غالب آیا اور کبھی دوسرے فریق کو فتح نصیب ہوئی۔ دونوں طرف سے بے تحاشا قتل عام کیا گیا۔ مسلمان مجاہدین اور ہندو سکھوں کے درمیان نفرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُن کا اظہار ضرب المثل اور مقامی روایات کی صورت میں ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی سرحدوں کو ایک ایسے قابل جرنیل کے ذریعہ مستحکم کر لیا تھا جو نپولین اعظم کی فوج کے منتشر ہونے کے بعد تمام دنیا میں پھیل گئے تھے۔ پشاور کے کسانوں کو ایک طالوی قسمت کے مارے جرنیل اویطابلی (A VITALULI)[۵۲] کا نام اب تک یاد ہے۔ مسلمان وقتاً فوقتاً پہاڑوں سے نکل کر میدانوں پر چھاپہ مارتے اور جہاں جاتے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں گاؤں کے بہادر سکھ مسلح ہو کر اُن کی مدافعت کرتے اور ان کوہستانی مجنونوں کو اپنے پہاڑوں کی طرف بھگا دیتے پھر درندوں

---

[۵۱] رسالہ ترغیب الجہاد یعنی مذہبی جنگ پر اکسانا۔ اس کے مصنف قنوج کے ایک مولوی صاحب تھے۔ سرکاری روداد ۱۸۶۵ء

[۵۲] میں نے اس جرنیل کا نام مقامی تلفظ کے مطابق دیا ہے۔

کی طرح ان کا تعاقب کرتے اس وقت کے انتہائی جوش و خروش نے پٹہ داری کی ایک نہایت ہی خوفناک صورت چھوڑی ہے۔ یعنی پٹہ داری بعوض خون، چنانچہ سرحد کے ہندو اب تک بھی بڑے فخر کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں کی اراضیات حسین خیل قبیلے کے ایک سوسر سالانہ کی پٹہ داری پر دی گئی تھیں

باقاعدہ جنگوں میں مجاہدین کی بے ترتیب فوج سکھوں کی منظم سپاہ کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ ۱۸۲۷ء کو امام صاحب نے اپنے قبائل کے ساتھ اُن کے ایک ایسے کیمپ پر حملہ کردیا جس نے خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تھا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ ان کو سخت جانی نقصان کے بعد پسپا ہونا پڑا مگر میدانی جرنیل کو فتحمندانہ تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ متعصب گروہ دریائے سندھ کے پار اپنے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اس طرح سے انہوں نے جنگ جہاد میں فتحمندی سے اپنا نام پیدا کرلیا۔ یہاں تک کہ سکھ حاکم اس بات پر مجبور ہوگیا کہ ان قبائل کی حمایت خریدے جو چھاپہ مارنے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ میدان والوں کو پشاور شہر کے متعلق بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ جو سرحدی صوبہ کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں کے صوبہ دار[۱] نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے دغابازی سے امام صاحب کو زہر دینے کی کوشش کی۔ اس افواہ نے کوہستانی مسلمانوں کے جوش کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا۔ وہ نہایت ہی جوش و خروش سے میدانی علاقوں پر ٹوٹ پڑے اور کفار کی تمام افواج کو تہ تیغ کر دیا اور اُس کے جرنیل کو مہلک طور پر زخمی کردیا۔ صرف شہر پشاور ہی اُس فوج کی وجہ سے جو شہزادہ شیر سنگھ اور جرنیل وینچورا (VENTUE) کی ماتحتی میں تھی بچ سکا اب امام صاحب کا احاطہ اقتدار بڑھتے بڑھتے کشمیر تک جا پہنچا تھا شمالی ہند کے غیر مطمئن شہزادوں کی فوج اُن کے کیمپ میں پہنچنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے جو سکھ ریاستوں کے وفاق کا سردار تھا ایک لشکر جرار اپنے قابل ترین جرنیلوں کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جون ۱۸۳۰ء[۲] میں شکست کھانے کے باوجود امام صاحب کی فوج نے بہت بڑی قوت کے ساتھ میدانی علاقوں پر قبضہ کرلیا

۱؎ یہ ایک مسلمان تھا اور رنجیت سنگھ کا پٹھو تھا۔

۲؎ اُس فوج سے جو جرنیل الیرڈ (ALDARD) اور ہری سنگھ نلوہ کی ماتحتی میں تھی۔

اور اسی سال کے اختتام سے پہلے خود پشاور کو بھی جو پنجاب کا مغربی دارالسلطنت تھا فتح کر لیا تھا۔

یہ زمانہ امام صاحب کی زندگی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے خلیفہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے جن پر یہ عبارت کندہ تھی

"احمد العادل محافظ دین اسلام جس کی شمشیر کی چمک کافروں کے لئے پیغام اجل ہے"

پشاور کے چھن جانے کا غم رنجیت سنگھ کے بے نظیر سیاسی تدبر کو بروئے کار لایا۔ اس چالاک سکھ نے معمولی معمولی مسلمان ریاستوں کو اُن کے اپنے مفاد کا واسطہ دے کر اسلامی فوج سے علیحدہ کر دیا۔ اس صورت حالات کو دیکھ کر امام صاحب اس بات پر مجبور ہو گئے کہ فدیہ لے کر پشاور کو خالی کر دیں۔ اُن کے مریدوں کی آپس میں لڑائی نے تمام نظم و نسق برد بار کر دیا تھا۔ اُن کی باقاعدہ منظم فوج ہندوستانی مذہبی مجنونوں پر مشتمل تھی۔ جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے بھرتی کئے گئے تھے۔ اور جنہوں نے ہر حالت میں خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اُس کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اور جن کے لئے اب اُن کو چھوڑ جانا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ اس اسلامی فوج میں سرحد کے سرکش پٹھان بھی شامل ہو گئے تھے۔ جو اپنی بہادری کے ساتھ ساتھ کوہستانی لوگوں کا سا تکبر اور لالچ بھی رکھتے تھے ایک موقع پر تو ان سرحدی قبائل میں سے ایک نے عین لڑائی کے وقت غداری کی[1] اور بعد میں ان مذہبی مجنونوں نے اس کا انتقام بہت ہی سخت لیا تھا۔ امام صاحب نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کو بہت فیاضی سے کام لینا چاہئے کیونکہ وہ ہر وقت اُن پر اعتماد کر سکتے تھے سب سے پہلے تو اُن کی ضروریات کے لئے آمدنی کا دسواں حصہ وہ اپنے سرحدی مریدوں سے حاصل کرتے تھے۔ اور وہ اُس کو دین کی حفاظت کے لئے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر کچھ پس و پیش کے ساتھ ادا کرتے رہتے۔ مگر جب فریقین میں اس قسم کے چندوں کی بنا پر منافقت پیدا ہو گئی تو امام صاحب کے اقتدار میں فرق آنا شروع ہو گیا۔ ان کا اصلی جوہر آتش بیانی تھا اور وہ اس قابل نہ تھے کہ مختلف گروہوں پر غیر جانبدارانہ حکومت کر سکیں۔ وہ حیرت انگیز ادعا

---

[1] بارک زئی پٹھانوں نے سیدو کے مقام پر جب سکھوں سے لڑائی ہوئی تھی۔

جو آپ کو سرحدی قبائل پر حاصل ہوا تھا اُس کے زائل ہونے کے آثار بہت جلد پیدا ہو گئے۔ جب اُن کو اپنی طاقت کے زائل ہونے کا خدشہ پیدا ہوا تو انہوں نے زیادہ سختی سے کام لینا شروع کر دیا اور آخر کار سرحدیوں کے نہایت ہی نازک جذبہ کو مجروح کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کے ورغلانے سے نہایت ہی غیر دانشمندانہ طور پر سرحدیوں کے شادی بیاہ کے رسم و رواج میں اصلاح شروع کر دی۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی لڑکی کو اُس شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو سب سے زیادہ بولی دیتا ہے۔ اُن کے ہندوستانی مریدوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا اور بغیر بیویوں کے تھے۔ انہوں نے ایک حکم نافذ کر دیا کہ جو لڑکی بارہ دن کے اندر اندر بیاہی نہ جائے گی وہ ان کے مریدوں کی ملکیت سمجھی جائے گی سرحدی قبائل برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے سید صاحب کے ہندوستانی ساتھیوں کو قتل کر دیا اور خود انہوں نے بھاگ کر بڑی مشکل سے جان بچائی[1]۔ مگر اب ان کا عہد حکومت ختم ہو چکا تھا اور ۱۸۳۱ء میں جبکہ وہ اپنے ایک نائب کی جس نے اپنے لئے ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی بطور ایک والنٹیر امداد کر رہے تھے سکھ فوج نے جو شہزادہ شیر سنگھ کے زیر کمان تھی ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ اس تحریک کے مذہبی پہلو کے متعلق اس کتاب کے آخری باب میں بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں ایک مذہبی لیڈر انسانوں کے دلوں کو اُس وقت تک نہیں گرما سکتا جب تک کہ وہ اپنی تحریک کی صداقت پر پورا پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ میں اپنے دوسرے باب میں سید احمد کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کروں گا۔ یہاں پر

---

[1] وادی پنج تار سے وادی پکھلی کو۔

[2] مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر۔ سید احمد صاحب کے مندرجہ بالا حالات میں نے دفتر خارجہ اور محکمہ ملکی گورنمنٹ آف انڈیا کی دستاویزات اور ۱۸۵۲ء اور ۱۸۷۶ء کے شاہی مقدمات میں جو گواہیاں دی گئیں اور پٹنہ کے جج مسٹر (T.E. REVEN SHA UD . I) کی ملفوظات سے حاصل کئے ہیں۔ اس کے بہت سے تفصیلی حالات کیپٹن (CUNNEGHAM) کننگھم کی تاریخ سکھ سے مل سکتے ہیں۔

ایک اور مصنف نے جس نے شاید یہ ہی مواد لکھا ہے ایک بہت ہی اچھا مضمون وہابیوں کے متعلق کلکتہ ریویو c ۱۸۷۰ء میں شائع کیا ہے۔

میں نے مجاہدین کی نوآبادی کے ابتدائی حالات ذرا تفصیل سے بیان کردئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس وقت تک کے واقعات کو مختصراً بیان کردوں جب کہ وہ ہماری سرحد پر باغی کیمپ کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس امام کے معتمد نائبوں میں سے دو بھائی تھے جو ایک مشہور و معروف قاتل کے پوتے[۱] تھے وہ اپنی جان کو بچانے کے لئے سندھ پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ اور وہاں ستیانا کے مقام پر بطور ایک عابد و زاہد کے زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ اس پناہ گزین درویش نے سرحدیوں میں بہت عزت حاصل کر لی تھی وہ اُس جگہ کو جہاں ان کی کُٹیا تھی جائے پناہ اور غیر جانبدار علاقہ تصور کرتے تھے اس سے اُن قبائل کے درمیان جو ہر وقت برسرِ پیکار رہتے تھے ایک بہترین صورت حالات پیدا ہوگئی۔ اس درویش کے ایک پوتے نے[۲] جو امام کا خزانچی تھا ستیانا کے مامون گاؤں میں اقتدار حاصل کرکے امام صاحب کی باقی ماندہ فوج کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

اُسی زمانہ میں سوات کی ریاست کے مذہبی پیشوا نے انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہوکر مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ یہاں پر ایک مضبوط شاہی حکومت قائم کرلی جائے۔ اسی خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُس نے درویش مذکور کے دوسرے پوتے[۳] کو سوات آنے کی دعوت دی اور اُس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اس طرح پر اُس نے باشندوں کی فطرتی شجاعت کو قائم رکھا۔ کیونکہ اب اُن کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ ہلالی فوج کے ایک مجاہد کے زیر کمان ہیں اور جو کوئی بھی اس متوقع جنگ میں جو انگریزوں یا ہندو کافروں سے ہونے والی ہے کام آئے گا وہ شہادت کا درجہ پائے گا۔ لیکن سوات کے قبائل کے خطرات کبھی بھی شرمندہ معنی نہ ہوئے اور اُن کے بادشاہ نے ۱۸۵۷ء تک حکومت کرکے اس دارِ فانی سے کوچ کیا اس کے بعد اُن کا کوئی جانشین منتخب نہ کیا گیا۔ فی زمانہ اُس کا لڑکا اس خاندان کا سردار ہے اور ستیانا کی مجاہد آبادی کا لیڈر ہونے کا دعویدار وہ ریاست سوات کی حکومت پر بھی نظر رکھتا ہے

اس طرح پر ان مجاہدین نے سرحد پر دو پہلوؤں سے اپنے اقتدار کو مستحکم کرلیا تھا۔ اور اپنے مبلغین کے

---

[۱] زمان شاہ جو تخت نشین ہونے والا تھا۔ [۲] سید عمر شاہ [۳] سید اکبر شاہ۔

ذریعے سرحد کی توہم پرست قبائل میں جہاد کی آگ ہمیشہ سلگائے رکھتے تھے۔ کچھ سالوں تک اُن کی حیثیت بے حقیقت سرحدی لٹیروں کی سی رہی جو کبھی کبھی ایک نہایت ہی خوفناک ہلالی فوج کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ہمارے الحاقِ پنجاب سے پہلے انہوں نے اپنے ہندو ہمسایوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا لامتناہی سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور اُس زمانہ میں مسلمانوں کی فوج میں بہت سے رنگروٹ خود ہمارے ہی علاقہ سے بھرتی ہونے لگے تھے۔ اس متعصب نو آبادی کے لئے اپنی رعایا کی بھرتی روکنے کے لئے ہم نے کوئی تدابیر اختیار نہ کیں تھیں یہ فوج اپنا غصہ سکھوں پر نکالا کرتی تھی یہ قبائل کے ناپائدار اتحاد پر مشتمل تھی جو کبھی ہمارے موافق اور کبھی ہمارے مخالف ہو جاتی تھی۔ ایک بہت بڑے انگریز تاجر نے جو ہمارے شمال مغربی صوبہ میں نیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا مجھے بتلایا کہ اُس کے بہت سے دیندار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معین حصہ سیتانا کیمپ کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے۔ اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لئے چلے جاتے تھے۔ جس طرح کبھی کبھی اُس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے اُسی طرح اُس کے مسلمان ملازم جو نیل کوٹھی میں کام کرتے تھے سنہ ۱۸۴۳ء اور سنہ ۱۸۴۶ء کے درمیان اس عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا ہے۔

اس غفلت کی وجہ سے ہماری رعایا کو اُس متعصب کیمپ میں ہمارے سکھ ہمسایوں کے خلاف بھرتی ہونے کی عام اجازت ہو گئی جس کا ہمیں بہت بڑا خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ امام[1] صاحب نے سکھوں کی سرحد پر اور ہمارے علاقہ میں باقاعدہ ایک گدی قائم کر لی تھی۔ اور اب یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ اور خود ان کی وفات کو بھی اُن کے پر جوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدس ذریعہ بنا

---

[1] امام صاحب کا لفظ جہاں کہیں بھی آئے گا اُس سے مراد سید احمد صاحب ہیں حقیقت میں وہ سیاسی اعتبار سے امام تھے اور شرعی لحاظ سے ایک ولی۔ اصلیت یہ ہے کہ حضرت مسیح اور حضرت محمدؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

لیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اُن کے دو خلفاء نے جن کو انہوں نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا زیارت کے لئے سرحد کا سفر اختیار کیا۔ اور پورے طور پر معلوم کر لیا کہ اُن کے امام صاحب معجزانہ طور پر غائب ہو گئے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی تک بقید حیات موجود ہیں اور وہ وقت مقررہ پر اپنے آپ کو ایک جہادی فوج کے قائد کی حیثیت سے ظاہر کریں گے اور انگریز کافروں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے اُس کے خلفاء نے دریائے گنگا کی وادی کے ساتھ ساتھ اُن تمام بڑے بڑے شہروں میں جہاں پر امام صاحب نے اپنے سفر کلکتہ ۱۸۲۰ء کے دوران میں تبلیغ کی تھی روپیہ اور آدمی جمع کرنے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا بالخصوص لڑنے کی فراہمی کا۔ اس طرح ہمارے ملک سے نکل کر متعصب نوآبادی تک غیر مطمئن لوگوں کے جانے کا ایک دائمی تانتا بندھ گیا۔ بھگوڑے مقروض۔ فرار شدہ قیدی ہر وہ فضول خرچ جو اب اس قدر برباد ہو چکا تھا کہ اپنوں میں رہنا اُس کے لئے دشوار تھا، اور غدار جس کے لئے قانون کی زد سے بچنا محال تھا تمام کے تمام انگریزی علاقے سے بھاگ کر سرحد پر جمع ہو جاتے تھے۔ وہاں پر اعلیٰ طبقہ کے پناہ گزین بھی تھے اور ہر وہ دیندار مسلمان جس کو عیسائی حکومت کے ماتحت آرام سے زندگی بسر کرنا ہرگز گوارہ نہ تھا کمر ہمت باندھ لیتا اور ستیانا کے کیمپ کی طرف چل دیتا۔ وہ سکھوں کے گاؤں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور اس بات پر بھی خوش ہوتے تھے کہ اُنکو انگریز کافروں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جنگ کابل میں انہوں نے ایک لشکر جرار ہمارے دشمن کی امداد کے لئے روانہ کیا اور ایک ہزار کے قریب آخر دم تک ہمارا مقابلہ کرتے رہے۔ صرف فتح غزنی کے موقع پر تین سو کے قریب نے انگریزی تلواروں کے ذریعے جام شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

جب ہم نے پنجاب کا الحاق کیا تو تعصب کی اس رَو کا رُخ جو پہلے سکھوں کی طرف ہوتا تھا اب اُن کے جانشینوں کی طرف پھر گیا۔ ستیانا فوج کی نظر میں انگریز اور ہندو دونوں کافر تھے اور اس لئے اس قابل تھے کہ تلوار کے ذریعہ اُن کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ سکھوں کی سرحد پر جس بدامنی سے ہم نے چشم پوشی کی تھی یا جس سے بے پروائی کی تھی وہ ایک تکلیف دہ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچی۔

پٹنہ کی عدالت کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے خلفاء[۵۱] نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سرہنری لارنس کو گواہیوں[۵۲] کے دوران میں معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں مجاہدین[۵۳] کے نام سے موسوم تھے۔ اور اسی حیثیت سے محافظوں کے درمیان اُن کو اُن کے وطن پٹنہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

یہاں مجسٹریٹ نے اُن سے اور اُن کی جماعت کے دو اور دانشمند ممبروں سے آئندہ نیک چلنی کی ضمانت لے لی۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں وہ پھر جنوبی بنگال کے راجشاہی ضلع میں بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے اور وہاں بھی اُن سے امن قائم رکھنے کے لئے مچلکہ لے لیا گیا۔ مگر اس جرم کا پھر اعادہ کرنے پر دو دفعہ ان کو اُس ضلع سے خارج کر دیا گیا۔ ۱۸۵۱ء میں یہی دونوں خلفاء[۵۴] امام صاحب کے جانشین باوجود کہ وہ مچلکہ اور ضمانت کی بنا پر جہاں تک کہ یہ کاغذی مچلکہ اور ضمانت ان کو پابند کر سکتے ہیں اپنے گھر پٹنہ میں رہنے کے لئے مجبور تھے۔ پھر بھی پنجاب کی سرحد پر بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے[۵۵]۔

۱۸۵۲ء کو اُنہوں نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آگیا ہے روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستیانا کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی۔ انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اُس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی۔ اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ اُن خطوط سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود

---

[۵۱] عنایت علی اور ولایت علی۔ [۵۲] مجسٹریٹ کے ریکارڈ ۱۳ اپریل ۱۸۴۷ء

[۵۳] غازی یا جہادی۔ ان کا نام وہابی بعد میں رکھا گیا تھا جس کی تشریح دوسرے باب میں آئے گی۔

[۵۴] مجسٹریٹ راجشاہی کی عدالت میں بیانات ۲۴ فروری ۱۸۵۰ء [۵۵] ریونیو بورڈ کی مثل ۱۲ مئی ۱۸۵۱ء

ہے۔ انہی دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے انگریزی صوبہ کے دارالخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی اعلانیہ تبلیغ کر رہے تھے۔ پولیس بھی ان ہی دیوانوں کی طرفداری کر رہی تھی اور اُن کے لیڈروں میں سے ایک نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اس غرض کے لئے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلہ کی کوئی مزید تفتیش ہوئی تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے۔

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا اُس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھیں بند نہ کر سکتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۲ء کے موسم خزاں میں اس موضوع پر دو[۱] اہم یادداشتیں تحریر کیں۔ پہلی یادداشت میں لارڈ موصوف نے یہ حکم فرمایا تھا کہ اندرون ملک میں اس نظام کی پورے طور پر نگرانی کی جائے۔ دوسری یادداشت میں سرحدی قبائل کے ساتھ ایک سرحدی جنگ کی موزونیت پر بحث کی گئی تھی۔ جن کی کافروں کے ساتھ توہم پرستانہ نفرت کو ہندوستانی دیوانوں نے ہوا دے کر خوب ہی بھڑکا دیا تھا اُسی سال انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امبہ کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط وکتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں اُن بے عزتیوں۔ حملوں اور قتل وغارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۷ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ ۱۶ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ پینتیس ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کا نمبر بیس تک پہنچ گیا تھا۔ اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثنا میں ستیانا کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا نہایت

---

[۱] ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء۔

عقلمندی سے ہماری فوج سے براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنا[1] ڈالی اور یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ انگریزی حاکموں سے بھی مطالبہ کرنے لگے کہ وہ بھی اُن کی تخویف مجرمانہ میں مدد کریں۔ ہمارے انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہوگئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹنٹ ہورن (LT HORN) کے کیمپ پر شبخون مارا۔ یہ وہاں کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے اب زیادہ دیر نہ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سر سڈنی کوٹن (SIR SIDNEY COTTON) پانچ ہزار فوج کی[2] معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہوگئے۔ چونکہ یہ جنگ اُن جنگوں میں سب سے پہلی تھی جو اس جنونی کیمپ کی وجہ سے ہمیں لڑنی پڑیں اس لئے میں اس کو یہیں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ اور دوسری لڑائی کو جو ۱۸۶۳ء میں ہوئی صرف بطور مثال پیش کروں گا۔ کسی قدر وقت کے بعد جنرل سر سڈنی کوٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُن کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار کر دیا۔ اور سیتانا کی باغی نوآبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ دہابن پہاڑیوں کی دشوار گزار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اُن کی قوت کو ذرا بھر بھی ضعف نہ پہنچا کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر ایک نوآبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

انگریزی حکومت کے علاوہ مجاہدین کے کیمپ کے اور بھی دشمن تھے۔ گاہے بگاہے انہوں نے اپنی دینی حمیت کی زیادتی کی وجہ سے اردگرد کے پہاڑی علاقہ سے بھی آمدنی کا عشر وصول کرنے کی کوشش کی۔ یہ ٹیکس مبلغ کے شخصی اقتدار کے مطابق جس کے سپرد ٹیکس جمع کرنے کا کام ہوتا تھا کبھی ادا کر دیا جاتا کبھی اس سے اغماض برتا جاتا اور کبھی بالکل ہی انکار کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح کوہستانی قبائل میں خلفشار کی حالت ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح وہ امام صاحب سے دل برداشتہ ہوگئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اُن سے علیحدگی اختیار

---

[1] خاص طور پر یوسف زئی اور پنج تار کے قبیلے۔

[2] توپ خانہ ۲۱۹ - سوار ۱۵۵ - پیدل ۴۱۵۷ کل ۴۸۸۷ باقاعدہ فوج۔

کی اور جس کی بنا پر آخر کار ۱۸۳۱ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔ جب کوئی قبیلہ عشر دینے سے انکار کر دیتا تھا تو مجاہدین سارے کے سارے اُس پر ہلّہ بول دیتے تھے اور انکار کرنے والوں کی فصلوں کو کاٹ کر غلّہ اٹھا لے جاتے تھے ۱۸۵۸ء میں قبیلوں نے اس مذہبی ٹیکس کی مخالفت کی بنا پر ستیانا پر حملہ کر کے اُس کے لیڈر کو قتل کر دیا تھا۔[1]

یہ باغی کیمپ سر سڈنی کوٹن کی مہم اور ان کے طرفداروں کی علیحدگی سے کمزور ہو گیا تھا اور اس وجہ سے دو سال تک بالکل خاموش رہا۔ ہم نے ستیانا کے علاقہ کو ہمسایہ قبیلہ کے سپرد کر دیا جس نے عشر دینے کی مخالفت کی تھی۔ اور مجاہدین کے امیر کو قتل کر دیا تھا۔ اس قبیلے اور ایک دوسرے طاقتور قبیلے[3] سے ہم نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقہ میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور وہ اُس تیسری قوم کی بھی مخالفت کریں گے جو اُن کو اس علاقہ میں لانے کے لئے اُن کی مدد و معاون ہوگی۔ نیز مجاہدین اور دوسرے شریر لوگوں کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے تاکہ وہ برطانوی علاقہ میں داخل ہو کر قتل و غارت برپا نہ کرنے پائیں۔

مگر ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ باغی نوآبادی نے از سر نو توہم پرست سرحدی قبائل میں پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں ملکا سے جو اُن کی پہاڑوں کے اندر جائے پناہ تھی مہابن پر حملہ کر دیا جہاں پر ۱۸۵۶ء میں سر سڈنی کوٹن نے اُن کو بھگا دیا تھا۔ اور عین ستیانا کی پرانی آبادی کے اوپر قلعہ بند ہو گئے[4]۔ اس مضبوط قلعے سے نکل کر وہ ہمارے گاؤں پر چھاپہ مارتے تھے اور اُن ہی قوموں نے جنہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے ان کو لوٹ مار کی غرض سے اپنے علاقہ سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس امر کا گویا بابانگ دہل اعلان کرنے کے لئے کہ پرانی حالت پھر قائم ہو گئی ہے مجاہدین راولپنڈی کے ضلع میں گھس آئے اور دن دہاڑے شاہراہ عام پر پولیس کی چوکی سے[5] تھوڑے ہی فاصلہ پر دو تاجروں کو

---

[1] سید عمر شاہ صاحب کو اتمان زئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔ [2] اتمان زئی۔ [3] جادون

[4] سری کے مقام پر۔ (Siri) [5] چودہ فروری ۱۸۶۱ء

قتل کر دیا اس کے تین ہفتہ بعد انہوں نے ہمارے علاقہ پر پھر چھاپہ مارا اور تین دولتمند آدمیوں کو اٹھا لے گئے اور بعد میں نہایت متانت کے ساتھ ہمارے افسروں سے خط و کتابت شروع کر دی جس میں ان قیدیوں کو آزاد کرنے کے لئے ایک ہزار پانچ سو پچاس (۱۵۵۰) روپے فدیہ طلب کیا گیا تھا۔ اس روپے کا نصف مجاہدین کے امیر کو ملنا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۸۶۱ء میں اغوا کی ایک اور واردات ہوئی سرحد کی حکومت نے رپورٹ دی کہ اپریل ۱۸۵۶ء کے شرمناک حالات پھر پیدا ہو گئے ہیں۔ انگریز افسروں نے اپنے حلیف قوموں کو اُن کے دین اور اُن کی تکالیف کا بے فائدہ واسطہ دیا۔ باوجودیکہ اُن کے بہت سے گاؤں ہمارے رحم و کرم پر تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے ہم مذہبوں ہی کا ساتھ دیا اور ہمارے پاس سوائے بدلے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ اس لئے ہم نے اِن قوموں کا محاصرہ کر لیا اور باقی دنیا سے ان کا تعلق منقطع کر دیا۔ اور ہر اُس شخص کو گرفتار کر لیا جس نے سرحد عبور کرنے کی کوشش کی۔ اِس سے اُن کی عقل ٹھکانے لگ گئی اور انہوں نے پھر ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا اور باغی آبادی کو ستیانا کے علاقہ سے مُلکا کی اندرونی وادیوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

تاہم ہماری بے وفا ہندوستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں اُن کی تعداد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک دوسری جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ حقیقتاً اب حالات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ وزیر ہند نے اپنے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ ان باغیوں کو جلد یا بدیر یہاں سے فوجی قوت کے ذریعہ نکال باہر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک یہ سرحد پر مقیم رہیں گے اس وقت تک یہ ہمارے لئے ہمیشہ ہی خطرہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

بہرحال اُس وقت مہم کا روانہ کرنا ناممکن تھا۔ اپریل ۱۸۶۳ء کے اوائل میں انہوں نے ہمارے علاقے میں پھر قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا اسی سال ماہ جولائی میں وہ نہایت دلیری کے ساتھ ستیانا کے علاقہ پر پھر قابض ہو گئے اور ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب کو تہدید آمیز

خطوط لکھے۔ اُن کی ہمسایہ اقوام نے ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کو اپنے تعصب پر قربان کر دیا اور اُن مواعید کو جو ہمارے ساتھ کئے گئے تھے بالکل فراموش کر دیا۔ اس باغی آبادی کو سرحد پر ایک دفعہ پھر حاکمانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو برطانوی علاقہ پر چڑھ دوڑے اور ہماری طلایہ گرد فوج کے کیمپ پر شبخون مار کر گویا قائدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر بھی حملہ کر دیا اور کوہ سیاہ پر ان کے دیہات کو جلا دیا اور سرحدی چوکیوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ اسی مہینے میں انہوں نے تناول کی حلیف تحصیلوں پر بھی چھاپا مارا اور ایک ملکی افسر کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ قتل کر ڈالا۔

پھر ہمارے دوستوں پر ہی حملہ کرنے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے انہوں نے دریائے سندھ کے کنارے ہماری چوکیوں پر بھی حملہ کر دیا۔ اور انگریز کافروں کے خلاف ایک باقاعدہ اعلان جنگ شائع کیا اور ہر دیندار مسلمان کو اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔

اب ہم تقریباً انہیں حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۷ء و ۱۸۳۰ء کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور جس کے نتیجہ پر اس متعصب لشکر نے پنجاب پر اپنا تصرف جما لیا تھا یہاں تک کہ سرحدی دارالخلافہ ان کے قبضہ میں آگیا۔ اب جنگ سے گریز کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا لیکن سرحدی لڑائیوں سے کوئی فوجی سبق حاصل نہیں ہوتا اور نہ کسی طاقتور سلطنت کی عزت میں کوئی نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی جنگ کے نتیجہ میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جو برطانوی ہندوستان جیسی فوجی طاقت اور غیر مہذب اقوام کے اتحادیوں کے درمیان ہو خواہ وہ کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں اور اُن میں دینی حرارت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ مزید براں ان لڑائیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور بے شک ان کا انجام ایک سخت انتقام کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جو ایک سنجیدہ انسان کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن ہوگا۔ اس متعصب نو آبادی کے خلاف اُن چار مہموں میں سے ایک مہم کو بہ تفصیل بیان کرنے کے لئے منتخب کر لوں گا۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح باغی کیمپ امن کے زمانہ میں ہماری سرحد پر ہمارے لئے باعث توہین تھا اُس سے کہیں زیادہ جنگ

کے زمانہ میں ہماری فوج کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ جب تک ہم نے اُن سے بازپرس نہ کی وہ ہمارے دوستوں اور ہماری رعایا کو قتل اور اغوا کرنے کے لئے گروہ پر گروہ بھیجتے رہے اور جب ہم نے اُن کو فوجی قوت کے ساتھ صفحہ ہستی سے نابود کر دینا چاہا تو انہوں نے ہمارے افسروں کو دھوکے میں رکھا اور ہماری فوج کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور کچھ عرصہ تک سالے برطانوی ہندوستان کی سرحدی فوج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔

اس سے یہ سمجھ لینا نہایت آسان ہوگا کہ کس طرح باغیوں اور پناہ گزینوں کی آبادی نے جس کے پشت پناہ ہماری ہی سلطنت کے سازشی اور متعصب لوگ تھے نفرت و حقارت سے مغلوب ہو کر خود ہم کو ہی کھلم کھلا چیلنج دے دیا تھا لیکن اس بات کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کس طرح ایک منظم فوج کی قوت اور جنگی قابلیت کا مقابلہ کر سکتے تھے خواہ وہ تھوڑے ہی وقت کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُس ملک کے مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں جس میں اُن کے امام صاحب نے اس جنگجو جماعت کا مرکز قائم کیا تھا۔

وادی سندھ کے عین شمال میں اُس سرحدی قبیلے کی حد پر جو برطانوی تاج کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے ہیں کوہ ہند کی مقدس پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن آریاؤں پر جنہوں نے پہلے پہل جنوب کی طرف سفر اختیار کیا تھا مہابن جس کا ترجمہ ہے بہت بڑا جنگل، کے سوائے اور کسی قدرتی رکاوٹ نے اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑ کا نام بھی یہ ہی تجویز کیا تھا۔ اور اُن تمام جنگلوں اور پہاڑوں کو جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ۰۰۰ء۷ فٹ کی بلندی تک چلے جاتے ہیں اب تک مہابن یعنی بہت بڑا جنگل ہی کہا جاتا ہے۔ اُس قوم کے نزدیک ان پہاڑوں کو وہی حیثیت حاصل تھی جو یہودیوں کے نزدیک وادی سینا کو حاصل ہے۔ اور سنسکرت کے گیتوں سے ابتدائی ایام کی اس پرستش کو بقائے دوام حاصل ہوگیا ہے۔ مدت مدید تک مہابن ہندوؤں کے لئے مہابن تیرتھ بنا رہا۔ یہی وہ متبرک پہاڑیاں تھیں جن پر ارجن نے تن تنہا ایک بہت بڑے دیوتا سے جنگ کی تھی[ا]۔ اور اگرچہ زمانہ قدیم کے حضرت یعقوبؑ کی طرح شکست کھائی تھی لیکن اُس

[ا] مہادیو۔

دیوتا سے ایک ایسا ہتھیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ زمانہ قدیم میں وہ سنیاسی بہت ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا جو ان پہاڑیوں کے تلے جان دے دیتا تھا۔ اور جیسا کہ قدیم روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ معمولی معمولی دیوتاؤں کو بھی یہاں پر برت رکھنے اور ریاضت کرنی پڑتی تھی تاکہ تزکیہ باطنی کر کے روحانی ترقی حاصل کر سکیں[۱]۔

قدیم ہندوؤں کے اس مقدس علاقہ میں اب توہم پرست مسلمان قبائل آباد ہو گئے ہیں۔ کوہ سیاہ پر دریائے سندھ کے مشرق کی طرف بھی ایسی ہی متشدد اور متعصب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ اور ایبٹ آباد کی سرحدی انگریزی چوکی کو ہر وقت ان کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ آمدنی کا عشر اور دیگر مذہبی چندے ایسے امور میں جو اس متعصب آبادی کے ساتھ دیگر اقوام کا میل یا اتحاد پیدا کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان قبائل میں مذہبی جوش کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ اور ہماری سرحد کے اندر ہندوؤں کے دولت مند دیہات کو لوٹنے کا موقعہ ان کے لئے ہمیشہ بڑی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ صرف سوات ہی کی مذہبی ریاست میں ۹۶۰۰۰ ہزار کی آبادی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ذہن میں پشتہا پشت سے انگریزی حملہ کے خطرات ڈالے جا رہے ہیں۔ اور یہ ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ اگر ان کو کافروں سے لڑنا ہی پڑے تو بہتر ہے کہ ایک مذہبی لیڈر کے جھنڈے تلے لڑا جائے تاکہ وہ لوگ جو میدانِ جنگ میں کام آئیں شہادت کا درجہ پائیں۔

۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے ۰۰۰،۵۳ ہزار[۲] جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ ملک

---

[۱] اس میں میں نے اپنے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے جو میں نے سات سال پہلے کلکتہ کوارٹرلی ریویو میں لکھا تھا۔

[۲] میں یہاں پر علیحدہ علیحدہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ایک قبیلہ بغیر کسی تکلیف کتنے آدمی میدان جنگ میں لا سکتا ہے حسین زئی ۲۰۰۰ اکازئی ۱۰۰۰ و منگازئی ۷۰۰ و مدک خیل ۴۰۰۰۔ آمازئی ۱۵۰۰۔ جادون ۴۰۰۰۔ خداخیل ۲۰۰۰۔ بنیری ۱۲۰۰۰ باجوڑ ۴۰۰۰۔ رانی زئی ۲۰۰۰۔ دیر قبیلہ ۶۰۰۰۔ سوات کے قبیلے ۱۰۰۰۰۔ مجموعہ ۵۳۵۰۰۔ یہ اعداد و شمار (باقی اگلے صفحہ پر)

کے دشوار گزار ہونے کی وجہ سے ہمارے سرحدی افسر قبائل کے مزاج اور اُن کے آپس کے تعلقات کے متعلق اکثر متذبذب رہتے ہیں اور جب کبھی ان باغیوں کو شکست ہوتی ہے تو وہ صرف پہاڑوں کے اندر دشوار گزار دروں میں چلے جاتے ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ۶۰۰۰[۵۱] ہزار برطانوی فوج نے سر نیول چیمبرلین کی سرکردگی میں کوچ کیا[۵۲]۔ اُن کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا۔ اور ۴ ہزار خچر اور باربرداری کے دیگر جانور رسد کو جمع کرنے کے لئے پنجاب کا کونہ کونہ چھان مارا تھا اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرے دن شام کو ایک کالم تمام رات کوچ کرتا ہوا ایک ایسی گھاٹی پر جا پہنچا جس پر بہت سی جھاڑیاں تھیں اور بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور جو زیادہ تکلیف دہ طور پر درہ امبیلہ کے نام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) میں نے دفتر خارجہ سے حاصل کئے ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکا کرنل میکریگر (MACRAGOR) سے اصلاح کرا لی ہے۔ جو اس وقت فرنٹیر گیزیٹیر میں مشغول ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں ایک موقع پر ہمارے خلاف ان جنگجوؤں کی تعداد ۶۰۰۰ ہزار ہوگئی تھی۔

[۵۱] باقاعدہ پیدل فوج ۵۱۵۰ باقاعدہ سوار ۲۰۰ توپ خانہ ۲۸۰ ۔ ۱۰۰۰ سے زیادہ بے قاعدہ فوج جو سول کمشنر کے ماتحت تھی اور ۱۳ توپیں

[۵۲] دربند کے مقام پر ۲۵۰ یورپین پیدل فوج۔ ۲۵۰۰ ہندوستانی پیدل۔ اور ۳ توپیں۔ توبیلا کے مقام پر۔ ہندوستانی سواروں کا ایک سکوارڈرن۔ اور مختلف ہندوستانی فوج۔ ٹوپی کے مقام پر ۱۵۰ ہندوستانی سوار۔ ۲۵۰ پیادے اور ۲ توپیں۔ ایبٹ آباد میں ہائی لینڈرز کی ایک کمپنی۔ ۵ گورکھا اور ایک پنجابی پیادہ فوج کا صدر مقام۔ ۵۰ ہندوستانی سوار۔ اور ۳ توپیں۔ رستم بازار میں ۴۰۰ ہندوستانی سوار مختلف ہندوستانی پیادے اور مردان گائیڈ کور کا صدر مقام۔ پشاور کے مقام پر مختلف توپخانہ کے علاوہ ہسار کی ایک رجمنٹ، ایک یورپین پیادوں کی ایک رجمنٹ۔ بنگالی سواروں کی ۲ رجمنٹ اور ہندوستانی پیادوں کی ۳ رجمنٹ موجود تھیں۔ اخیر میں بیان کردہ رجمنٹ میں کار آمد اشخاص بہت کم تھے۔ اور اُن کا کام یہ تھا کہ سرحد چوکیوں پر قابض رہیں اور اس کے لئے ایک رجمنٹ ضروری تھی۔ راولپنڈی کے مقام پر ہندوستانی پیادوں کی ایک رجمنٹ تھی جن میں ۱۲ آدمی مارے گئے۔ توپخانہ کی ایک بیٹری ۹۳ ہائی لینڈرز کی ایک کمپنی اور ۱۵ اور ۱۰۱ کا صدر مقام کوہاٹ میں ۲ توپیں۔ ہندوستانی سواروں کے ۲ سکواڈرن۔ پنجابی پیادوں کی ایک رجمنٹ مگر کمزور تھی۔ بنوں میں ۲ توپیں ایک پنجابی سواروں کی رجمنٹ اور ایک پنجابی پیادوں کی رجمنٹ موجود تھی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ۲ توپیں ایک پنجابی سواروں کی رجمنٹ اور ایک پنجابی پیادوں کی رجمنٹ تھی۔

مشہور ہے۔ ہمارے جنگی مرکز[1] کی حفاظت کے لئے کافی فوج موجود رہتی تھی۔ اور اس کے پیچھے سرحدی مقامات میں بھی طاقتور مورچہ بندی کی گئی تھی جس میں پیادہ اور سوار فوج اور کافی توپخانہ موجود تھا۔ یہ کچھ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ حملہ آور فوج کی پشت پر اتنی امداد موجود تھی کیونکہ ۲۰ تاریخ کو جرنیل کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ قبائل جن کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا اب مذبذب حالت میں ہیں۔ اور اس کے دو ہی دن بعد اس نے گورنمنٹ کو تار دے دیا تھا کہ فوج کو مجبوراً رکنا پڑا ہے۔ ۲۳ تاریخ کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا اور بونیر والوں نے ہماری طلایہ گرد پارٹی پر حملہ کر دیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سوات کا روحانی پیشوا بھی ہمارے دشمنوں کے ساتھ جا ملا۔ اس اثنا میں گورنمنٹ کو سرحد پر سے تار پر تار چلے آتے رہے۔ جن میں مزید اور مزید بر مزید فوج بھیجنے کی التجا کی جاتی تھی۔ فیروز پور رجمنٹ کے ایک حصہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا گیا اور ایک اور رجمنٹ کو پشاور سے مغرب کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا۔ ۹۳ ہائی لینڈر سیالکوٹ سے اور ۲۳ اور ۲۴ ہندوستانی پیدل فوج لاہور سے یلغار کرتی ہوئی آگے بڑھی ابھی تین ہفتے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ پنجاب کے قلعے یہاں تک خالی ہو گئے کہ بہا نیر کے کمانڈر افسر کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ پنجاب کے گورنر کے لئے ۲۴ فوجیوں کی گارد کا انتظام کر سکے۔

اس اثنا میں قبائلی لشکر ہماری قلیل فوج کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اب آگے بڑھنا تو بالکل ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست کھا جانے سے بھی بدتر۔ ہماری اس حالت نے قبائلی لشکر کو جس کے افراد بچپن سے ہی پہاڑی جنگوں میں ماہر ہو جاتے تھے۔ بہت ہی فائدہ میں رکھا اور ایک افسر کی یادداشت سے مندرجہ ذیل اقتباس بخوبی ظاہر کر دے گا کہ ہماری فوج کیسے کیسے خطرات سے گھری ہوئی تھی۔

"۲۰ تاریخ کو ہم اپنے بکھرے ہوئے گروہ کو بلا کر واپس ہوئے۔ اور کیمپ پہنچنے تک برابر لڑتے رہے جہاں ہم کافی رات گئے پہنچے۔ دشمن کافی تعداد میں تھے۔ انہوں نے ہماری صفوں کو چیرنے کی بھی کوشش کی۔

---

[1] عبدالغفور ایک درویش صفت آدمی ہے جس نے یوسف زئی قبیلہ پر توہم پرستانہ اور حیرت انگیز اثر جما رکھا ہے۔ اور تمام پٹھان قبیلے اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

گیا۔ اور ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھی بھیج دی گئی تاکہ ہمارے سلسلۂ آمد و رفت کی حفاظت ہو سکے جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ باربرداری کے سامان کے لیے ۴۰۰ اونٹ اور ۲۱۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کرکے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے تھے۔[۵]

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکامیاب ہو چکی تھیں۔ اصلی خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اس سے آگے کھلے میدان پر قبضہ کر لیا جائے۔[۶] امپیریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ نومبر تک ختم ہو جانا چاہیئے مگر ۱۸ نومبر کو یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں چند لڑائیاں لڑی جاتیں جہاں پر موجودہ مہذبانہ لڑائی کے تمام آلات کام میں لائے جا سکتے تھے ہمیں ہر اس چوکی کی حفاظت کرنی پڑی جو ہم آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کرتے تھے۔ اُسی دن پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک امدادی بریگیڈ سرحد پر روانہ کر دیا جائے کیونکہ جرنیل چیمبرلین کی ۱۹ تاریخ والی تار سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں کمک ضرورت کے وقت سے بہت بعد نہ پہنچے۔

۱۸ تاریخ کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہو گئے اور افسروں کے علاوہ ۱۱۴ آدمیوں کو زخمی یا قتل کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا۔ جو بعد میں ایک خونریز جنگ کے بعد دوبارہ حاصل کر لی گئی۔ جس میں ہمارے جرنیل صاحب بھی شدید طور پر زخمی ہوئے اور افسروں کے علاوہ ۱۲۵ آدمی میدان جنگ میں کام آئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔ ۲۰ تاریخ کو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیج دینا ضروری سمجھا گیا تھا جن کی کل تعداد اب ۴۱۵ ہو گئی تھی۔ جرنیل صاحب نے جو تار ۱۹ تاریخ کو دیا تھا اُس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ فوجیوں کو ایک مہینے تک دن رات بہت سخت کام کرنا پڑا ہے اور تازہ دم دشمنوں کا مقابلہ ایسے نقصان کے ساتھ کرنا بڑا حوصلہ شکن ہے۔ یہاں کمک کی سخت ضرورت ہے۔ میرے لئے دشمن کا مقابلہ کرنا۔ خوراک بہم پہنچانے کے لیے آدمی مہیا کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے اگر آپ تازہ دم

۵؎ پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ ۱۰ فروری ۱۸۶۴ء پیرا نمبر ۶۔ ۶؎ پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ یکم فروری ۱۸۶۴ء پیرا نمبر ۸۔ ۷؎ یہی ایک دستاویز ہے جس کو میں نے اس مہم کے بیان کرنے میں بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ میں یہ قطعاً امید نہیں کر سکتا کہ اس قدر تباہ کن مہم مخالفانہ تنقید سے بچ جائے گی مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ نہایت احتیاط سے ٹھیک کی ہوئی سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہے۔

فوج کے دستے اُن دستوں کی جگہ جو تعداد اور جوش و خروش میں بہت کم ہو گئے ہیں بھیج سکیں تو ان فارغ شدہ دستوں کو میدانوں میں بھیجا جا سکتا ہے تاکہ اُن سے حفاظت کا کام لیا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے +

اب ایک بہت بڑی سیاسی مصیبت کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا عین ممکن تھا کہ ہماری فوج میں جو ہر روز کے حملوں سے اکتا چکی تھی خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی اور وہ بہت سی قتل و خونریزی کے ساتھ نہایت ابتر حالت میں اس درے سے نکال باہر کی جاتی مگر ایسی شکست گو اس میں اتنی جانیں تلف نہ ہوتیں جتنی کہ ایک بڑی جنگ میں ہوتی ہیں۔ سرحد پر ہماری طاقت کو بالکل تباہ کر دیتی۔ اور اس کے ساتھ جو سیاسی مصیبتیں نازل ہوتیں اُن کی حد کے متعلق کسی قسم کی پیشگوئی کرنا ممکن نہ تھا اس بنا پر پنجاب گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر جرنیل چیمبرلین یہ مناسب سمجھے تو تمام فوج کو پرمولی کے مقام پر واپس لے آئے۔ مگر پنجاب کے حاکموں کی احتیاط پسندی نے برطانوی فوج کی پامردی و استقلال کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ۲۲ تاریخ کو تار آیا جس میں لکھا تھا کہ ہماری فوج نے موجودہ جگہ پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور باوجودیکہ دشواریاں بہت تھیں لیکن پھر بھی ہمارے جرنیل کا خیال تھا کہ آخر کار فتح ہماری ہی ہوگی۔

دوسرے دن ۲۲ دیسی پیدل فوج بمع چند یورپینوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ دشمن اپنی تمام طاقتیں پہلے ہی صرف کر چکے تھے۔ اب ہماری تازہ دم فوج کے پہنچنے سے قبائل پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اب وہ اس بات کو سمجھنے لگے کہ ایک وسیع فوجی سلطنت کے لامتناہی ذرائع سے جنگ کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں اور دوسرے ہی جمعہ کو (یہ ہفتہ کا وہ دن ہے جس دن مجاہدین عام طور پر حملہ آور ہوتے ہیں) کوئی حملہ نہ ہوا لیکن پھر بھی ہم آگے بڑھنے کے قابل نہ ہوئے اور ۲۸ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے بے فائدہ ایک یادداشت لکھی جس میں فوجوں کا ایک ہی جگہ جم جانے پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور آگے بڑھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ جونہی ہماری کمک پہنچی کوہستانوں سے تازہ دم قبائل بھی آ موجود ہوئے۔ صرف ایک سردار[1] ۳۰۰۰ آدمی اپنے ہمراہ لایا اور ایک دوسرے رولیش[2] نے ۵۰۰ مجاہدین بھیجے جو یہ عہد کر کے آئے تھے کہ یا تو وہ غازی کہلائیں گے اور یا شہید۔

۵ دسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی اور آگے بڑھنے کی پُر زور تاکید کی گئی تھی۔ اب ہمارے پاس نو ہزار باقاعدہ فوج تھی جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں جیسے کہ ۹۳ ہائی لینڈز اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ اور بظاہر یہ ناقابل تسلیم امر تھا کہ طاقتور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ہی ایک درہ میں دبکی بیٹھی رہے گی۔ اور دشمن اُس کو اپنے حملوں سے تنگ کیا کریں گے

---

[1] نصیحت لال خاں آف باجور۔ [2] حاجی آف گنہار۔

گیا۔ اور ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھی بھیج دی گئی تاکہ ہمارے سلسلہ امدرفت کی حفاظت ہو سکے جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ باربرداری کے سامان کے لئے ۲۰۰ اونٹ اور ۲۱۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کرکے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے تھے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکامیاب ہو چکی تھیں۔ اصلی خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اس سے آگے کھلے میدان پر قبضہ کر لیا جائے۔[۲] امپیریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ نومبر تک ختم ہو جانا چاہیئے مگر ۱۴ نومبر کو یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں چند لڑائیاں لڑی جاتیں جہاں پر موجودہ مہذبانہ لڑائی کے تمام آلات کام میں لائے جا سکتے تھے ہمیں ہر اس چوکی کی حفاظت کرنی پڑی جو ہم آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کرتے تھے۔ اسی دن پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک امیر بریگیڈ سرحد پر روانہ کر دیا جائے کیونکہ جنرل چیمبرلین کی ۱۹ تاریخ والی تار سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں کمک ضرورت کے وقت سے بہت بعد نہ پہنچے۔

۱۸ تاریخ کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہو گئے اور افسروں کے علاوہ ۱۱۴ آدمیوں کو زخمی یا قتل کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا۔ جو بعد میں ایک خونریز جنگ کے بعد دوبارہ حاصل کر لی گئی جس میں ہمارے جرنیل صاحب بھی شدید طور پر زخمی ہوئے اور افسروں کے علاوہ ۱۲۵ آدمی میدان جنگ میں کام آئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔ ۲۰ تاریخ کو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیج دینا ضروری سمجھا گیا تھا جن کی کل تعداد اب ۴۲۵ ہو گئی تھی جرنیل صاحب جو تار ۱۹ تاریخ کو دیا تھا اس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ فوجیوں کو ایک مہینے تک دن رات بہت سخت کام کرنا پڑا ہے اور تازہ دم دشمنوں کا مقابلہ ایسے نقصان کے ساتھ کرنا بڑا حوصلہ شکن ہے۔ ہمیں کمک کی سخت ضرورت ہے۔ میرے لئے دشمن کا مقابلہ کرنا۔ خوراک بہم پہنچانے کے لئے آدمی مہیا کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے اگر آپ تازہ دم

---

[۱] پنجاب گورنمنٹ کا خط نمبری ۱۰ فروری ۱۸۶۴ء پیرا نمبر ۶۔ [۲] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ یکم فروری ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۷۔ یہ ہی ایک کتاب ہے جس کو میں نے اس مہم کے بیان کرنے میں بہت زیادہ استعمال کیا ہے میں یہ قطعاً امید نہیں کر سکتا کہ مستقر رہ کر ہم مخالفانہ تنقید سے بچ جائے گی مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ نہایت احتیاط سے ٹھیک کی ہوئی سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہے۔

فوج کے دستے اُن دستوں کی جگہ جو تعداد اور جوش و خروش میں بہت کم ہو گئے ہیں بھیج سکیں تو ان فارغ شدہ دستوں کو میدانوں میں بھیجا جا سکتا ہے تاکہ اُن سے حفاظت کا کام لیا جائے ۔ یہ بہت ضروری ہے +

اب ایک بہت بڑی سیاسی مصیبت کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا عین ممکن تھا کہ ہماری فوج میں جو ہر روز کے حملوں سے اُکتا چکی تھی خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی اور وہ بہت سی قتل و خونریزی کے ساتھ نہایت ابتر حالت میں اس درے سے نکال باہر کی جاتی مگر ایسی شکست گو اس میں اتنی جانیں تلف نہ ہوتیں جتنی کہ ایک بڑی جنگ میں ہوتی ہیں ۔ سرحد پر ہماری طاقت کو بالکل تباہ کر دیتی ۔ اور اس کے ساتھ جو سیاسی مصیبتیں نازل ہوتیں اُن کی حد کے متعلق کسی قسم کی پیشگوئی کرنا ممکن نہ تھا اس بنا پر پنجاب گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر جرنیل چیمبرلین یہ مناسب سمجھے تو تمام فوج کو پرمولی کے مقام پر واپس لے آئے ۔ مگر پنجاب کے حاکموں کی احتیاط پسندی نے برطانوی فوج کی پامردی و استقلال کا غلط اندازہ لگایا تھا ۔ ۲۲ تاریخ کو تار آیا جس میں لکھا تھا کہ ہماری فوج نے موجودہ جگہ پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور باوجودیکہ دشواریاں بہت تھیں لیکن پھر بھی ہمارے جرنیل کا خیال تھا کہ آخر کار فتح ہماری ہی ہو گی ۔

دوسرے دن ۲۳ دیسی پیدل فوج مع چند پلٹنوں کے کیمپ میں پہنچ گئی ۔ دشمن اپنی تمام طاقتیں پہلے ہی صرف کر رہے تھے ، اب ہماری تازہ دم فوج کے پہنچنے سے قبائل پر خوف و ہراس چھا گیا ۔ اب وہ اس بات کو سمجھنے لگے کہ ایک وسیع فوجی سلطنت کے لامتناہی ذرائع سے جنگ کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں اور دوسرے ہی جمعہ کو (یہ ہفتہ کا وہ دن ہے جس دن مجاہدین عام طور پر حملہ آور ہوتے ہیں) کوئی حملہ نہ ہوا ۔ لیکن پھر بھی ہم آگے بڑھنے کے قابل نہ ہو گئے اور ۲۸ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے بے فائدہ ایک یادداشت لکھی جس میں فوجوں کا ایک ہی جگہ جم جانے پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور آگے بڑھنے کی تاکید کی گئی تھی ۔ جونہی ہماری کمک پہنچی کوہستانوں سے تازہ دم قبائل بھی آ موجود ہوئے ۔ صرف ایک سردار ۳۰۰۰[۱] آدمی اپنے ہمراہ لایا اور ایک درویش[۲] نے ۵۰۰ مجاہدین بھیجے جو یہ عہد کر کے آئے تھے کہ یا تو وہ غازی کہلائیں گے اور یا شہید ۔

۵ دسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی اور آگے بڑھنے کی پُرزور تاکید کی گئی تھی ۔ اب ہمارے پاس نو ہزار باقاعدہ فوج تھی جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں جیسے کہ ۹۳ ہائی لینڈز اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی ۔ اور بظاہر یہ ناقابل تسلیم امر تھا کہ طاقتور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ہی ایک درہ میں دبکی بیٹھی رہے گی ۔ اور دشمن اُس کو اپنے حملوں سے تنگ کیا کریں گے

[۱] نصیحت لال خاں آف باجوڑ ۔ [۲] حاجی آف گنہار ۔

اور وہ اس قابل نہ ہو سکے گی کہ اُن کو ہرا دے سکے۔ مگر مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا ہم نے اُس کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ لوگ جو ان کے ساتھ مذہب کی بنا پر شامل ہوئے تھے وہ فتح یا شہادت کی امید پر انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور وہ قبائل جو ذرا کم متعصب تھے اُن کو اس خدشہ کو کام میں لا کر اُکسایا گیا تھا کہ اُن کے علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا اُن کا علاقہ میدانِ جنگ بنایا گیا ہے۔ اس طرح شوق اور رقابت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگا دی تھی اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک چشمدید گواہ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں سرحد کی حالت یوں بیان کرتا ہے۔ جوش و خروش دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پشاور کی سرحد پر ہمہند لارڈ کلائیڈ (Clyde) آنجہانی کے ہاتھوں ۱۸۵۲ء میں شب قدر کے مقام پر شکست کھانے کے بعد اسی مقام پر پہلی دفعہ مخالفانہ مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوہاٹ سے وزیریوں اور اتمان خیل کے چھاپوں کی افواہیں بھی مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ کابل اور جلال آباد کے ایلچی بھی اخوند صاحب (سوات کے روحانی پیشوا) کے ساتھ تھے اور مزید برآں اُن کو غازیان خان نواب پر اور ۲۰۰۰ آدمیوں کی کمک بھی پہنچ چکی تھی۔ ۵ دسمبر کو ہمندوں نے شب قدر کے نزدیک ہمارے علاقہ پر چھاپہ مارا۔

کوہستانی قبائل کا اتحاد عام طور پر ناپائدار ہوتا ہے جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) نے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ۲۷ نومبر کو پشاور کا کمشنر[1] بونیر کے بعض قبائل کو اتحاد سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور گروہ کو جس کی تعداد ۲۰۰۰ تھی اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ اور سوات کے پیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ ۱۵ دسمبر کو یہ بے اعتمادی اپنا پھل لانے ہی والی تھی۔ بونیر قبائل کا ایک بڑا جرگہ اچانک کمشنر کے پاس آیا مگر شرائط طے نہ ہو سکیں۔ ۱۵ تاریخ کو ہم نے اُن کو جلد فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے کے لئے لالو پر شبخون مارا اور اُن کے چار سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ ۱۶ تاریخ کو ہم نے امبیلا کے گاؤں کو جلا دیا اور قبائل کے دو سو آدمی میدان جنگ میں ہلاک یا مجروح ہوئے۔ پندرہ دن سے پہلے ہی بونیر کے قبائل نے فیصلہ کر لیا اور کمشنر کے پاس حاضر ہو کر احکامات کے صادر ہونے کی درخواست کی۔ یہ علیحدگی مجاہدین کی امیدوں کے لئے موت کا حکم رکھتی تھی۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی قبیلہ علیحدہ ہو جاتا تھا۔ دیر اور باجوڑ کے لوگ بھاگ گئے۔ سوات کے فوجی علیحدہ ہو جانے کے لئے ہر وقت پا بہ رکاب بیٹھے تھے۔ یہ اتحاد کوہستانی کہر کی طرح فوراً دور

---

[1] میجر جیمز۔ پشاور ڈویژن کا کمشنر۔

ہو گیا اور بونیر کے قبائل نے جن پر مجاہدین کا بہت کچھ انحصار تھا ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ اُن کو اُن کی رہائشی غاروں میں ہی جلا دیا جائے گا اور ہفتہ کے اندر اندر انگریزی فوج کا ایک دستہ بونیریوں کی کمک اور رہنمائی میں پوری سلامتی کے ساتھ پہاڑوں میں سے گزرتا ہوا مجاہدین کی آبادی ملکا تک پہنچ گیا اور اس کو جلا کر راکھ کر دیا ۲۲ر دسمبر کو یہ بدقسمت فوج درہ امبیلا میں واپس آ گئی اور ۲۵ر دسمبر کو تمام کی تمام فوج میدانوں میں آ گئی اور گھر کو واپس آتے ہوئے اُن پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔

بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا ہے تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں ہمارا نقصان جان ۸۴۷ ہلاک و مجروح تک پہنچ گیا تھا۔ یعنی تمام فوج کا دسواں حصہ جو ایک وقت میں مجموعی طور پر نو ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نقصان صرف درہ میں ہوا تھا اور اس کا اُن لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا جو سردی لگ جانے سے بیمار ہو گئے یا کسی بیماری کی وجہ سے مر گئے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی تھی اور یہ کہ ان مجاہدین نے قبائل کا ایک خطرناک اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اس اتحاد میں اُن کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی۔ اور یہ کہ مجاہدین بے ضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں اور یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں اور یہ جو جہاد کا وعظ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے تمام سرحدی قبائل یہ ہی وطیرہ اختیار کر لیں۔ اس بحران کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت ہندوستانی سلطنت کے سر پر کوئی ذمہ دار حاکم موجود نہ تھا۔ وائسرائے لارڈ ایلجن LORD ELGIN ایک پہاڑی مقام پر بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ اور تار کے ذریعے اُن تک خبر رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور وہ کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ باوجودیکہ اس مہم میں ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس نے چار سال کے لئے سرحد کو بالکل خاموش کر دیا نصف کے قریب مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور باقی ماندہ مجاہدین کو قبائل اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اس لئے کہ اُن کے پہاڑوں کی وادیوں میں یہی لوگ جنگ کا باعث ہوتے تھے۔ ان غداروں کے سرداروں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر مامون پایا کہ [۱۸۶۶] ۱۸۶۶ء میں اُن میں سے دو نے براہ راست ہمارے افسروں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی ان کوششوں کو ایک تیسرے سردار[۱] نے ضائع کر دیا جس نے بار دیگر اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا[۲] بہر حال وہ ۱۸۶۶ء کے اخیر تک اپنے اندرونی جھگڑوں

۱ مولوی عبداللہ۔ ۲ محمد اسحاق و محمد یعقوب نے سید محمود کی وساطت سے جو پہلے ہماری ملازمت میں تھا کوشش کی تھی۔

میں اس قدر مشغول ہے کہ وہ ہمارے علاقوں میں تاخت و تاراج کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر فروری ۱۸۶۸ء میں وہ سات سو جنگجوؤں کا ایک جتھا بنا کر نکلے تا کہ مختلف قبائل میں اتحاد پیدا کرنے کی بنیاد رکھیں لیکن اُس سزا کی یاد نے جو ہم نے ۱۸۶۳ء میں اُن کو دی تھی اُن کے اِس کام کو بہت مشکل بنا دیا لیکن آہستہ آہستہ قبائل کا وہی تعصب اُن کی عقل پر غالب آ گیا انہوں نے اگرور کی وادی میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ اُس وقت گورنمنٹ نے لکھا تھا کہ اگر اِس کے متعلق ہم جلد کارروائی نہ کرتے تو ہمیں پھر ایک دفعہ بہت بڑے قبائلی اتحاد سے دوچار ہونا پڑتا۔ بہرحال انگریزی حکومت نے اِس دفعہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے گا۔ ۸ ستمبر کو حکومت عالیہ نے قبائل کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجنے کی اجازت دے دی اور ۳۰ اکتوبر کو ہماری فوج نے کمانڈر اعظم کی رہنمائی میں کوچ کیا جو جنرل وائلڈ C.B (Wild) کی ماتحتی میں تھی۔ اِس کے ساتھ ہی ہم نے ایک اعلان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ کس طرح بعض قبائل جن کو ہم نے کسی طرح تنگ نہیں کیا تھا۔ اور اُن کے علاقہ میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقہ میں آ گھسے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا تھا اور اب ان کو سزا دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ لہٰذا انگریزی حکومت جس کو بہت پریشان کیا جا چکا ہے اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اِس کا جواب دیں۔

میں یہاں پر اس مہم کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ جولائی کے مہینے ہی میں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ضروری برقی پیغامات موصول ہوئے تھے جن میں شورش برپا ہونے کی اطلاعات دی گئیں تھیں۔ جیسا کہ فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل[1] نے لکھا تھا "کہ تنبیہ اس قدر ضروری تھی اور مدد کے لئے التجا اس قدر اہم تھی اور حقیقتاً" ہماری فوج کا ایک دستہ باغیوں کے محاصرہ میں تھا کہ حکومت ہند نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تباہی نے سبق سکھا دیا تھا کمانڈر اعظم نے پنجاب کی فوجی چھاؤنیوں کو کمزور کرنے یا سرحدی چوکیوں سے فوجی دستے منگوانے کے بجائے شمال مغربی صوبوں سے رجمنٹیں منگوائی تھیں۔ لڑائی لڑنے والا دستہ چھ ہزار سے سات ہزار باقاعدہ

---

[1] گورنمنٹ کے ملٹری محکمہ کے سیکرٹری کو خط نمبر ۴۴۳ مجریہ ۵ نومبر ۱۸۶۸ء پیرا (۴)

فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ باقی سرحد کی تمام فوج دُگنی کر دی گئی تھی۔ اور ہندوستان میں انگریزی فوج کے منتخب شدہ سپاہی مجاہدین کے مقابلہ میں جمع کر دیئے گئے تھے[1]۔ اگست اور ستمبر کی چلچلاتی دھوپ میں ہمارے سپاہی ایسی یلغار کر رہے تھے جس کی مثال خوشگوار اور معتدل آب و ہوا میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مثلاً سرنگ لگانے والے اور خندق کھودنے والوں نے ۲۹ دن میں چھ سو میل کی مسافت طے کی۔ اندرون ملک کے صوبجات سے ہماری فوج بہت زیادہ تعداد میں سرحد پر جمع ہو گئی تھی جس سے قبائل بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور مجاہدین کی قبائل کو اکٹھا کرنے کی کوشش رائیگاں گئی۔ ہم نے بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے اپنی فوج کو مع توپخانہ کے کوہ سیاہ پر چڑھا دیا تھا۔ اور سرحدی اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

کوارٹر ماسٹر جنرل نے لکھا تھا "یہ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کس طرح انگریزی فوج یورپین اور ہندوستانی دس ہزار فٹ کی بلند پہاڑیوں پر چڑھی ہوئی ہے اور اُن کے درمیان جنگ کر رہی ہے اور کمانڈر انچیف تک کے لئے کوئی خیمہ نہیں[2]"۔ بہر حال اس دفعہ بھی ہم شرارت کی جڑ تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے۔

پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا اُن کو اس بات پر ہی آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور ہندوستان

---

[1] رائل توپخانہ کی D بیٹری اور F برگیڈ E بیٹری۔ ۱۹ برگیڈ RA اور ۲۴۔ ۲ برگیڈ R.A۔ ۱۹ اور ۶ نمبر کی پہلی بٹالین ۶۲ کی دو کمپنیاں۔ ۱۶ بنگال کیولری۔ ۲۲ گورکھا رجمنٹ۔ ۲۴ نیو انفنٹری۔ یک بیک راولپنڈی سے ایبٹ آباد کو روانہ کر دی گئیں جو ضلع ہزارہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ۲۰ N.I نے لاہور سے ایبٹ آباد کو کوچ کیا۔ ۲۸ فٹ سیالکوٹ سے دربند جو ہزارہ میں ہے کی طرف روانہ ہوئی اور مہم کے دوران میں 3/8/1×1 بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پہلی اور چوتھی گورکھا دور درانہ کے پہاڑی علاقوں بلکوہ اور دھرم سالہ سے جرنیل وائلڈ کے ساتھ جا ملی۔ اس کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی ہیں ۹۰ و ۱۹ و ۲۴ N.I – 9 بنگال کیولری اور ۲۰ سوار اپنی مختلف چھاؤنیوں کانپور علیگڑھ۔ امرتسر۔ لاہور۔ کیمبلپور اور راولپنڈی سے روانہ ہوئیں۔ اور ریزرو رکھی گئیں تھیں۔ پشاور اور نوشہرہ میں بھی فوج کو تیار رہنے کا حکم تھا جو سوات اور ہوتی مردان کے مقابل ہے تاکہ گائیڈ کور کو مدد دے سکیں۔

[2] گورنمنٹ کے ملٹری شعبہ کے سیکرٹری کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خط نمبر ۹۴۳ مجریہ ۵ نومبر ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۱۷

میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں[۵]

اب میں نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۳۱ء سے جب کہ اس کی ابتدا ہوئی ۱۸۶۸ء تک جب کہ آخری مرتبہ انہوں نے ہمکو جنگ میں دھکیلا بیان کر دی ہے۔ وہ تمام پرانی مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کیں تھیں وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچیں۔ اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ تین مرتبہ قبائل کو یکجا اکٹھا کر دیا جس کی وجہ سے برطانوی ہند کو ہر ایک موقع پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یکے بعد دیگرے ہر گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لئے ایک مستقل خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کو تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اب تک بھی یہ ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آجائیں گے جو وسط ایشیا میں ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ مگر اس وقت یہ عین ممکن ہے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے۔ یہ جنگ جب کبھی بھی ہوگی (اور جلد یا بدیر یہ ہو کر رہے گی) تو ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کرسکے گی۔ ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہیں اگر ہمیں ڈر ہے تو اُن شورش پسند عوام سے ہے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لئے بار بار اکٹھا کرتے ہیں۔ نو صدیوں کے دوران میں ہندوستانی لوگ شمال کی طرف سے حملہ ہونے کے عادی ہو چکے تھے اور کوئی شخص اس اہمیت کے متعلق پیشگوئی نہیں کرسکتا جسے یہ باغی کیمپ مغربی مسلمان خانہ بدوش گروہوں کی مدد سے ایک ایسے لیڈر کی سرکردگی میں جو اپنے اندر ایشیائی قوموں کو جہاد کرنے کے لئے اکٹھا کرسکتا ہو حاصل کرسکتا ہے۔

---

[۵] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ ۲ نومبر ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۲۲ ۱۸۶۸ء کی سرحدی مہم کی مندرجہ کیفیت بیان کرنے میں۔ میں نے اس خط سے مدد لی ہے۔ یا اُس افسر کی رپورٹ سے جس کا ذکر کنایتاً کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کوارٹر ماسٹر جنرل کا خط مجریہ ۵ نومبر ۱۸۶۸ء بمع اُن ملٹری کیفیات کے جو اس کے ساتھ تھیں میں مدد لی گئی ہے۔

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — روساسے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۶	اپریل سنہ ۱۹۴۲ء	عدد ۴

سخنہائے گفتنی — پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی — ۲

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت — از ولیم ہنٹر مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم بی۔بی۔ایس لاہور۔ — ۹

سید محمد شاہ پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

گذشتہ ماہ جمعیۃ العلماء کا تیرہواں اجلاس (۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء) لاہور میں منعقد ہوا۔ مولوی حسین احمد صاحب مدنی نے جو خطبۂ صدارت اس موقع پر پڑھا، وہ خاصہ طویل ہے اور اس لائق ہے کہ اُسے غور سے پڑھا جائے۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ اس پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کروں گا سردست ناظرین کی توجہ چند اہم امور کی طرف منعطف کرنی مناسب سمجھتا ہوں۔

اولاً مولینا نے ارشاد فرمایا "مخالفین کا یہ پروپاگنڈا کہ جمعیۃ العلماء کانگرس کی آلۂ کار ہے بالکل غلط اور افتراء اور ناقابلِ التفات ہے"

حقیقت حال یہ ہے کہ جب ۱۹۲۹ء میں، اسی جمعیۃ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں، مولینائے موصوف نے، یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر کانگرس میں داخل ہونا چاہیئے" تو مخالفین نے بجا طور پر یہ پروپاگنڈا کیا کہ جمعیۃ کانگرس کی آلۂ کار ہے؛ مخالفین تو بہر حال مخالفین تھے خود مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی نے، اس غیر مناسب اصول کی مخالفت کی تھی۔ لیکن "گذشتہ را صلوات" اگر اب مولینا یہ اعلان فرماتے ہیں کہ جمعیۃ، کانگرس کی آلۂ کار نہیں ہے تو میں مولینا کے اس اعلان پر اظہار مسرت اور صرف اس قدر توقع رکھتا ہوں کہ ارکانِ جمعیۃ اپنے عمل سے اس قول کی صداقت کو ثابت کر دیں گے۔

دوسری بات مولینا نے اپنے خطبہ میں یہ بیان کی کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں جغرافیائی حیثیت سے انہیں قدرتی استحکام

حاصل ہے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی از سر نو تحدید اور توسیع کی جائے تو وہ نیرہ مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان تمام حالات میں بھی، اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دوسری اقلیتوں میں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا فریب، دنیا کو اور کیا دیا جا سکتا ہے؟"

خلاصہ اس بیان کا یہ ہے کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں۔ گویا اس معاملہ میں جمعیۃ العلماء معناً مسلم لیگ کی ہمنوا بن گئی ہے، فرق صرف انداز بیان کا ہے یعنی ہم صاف لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک مستقل اور جداگانہ قوم ہیں جمعیۃ اسی بات کو یوں کہتی ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں (بالفاظ دگر ایک علٰحدہ گانہ قوم ہیں)

ہمیں امید ہے کہ تھوڑے سے تدبر کے بعد، جمعیۃ کے ارکان، لیگ کے لفظاً ہمنوا بھی بن جائیں گے اور مغایرت کا یہ ہلکا سا پردہ بھی دور ہو جائے گا۔ سچ پوچھئے تو ارکان جمعیۃ کے زاویہ نگاہ میں یہ تبدیلی، مسلم لیگ کے نظام تصورات (IDEOLOGY) کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔

تیسری بات مولینا نے اپنے خطبہ میں یہ بیان کی ہے کہ "جمعیۃ العلماء ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے نہ صرف سیاسی نقطہء نظر سے ایک باعزت مقام حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے کوشاں ہے۔"

ہمیں اس اعلان سے خاص طور پر مسرت اس لئے ہے کہ جب جمعیۃ العلماء اپنے اس مقدس نصب العین کو، خلوص نیت کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع کرے گی تو اس کا پروگرام بھی وہی ہوگا جو مسلم لیگ کا ہے یعنی اس بات کے لئے جدوجہد کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں وہ حکومت کریں اور جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں وہ۔

چوتھی بات مولینا نے اپنے خطبہ میں یہ بیان کی ہے کہ "مسلمان ہندوستان میں اپنی پوری مذہبی آزادی اور پوری تہذیب و ثقافت کے ساتھ زندہ رہیں گے اور کسی غیر کی غلامی قبول کرنے پر وہ عزت کے ساتھ مرجانے کو ترجیح دیں گے۔"

مسلم لیگ کا مسلک بھی یہی ہے کہ ہم نہ انگریز کی غلامی گوارا کریں گے نہ ہندو کی اور اسی لئے مسلم لیگ اس بر اعظم میں وحدانی طرز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ گویا جمعیۃ بھی لیگ کے دوش بدوش کام کرنے پر مجبور ہوگی۔ الحمدللہ۔

پانچویں بات مولانا نے اپنے خطبہ میں یہ بیان کی ہے کہ "یورپ کے جمہوری نظام میں، اس قدر سرمایہ پرستی خود غرضی اور یورپین قومیت (وطنیت) کی لعنت گھس گئی کہ عام انسانی دنیا شخصی حکومتوں سے اس قدر ہلاکت و بربادی کا شکار نہیں ہوئی جتنی کہ اس فریب انگیز جمہوریت اور نام نہاد خدمت خلق سے ہونے لگی"۔

جمعیۃ تو یہ بات ۱۹۴۲ء میں کہہ رہی ہے لیکن حکیم الامت علامہ اقبال نے آج سے ربع صدی پہلے اعلان کر دیا تھا۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اور قائد ملت مسٹر جناح (متعنا اللہ بطول حیاتہ) ۱۹۳۸ء سے مسلسل اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ مغربی جمہوری نظام مسلمانوں کے لئے کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

سردست ان چند اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں جن سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ جمعیۃ العلماء بھی تجارب تلخ کے بعد اصولی طور پر مسلم لیگ کی ہمنوا ہوتی جاتی ہے۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ہم یہ مصرع پڑھ کر ارکان جمعیۃ کا خیر مقدم کریں گے ع

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور

ماہ رواں کے پہلے ہفتہ (۳ تا ۵ اپریل) میں، آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس، بمقام الہ آباد نہایت شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ قائد اعظم کا مکمل خطبہ صدارت اس وقت میرے سامنے موجود نہیں اس لئے اس پر آئندہ اظہار خیالات کروں گا سردست خطبہ استقبالیہ سے صرف ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"میں امید کرتا ہوں کہ ہندو قوم کے رہنما، اس حقیقت کا احساس کر سکیں گے کہ تعصب، تنگدلی، تنگ نظری، عیاری، غلط بیانی اور حق پوشی پر کاربند ہونے سے یہ ملک آزاد نہیں ہوگا۔ بلکہ بدستور غیر ملکی حکومت کا غلام بنا رہے گا،

اور وہ حکومت اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان توازن کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہندوؤں کا یہ دعوے صداقت پر مبنی ہے (اگرچہ میری رائے میں یہ صحیح نہیں) کہ اس ملک میں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جس قدر اختلافات ہیں وہ سب انگریزوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں، تو ہندوؤں کے لئے اس مفروضہ کو صحیح ثابت کرنے کا اس وقت ایک زریں موقع موجود ہے، وہ کیوں نہیں خلوص نیت کے ساتھ آگے بڑھتے، اور مسلمانوں کو عدل و مساوات کی بنا پر اس ملک کی حکومت میں، ان کا جائز حصہ دے کر اُن اختلافات کو دور کرتے؟ اس طرح وہ نہ صرف اس ملک پر احسان کریں گے بلکہ دنیا پر بھی ثابت کر دیں گے کہ ہندو اس قدر فراخدل اور معدلت شعار ہیں کہ اگر ان کو موقع دیا جائے تو وہ تمام باہمی اختلافات کو خوبصورتی کے ساتھ ختم کر سکتے ہیں۔"

نواب سر محمد یوسف صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی صحت و صداقت میں کوئی کلام نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندو قوم یا گاندھی و نہرو اُن کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں؟ موصوف نے تو صرف تعصب اور تنگدلی کا تذکرہ کیا ہے میں تو اپنے گزشتہ بست سالہ تجربہ کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف اس درجہ دشمنی اور عداوت کے جذبات موجزن ہیں کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ کسی کلمہ گو کو زندہ نہ چھوڑیں؛ اگر یہ سچ ہے کہ کسی قوم کا پریس، اس قوم کے جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے تو ہندو قوم کے جذبات عداوت کا اندازہ "ویر بھارت" مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کی اُس ہرزہ سرائی سے ہو سکتا جو اُس نے دس کروڑ مسلمانوں کے محبوب رہنما اور قائداعظم مسٹر جناح کی شان میں روا رکھی؛ میں بھی گاندھی اور نہرو کو اسی قسم کے ناپاک الفاظ سے یاد کر سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا کہ شرافت اور دنائت کا امتیاز مٹ جائے۔

بہرحال نواب صاحب کے مشورہ کی صحت و صداقت اپنی جگہ مسلّم سہی لیکن ہندو قوم تو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل کر رہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کانگرس دنیا کو اس فریب میں مبتلا رکھے کہ وہ سب کی نمائندہ ہے اور مہاسبھا، کانگرس کے مقاصد کی تکمیل کرتی ہے، دراصل دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ ہندو قوم زبان سے کانگرس کا کلمہ پڑھتی ہے لیکن دل مہاسبھا کے ساتھ ہے، اور جس بات کو کانگرس اشارۃً

میں کہتی ہے مہاسبھا اُسے صاف الفاظ میں بیان کر دیتی ہے مثلاً کانگرس کہتی ہے کہ ہندوستان میں، ہندیوں کی حکومت قائم ہوگی، بظاہر تو یہ اعلان بہت معصوم نظر آتا ہے لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت میں، دراصل تمام اقتدار اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بالفاظ دگر ہندو اکثریت کی حکومت ہوگی؛ مہاسبھا اسی بات کو صاف لفظوں میں یوں کہتی ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔

الغرض سوال یہ ہے کہ جب ہندوؤں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں حکومت کریں گے تو ان سے کسی معقول طرز عمل یا عادلانہ مفاہمت کی توقع ایسی ہی ہے جیسی ریگ سے روغن نکالنے کی کوشش۔ اگر ہندو قوم مسلمانوں سے انصاف کر سکتی تو ہندوستان کبھی کا آزاد ہو چکا ہوتا۔

لیگ کے سالانہ اجلاس میں، قائد اعظم نے، فرمایا "مسلمانان ہند اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک برطانیہ اس حقیقت کا اعلان اور اعتراف غیر مبہم الفاظ میں نہ کرے کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ قومیت کی بنا پر دیگر اقوام عالم کی طرح، حکومت خود اختیاری کا پورا حق حاصل ہے۔ واضح ہو کہ ہندوستان کبھی بھی ایک ملک نہیں رہا اور اس کے تمام باشندے کسی زمانہ میں بھی ایک قوم نہیں ہوئے۔ ہندوستان کا مسئلہ بین الجماعتی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور یہاں کی مختلف اقوام کے مابین جو سیاسی ثقافتی تمدنی اور مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس قدر شدید اور اہم ہیں کہ انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

بنائے فساد جو کانگرس اور مہاسبھا نے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک وحدت ہے اور یہاں کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست میں جس قدر پیچیدگی نظر آتی ہے وہ سب اسی فاسد نظریہ پر مبنی ہے؛ لہٰذا قائد اعظم نے اس فریب کا پردہ چاک کر کے، اسلامی سیاست کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ان کو اپنا واحد رہنما تسلیم کرتے ہیں۔

ان کی اسی مومنانہ فراست کی بنا پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ۲۸ جون ۱۹۳۷ء کو اپنے خط میں انہیں لکھا تھا۔

"میری رائے میں آپ اس وقت ہندوستان میں، وہ تنہا مسلمان ہیں، جو ملت اسلامیہ کی کشتی بھنور سے نکال کر ساحل مقصود تک پہنچا سکتا ہے"۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جناح تن تنہا، سارے دشمنوں سے لڑ رہا ہے اور سب کو ترکی بترکی جواب دے رہا ہے یہ اُسی کی مومنانہ فراست کا نتیجہ ہے کہ آج برطانیہ کانگریس کو محض ایک ہندو جماعت تسلیم کرتی ہے اور یہ اُسی کے سیاسی تدبر کا ثمرہ ہے کہ آج انگریز اور ہندو دونوں کی مزعومہ قیادت کا طلسم پاش پاش ہو چکا ہے۔

ہم مسلمان نہ انگریز کی غلامی گوارا کر سکتے ہیں اور نہ ہندو کی، ہم ایک مستقل قوم ہیں اور اگر ہندو کو یہ حق حاصل ہے کہ جن صوبوں میں اس کی اکثریت ہے وہاں وہ حکومت کرے تو مسلمان کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جن صوبوں میں اس کی اکثریت ہے وہاں وہ حکومت کرے، اقبالؒ کی یہ دعا انشاء اللہ بہت جلد قبول ہونے والی ہے

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلمان کو تلوار کر دے

امسال لیگ کے اجلاس میں ایک صاحب نے دوران تقریر میں، قائداعظم سے درخواست کی کہ انہیں عامتہ المسلمین سے ربط و ضبط پیدا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آخری اجلاس میں، قائداعظم نے اپنی اختتامی تقریر میں ارشاد فرمایا "میں سامعین کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دراصل میرے دل میں اگر کسی کے لئے جگہ ہے تو غریبوں کے لئے، اور میں جو کچھ کر رہا ہوں انہی کے فائدے کے لئے ہے، اور میرا خیال یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد مسلم عوام کو اس حقیقت کا خود بھی احساس ہونے لگے گا کہ میں ان کا سچا اور مخلص خادم ہوں اور اگر مجھے اپنے نصب العین میں کامیابی حاصل ہو گئی، تو مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات سے ہو گی کہ میں عامتہ المسلمین کے لئے کچھ کام کر سکا اور ان کے معیار زیست کو بلند کر سکا۔ ہم پاکستان قائم کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں تاکہ ہم خود حکومت کر سکیں۔ لیکن اگر وہ حکومت، مساوات نسل انسانی کے زریں اصول کو قائم نہ کر سکی تو مسلمان کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت

نہیں ہو سکتی۔ نیز اگر وہ حکومت غریبوں کے درد کا درماں مہیا نہ کر سکی، تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں
میں آپ صاحبان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری تمام موجودہ جد وجہد کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حتی المقدور عامۃ المسلمین کی حالت کو سنوارا جاسکے۔

مجھے یقین ہے کہ اس حقیقت افروز بیان سے ان دوستوں کے شکوک بالکل رفع ہو جائیں گے جو مسلم لیگ کو کسی غلط فہمی کی بنا پر صرف خواص کی جماعت، اور قائد اعظم کو صرف خواص کا رہنما سمجھتے رہے ہیں: نیز پاکستان کے مخالفین بھی قائد اعظم کے ان الفاظ پر غور کریں کہ مسلمان اس بر اعظم میں پاکستان کے قیام کی کوشش اس لئے کر رہے ہیں کہ مساوات نسل انسانی کے زریں اصول کو ایک عنصر فعال اور زندہ حقیقت کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے: یعنی ایسی حکومت قائم کی جائے جس میں برہمن اور شودر دونوں کو انسان سمجھا جائے اور غریبوں کو زندگی کی ضروریات بہم پہنچائی جا سکیں: تاکہ وہ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے نجات پا سکیں یعنی پاکستان کا جو تخیل ہمارے قائد اعظم کے دماغ میں جلوہ گر ہے وہ یہ ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس (اقبالؒ)

میں قائد اعظم کو ملت کی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان اب بیدار ہو چکے ہیں۔ اور ان میں اس قدر شعور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز کر سکیں۔ اس لئے تمام مسلمانان ہند، دل و جان سے اُن کے ساتھ ہیں اور جس وقت وہ انہیں پکاریں گے، لاہور سے بنگلور تک اور کراچی سے کلکتہ تک سارے مسلمان ان کی پکار کا کنفس واحدۃ جواب دیں گے۔ (ان شاء اللہ)

اس پرچہ میں مطالب القرآن کی قسط نہیں دی جاسکی کیونکہ مجاہدین سرحد کی تاریخ کا باب دوم اتنا طویل ہو گیا ہے کہ اس نے تمام جگہ لے لی۔ خدا کو منظور ہوا تو آئندہ ماہ سے باقاعدہ مطالب القرآن کی قسط شائع ہو گی۔

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت

باب دوم

ایک پرانی سازش

(سلسلہ کے لئے مارچ ۱۹۶۲ء کا پرچہ دیکھیں)

"بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا اُس ہندوستانی حکومت نے جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمران تھی اسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ یہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دیندار مسلمان ان کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے کو ہی ان کے آخر کار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نوآبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اُس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام اُن کو لاتعداد آدمیوں اور روپوں سے مدد دے کر گویا اُن چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر جن کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔

۲۲-۱۸۲۱ء تک سید احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکام نے کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے جانثار مریدیں کے ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت قائم کردی اس اثنا میں ہمارے افسران اپنے اردگرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرنے، انصاف کی لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے میں ہی مصروف رہے ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بہت بری طرح جھنجوڑے

گئے کلکتہ میں سید صاحب کے مریدوں میں ایک کسبی پہلوان اور لڑا کا آدمی بھی تھا جس کا نام تیطو میاں[1] تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک باعزت کاشتکار کے لڑکے کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اور ایک اچھے[2] سے زمیندار کی لڑکی سے شادی کر کے اپنی حیثیت کو اور بھی بلند کر لیا تھا۔ مگر اس کی پر جوش اور بے صبر فطرت نے ان فوائد کو پرے پھینک دیا۔ کچھ مدت تک یہ کلکتہ میں ڈنڈے بازی کے معیوب طریقہ پر روزی کماتا رہا۔ اور اس کے بعد ایک لٹھ باز گروہ میں شامل ہو گیا۔ جن سے بنگال کے زمیندار اپنے خاندانی جھگڑے اور زمین کی حدود کے تنازعات کا فیصلہ کرایا کرتے تھے۔ اس پیشہ کی وجہ سے آخر کار اس کو جیل جانا پڑا۔ رہا ہونے کے بعد وہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ روانہ ہو گیا۔ اس مقدس شہر میں اس کی ملاقات سید احمد صاحب سے ہوئی اور وہ ہندوستان میں اُن کے اصولوں کا ایک زبردست مبلغ کی حیثیت سے واپس آیا۔ اس نے ضلع کلکتہ کے شمال اور مشرق کی طرف دورہ کیا بہت سے آدمیوں کو اپنا مرید بنا لیا اور خفیہ طور پر کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریاں کرتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں جب مجاہدین سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو تیطو میاں اس قدر بے دھڑک ہو گیا کہ اس نے اپنا نقاب اُتار پھینکا۔ اور اُن معمولی معمولی سختیوں[2] کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اُس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے یہ کسانوں کی پر جوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا اس کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں جس کے نتیجہ پر باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں محفوظ کر لیا۔ انگریزی حکام کی نافرمانی کی اور کچھ قتل و غارت کے بعد اُن کو پسپا کر دیا۔ کلکتہ سے شمال اور مشرق کی طرف کا علاقہ مع اُس ضلع کے تمام کا تمام باغیوں کے رحم و کرم

---

[1] اس کو نثار علی بھی کہتے ہیں۔ یہ چندر پور گاؤں کا باشندہ ہے اور بارہ ست میں رہتا ہے اس کی زندگی کے اکثر حالات کلکتہ ریویو جلد (۱۱) میں دیئے گئے ہیں میں نے اُن کو اور پٹنہ کی مجسٹریٹ کی سرکاری رپورٹ کو استعمال کیا ہے۔

[2] مثال کے طور پر کرشن رائے نے جو اشامتی کے کنارے ایک بڑا زمیندار تھا۔ اپنے اُن کاشتکاروں پر ۵ شلنگ فی کس کے حساب سے ٹیکس لگایا تھا جنہوں نے نیا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ایک اور زمیندار نے اپنے پرائیویٹ جیل میں ایک آدمی کو اس لئے محبوس رکھا کہ اُس نے محرم کے دنوں میں تازیے جلا دیئے تھے۔

پر تھا جن کی تعداد تین چار ہزار کے قریب تھی[۱] اس فرقے نے اپنے کام کا آغاز دن دہاڑے اُس گاؤں کو جلا دینے سے کیا جس نے ان کے روحانی پیشوا کو ماننے سے انکار کر دیا تھا[۲]۔ ایک دوسرے ضلع میں ایک اور گاؤں[۳] کو لوٹ لیا اور ایک مسجد کو جلا ڈالا۔ اور ساتھ ہی اس کے دیندار مسلمانوں پر روپیہ اور چاول کا چندہ عائد کیا گیا۔ ۲۳ ر اکتوبر ۱۸۳۱ء کو باغیوں نے اپنے صدر مقام کے لئے ایک گاؤں منتخب کیا اور اُس کے ارد گرد بانسوں کا ایک مضبوط جنگلا کھڑا کر دیا۔ ۶ ر نومبر کو ۵۰۰ جنگجو کوچ کرتے ہوئے باہر نکلے۔ ایک قصبہ پر حملہ کیا۔ اس کے پروہت کو قتل کرنے کے بعد دو گائیں ذبح کیں (جو ہندوؤں کا متبرک جانور ہے) جن کے خون سے ایک ہندو مندر کو بے حرمت کیا گیا۔ اور پروہت کی لاش کو تحقیر اُبت کے سامنے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزی راج کے خاتمہ اور دوبارہ اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب بغاوتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے گاؤں میں گائے ذبح کی جاتی اور اگر لوگ اُس کی مخالفت کرتے تو یا تو اُن کو قتل کر دیا جاتا یا اُن کو گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا۔ اُن کے گھروں کو لوٹ لیا جاتا اور پھر جلا دیا جاتا تھا۔ بعینہ وہ اُن مسلمانوں کے بھی خلاف تھے جو اُن کے فرقے میں داخل نہ ہوتے تھے۔ البتہ ایک موقع پر ایک مالدار اور ضدی مسلمان کا گھر بار لوٹنے کے لئے انہوں نے اپنا طریق کار بدل دیا کیونکہ انہوں نے اس کی لڑکی کی شادی اپنے گروہ کے ایک سردار سے زبردستی کر دی۔

ضلع کے حاکموں کی ناکامیاب کوششوں کے بعد ۱۷ ر نومبر ۱۸۳۱ء کو کلکتہ کی ملشیا فوج کا ایک حصہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مجاہدین نے صلح کی گفتگو کو ٹھکرا دیا اور کمانڈر افسر نے اس خیال سے کہ خونریزی نہ ہو اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ خالی کارتوس بندوقوں میں بھر لیں۔ باغیوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ اس کے جواب میں بے ضرر بوچھاڑ ہوئی اور باغیوں نے فوراً ہمارے سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ کلکتہ سے اتنے فاصلہ پر ہوا جس کو ایک سوار دو گھنٹے میں طے کر سکتا ہے۔ ۱۸ ر تاریخ کو مجسٹریٹ نے ادھر اُدھر سے کمک مہیا کی اور فرنگیوں کو ہاتھی پر بٹھا دیا۔ باغیوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اور ایک ہزار جنگجو میدان میں لے آئے۔ انہوں نے حملہ آوروں

---

[۱] ۲۴ پرگنہ، ندیا اور فرید پور۔ [۲] فرید پور کا ضلع۔ [۳] سرفراز پور ندیا میں۔

کا اُن کی کشتیوں تک تعاقب کیا اور جس شخص نے بھاگنے میں سستی کی اُس کو تہ تیغ کر دیا۔ اندریں حالات ضروری ہو گیا کہ باغیوں کی سرکوبی باقاعدہ فوج سے کی جائے۔ دیسی پیادہ فوج کا ایک حصہ۔ گھوڑوں والا توپخانہ اور باڈی گارڈ کا ایک حصہ بسرعت تمام کلکتہ سے روانہ کیا گیا۔ باغیوں نے اپنے مورچے کی حفاظت دیہی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوئے فوج کا مقابلہ کھلے میدان میں کیا اور ایک فرنگی کی لاش کو جو اگلے دن مارا گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی صفوں کے آگے لٹکا دیا لیکن ایک نہایت ہی سخت مقابلہ نے اُن کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ وہ نہایت ہی ابتر حالت میں اپنے مورچے کی طرف بھاگ گئے۔ اُن کے کیمپ پر ایک ہی ہلہ میں قبضہ جما لیا گیا۔ اُن کا سردار تیطو میاں جنگ میں مارا گیا۔ باقیماندہ ۳۵۰ میں سے ۱۴۰ کو عدالت نے مختلف سزائیں دیں اور ایک کو جو تیطو میاں کا نائب تھا موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مجاہدین کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ پنجاب کی سرحد پر ان کی قوت بالکل توڑ دی گئی تھی۔ اور ان کا سردار قتل کر دیا گیا تھا۔ جنوبی بنگال میں بھی باغیوں کا یہی حشر ہوا تھا۔ مگر وہ خلیفے جن کو امام صاحب نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا بچاؤ کے لئے آموجود ہوئے۔ انہوں نے ایسے عینی شاہد پیدا کئے جنہوں نے اعلان کیا کہ جس وقت لڑائی زوروں پر تھی ہمارے امام صاحب کو گرد کے بادلوں میں ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے عوام کو یقین دلا دیا کہ خود انہوں نے بھی اس طرح گم ہو جانے کی پیشگوئی کی تھی حقیقتاً امام صاحب نے اِس قسم کی دعا کی تھی کہ میری قبر میرے مریدوں سے اوجھل رہے تاکہ حضرت موسیٰؑ کی طرح میری ہڈیوں کی ناجائز پرستش شروع نہ ہونے پائے۔ انہوں نے اس بات کی تبلیغ شروع کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو موجودہ کمزور دل نسل سے اٹھا لیا ہے۔ اور جب ہندوستان کے مسلمان یک جان ہو کر انگریز کافروں کے خلاف جہاد شروع کریں گے تو امام صاحب ظاہر ہو کر فتح کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے۔ اِس میں ایک مسلمان کے لئے کوئی ناقابل تسلیم بات نہ تھی۔ ایسی باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت یونس کچھ عرصہ کے لئے گم ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی مچھلی کے پیٹ میں چھپائے رکھا تھا۔ اسی طرح حضرت موسےٰ

بھی جب کوہ سینا پر خدا کا پیغام لینے کے لئے گئے تھے تو کسی کو نظر نہ آتے تھے۔ حضرت ذوالقرنین بھی جنہوں نے یاجوج ماجوج کو قید کیا تھا اسی طرح روپوش ہو گئے تھے۔ حضرت عیسٰے نے بھی موت کا مزا نہیں چکھا[1]۔ اس لیے ہر دیندار مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ جہاد میں مصروف ہو جائے۔ پٹنہ کے خلیفوں نے ایک نیا روحانی پیشوا مقرر کیا[2]۔ اور خود اُنہوں نے تعداد میں ہر وقت بڑھتے ہوئے جاں نثار شمشیر زنوں کے درمیان شمال کی طرف سفر اختیار کیا۔

ایک عرصہ تک امام صاحب کے غائب ہو جانے کے معجزے کے متعلق تحقیقات کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا اور ہر کام ویسا ہی ہوتا رہا جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔ جنوبی بنگال کا ایک جان نثار مبلغ جس نے تمام مشرقی اضلاع۔ ڈھاکہ اور سلہٹ میں تبلیغ کی تھی ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف چلا گیا۔ جو وہاں سے ۱۸۰۰ میل دور ہے۔ مگر امام صاحب کی عرصہ دراز تک غیر حاضری نے اُس کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا۔ اور تھوڑی سی مُناقشت کے بعد اُس نے یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ دور دراز کے کوہستانی علاقہ میں اُس غار تک ضرور پہنچے گا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں خدا نے اُس کے امام کو چھپا رکھا ہے اُس کے تحقیق حق کے جوش کو دوسرے خودغرض سرداروں کے حسد پر فتح نصیب ہوئی اور جب وہ اُس پہاڑی خانقاہ تک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ تین انسانی مجسمے گھاس سے بھرے ہوئے موجود ہیں یہ فریب خوردہ مبلغ اس نامراد غار سے بھاگا اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں اور اپنے کلکتہ کے مریدوں کو ایک غصہ میں بھرا ہوا خط لکھا جو اب تک مدینہ اور آدمی بہم پہنچا رہے تھے۔

اُس نے لکھا "السلام علیکم۔ تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ مُلا قادر نے امام صاحب کا ایک بُت بنایا ہے۔ مگر کسی کو دکھلانے سے پہلے اُس سے یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ نہ وہ امام صاحب سے ہاتھ ملائے گا۔ اور نہ اُن سے بولنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امام صاحب چودہ[14] برس کے لئے گم ہو جائیں گے۔ تمام آدمی بہت متاثر ہو کر اس بے جان بت کو دور ہی سے دیکھ کر اُس کی تعظیم و تکریم کر لیتے ۔ جب بہت عرصہ تک کوئی جواب نہ ملا تو

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱ ج ۷ جولائی ۱۸۷۰ء صفحہ ۱۸۰۔ [2] مولوی نصیرالدین صاحب۔

لوگوں میں امام صاحب سے ہاتھ ملانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مگر ملا قادر نے اُن کے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اگر کسی شخص نے پہلے سے اطلاع کئے بغیر امام صاحب سے ہاتھ ملایا تو امام صاحب کے خادم اُس کو پستول مار دیں گے پھر اُس خط میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ملا قادر نے لوگوں کو اُن کی بد اعتقادی پر لعنت ملامت کی۔ کس طرح اُس نے بت کو عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیا اور آخر کار کس طرح انہوں نے بہت منت سماجت کر کے اُس کو دیکھنے کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے اُس کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ ایک بکرے کی کھال کو گھاس سے بھر رکھا تھا۔ اور کچھ لکڑی کے ٹکڑوں اور بالوں کی مدد سے اُس کو انسانی شکل دی ہوئی تھی۔ اِس بندہ ناچیز نے مُلا صاحب سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن امام صاحب نے خود بطور معجزہ کے اپنے آپ کو ایک گھاس سے بھرے ہوئے مجسمہ کی شکل میں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ اِن جعلسازوں کی غلطی اور بے ایمانی روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے اور کم از کم میں نے اپنے آپ کو گناہوں سے بچا لیا ہے۔

ایک دفعہ پھر ان مجنونوں کی تحریک تباہی کے قریب معلوم ہوتی تھی مگر پٹنہ کے خلیفوں کے تبلیغی جوش اور مال و دولت نے جو اُن کے تصرف میں تھی مقدس جھنڈے کو خاک سے اُٹھا کر ایک بار پھر بلند کر دیا۔ انہوں نے تمام ہندوستان میں اپنے مبلغ دوڑا دیئے اور مذہبیت کو اِس حد تک زندہ کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ان دونوں خلیفوں[1] نے بذات خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا چھوٹے مبلغین بے شمار تھے اور مدبرانہ تنظیم نے اُن کو اس قابل بنا دیا تھا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے اپنے مرید

[1] ولایت علی اور عنایت علی۔ اول الذکر نے بنگال کا دورہ کرنے کے بعد بمبئی۔ علاقہ نظام اور وسط ہندوستان کو اپنا خاص علاقہ بنا لیا۔ عنایت علی نے اپنی تمام کوششیں جنوبی اور وسطی صوبوں میں صرف کر دیں۔ مالدہ۔ بوگرہ۔ راجشاہی۔ پٹنہ۔ نادیہ اور فرید پور کرامت علی نے اس تحریک کو فرید پور سے مشرق کی طرف ڈھاکہ۔ میمن سنگھ۔ نواکھلی اور باریسال تک پہنچا دیا۔ زین العابدین نے جو حیدرآباد کا رہنے والا تھا۔ اور جس کو ولایت علی نے اپنے جنوب کے دورے میں مرید کیا تھا اپنی کوششوں کا مرکز شمال مشرقی بنگال کو بنایا اور سلہٹ اور شمالی پتریا کے کسانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا (کلکتہ ریویو جلد ۶ ص ۷۰)

میں اپنا اڈا جما لیتے۔ اس طرح پر ہر ضلع میں مجاہدین کا ایک مبلغ ہوتا اور اُن کے جذبات کو مشتعل رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً سفری واعظ بھی دورہ کرتے رہتے۔ پٹنہ کا مرکزی پراپیگنڈا اُن کے اقتدار کو پائدار اور مستقل کرتا رہتا تھا۔ شرانگیزی کے لیے ان مبلغوں کی قوت بنگال میں کس قدر بڑھ گئی ہے میں بعد میں بیان کروں گا۔ جنوبی ہند میں انہوں نے جوش و خروش کی وہ آندھی چلائی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں دے دیئے۔ شمال مغربی صوبوں سے انہوں نے رنگروٹوں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ کیں ہر جگہ پر انہوں نے مسلمان آبادی کے جوش کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اگرچہ بنگالیوں کی اعلٰی دفاعی قوتیں آخرکار اس تحریک کو موجودہ درجہ تک لے آئیں لیکن کچھ مدت کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں میں ایک ہی جیسے جوش و خروش کے ساتھ زندہ رہی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسروں کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ و فساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا جیسا کہ ظاہر ہے[1]۔

بہرحال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ و فساد نہ تھی۔ سید احمد صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بنیاد انہیں دو اصولوں کی نشر و اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات۔ انہوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے الفاف چاہا۔ اُن کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی۔ اور صدیوں تک ہندوؤں سے میل جول سے اُن کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم بت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے۔ گو سید احمد ایک لیڈر اور جعلساز تھا اور اُن کے حواریوں نے بھی بعد میں یہی پیشہ اختیار کیا لیکن میں اس بات کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سید احمد صاحب کی زندگی کا ایک درمیانی حصہ ایسا بھی تھا جس میں ان کا دل و دماغ اپنے برادران وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔ اور ان کا دھیان ہر وقت

---

[1] سرکاری دستاویزات ۱۸۶۵ء

خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ وہ بہت ہی بے قرار جوشیلے اور اعصابی مزاج کا انسان تھا۔ اگرچہ ان کا ظاہری اطمینان اُن کی قلبی کیفیت کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی جس کو ہم مغربی سائنس کی اصطلاح میں مرگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جو ایشیائی عقیدہ کے مطابق بڑی ہی متبرک حالت ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب خدائے تعالیٰ سے براہ راست تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ان وجدانی کیفیات میں پیغمبران سلف اُن کی بصیرت پر عیاں ہو جاتے تھے اور کشفی طور پر وہ ہندوستان کے دو گزشتہ مذہبی اماموں سے متواتر راہ و رسم رکھتے تھے۔

۱۸۲۰ء میں جب انہوں نے اپنی تبلیغ کا آغاز کیا تو اُس وقت اُن کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ قد درمیانہ تھا۔ اور سینے تک لمبی داڑھی رکھتے تھے۔ وہ کم گو اور خوش اخلاق تھے۔ لیکن جید عالم نہ تھے۔ انہوں نے اپنے برادران وطن کی عملی زندگی پر وعظ کہنا شروع کیا۔ اور ہر قسم کی اصولی بحثوں سے پرہیز کیا جس کے متعلق اُن کے دشمن تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے اور اُن کے مریدوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اُن کی بزرگی اور برتری کی شان کے خلاف تھا۔ ان کے پہلے دو مرید بڑے عالم فاضل تھے اور انہوں نے دہلی کے بہت بڑے عالم شمس الہند کی بحثوں کے درمیان تربیت پائی تھی جن سے امام صاحب کو بھی شرف تلمذ حاصل رہا۔

یہ دونوں شخص اپنے وقت کے جید مسلمان عالم[1] کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اُن کی تربیت بڑی احتیاط سے کی تھی۔ وہ مذہبی زبانوں اور شریعت کے قوانین سے اچھی طرح واقف تھے۔ دونوں نے اپنے ہم وطن بھائیوں کے مذہب اور طور طریقوں میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی گو مختلف حد تک، اور دونوں نے ایک ہی وقت میں اپنے بے علم ہم سبق اور گذشتہ لیڈر کو اپنا امام تسلیم کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک وہ خدا کی طرف سے اس کام کو پورا کرنے کے لئے مامور تھے۔ جس طرح ان دو عالموں اور قوانین شریعت کے جاننے والوں نے عوام کے سامنے سید احمد صاحب کی جو ٹوٹی پھوٹی عربی بھی نہ جانتے تھے تعظیم و تکریم کی اس کی وجہ سے عوام بھی اس

---

[1] شاہ عبدالعزیز صاحب۔ مولوی محمد اسمٰعیل ان کے بھتیجے اور مولوی عبدالحی ان کے داماد تھے۔

ہونے والے امام کی طرف راغب ہو گئے اسلام کے تمام فرقوں کی تعلیم کو اچھی طرح جاننے کی وجہ سے انہوں نے سید احمد صاحب کے اُس دعوے کی کھلم کھلا حمایت کی جس کو وہ خود تسلیم کر چکے تھے اس مقبول عام عقیدے سے شروع کر کے کہ اللہ تعالے اپنے بندوں کے ایمان کو مضبوط کرنے اور انسانوں کو نجات کا راستہ دکھلانے کے لئے وقتاً فوقتاً امام اور ولی بھیجتا رہتا ہے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ سید احمد صاحب بھی خدا کی طرف سے مامور ہیں اور اس منصب کی تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ سید اور آل رسول ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا ہے کہ اپنی وجدانی کیفیت میں وہ خدا اور اُس کے رسول سے براہ راست گفتگو کرتے ہیں اور اپنی تمکنت کم گوئی خوش اطواری حتیٰ کہ اپنی شکل و شباہت میں پیغمبر اسلام سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن بارہ اماموں میں سے جو تمام دنیا کو مسلمان بنالیں گے ہندوستان کے بعض مسلمان[1] تو یہ مانتے ہیں کہ چھ ہو گزرے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ صرف چار ہو گزرے ہیں۔ سید احمد صاحب اُسی متبرک سلسلہ کی ایک کڑی ہیں خوابوں میں رسول اکرم کی صاحبزادی اور اُن کے خاوند جہاں سے ان کا نسب چلتا ہے، اُن سے ملاقات کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے کی طرح اُن کو سلام کرتے ہیں۔ اُن کی خوشبوؤں میں نہلاتے ہیں اور اُن کو شاہانہ لباس پہناتے ہیں۔ عوام الناس اور خود سید احمد صاحب اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہتے ہیں؟ ان دو عالم فاضل مریدوں کے متواتر دلائل کے سامنے سید احمد صاحب کا انکسار اور شک و شبہ ٹھہر نہ سکتا تھا۔ آخر کار اُن کو اپنے دعوے پر اس قدر پختہ یقین ہو گیا کہ انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر شاہی اختیارات ہاتھ میں لے لئے سامدنی پر دسواں حصہ بطور ٹیکس قائم کیا۔ اپنے خلیفہ مقرر کئے تاکہ بیعت درسیعت

---

[1] سُنّی حضرات۔ شیعہ حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ گیارہ ہو گئے ہیں اور بارہواں امام شمال مغربی سرحد کے پار کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن سُنّی مسلمانوں کی تعداد ۹۵ فیصدی ہے۔

کا سلسلہ جاری ہے اور پشاور میں باقاعدہ طور پر امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ تشریف لے جانے سے پہلے سید صاحب نے اپنے اصولوں کو باقاعدہ مرتب نہ کیا تھا۔ اُن کے خیال کے مطابق دین کی اصلاح ایک عملی شے تھی۔ انہوں نے اپنی پند و موعظت سے سامعین کو بتلایا کہ اگر وہ خدا کے غضب سے بچنا چاہتے ہیں تو اچھی زندگیاں بسر کریں۔ اُن کے ایک مرید نے اُن کے اقوال کو ایک کتاب[۱] کی صورت میں جمع کیا ہے۔ جواب اس فرقے کی مقدس کتاب ہے۔ اور عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے مختصر اقوال کو لکھنے والے کی عقیدت مندی نے بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔ لیکن اس قدر زیادتی کے باوجود بھی وہ ایک عملی اخلاق کی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اُن دستاویزات میں جن کی رو سے انہوں نے پٹنہ کے خلیفوں کا تقرر کیا تھا اسی عملی زندگی کی روح نمایاں ہو رہی ہے۔ اُن کا صرف ایک ہی اصول تھا اور وہ یہ کہ خدائے احد کی عبادت کی جائے براہ راست عبادت انسانی طور طریقوں اور وسطوں کے بغیر۔ بطور نمونہ چند اقوال ملاحظہ فرمائے جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا اُن لوگوں کو جو راہ حق کے طالب ہیں بالعموم اور ان کو جو سید احمد کے دوست ہیں بالخصوص معلوم ہونا چاہیئے خواہ وہ حاضر ہیں یا غیر حاضر کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرکے مرید ہو جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کو راضی کرنے کے ذرائع حاصل ہوں۔ اور یہ رسول اکرم کے احکام کو پورا کرنے پر منحصر ہے۔

رسول اللہؐ کے احکام کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ پہلی شے یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کو معبود نہ ٹھہرایا جائے۔[۲] اور دوسرے کوئی دستور یا طریقہ ایسا اختیار نہ کیا جائے جو رسول کریم اور اُن کے خلفا کے وقت میں نہ تھا۔[۳] اول الذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس عقیدے سے کہ کوئی فرشتہ روح یا روحانی رہنما۔ مرید۔ استاد۔ طالب علم۔ پیغمبر یا ولی کسی کی تکلیفوں کو دور کر سکتے ہیں توبہ کی جائے۔ کسی خواہش یا ارادہ کو پورا کرنے کے لیئے اُن کا وسیلہ ڈھونڈنے سے پرہیز کیا جائے۔ اور اس بات سے انکار کیا جائے کہ اُن کو کسی کی طرفداری کرنے یا برائی کو دور کرنے کی طاقت حاصل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاقت کے سامنے ان کو اپنے ہی ایسا بے چارہ اور بے علم سمجھنا چاہیئے۔ لہذا کسی امام —

[۱] صراط المستقیم مصنفہ مولوی محمد اسماعیل صاحب۔ [۲] شرک [۳] بدعت۔

بزرگ۔ ولی اللہ یا فرشتہ کو اس خیال سے کوئی تذر نیاز نہ دینی چاہیئے۔ کہ اُس سے ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ بلکہ اس لئے کہ یہ خدا کے دوست ہیں۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ ان کو زندگی کے واقعات پر اختیار حاصل ہے یا اسرار الٰہیہ سے واقف ہیں صریحاً کفر ہے۔

آخرالذکر اصول کا مطلب یہ ہے کہ سچا اور صاف مذہب ہے کہ رسول اللہ کے وقت جس طرح عبادت اور زندگی بسر کی جاتی تھی اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔ اور اُن تمام بدعتوں مثلاً بیاہ شادی کی رسمیں سرگ کی رسمیں خانقاہوں کی تعظیم۔ قبروں پر قبہ بنانا۔ مُردے کے سالانہ ختم پر بے دریغ روپیہ صرف کرنا وغیرہ وغیرہ سے پرہیز کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے ان رسموں کو بند کرنے کی کوشش کی جائے[1]۔

۱۸۲۲ ۱۲۳۷ھ میں امام صاحب کے مکہ معظمہ تشریف لے جانے پر اس عام فہم اصلاحی عقیدہ کو وسعت دی گئی اور باقاعدہ طور پر ترتیب دے دیا گیا۔ انہوں نے اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا۔ اور جو اُن کے عقائد کے مطابق تھا۔ اس کے بانی نے مغربی ایشیا میں ایک دینی سلطنت قائم کر لی تھی بعینہٖ جیسی کہ سید احمد صاحب ہندوستان میں قائم کرنے کی امید رکھتے تھے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس مذہب کی آئندہ ترقی کے واقعات کو یہاں تھوڑے عرصہ کے لئے ختم کر دیں اور عرب میں وہابیوں کی ترقی و زوال کی مختصر داستان بیان کریں۔

ایک سو پچاس برس ہوئے کہ ایک نوجوان عرب حاجی جس کا نام عبدالوہاب تھا اور جو نجد کے ایک معمولی شرطہ کا بیٹا تھا اپنے ہمراہی حاجیوں کی بدمعاشی اور ریاکاری سے جس سے اماکن مقدسہ کی بے حرمتی کی جا رہی تھی سخت دلگیر ہوا۔ وہ تین سال تک دمشق میں اُن بدعات پر غور و خوض کرتا رہا جو مذہب اسلام میں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور آخر کار ان بدعات کے انسداد کے لئے میدان عمل میں نکل پڑا۔ لیکن حکومت قسطنطنیہ کے کارپردازوں نے اس کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ اس نے ترکی علما پر یہ الزام رکھا تھا کہ ان کے اعمال و افعال نے

---

[1] کلکتہ ریویو نمبر ۵ اپریل ۱۸۷۰ء صفحہ ۹۸۔

شرعی تعلیم کو بالکل بے کار کر دیا ہے چنانچہ ترکی باشندے اپنی برائیوں کی وجہ سے کافروں سے بھی بدتر ہیں لہٰذا عبدالوہاب کو شہر بدر شہر خارج ہونا پڑا۔ آخرالامر اس نے درایہ کے سردار محمد ابن سعود کے ہاں پناہ لی اور اسے اپنے دینی عقائد اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے بعد سردار مذکور کو اس کے گناہوں پر ملامت کی۔ یوں بہت جلد کئی ایک برائیاں دور کرنا ان کے لئے مقدر ہو گئیں۔ اپنے نئے مرید سے مل کر جس کی بیٹی سے عبدالوہاب نے شادی کر لی تھی اس نے ایک مختصر سی عرب لیگ کی بنیاد رکھی اور قسطنطنیہ کی حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف احتجاج اور بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اب انہیں فتح پر فتح ہو رہی تھی۔ اور وہ بدوی بھی جنہوں نے کبھی بھی محمدؐ کو رسول نہ جانا اور نہ قرآن کو خدا کا کلام نہ سمجھا تھا اُن کے اصلاحی جھنڈے کے نیچے آ جمع ہوئے۔ نجد کا بہت سا حصہ فتح ہو گیا عبدالوہاب اُس کا روحانی پیشوا تھا اور اُس کا خسر محمد ابن سعود دنیاوی حاکم۔ انہوں نے مطیع شدہ صوبجات میں اپنے نائب مقرر کیے اور ان کو سختی کے ساتھ اپنا اطاعت گزار بنائے رکھا۔ سعودی قوم کا جرگہ امن کے زمانہ میں قانونی اور دینی امور سرانجام دیتا لیکن جنگ کے زمانہ میں ایک جنگی کونسل کی حیثیت اختیار کر لیتا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نئی سلطنت نے نہایت دلیری سے ترکی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۹۸ء میں بغداد کا پاشا جو کبھی وزیر اعظم رہ چکا تھا اس تحریک کے خلاف عملی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکہ یہ تحریک آخر کار خلیفوں کے نااہل جانشینوں کو باب عالی سے نکال دیتی اور ایک نئی مسلمان سلطنت کی بنیاد رکھتی۔

ان مصلحین نے اپنے آپ کو سول حکومت میں ہر جگہ ایسا ہی قابل ثابت کیا جیسا کہ لڑائی میں فاتحین کی حیثیت سے انہوں نے خانہ بدوش عربوں کو جن پر ان کی قوت کا دارومدار تھا ایک مستحکم وفاق میں جکڑ دیا۔ زکوٰۃ کا باقاعدہ انتظام کیا۔ جنگ کے زمانے میں مال غنیمت کا ⅘ حصہ تو سپاہیوں کو ملتا اور ⅕ حصہ بیت المال میں جمع ہوتا۔ مالگذاری جس کو قرآن میں خیرات کہا گیا ہے سختی کے ساتھ وصول کی جاتی تھی۔ وہ زمین جو بارش یا دریا سے سیراب ہوتی تھی اُس پر سالانہ آمدنی کا دسواں حصہ مقرر کیا گیا اور وہ زمینیں جو مصنوعی

طریقوں سے سیراب ہوتی تھیں اُن کی سالانہ آمدنی پر بیسواں حصہ مقرر ہوا۔ تمام تاجروں کو اپنے اصل سرمایہ کا ڈیڑھ فیصدی دینا پڑتا تھا۔ باغی اور تفرقہ انداز شہر اور صوبے بھی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تھے۔ پہلی بغاوت کی سزا عام لوٹ مار تھی جس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جاتا تھا۔ دوسری بغاوت یا ارتداد پر وہ تمام زمین جس پر شہر بسا ہوا ہو اور اس کے ارد گرد کی تمام زمین جو اس شہر سے متعلق ہو وہابی سردار کی ملکیت ہو جاتی۔ چنانچہ مصلحین کی یہ جماعت قدرتاً ایک جنگجو فرقہ تھا اور نہایت دلیری کے ساتھ اپنے عقاید کو تلوار کے ساتھ منواتا تھا اس لئے یہ آمدنی کا نہایت ہی قیمتی ذریعہ تھا جو ہر سال دو یا تین لڑائیوں کے ذریعے حاصل کر لی جاتی۔

وہ عقائد جن کو انہوں نے اس طرح خون کے ساتھ لکھا بذات خود نہایت شریفانہ تھے۔ سب سے پہلے جس چیز کو انہوں نے اہمیت دی وہ اخلاق کی عملی اصلاح تھی۔ ترکوں نے اپنی ذلیل شہوت پرستی کو مقدس شہروں میں بھی پھیلا دیا تھا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر بھی قناعت نہ کر کے وہ حاجیوں کے قافلے میں بد اطوار عورتوں کو بھی لے آتے تھے۔ ترکوں کی بدمعاشی کا افسانہ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہی عجیب وہ اس سے بھی زیادہ بداخلاقیوں کے عادی ہو چکے تھے ایسی عادتیں جن کو قرآن نے قطعاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ مقدس شہر میں شراب اور افیون کا اعلانیہ استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ مکہ معظمہ کو جانے والا ترکی قافلہ بداخلاقی کا نہایت ہی نفرت انگیز منظر پیش کرتا تھا۔ یہی وہ عملی اور ظاہری بے حرمتیاں تھیں جن کے خلاف عبدالوہاب نے سب سے پہلے آواز اٹھائی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ ایک دینی فرقہ بن گیا جو وہابیت کے نام سے اب تک مشہور ہے ہندوستانی فرقہ کا بھی بڑی حد تک یہی عقیدہ ہے اس طریقے کے مطابق محمد رسول اللہ کا دین سچی خدا پرستی کا دین ہو گیا۔ اس کے سات بڑے بڑے اصول ہیں۔ اول۔ خدائے واحد پر اعتماد کلی رکھنا۔ دوسرے خدا اور اس کے بندے کے درمیان کسی واسطے کا قطعی انکار۔ جس میں بزرگوں کی دعاؤں اور خود محمد رسول اللہ کی شفاعت تک سے بھی انکار شامل ہے۔ تیسرے ہر شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بذات خود قرآن کی تاویلات کرے اور علماء سوء کی تمام تاویلات کو رد کر دے۔ چوتھے اُن تمام طریقوں مراسم اور ریاکاریوں سے قطعی پرہیز کرنا جن کو گزشتہ اور موجودہ مسلمانوں نے صاف اور سچے مذہب

پر اپنا زاد کیا۔ پانچویں ہمیشہ اُس امام کی تلاش میں رہنا جو سچے مسلمانوں کی تمام کفار کے خلاف فاتحانہ رہنمائی کرے گا۔ چھٹے ہر وقت علمی اور عملی طور پر جہاد کی ضرورت کو مد نظر رکھنا۔ ساتویں روحانی رہنما کی مکمل اطاعت۔ وہابی اصل میں سنیوں کی ایک ترقی یافتہ جماعت کا نام ہے شمال مغربی صوبجات اور بنگال کے تقریباً تمام مسلمان سُنی ہیں۔[۱]

عبدالوہاب کا انتقال سنہ ۱۷۸۷ء میں ہوا اور وہ اپنی تمام فتوحات کو ایک قابل جانشین کے سپرد کر گیا۔ سنہ ۱۷۹۱ء میں وہابیوں نے شریف مکہ کے خلاف ایک کامیاب جنگ کی ۱۷۹۷ء میں انہوں نے بغداد کے پاشا کو بہت خونریزی کے ساتھ پسپا کر دیا اور ایشیائی ترکی کے بہت سے زرخیز صوبجات پر قابض ہو گئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں انہوں نے ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی۔ اور سنہ ۱۸۰۳ء میں اس مقدس شہر کو فتح کر لیا اگلے سال انہوں نے مدینہ شریف بھی فتح کر لیا۔ اسلام کے ان دو مستحکم مراکز میں مصلحین نے ہر اس باشندے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس نے اُن کے طریقے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ مسلمان بزرگوں کی خانقاہوں کو لوٹا اور بے حرمت کیا۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی تک کو بھی نہ چھوڑا۔ اسلام کے ہر ایک دیندار بادشاہ یا شہنشاہ نے اپنے ملک کے بہترین تحائف نذر و نیاز کے طور پر یہاں بھیج رکھے تھے۔ اس طرح گیارہ صدیوں کی جمع شدہ نذر و نیاز صحرائی فرقہ بندوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

اس واقعہ سے جو اضطراب اسلامی دنیا میں پھیلا اُس کا اندازہ اُس پریشانی سے کیا جا سکتا ہے جو عیسائی

[۱] یہ سُنی تقریباً سارے حنفی ہیں اور بہت تھوڑے شافعی۔ حنفی امام ابو حنیفہ کے پیرو ہیں جو سنہ ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء میں فوت ہو گئے۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں اور نماز کے وقت ناف پر ہاتھ باندھتے ہیں اور رکوع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو کانوں تک نہیں اٹھاتے۔ اور نماز کے بعد آمین آہستہ کہتے ہیں۔ شافعیوں کا نام بھی اُن کے امام ابو عبداللہ شافعی کے نام پر ہے جو سنہ ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۰۴ھ مطابق ۸۱۹ء میں فوت ہوئے وہ نماز کے وقت اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں اور جب رکوع کرتے ہیں تو ہاتھوں کو سر سے اوپر اٹھاتے ہیں اور آمین بالجہر کہتے ہیں۔

دنیا کو اس وقت ہوئی جب اُن کو یہ تبلایا گیا تھا کہ براؤرن لٹیروں نے پاپائے روم کے محل کا محاصرہ کر لیا ہے اور خود پاپائے اعظم سینٹ اینجل میں قید ہیں۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کو صرف لوٹا ہی نہیں گیا بلکہ ان مسلح فرقہ پرستوں نے اس کی سخت بے حرمتی بھی کی تھی۔ خود رسول اللہ کے روضہ اطہر کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ پھر حج کا راستہ بھی جو مسلمانوں کی فلاح کا ذریعہ ہے بند کر دیا۔ قسطنطنیہ کی مرمریں مسجد آیا صوفیہ سے لے کر چین کے دور دراز علاقہ کی کچی مسجد تک مسلمانوں کی ہر عبادتگاہ نالہ و شیون سے گونج اٹھی بعض شیعوں نے تو یہاں تک اعلان کر دیا کہ بارھویں امام کے ظاہر ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ مگر پرانی وضع کے دیندار مسلمانوں کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ وہ جھوٹا پیغمبر یعنی دجال جس کے متعلق آنحضرت نے پیشگوئی فرمائی تھی زمین پر نازل ہو گیا ہے گویا اب قیامت آیا ہی چاہتی ہے۔

۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۹ء تک نماز روزہ کی مخالفت کی بنا پر کوئی قابل ذکر قافلہ حج کی غرض سے صحرا سے نہ گزرا۔ وہابیوں نے شام کو فتح کرتے ہوئے خلیج فارس میں انگریزوں سے بھی جنگ کی اور قسطنطنیہ تک کو خطرہ میں ڈال دیا۔ آخر کار محمد علی پاشا والیٔ مصر مصلحین کو تباہ برباد کرنے میں کامیاب ہو گیا ۱۸۱۲ء میں ٹھوس کیتھ نے جو سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا پاشا کے لڑکے کے ماتحت مدینہ شریف پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ۱۸۱۳ء میں مکہ معظمہ پر بھی قبضہ ہو گیا اور اس کے پانچ سال بعد یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصہ شہود پر آئی تھی اُسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی۔

وہابی جو اب خانماں برباد اور منتشر ہو چکے ہیں ایسے عقائد کے حامل ہیں جن کو خوشحال مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے متعلق اعتقاد رکھنے کے بارے میں یہ اُس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ میں خدائی صفات کے منکر ہیں۔ اُن کے نام پر عبادت کرنے کو منع کرتے ہیں اور اُن بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز دینے کو برا سمجھتے ہیں جن کا انتقال ہو چکا ہے۔

بہرحال اُن کی قوت کا راز اُن کے اخلاص اور عملی دینی تعلیم میں مضمر ہے۔ وہ علانیہ اس بات پر مصر

تھے کہ ہمیں آغاز اسلام کے مسلمانوں کے عقائد۔ اُن کے سیدھے سادے اطوار اور اُن کے اخلاق کی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور تبلیغ اسلام میں اُن کے عزم کا پیرو کار خواہ اس میں کتنے ہی کفار کا خون کیوں نہ بہے یا خود ان کو کتنی ہی جانوں کی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے ۔ ان کے دو بڑے اصول یہ ہیں ۔ خدا کی وحدانیت اور دوسرے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دینا (بے خودی) وہ اُس رواداری کو بہت بُرا سمجھتے ہیں جس سے پیغمبر اسلام نے اپنے سخت مذہبی تعصب کو کمال ہوشیاری سے ملکی قوانین کی حیثیت دے دی ہے اور جس کو اسلامی سلطنتوں نے اپنی اندرونی ضروریات اور خارجہ تعلقات کے مطابق رواج دیا ہے وہ ہر ایک مسلمان سے خدا کی مرضی کے سامنے کامل اطاعت چاہتے ہیں (اسلام) جو بانی اسلام کی کامیابی کا راز ہے ۔ مگر دیگر اصلاحی جماعتوں کی طرح ہمیشہ اس اصل الاصول پر زور دیتے ہوئے انہوں نے اپنی تحریک کو عالموں میں اپنے مواحدانہ اعتقاد کی وجہ سے اور عوام میں دیرینہ رواج اور مقدس روایات کی مخالفت کی وجہ سے کمزور کر دیا ہے ۔ ایشیا کے بہت سے حصوں میں ایک وہابی کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دیگر مسلمانوں سے علیحدہ ہو جائے ۔ اُس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی محبوب روایات ۔ اپنے مذہبی تہوار اور اپنے مقدس اعتقادات کو چھوڑ دے ۔ اُس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کی عادت بھی چھوڑ دے جو اس کے لئے باعث تسکین خاطر تھی ۔ ـلہ

بہر حال ہندوستان کے وہابی مسلمانوں میں ایک ایسے اصول کی اشاعت کرتے ہیں جس کی سختی ان تمام تکالیف کو نرم کر دیتی ہے ۔ سید احمد صاحب جب مکہ ہی میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ سید احمد صاحب کے عقائد بھی اُن صحرائی بدوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اٹھانا پڑے لہذا مکہ معظمہ میں اُن کی اعلانیہ بے عزتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبد الوہاب کے

ـلہ یہاں پر اور اس کے بعد میں نے اپنے مضمون مندرجہ انڈین ڈیلی نیوز ۱۸۶۶ء سے مدد لی ہے ۔

پکے مرید تھے۔ پہلے جو چیز اُن کی نظر میں محض خواب و خیال تھی اب وہ ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا پہلے جو کچھ اُن کی تعلیم میں مبہم تھا اب اُس نے اُس خوفناک اور باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کر لی جس سے عبدالوہاب نے عرب میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اور جس سے سید احمد صاحب کو امید تھی کہ وہ ہندوستان میں اُس سے بھی زیادہ عظیم الشان اور پائدار سلطنت قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا علم کُلّی یا صرف خدا کو ہو سکتا ہے لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے ظاہری عادات بالکل بدل گئے اب اُن کی زندگی کا مقصد صرف مرید بنانا ہی نہ تھا بلکہ اُس مقصد اصلی کو پورا کرنے کے لئے یہ محض ایک ابتدائی ذریعہ تھا۔ بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو ان کا وعظ سننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے ان کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے مجبور نہ کر سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ ان پرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا ہے اب کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دور دراز جنگجو آبادی پر لگی رہتی تھی اُن کی آئندہ زندگی کو ہم اپنے پہلے باب میں اچھی طرح بیان کر چکے ہیں اب ہمیں اس مجموعہ قوانین کا حال مختصراً بیان کرنا ہے جو اُن کے پیروؤں نے اُن کی تعلیم سے اخذ کیا اور جس کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال اسکی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔

سب سے پہلی مصیبت جو ہندوستان کے وہابیوں کو پیش آئی وہ اُن کے امام کا غائب ہو جانا تھی۔ اُن کی وفات نے اُن کی اس امید کو خاک میں ملا دیا کہ وہ خود بنفسِ نفیس ایمانداروں کی فتح و نصرت کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اس غیر اختیاری واقعہ کی تاویل بھی جماعت کے نئے اصولوں کے مطابق کسی نہ کسی طرح ہوتی رہی۔ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے قریب بہت سی جنگیں اور بغاوتیں ہوں گی۔ نئی نئی اخلاقی جماعتیں پیدا

ہوں گی۔ حقیر آدمی باعزت جگہوں پر قابض ہو جائیں گے۔ زلزلے آئیں گے۔ وبائیں پھیلیں گی۔ قحط عام ہو جائے گا۔ تو امام امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ وہ آل رسول میں سے ہوں گے۔ اور ان کا نام بھی محمد ہوگا ان کی پیدائش پنجاب کے شمالی مغربی سرحد کے پار ہوگی اور وہ اپنی زندگی کے کچھ سال انسانوں کی نظروں سے چھپے رہیں گے۔ آخرکار وہ عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور قسطنطنیہ کو دوبارہ فتح کریں گے جو اس وقت عیسائی حکمرانوں کے قبضہ میں ہوگا۔ اُس وقت دجال پیدا ہوگا۔ اور امام کے خلاف ایک سخت جنگ کرے گا۔ تا آنکہ حضرت عیسیٰؑ دمشق کے مشرق میں ایک سفید مینار کے قریب زمین پر نازل ہوں وہ سرکشوں کو تباہ و برباد کر دیں گے اور تمام دنیا کو آنحضرت صلعم کے سچے مذہب کے دائرے میں لے آئیں گے۔

ہندوستانی وہابیوں نے یہ دعوے کیا تھا کہ سید احمد صاحب ہی وہ بڑے امام ہیں جن کو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے تشریف لانا ہے مگر جن حالات میں اُن کی زندگی ختم ہوئی اس کی حق و باطل کی جنگ کے عام عقیدہ کے ساتھ کسی طرح بھی مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی اس لئے انہوں نے عام عقیدہ کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ امام مہدی قیامت کے نزدیک تشریف نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت کی وفات اور قیامت کے درمیانی زمانہ میں ایک مصلح کی حیثیت سے ظاہر ہوں گے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ اُن میں موعودہ امام کی تمام نشانیاں (یہ لفظ عیسائیوں کی تاریخ سے لیا گیا ہے) پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے بہت سی مستند کتابوں کے حوالے دے کر ثابت کیا کہ تیرھویں صدی ہجری مطابق ۱۷۸۶ء - ۱۸۸۰ء میں ہی امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ سید احمد صاحب ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گو مصلحین شیعوں کو بہت برا سمجھتے تھے لیکن پھر بھی اُن کے علماء کو کام میں لایا گیا تھا۔ شیعہ علماء نے سنیوں سے زیادہ صحیح وقت مقرر کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ظہور امام کا وقت ۱۲۶۰ء مطابق ۱۸۴۴ء تھا۔ کیا یہ محمد رسول اللہ کی حدیث نہیں ہے کہ جب تم خراسان کی طرف سیاہ جھنڈے آتے دیکھو تو اُن کے ساتھ مل جاؤ کیونکہ اُن کے ساتھ خدا کا خلیفہ اور ایلچی ہوگا۔ ہندوستان پر عیسائی حکومت کا غلبہ اور زمانہ کی دیگر سینکڑوں علامات اُس وقت آفات زمانہ کی اطلاع دے رہی ہیں جو اُن کے ظہور کا پیش خیمہ ہوں گی اس میں زیادہ قوت

پیدا کرنے کے لئے جعلی پیشگوئیاں بنائی گئیں۔ اُن میں سے چند اشعار جو ایک طویل نظم سے لئے گئے ہیں اور جو آج تک شمالی ہندوستان میں پڑھی جاتی ہے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

میں خدا کی طاقت کو دیکھتا ہوں اور دنیا میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت دیکھتا ہوں۔

میں زذیلوں کو بے قاعدہ علم حاصل کرتے اور بزرگی کی قبا پہنے ہوئے دیکھتا ہوں۔

میں نیکی کو کم اور تکبر کو زیادہ ہوتے دیکھتا ہوں۔

میں ترکوں اور ایرانیوں میں جنگ و جدل دیکھتا ہوں۔

میں سبزہ زاروں کو نیکوں سے خالی اور بدوں سے آباد دیکھتا ہوں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں مگر مایوس نہیں ہوں کیونکہ میں مصیبتوں کے رفع کرنے والے کو دیکھتا ہوں

میں دیکھ رہا ہوں کہ جب ۱۲۰۰[1] سال گزر جائیں گے تو عجیب غریب واقعات رونما ہوں گے۔

دنیا کے تمام بادشاہوں کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

میں ہندوؤں کو خراب و خستہ اور ترکوں کو مظلوم دیکھ رہا ہوں۔

اُس وقت ایک امام کا ظہور ہو گا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔

میں دیکھتا ہوں اور پڑھتا ہوں (ا ح م د[2]) یہ حروف حاکم کے نام کو ظاہر کرتے ہیں[3]

ایک اور صریح پیشگوئی

مولانا نعمت اللہ کی پیشگوئی۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

---

[1] اصل نظم میں ۵۰۰ تھا لیکن سید احمد صاحب کی وفات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے اس کو ۱۲۰۰ کر دیا گیا۔ کلکتہ ریویو جلد ۵ صفحہ ۱۰۰ جہاں سے میں نے یہ نظم لی ہے۔

[2] اصل نظم میں م ح م د (محمد) تھا۔

[3] تمام نظم سے چند اشعار نقل کئے ہیں ۱۸۶۵ء کے وہابی مقدمہ کے سلسلہ میں سرکاری دستاویزات میں درج ہے۔

میں یہ سچ کہتا ہوں کہ ایک بادشاہ ہوگا۔

اس کا نام تیمور ہوگا اور وہ ۴۰ سال حکمرانی کرے گا۔

یہاں پر مسلسل مغل بادشاہوں کے نام آتے ہیں جو شاہ جہاں کی اولاد کے آخری بادشاہ تک ہیں۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ ہوگا۔

نادر ہندوستان پر حملہ کرے گا۔

اُس کی تلوار سے دہلی میں قتل عام ہوگا۔

اس کے بعد احمد شاہ حملہ کرے گا۔

اور وہ پہلے خاندان کو تباہ کر دے گا۔

اس بادشاہ کے مرنے کے بعد

پہلے خاندان سے ایک بادشاہ دوبارہ تخت نشین ہوگا۔

اُس وقت سکھ قوم طاقتور ہو جائے گی اور ہر قسم کا ظلم روا رکھے گی

اور چالیس سال تک یونہی ہوتا رہے گا

پھر نصرانی تمام ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔

وہ ایک سو سال تک ملک پر حکمرانی کریں گے۔

ان کے زمانے میں تمام دنیا میں بہت ظلم ہوگا۔

ان کو تباہ کرنے کے لئے مغرب میں ایک بادشاہ ہوگا۔

یہ بادشاہ نصرانیوں کے خلاف اعلان جنگ کرے گا۔

اس لڑائی میں بہت سے انسان قتل ہوں گے۔

اور مغرب کا بادشاہ تلوار کے ذریعے اس جہاد میں کامیاب ہوگا۔

حضرت عیسٰے کے پیروؤں کو شکست ہوگی۔

پھر اسلام کا غلبہ چالیس سال تک رہے گا۔

پھر ایک بے دین قوم اصفہان سے نمودار ہوگی۔

ان ظالموں کو تباہ کرنے کے لیے حضرت عیسٰے نازل ہوں گے اور مہدی موعود کا ظہور ہوگا۔

اور یہ سب کچھ دنیا کے خاتمہ کے قریب ہوگا۔

یہ نظم سنہ ۵۷۰ھ میں لکھی گئی [1]

سنہ ۱۲۷۰ھ میں مغرب کا یہ بادشاہ ظاہر ہوگا۔

نعمت اللہ خدا کے رازوں کو جانتا ہے

اس کی پیش گوئی انسانوں کے سامنے پوری ہوگی۔

ہندوستانی وہابیوں نے اپنے امام کی تبلیغ دین کو منجانب اللہ ثابت کرنے کے بعد تمام معمولی مسائل کو چھوڑ کر اپنی توجہ جہاد کے اہم اصول کی طرف مبذول کر دی۔ اس فرقے کے تمام مذہبی ادب میں اُس شخص کے لیے جو ان کے اصلاحی عقاید پر ایمان لا چکا ہو۔ اسی فرض کی بجا آوری سب سے مقدم ہے۔ اُن کی ابتدائی کتابوں میں شریعت کے اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاد ایک بہت بڑے امام کا کام ہے جس طرح بارش سے انسان، حیوان، نباتات سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح کافروں کے خلاف جہاد سے تمام آدمی مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو عام فائدہ جس سے تمام انسان حتیٰ کہ بت پرست، کفار، حیوانات اور نباتات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور دوسرا خاص فائدہ ہے جس سے خاص خاص جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں اور وہ بھی مختلف مقدار میں۔ عام فوائد یہ ہیں۔ خدا کی رحمتیں مثلاً فصلوں کے وقت بارش کا خوب ہونا۔ غلے کا زیادہ مقدار میں پیدا ہونا اچھے زمانہ کا ہونا جس میں انسان ہر قسم کی مصیبتوں سے آزاد ہو گیا ہے۔ جانداروں

---

[1] مطابق ۱۱۷۴-۱۱۷۵ء [2] مطابق ۱۸۵۳-۱۸۵۴ء

کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اہل علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ عدالتیں انصاف کرتی ہیں۔ مدعی دلیر اور دولتمند سخی ہو جاتے ہیں ان تمام برکات میں سو فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ دین اسلام کی عزت کو دوبالا کیا جائے اور مسلمان بادشاہ طاقتور فوج کے ساتھ سربلند ہو اور تمام ملکوں میں اسلامی شریعت کو رواج دینے پر قادر ہو جائے۔ اب جہاں تک خدائی رحمتوں کا تعلق ہے ملک ہندوستان کا مقابلہ ترکی یا ترکستان سے کرو۔ یہی نہیں بلکہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء کے ہندوستان کی حالت کا جب کہ اس کا بہت سا حصہ کفار کے قبضہ میں چلا گیا تھا (دارالحرب) مقابلہ دریا تین صدی پہلے کی حالت سے کرو اور اس وقت خدا کی جو رحمتیں نازل ہوتی تھیں اور اس وقت کے عالموں کی تعداد کا مقابلہ اس وقت کی حالت اور عالموں کی تعداد سے کرنا چاہیے۔

ان کی مشہور نظموں میں بھی یہی روح کام کر رہی ہے ہماری سرحد پر باغی اپنے کیمپ میں صبح و شام اس قسم کے ترانے کی لے میں قواعد سیکھتے ہیں اور دیگر دوں کی وہ کمپنیاں جو ہمارے علاقہ سے بھرتی کی جاتی ہیں شمال کی طرف جاتے ہوئے برطانوی شاہراہوں پر یہی نظمیں گاتی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے خدا کی حمد بیان کرتا ہوں جو تمام تعریفوں سے بالاتر ہے پھر اس کے رسول ؐ کی ستائش کرتا ہوں اور جہاد پر نظم لکھتا ہوں

جہاد وہ جنگ ہے جو محض دین کے لئے لڑی جاتی ہے نہ کہ طاقت و اقتدار حاصل کرنے کے لئے۔ مقدس کتابوں میں اس کی بہت تعریف لکھی ہے ان میں سے چند بیان کرتا ہوں۔

کافروں کے ساتھ جہاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور ہر کام سے پہلے اس کے لئے انتظام کرنا چاہئے۔

وہ شخص جو صدق دل سے اس کام میں ایک پیسہ بھی دیتا ہے وہ آخرت میں سات سو گنا پائے گا اور وہ جو خرچ بھی کرتا ہے اور خود بھی شریک ہوتا ہے وہ خدا سے سات ہزار گنا پائے گا۔ اس کی اولاد کو عذاب قبر سے خوف نہ کرنا چاہئے نہ قیامت سے اور نہ ہی روز جزا سے۔ بزدل نہ بن۔ خدا کے بھیجے ہوئے امام کا ساتھ دے اور کافروں کو تباہ کر دے میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ تیرھویں صدی ہجری میں ایک امام آیا لہ ۔

لہ مطابق سنہ ۱۷۸۶ء

اے میرے دوست جب ایک دن مرنا ہی ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ خدا کی راہ میں جان دی جائے ہزار دل آدمی جنگ میں جاتے ہیں اور صحیح سلامت واپس آتے ہیں۔ اور ہزاروں ہیں کہ گھر میں بیٹھتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔

تو دنیا کے دھندوں میں پھنس گیا ہے اور بیوی بچوں کے خیال میں خدا کو بھول گیا ہے تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کتنی مدت رہ سکے گا اور موت سے کب تک بچا ہے گا اگر تو دنیا کو خدا کے لئے چھوڑ دے گا تو ہمیشہ جنت کے مزے لوٹے گا۔

ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام پھیلا دے تاکہ اللہ اللہ کی آواز کے سوائے اور کوئی آواز سنائی نہ دے۔

انگریزوں کے خلاف ضرورت جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیشگوئیوں سے پر اور ضرورت جہاد کے لئے وقف ہے۔ ان کتابوں کے محض نام ہی سے اُن کے تمام و کمال باغیانہ ہونے کا پتہ چلتا ہے میں ذیل میں چودہ کتابوں کی فہرست دیتا ہوں۔ بعض تو اُن میں حد

[۱] رسالہ جہاد کلکتہ ریویو ۱۰۱ صفحہ ۳۹۶ [۲] صراط المستقیم۔ یہ امام سید احمد امیر المومنین کے ملفوظات ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اس کو فارسی میں لکھا اور مولوی عبدالجبار کانپوری نے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۲) قصیدہ:۔ یہ ایک نظم ہے جس میں جہاد کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اور اُن لوگوں کے لئے اجر بیان کیا گیا ہے جو اس میں حصہ لیں گے مصنفہ مولوی کرم الہی کانپوری۔

(۳) شرح وقائع:۔ کافروں کے خلاف جہاد پر بحث ہے۔ اس میں مجاہدین کے متعلق اور کن کن سے جہاد کرنا چاہیئے کے متعلق پوری ہدایات موجود ہیں۔ اس میں بہر حال اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جہاد اُس وقت کرنا چاہیئے جبکہ مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہو۔

(۴) منظوم پیشگوئی نعمت اللہ:۔ یہ انگریزی حکومت کے زوال کی پیشگوئی ہے اور اس میں ایک مغربی بادشاہ کی آمد کا بیان ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کے پنجے سے رہائی دلائے گا۔

(۵) تاریخ قیامرودم۔ مصباح السیر۔ یہ عبدالوہاب بانی جماعت کی سوانح عمری ہے۔ اُس پر مظالم۔ اُس کی جنگ ترکی مرتدین کے خلاف وغیرہ درج ہیں (مسودہ)

(۶) آثار محشر یعنی قیامت کی نشانیاں مطبوعہ مولوی محمد علی ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء۔ اس منظوم کتاب کی بہت اشاعت کی گئی ہے۔ یہ پنجاب کی سرحد پر خیبر کی پہاڑیوں پر ایک جنگ کی پیشگوئی ہے جہاں پر انگریز پہلے پہل مسلمانوں کو شکست دیں گے۔ اس پر مسلمان ایک سچے امام کی تلاش کریں گے پھر ایک جنگ ہوگی جو چار دن تک رہے گی جس کا انجام انگریزوں کی مکمل تباہی پر ہوگا۔ (باقی برصفحہ ۳۲)

سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں اور مسودات کی صورت میں رانداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں اُن میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی ہے اور اُن کا زہریلا اثر اُن کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلغین کے اُس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ روح پھونک دی جاتی ہے بنگال کے ہر ضلع تک پہنچ چکا ہے۔

ان میں سے اکثر کتابیں تو اعلانیہ برطانوی ہندوستان کے بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں کتاب جتنی زیادہ سخت اور باغیانہ ہو اتنی ہی عوام میں زیادہ مقبول ہوگی لیکن یہ اشتعال انگیز لٹریچر تو اُس مستقل چہارگانہ تنظیم کا ایک حصہ ہے جو وہابی لیڈروں نے بغاوت پھیلانے کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے مقدم پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت ہے۔ (پروپیگنڈا) جس نے کچھ مدت کے لئے اُس شہر میں انگریزی حکام کا مقابلہ کیا تھا

(بقیہ صفحہ ۳۱) یہاں تک کہ حکومت کی بو بھی اُن کے دل و دماغ سے نکل جائے گی۔ اس کے بعد امام مہدی کا ظہور ہوگا اور اب کہ مسلمان ہندوستان کے حکمران ہوں گے تو وہ جوق در جوق مکہ معظمہ میں اُن سے جا ملیں گے یہ واقعات اُس وقت رونما ہوں گے جب کہ چاند اور سورج دونوں رمضان المبارک کے مہینے میں گرہن ہوں گے۔

(۷) تقویۃ الایمان۔ یعنی استحکام دین۔ مصنفہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی۔

(۸) تذکیر الاخوان یعنی برادرانہ گفتگو۔ مصنفہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی۔

(۹) نصیحت المسلمان۔ مسلمانوں کو نصیحت۔ مصنفہ مولوی کرم علی کانپوری۔

(۱۰) ہدایت المومنین۔ مصنفہ اولاد حسین۔

(۱۱) تنویر العینین۔ آنکھوں کی روشنی۔ عربی میں ہے۔

(۱۲) عبد المجاہد۔ عربی میں ہے۔

(۱۳) تنبیہ الغافلین۔ اردو میں ہے۔

(۱۴) چہل حدیث۔ رسول اکرم کی چالیس حدیثیں جہاد کے متعلق۔

اور جو متعدد سرکاری مقدمات کی وجہ سے اب بہت کمزور ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی تمام بنگال میں کافی اثر رکھتا ہے
۱۸۲۱ء میں امام صاحب نے اپنے خلفا کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و
خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے
کے قریب تھی انہوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سر نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفا جو ان تھک
واعظ خود اپنے آپ سے بے پرواہ۔ بے داغ زندگی بسر کرنے والے۔ انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں
ہمہ تن مصروف روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لئے ایک مستقل نظام کرنے میں نہایت چالاک تھے
وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور اُن کے لئے ایک مثال تھے۔ اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور
یہ انہیں کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہموطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالےٰ کے متعلق
بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ مگر صرف اخلاقی نظام ہی ایک بہت بڑی جماعت کو آپس میں اکٹھا
نہیں رکھ سکتا۔ اس نئی زندگی کے مذہبی پہلو نے بہت جلد اپنی طاقت کو کھونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس
تحریک کے ابتدائی لیڈروں کے ماتحت بھی اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اور خلفا کو ہمیشہ اپنے
سامعین کی کافروں کے خلاف نفرت کو بار بار مشتعل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ پٹنہ کے پروپیگنڈا نے
اس کو صاف طور پر بھانپ لیا تھا اور وقت کی نئی ضروریات کے ساتھ اپنی تعلیم میں مطابقت پیدا کرتے
رہے۔ انہوں نے بیدار شدہ ضمیر کی قوت کی دہشت انگیزیوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اُس سخت اور
دائمی نفرت و حقارت کو ابھارے رکھا جو ہندوستانی مسلمان کو انگریزوں سے ہے۔ اس طرح انہوں نے
اپنی تعلیم کی بنیاد مسلمانوں کے قلوب کی اعلےٰ ترین قابلیتوں کے بجائے عوام کے تعصبی جوش و خروش
پر رکھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصہ کو مضبوط تر
کرتے رہیں۔ انہوں نے پٹنہ کے دارالاشاعت کو باغیوں اور غداروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا۔ اور
اُس کے اردگرد دیواروں اور حجروں کی کئی ایک بھول بھلیاں بنائی ہوئیں تھیں۔ جو خفیہ دروازوں کے

ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے طیار کئے گئے تھے جہاں وہ رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفا نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کی مسلح ہو کر مدافعت کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن اُن کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچیدار راستوں کمروں اور باہر جانے کے راستوں کی شکل میں اختیار کیا۔ آخر کار جب حکومت نے اس سازشی ادارے کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو اس عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا گویا اسے ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کارروائی کرنا ہے۔

ہر ایک ضلع کے مبلغین متعصب لوگوں کے گروہ دار الاشاعت میں بھیجتے اُن میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھی بھڑکا دیتے تھے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ اُن میں سے زیادہ ہشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو ان کو اُن کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا۔

میں اس بات کے لئے بے قرار ہوں کہ پٹنہ کے خلیفوں کی تاریخ کا جو روشن پہلو ہے اس کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ بہترین اخلاقی نظام سے شروع کرتے ہوئے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تعلیم کے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اپنی زوال پذیر تحریک کو انسانی دل کے بدترین جذبہ کو اُبھار کر مضبوط کیا۔ میں اس کے بعد اُن کے تربیت یافتہ مبلغین کا ایک وعظ مثال کے طور پر نقل کروں گا۔ یہ اُس تعلیم کا ایک نمونہ ہے جس سے اِن مبلغین کی تربیت کی جاتی ہے پٹنہ کا پروپیگنڈا ہمیشہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ کافروں کے ساتھ جہاد کریں اور یا اس لعنتی سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔ کوئی سچا دیندار اپنی روح کو خراب کئے بغیر اس حکومت کا وفادار نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ جہاد یا ہجرت سے منع کرتے ہیں وہ دل کے منافق ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُس ملک میں جہاں اسلام کے سوائے کوئی اور مذہب رائج ہو، وہاں اسلامی قوانین کو رواج نہیں دیا جا سکتا۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ آپس میں متحد ہو جائیں اور کفار کے خلاف جہاد کریں۔ جو لوگ جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے ان کو کسی اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر جانا چاہیئے اس وقت ہندوستان سے ہجرت کرنا ایک ضروری فرض ہے۔ جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے اُس کو صاف طور پر اعلان کر دینا چاہیئے کہ وہ عیش و عشرت کا بندہ ہے۔ جو کوئی ایک دفعہ ہجرت کر جائے اور پھر واپس آ جائے اس کو جان لینا چاہیئے کہ اُس کی تمام گذشتہ قربانیاں رائگاں گئیں۔ اگر وہ ہندوستان میں مر جائے تو وہ نجات کا راستہ نہ پائے گا۔

القصہ یہ کہ اے برادران عزیز ہمیں اپنی حالت پر رونا چاہیئے کہ خدا کا پیغمبر ہم سے اس بات پر ناراض ہے کہ ہم کفار کے ملک میں بستے ہیں۔ جب خدا کا رسول ہی ہم سے ناراض ہے تو پھر ہم کو کونسی جائے پناہ مل سکتی ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے ہمت دی ہے اُن کو ہجرت کی تیاری کرنی چاہیئے کیونکہ ہر طرف سے آگ کے شعلے لپک رہے ہیں اگر ہم سچ بولتے ہیں تو ہمارا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور اگر ہم چُپ رہتے ہیں تو ہمارا ایمان خراب ہو جاتا ہے[۱]

باغیانہ لٹریچر اور پٹنہ کا مرکزی پروپیگنڈا کے علاوہ وہابیوں کا دیہاتی علاقوں میں اپنا مذہب پھیلانے کے لیے ایک باقاعدہ اور مستقل نظام تھا گو یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیاں ثابت ہوتے لیکن میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں۔ اُن میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی کو شروع کرتے ہیں۔ اکثر پتے اس مذہبی جوش کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں جس میں ان زہریلے اصولوں کا جن کے ماتحت پٹنہ کے واعظین اُن کی تربیت کی تھی شائبہ تک نہیں ہوتا۔

ایک مہذب انسان جو شہر کی گنجان آبادی میں رہتا ہے۔ اگر اُس کے لیے سفر کرنا ممکن ہو تو وہ مال و اسباب اور ہم سفر رفیقوں کی ہمراہی میں بہ سہولت سفر طے کرے گا لہذا اُس کے لیے مبلغین کی آزادانہ

---

[۱] جامع التفاسیر ۱۸۶۷ء میں دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء صفحہ ۱۹۰ پہلا پیراگراف مختصر کر دیا گیا ہے صفحہ ۱۹۱

زندگی اور ان کے بے یار و مددگار سفر کا تصور ذرا مشکل ہوگا۔ ہم یہ سب محسوس کرتے ہیں کہ تنہائی میں روح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں پر اکیلا یا پیادہ سفر کرنے والا درویش گھروں میں رہنے والے لوگوں سے زیادہ اچھا اور بہتر سوچ سکتا ہے جہاں تک میرا تجربہ ہے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا سب سے کم خود غرض اور بے لوث ہوگا۔ ہر انگریز اس بات پر محبت انگیز جذبہ کے ساتھ یقین رکھتا ہے۔ کہ جب اُس کے اسلاف زیادہ خوشحال تھے تو ہم سے کہیں زیادہ وہ اپنی زندگی انگلستان کی کھلی فضاؤں میں بسر کرتے تھے۔ زندگی کے ستائے ہوئے انسان کے لیئے بچپن کی کوئی یادگار دل خوش کن ہو سکتی ہے تو کھلی ہواؤں میں عیسائی قصہ کی تمثیل کا وہ نظارہ ہے جس میں ایک قافلہ کسی تباہ کن شہر سے نکل کر بیت المقدس میں داخل ہو جاتا ہے۔

کھلی ہواؤں میں زندگی بسر کرنے کا یہ جذبہ زمانہ قدیم کے ہندوستان میں درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ یہاں آب و ہوا کی موافقت نے سرد ملک کے رہنے والے انسانوں کی طرح اپنے بچاؤ کے لئے مکانات کی تعمیر کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ سنسکرت کے قوانین زندگی کے مطابق اونچی ذات کے گھرانوں کے ہر ایک آدمی کے لئے ضروری ہے کہ جس وقت اُس کے ہاں اولاد ہو جائے وہ اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ چھاڑ جنگل میں تنہا زندگی بسر کرے ہر ایک مقبول عام کہانی میں ہمیں ندی کے کنارے پر ایک قابل عزت سنیاسی کا ذکر ملتا ہے اور شکنتلا کے سب سے زیادہ دل آویز نظارے وہ ہیں جہاں ایک خوبصورت لڑکی وسیع و عریض جنگل کے منظر عام پر سدھائے ہوئے ہرنوں کے جھرمٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ وہابی رہنماؤں نے ہندوستان میں اس گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے قومی جذبہ سے بڑی ہشیاری سے فائدہ اٹھایا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے شہروں کے ناکارہ انسان جب عیاشی اور اوباشی میں اپنا تمام سرمایہ برباد کر چکتے ہیں یا وہ مجرم جو قانون کی زد سے اب کس طرح بھی بچ نہیں سکتے تھے کسی نہ کسی مذہبی جماعت میں شامل ہو کر پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے یا بے یار و مددگار صوبہ بہ صوبہ پھرنے کی وجہ سے اپنے ارد گرد تقدس کا حصار کھینچ لیتے ہیں۔

وہابی مبلغ کی یہی تجرد پسندانہ زندگی ہے جو سب سے زیادہ اُن دیہاتوں کو جو ان کی راہ میں پڑتے اپنی طرف متوجہ کرلیتی۔ سال میں کئی کئی مہینے وہ کسی کے گھر میں قدم تک نہیں رکھتا۔ وہ دور دراز کے صوبوں سے آتا لیکن اس طول طویل سفر میں اُس کا کوئی ہمسفر نہ ہوتا بجز شاید ایک وفادار مرید کے جو اُس کو اس کے مراقبوں سے وقتاً فوقتاً چونکا دیتا۔ اس کی حلیم الطبعی اور اپنے گرد و پیش سے بے تعلقی اُس کو عام آدمیوں سے ظاہراً بالکل مختلف بنا دیتی ہے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیہاتی اُس کے اردگرد جمع ہو جائیں اور کچھ مدت کے لئے پانی اور زمین کی حد بندی کے جھگڑوں کو فراموش کر دیں۔ یہ مبلغ ہر وقت بغاوت کی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ایسے اصولوں کی اشاعت بھی کرتے جو لامحالہ اُن کے قبول کرنے والوں کو بغاوت کی طرف لے جائیں۔ یہ وہ اصول ہیں جن کے متعلق بیکن کے مقولے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ ان سے انسانی سوسائٹی اور انصاف کے قوانین نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ وہ احکامات الٰہی کو رحم و شفقت کے بجائے ظلم و تعدی سے رائج کرتے ہیں یہ امر مشکوک ہے کہ بعض مبلغین اس قسم کی زہریلی تعلیم سے قطعاً پرہیز کرتے ہیں۔

۱۸۶۰ء میں بنگال کے متعصب مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے ہوئے میں نے ایک ایسا ہی واقعہ سنا تھا۔ مجھے معاف فرمایا جائے اگر میری تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ میں وہابی اور غدار کو ہم معنی سمجھتا ہوں۔ ایک وہابی مبلغ دور دراز سے ایک گاؤں میں وارد ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد ہزاروں مسلمان اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ آس پاس کے ہندوؤں نے کافروں کے خلاف جوش و خروش کی تباہ کاریوں سے خائف ہو کر جو ایسے اجتماعات کا لازمی نتیجہ ہیں۔ نہایت عجلت کے ساتھ ضلع کے حکام کی طرف مدد کے لئے پیغامبر دوڑا دیئے اس مبلغ نے اپنے مسلمان سامعین کی بت پرستانہ عادات اور فسق و فجور کی زندگی پر لعنت ملامت کی اور جہاد کے مسئلے پر کسی قسم کا اظہار خیال کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ مگر عام لوگ دور دراز سے محض اخلاقی باتیں سننے کے لئے نہ آئے تھے۔ اس لئے ناامید ہو کر انہوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی

جب ہندو پیغامبر واپس آئے تو انہوں نے اِس بظاہر باغی واعظ کو بالکل بے یار و مددگار پایا۔ اب وہ آگ اور تھوڑے سے چاولوں کے لیے بھی ہندو دیہاتیوں کا دست نگر تھا۔

عام طور پر وہابی مبلغ کو اُس ضلع کے حاکم سے جہاں سے اُس کا گزر ہو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ فی الحقیقت اس کا تبلیغی میدان مجسٹریٹ کی عدالت کے سامنے کھلی جگہ ہے۔ جہاں مقدمہ باز جمع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا مبلغ جس کے ساتھ میری ملاقات ہوئی وہ اس میدان میں جو کمشنر کے سرکٹ ہاؤس کے متصل واقع ہے ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اور پیپل کے ایک درخت کے نیچے اپنے ہم مذہبوں کے ایک انبوہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹے قد کا ایک سرخ گھوڑا تھا جس کی نحیف گردن اُس کے سر کو سنبھالے ہوئے تھی اور جس کی ناہموار دم زین کے پیدا کردہ زخموں پر سے مکھیاں ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس غریب جانور کی اگلی دو ٹانگیں سوسن کی رسی سے بندھی ہوئی تھیں اور وہ بہت تکلیف سے گھاس کے ایک گچھے سے دوسرے گچھے پر کودتا تھا۔ کبھی کبھی غصے میں آکر وہ اُس مکھی پر اپنا منہ مارتا تھا جو اُس کی ناہموار دُم کی دست بُرد سے دور ہو جاتی تھی۔ پھر جلد ہی سفر کی تکان سے چور حیوان کی طرح نہایت بے پروائی سے اپنی گردن کو دراز کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ اس بزرگ آدمی کے مُنہ پر ترو تازگی تھی اور اس کے ساتھ ایک سفید لمبی داڑھی۔ وہ لفظوں کو چبا چبا کر باتیں کرتا تھا مگر نہ اِس قدر کہ وہ اپنی شمالی ہند کی طرز ادا کو جس میں وہ اپنے فقرات ادا کرتا تھا چھپا سکے۔ وہ خود بڑا مخلص معلوم ہوتا تھا۔ آٹھ دس سامعین اُس کو بڑی بے پروائی سے سن رہے تھے۔ یہ سامعین سوائے اُس معمولی سے سلام کے جو چلتے وقت کیا جاتا ہے انگلستان میں چوراہوں پر وعظ کہنے والوں کے مجمع کے سامعین کی طرح نہایت آزادی کے ساتھ آتے اور چلے جاتے میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں مئی کا مہینہ تھا لہٰذا اس بزرگ آدمی نے بڑی سختی کے ساتھ آنے والے میلے کی برائیوں کی پر جوش مذمت کی۔ اس کو اُن کے ناراض ہو جانے کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔ اُس نے اپنے سامعین کو بتلایا کہ وہ نئے کپڑے پہنیں گے تب بھی اُن کے دل پُرانے ہی رہیں گے۔ وہ اپنے کانوں کو

بنگالی ایسے دینوں کی نفیریوں اور ڈھولوں سے اس قدر بہرہ کر لیں گے کہ قرآن کی سچائیوں کو سننے کے بالکل ناقابل ہو جائیں گیں۔ محرم کا تمام میلہ اُس کی نقلی لڑائیاں۔ اُس کے فرضی ماتم۔ اُس کی ناشائستہ دعوتیں۔ ریاکاری کی توبہ۔ یہ سب خدا اور اُس کے رسول کے نزدیک حرام ہیں۔

مغربی بنگال کے پُرامن مسلمان دیہاتی اصلاح پسندوں کی تبلیغ کے لئے بہترین لوگ نہ تھے۔ وعظ ختم ہونے کے بعد جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے تو گو تمام لوگ متفق نہ تھے مگر اکثریت اس مبلغ کے خلاف تھی۔ ایک نے کہا یہ شخص چاہتا ہے کہ ہم اپنے باپ کی قبر کا چراغ گل کر دیں۔ دوسرے نے کہا کہ یہ ہمیں اپنی بچیوں کی شادی کے موقع پر ڈھول ڈھاکہ اور عورتوں کے ناچ سے منع کرتا ہے۔ تیسرا اُس کے کچھ موافق تھا۔ اُس نے کہا کچھ بھی ہو لیکن پھر بھی وہ قرآن کے ستر ہزار چھ سو انتالیس حرف تو جانتا ہے وہ یہ بھی تو کہتا ہے کہ اس کتاب کی رو سے عبادت صرف خدا ہی کی کرنی چاہئے۔ فی الواقع علما میں سے ہے لیکن ملّا (مسجد میں اذان دینے والا) نے اس خیال کی تردید کر دی اور ایک مستند کی حیثیت سے اس بات کا خاتمہ کر دیا۔ کہ یہ شخص ایک جھوٹے امام کا پیرو ہے جس نے مکہ و مدینہ کو تلوار کے زور سے فتح کیا تھا۔ جس نے حج کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ اور خانہ کعبہ کے دروازہ پر یہ لکھ دیا تھا۔ سوائے خدا کے اور کوئی معبود نہیں اور سعود اُس کا رسول ہے (لا الٰہ الا اللہ سعود رسول اللہ) (نقل کفر کفر نباشد)

حاصل کلام یہ کہ وعظ بالکل بے اثر رہا۔ مبلغ کو بھی اس کا پورا پورا علم تھا۔ جس وقت مجمع منتشر ہو گیا تو صرف دو مسلمان جو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اُس کے پاس رہ گئے وہ اُس کے ہمسفر معلوم ہوتے تھے اور مبلغ کی ہر حرکت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُس نے نہایت اخلاص کے ساتھ اُن سے آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ پھر سو گیا اُس کے میلے کچیلے کپڑوں والے مرید اُس کو باری باری پنکھا جھلتے رہے۔ اُس کے تھکے ماندے گھوڑے نے بھی گھاس کی زیادہ تلاش کرنی چھوڑ دی اور اپنی روزمرہ کی تکالیف کو فراموش کر کے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ دن ڈھلے ذرا ٹھنڈک ہونے پر یہ جماعت جیسے آئی تھی ویسے ہی بے خبر چلی گئی۔

وہ بزرگ آدمی تو گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے دونوں طرف میلے کچیلے کپڑوں والے دونوں مرید چلے جارہے تھے۔

یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستانی وہابی ایک بہت بڑی جماعت کا تھوڑا سا حصہ ہے۔ اس ناکام مبلغ کو ان ہزاروں مبلغین میں سے ایک تصور کیجیئے جو اس وقت تمام ایشیا میں چکر لگا رہے ہیں۔ بعض مسجدوں میں تو اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے اور بعض جگہ اُن کو کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ سب کے سب پیغمبر اسلام کے مذہب سے بدعات کو دور کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں جس طرح کہ ہیڈربینڈ کے پادریوں نے روم کے کلیسا کی اصلاح کی تھی۔

ہندوستان میں انگریزی راج کی بدقسمتی ہے کہ یہ اصلاح کا فرقہ فاتحوں کے خلاف نفرت وحقارت کے ساتھ لازم وملزوم ہو گئی ہے لیکن جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے ابتدائی اصولوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اُن کو حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا پڑی۔ کیونکہ راسخ العقیدہ اسلامی حکومت کو بھی ملکی ضروریات کے مطابق شریعت میں تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ خود مکہ معظمہ میں بھی جو مرکز اسلام ہے اور جہاں دنیا میں سب سے زیادہ اس فرقہ کا خوف بیٹھ گیا تھا اس قسم کی تبدیلیاں کی گئیں ہیں پچھلے چند صفحات میں میں نے ایک بہت ہی معصوم قسم کے وہابی کا نقشہ کھینچا ہے۔ مگر اُن میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے ملک کے سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں کے باغیانہ جذبات کو کمینگی کے ساتھ ابھارنے ہی کے لیے جیتے ہیں ذیل میں میں اُس وعظ کا ایک نمونہ پیش کروں گا جس سے وہ انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا بیج بوتے ہیں۔

مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض جہاد ہے۔ مگر جو کوئی ان سے یہ کہے کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جہاد کرنا ناقابل عمل ہے تو وہ جواب دیں گے کہ پھر اُس کا بدل ہجرت ہے۔ یہ ملک اور جو کچھ اس میں پیدا ہوتا ہے اس وقت تک قابل لعنت ہے جب تک اس پر کافر حکومت کر رہے ہیں۔ میں وہابیوں کی جہاد پر اُکسانے کی مثالیں نظم ونثر میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہاں پر وہ دلائل بیان کروں گا جن سے مشرقی بنگال کے بے علم کسان

کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ اگر ان کے لئے اجتماعی طور پر بغاوت کرنا ناممکن ہے تو پھر دوزخ کی آگ سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر کافروں کے ملک سے ہجرت کر جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (خدا کے نام پر جو بڑا مہربان اور بخشش کرنے والا ہے) وہ تمام دنیا کا مالک ہے۔ محمد رسول اللہ ؐ پر خدا کی رحمت نازل ہو۔ ان کی اولاد پر اور ان کے صحابہ پر۔ (نحمدہٗ و نصلے علی رسولہ الکریم وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین) آپ سب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جملہ اہل اسلام پر فرض ہے کہ ہر ایک ایسے ملک سے ہجرت کر جائیں جہاں کافروں کی حکومت ہو اور جس میں حاکم شرع محمدی پر عمل درآمد کرنے سے منع کریں۔ اگر وہ ہجرت نہیں کریں گے تو مرنے کے وقت جب روح اُن کے جسم سے نکالی جائے گی ان کو عذاب دردناک میں مبتلا ہونا پڑے گا جس وقت موت کا فرشتہ اُن کی روح کو ان کے جسم سے نکالنے کے لئے آئے گا تو اُن سے سوال کرے گا کیا خدا کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اپنے گھروں کو چھوڑ دیتے اور کسی اور ملک میں جا کر آباد ہو جاتے؟ یہ کہہ کر ان کی روح کو ان کے جسموں سے نکالتے ہوئے ان کو دردناک عذاب دے گا۔ اُس کے بعد وہ قبر کے عذاب میں متواتر مبتلا رہیں گے اور قیامت کے دن دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ عذاب دردناک میں مبتلا رہیں گے۔ خدا مسلمانوں کو ایک ایسے ملک میں مرنے سے بچائے جس پر کافر حکمران ہوں۔

یہاں سے ابھی نکل جاؤ اور ایسے ملک میں چلے جاؤ جہاں مسلمان حاکم ہوں اور دینداروں کے ملک میں جا بسو اگر تم صحیح سلامت وہاں پہنچ گئے تو تمہاری زندگی کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اپنی ضروریات زندگی کی مدد کرو خدا جو سب کو دیتا ہے جہاں کہیں بھی تم رہوگے تم کو بھی دے گا۔

یہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل میں سے ایک شخص ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد ایک خدارسیدہ بزرگ کے پاس آیا۔ اور اپنے جرموں کا اقرار کیا۔ اور اُس سے پوچھا کہ وہ اپنے گناہوں کی بخشش کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اُس خدارسیدہ بزرگ نے کہا اگر ایک شخص دوسرے بے گناہ شخص کو قتل کرے گا تو وہ یقینی طور پر جہنمی ہے تمہارے گناہ

کبھی بھی نہیں بخشے جائیں گے اور تم یقیناً جہنم میں داخل ہو گے۔ اُس اسرائیلی نے یہ سن کر کہا کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ میں جہنم میں جاؤں گا اس لئے میں سو پورے کرنے کے لئے تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ چنانچہ اُس نے اُس خدارسیدہ بزرگ کو قتل کر دیا پھر ایک اور بزرگ آدمی کے پاس گیا اور اقرار کیا میں نے سو قتل کئے ہیں۔ اب اُن کی کیسے بخشش حاصل کر سکتا ہوں۔ اُس بزرگ نے جواب دیا کہ تو دل سے توبہ کر اور کافروں کے ملک سے ہجرت کر جونہی اُس نے یہ سُنا اُس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک کی راہ لی۔ راہ ہی میں اُس کو موت آگئی اور دونوں فرشتے یعنی رحم کا فرشتہ اور عذاب کا فرشتہ اس کی روح کو جسم سے نکالنے کے لئے موجود ہوئے۔ رحم کے فرشتہ نے کہا کہ میں اُس کی روح کو جسم سے علیحدہ کروں گا کیونکہ اُس نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی اور ہجرت کی تھی۔ عذاب کے فرشتے نے اُس کو تسلیم کیا اور کہا کہ اگر وہ دوسرے ملک میں پہنچ جانے میں کامیاب ہوتا تو پھر یہ کام رحم کے فرشتے ہی کا تھا اس لئے اُس نے یہ کام کرنے کا دعوےٰ کیا اور اس کو عذاب دینا چاہا۔ کیونکہ وہ دینداروں کے ملک کو ہجرت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا پھر دونوں فرشتوں نے اُس زمین کو ناپا جس پر وہ لیٹا ہوا تھا اور اُنہیں معلوم ہوا کہ اُس کا ایک پاؤں سرحد کے پار اسلامی ملک کی حد میں پہنچ چکا ہے۔ اس پر رحم کے فرشتے نے اپنا دعوےٰ ثابت ہو جانے کا اعلان کر دیا اور بغیر تکلیف کے اُس کی روح کو اُس کے جسم سے نکال لیا اور اس کو خدا کے نیک بندوں میں شامل کر دیا۔ آپ نے سن لیا کہ اگلے جہاں میں ہجرت کا کیا اجر ہے اس لئے خدا سے دعا کرو کہ وہ ہم سب کو ہجرت کرنے کی قابلیت بخشے اور ایسا کرنے کی جلد استطاعت دے ایسا نہ ہو کہ ہمیں کافروں ہی کے ملک میں موت آ جائے۔ لے

لاتعداد باغیانہ لٹریچر پٹنہ کا مرکزی دار الاشاعت اور مبلغین کے علاوہ جو بنگال کے طول و عرض میں چکر کاٹتے پھرتے تھے وہابیوں نے باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ایک چوتھی راہ بھی نکال رکھی تھی۔ ابتداء ہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی اُن کے مریدوں کی تعداد اس بات کی اجازت

لے مختصراً کلکتہ ریویو ۱۰۰ C صفحہ ۳۷۹ و ۳۸۰

نے مبلغین کو چاہیے کہ وہاں اپنی ایک مستقل بستی قائم کریں اس طرح بنگال کے دیہات میں متعدد غدار بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ بغاوت کے یہ ضلع وار مراکز پٹنہ کے مرکزی دار الاشاعت سے باقاعدہ خط و کتابت رکھتے تھے ہر مرکز روپیہ جمع کرنے اور آدمی بھرتی کرنے کا ایک انتظام کرتا جو بذات خود بالکل مکمل ہوتا تھا ۱۸۶۴ء میں جب ایسے دو ضلعوں کے مراکز کو توڑ دیا گیا۔ تو اُن کے رئیسوں کے خلاف غیر جانبدارانہ طور پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا جہاں ان کو عمر قید بعبور دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا ہوئی۔ اُس وقت جو واقعات گواہیوں سے ظاہر ہوئے وہ ہر اُس غیر ملکی حکومت کو خوف دلانے کے لئے کافی ہیں جو انگریزی ہندوستان کی طرح اپنے آپ کو اتنی مستحکم خیال نہ کرتی ہو میں مختصراً ایک قیدی کے حالات زندگی بیان کرتا ہوں۔

تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوا خلیفہ[1] سے ایک جنوبی بنگال کے ضلع مالدہ میں تبلیغی دورے پر آئے اور ماحول کو اپنے مطابق پا کر انہوں نے کئی سال تک اُسی گاؤں میں قیام کیا۔ پھر وہیں ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ اور سکول ماسٹر کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ چونکہ معمولی معمولی زمینداروں کے لڑکے اس عالم شخص کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے ضلع کے زمیندار گھرانوں میں اثر و اقتدار حاصل کر لیا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ بغاوت کی تبلیغ شروع کر دی۔ انہوں نے لوگوں کو منظم طور پر جہاد کے لئے امداد کرنے کا عادی بنا دیا۔ وہ سرحدی کیمپ کے لئے پٹنہ کے مرکزی دار الاشاعت کو ہر سال روپیہ اور آدمی بھیج دیتے تھے، اُن کے ٹیکس جمع کرنے والوں میں سے ایک شخص جس کو انہوں نے ایک معمولی کسان کی حالت سے اس درجے تک بڑھا دیا تھا بہت ہی پُر جوش اور عقلمند تھا۔ وہ جمع شدہ رقم سے ایک چوتھائی بطور تنخواہ کے رکھ لیتا۔ رفتہ رفتہ وہ گاؤں کے با اقتدار لوگوں میں شمار کیا جانے لگا۔ کئی سال تک وہ اس کام کو بلا رکاوٹ کرتا رہا۔ مگر ۱۸۵۳ء میں قریب کے مجسٹریٹ کو اس کے متعلق کچھ شبہات پیدا ہو گئے۔ اس دینی ٹیکس جمع کرنے والے کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ اور ایسے خطوط پکڑے گئے جن سے اُس کی تجارت کے باغیانہ اور اُس جہاد سے جو سرحدی کیمپ نے تھوڑا ہی عرصہ ہوا پنجاب میں شروع کرنے کی کوشش کی تھی

[1] مولانا عبد الرحمٰن جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور ان کو اصلی خلیفہ ولایت علی نے خلافت کی سند دی تھی۔

اس کے تعلق کا ثبوت ملتا تھا ۔[۵۱]

ضلع کے مرکزی دفتر کے باغی سردار کو زیر حراست کر لیا گیا تھا مگر چونکہ ہم معمولی سازشی لوگوں کو زیادہ اہمیت دینے کے عادی نہیں ہیں لہذا اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے چھوڑ دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کی قید سے اس کے لئے باغیانہ ٹیکس وصول کرنے کے کام کو جاری رکھنا خطرناک ہو گیا تھا۔ بنابریں وہ مذہبی ٹیکس جمع کرنے سے اپنے لڑکے کے[۵۲] حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس کے جانشین نے اپنے آپ کو اس کام کی انجام دہی کا پورا پورا اہل ثابت کیا اور اس مقدمے کے انچارج افسر کے غیر جانبدارانہ بلکہ ایک حد تک قدر دانی کے الفاظ میں اس نے اس وقت سے لے کر مقدمے کے وقت تک نہایت ایمانداری سے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے لوگوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کی۔ اس کے کام کی تکمیل میں ضلع کے حاکموں نے کوئی مداخلت نہ کی۔ ہندوستان کا انگریز مجسٹریٹ آگسٹن ایسپائر کے پادری کی طرح ان اقوام کے عقائد اور توہمات میں دخل انداز ہونے سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہے جو اس کے زیر نگین ہوں۔ اس طرح مذہبی شعار کی بجا آوری کے بہانے بغاوت بے خطر پھیل سکتی ہے۔ مگر ۱۸۶۵ء میں پٹنہ کے مقام پر سیاسی مقدمے کے دوران[۵۳] میں ضلع مالدہ کے مرکز کا عام بغاوت میں حصہ اچھی طرح واضح ہو گیا تھا۔ اس تنبیہ کے باوجود وہ سرحدی جنگ کے لئے روپیہ اور آدمی فراہم کرتا۔ اور گاؤں گاؤں کھلم کھلا بغاوت کی تعلیم دیتا رہا۔ ۱۸۶۸ء میں جب اس نے پٹنہ سے خلیفہ کے لڑکے کو مدد کے لئے بلا بھیجا اس کی عملداری میں تین مختلف اضلاع تھے۔ دریائے گنگا کے دونوں اطراف اور وہ جزائر جو اس کے ڈیلٹا میں واقع ہیں اور جن کی حد کئی دن کی مسافت تک ہے۔ اس علاقے کے جاہل مسلمان کسان اس کے زیر اثر تھے[۵۴] ان رنگروٹوں کی تعداد جو

---

[۵۱] ۱۸۵۲ء میں نمبر ۲ نیو انفنٹری کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی اور پٹنہ کے مجسٹریٹ نے قوت کے ساتھ اس جماعت کو پھیلنے سے روکنے اور تحقیقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

[۵۲] مولوی امیر الدین آف مالدہ۔

[۵۳] مولوی احمد اللہ کے مقدمہ میں بغاوت کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ سیشن کی عدالت سے ان کو موت اور ضبطی املاک کی سزا ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں ان کی انتہائی سزا کو عمر قید بعبور دریائے شور سے بدل دیا گیا تھا۔

[۵۴] مالدہ کا تمام ضلع۔ مرشد آباد اور راجشاہی کے کچھ حصے۔

اُس نے سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کئے کبھی بھی معلوم نہیں کی جا سکتی۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری سرحد پر ان غداروں کی ایک سرحدی چوکی میں کل ۴۰۰ جنگجو تھے اور اُن میں سے دس فیصدی اسی شخص کے زیر اثر علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔

اس کا روپیہ جمع کرنے کا نظام بالکل سادہ اور مکمل تھا۔ اُس نے دیہاتوں کو مالی علاقوں میں تقسیم کردیا اور ہر علاقے میں ایک محصل ٹیکس مقرر کیا۔ پھر یہ افسر از خود ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس مقرر کرلے اور ان کے جمع کئے ہوئے روپے کا حساب بھی لیتے۔ آخر الامر اُس روپے کو ضلع کے مرکز میں بھیج دیا جاتا۔ اصولاً ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس ضرور ہوتا۔ جہاں آبادی بہت زیادہ ہوتی وہاں زیادہ آدمیوں کو ملازم رکھ لیا جاتا۔ ایسے مقامات پر ایک امام[1] ہوتا تھا جو نماز با جماعت پڑھاتا اور چندہ وصول کرتا۔ امام کے علاوہ ایک شخص ملیجر[2] ہوتا تھا جس کے ذمے جماعت کی دنیاوی ضروریات کی خبر گیری تھی۔ اور ایک ڈاک افسر[3] تھا جو خطرناک خطوط اور اس نذر و نیاز کو جو سازشیوں کو دی جاتی منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے قاصد مہیا کرتا۔

یہ نذر و نیاز اور منتیں چار قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک تو اڑھائی فیصدی کا ٹیکس اُس جائداد کا جس پر ایک قمری سال گزر چکا ہو۔ اس کا نام زکوٰۃ ہے اور وہ شروع ہی سے کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے مصرف میں آتا رہا۔ مگر یہ ٹیکس صرف اُس جائداد پر عائد ہو سکتا ہے جس کی قیمت ایک خاص مقدار سے زیادہ ہو۔ پٹنہ کے خلفا[4] نے سرحد سے واپس آنے پر محسوس کیا کہ یہ رقم جہاد کو جاری رکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے وہ خیرات بھی جو غریبوں کا حق ہے اس کام پر لگادی اور غریبوں کا حق پامال کرتے ہوئے بغاوت اور غارت گری کے کام میں صرف کردی۔ یہ صدقہ مذہبی فرض سمجھ کر سال بھر میں ایک دفعہ ایک اسلامی تہوار کے موقع پر دیا جاتا ہے[5] جب رمضان شریف کے مقدس مہینے کے بعد مسلمانوں کی مذہبی خوشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اس تہوار کے دن نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں قدم رکھنے سے پہلے ہر دیندار مسلمان فرض سمجھتا ہے کہ غریبوں میں صدقہ تقسیم کرے ورنہ گذشتہ تیس دن تک اُس نے جو تکلیف اٹھائی ہے اُس کا اجر خدا کی طرف سے نہ ملے گا۔

---

[1] دین کا سردار [2] دنیا کا سردار [3] ڈاک کا سردار [4] عنایت علی۔ [5] عید الفطر۔

یہ وہ فطرہ[1] ہے جس کو پٹنہ کے خلفا نے نذرانوں کے حساب میں جمع کر لیا تھا۔ انہوں نے ایک اور ٹیکس بھی مقرر کیا جس سے غریب سے غریب آدمی بھی بچ نہ سکتا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہر خاندان کا مالک کھانا کھاتے وقت اُس کے خاندان میں جتنے فرد ہوں اتنے ہی مٹھی بھر چاول علیحدہ کرتا ہے اور ہر جمعے کے روز گاؤں کے محصل ٹیکس کے حوالے کر دے۔ اس طرح غلے کے انبار کے انبار جمع کر لئے جاتے اور ان کو اعلانیہ جہاد کے مصرف کے لئے بھیج دیا جاتا۔ بہرحال یہ ٹیکس کم سے کم مقدار کو ظاہر کرتا ہے جو مذہبی ٹیکس وصول کرنے والوں کو جمع کرنے کا حق تھا اس دانشمند خلیفہ نے ان لوگوں کے جوش و خروش اور فوری جذبات کے اظہار کے لئے جو نئے نئے جماعت میں داخل ہوں اور جو ہلا دینے والے مواعظ سے پیدا ہوتے تھے بہت کافی مواقع بہم پہنچانے کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ نظر بریں اُس نے ایک غیر معمولی چندہ کی ابتدا کی جو وقتاً فوقتاً اختیاری طور پر دیا جاتا تھا۔ یہ اُن چندوں کے علاوہ تھا جو محصلین ٹیکس بطورِ حق کے طلب کر سکتے تھے۔ تمام ٹیکس جمع کرنے والوں کا سردار ایک سالانہ دورہ بھی کرتا تھا وہ عید کے موقع پر اپنے علاقے کے ہر گاؤں میں جاتا اور اس بات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتا کہ ہر خاندان نے پچھلے سال کا تمام بقایا ادا کر دیا ہے۔

بنگال کے ہر ضلع میں اس قسم کے اعلےٰ مرکز موجود تھے۔ جس بدقسمت انسان کو میں نے مثال کے لئے منتخب کیا ہے وہ انہی میں سے ایک تھا۔ اس کا مرکز جنوبی بنگال سے شمال مغرب کو جانے والی شاہراہ پر واقع اور بغاوت پھیلانے والے مبلغ کی قیام گاہ تھا جن کا ہمیشہ وہاں گذر ہوتا رہتا ہے گو وہ دونوں خلیفے بھی جنہوں نے سرحد پر امام صاحب کی موت کی تصدیق کی یہاں قیام کر چکے ہیں[2] اور باغی کیمپ کے موجودہ سرداروں میں سے بھی ایک شخص سرحد کی طرف جاتے ہوئے یہاں خودکشی ہو چکا ہے[3]۔ پھر کئی ایک دوسرے اضلاع کے سرداران مراکز نیز پٹنہ کے مرکزی دار اشاعت کا امام بھی اس شخص کے مہمان رہ چکے ہیں۔ پہلے پہل اُن کا یہ شہر[4] دریائے گنگا کے دائیں کنارے ضلع کے ہیڈ کوارٹر یا کسی ایسے گاؤں سے جس میں تھانہ چوکی موجود ہو بہت دور واقع تھا۔ قدرت کی تباہ کاریوں نے بھی جنہوں نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا ہے اس تحریک کے پھیلانے میں مدد دی۔ دریائے گنگا اپنی وادی میں آگے اور پیچھے راستہ بدلتا ہوا اپنے

---

[1] صدقۂ عید الفطر۔ [2] عنایت علی اور مقصود علی۔ [3] فیاض علی۔ [4] تریان پور۔

دائیں کنارے کی بہت سی زمین کو نگل گیا۔ اور وہابی آبادی کا نام و نشان تک بھی نہ چھوڑا۔ اس کے باشندے منتشر ہو گئے کچھ تو دریائے گنگا کے بائیں کنارے نئی آبادی میں چلے گئے اور باقی ماندہ اندرون ملک کے دیہات میں۔ لیکن جہاں کہیں بھی گئے وہیں ہر گروہ نے بغاوت کا ایک نیا مرکز قائم کر دیا۔ جہاں کہیں بھی دریا کوئی نئی زمین چھوڑ دیتا ہے وہاں فوراً ہی وہابی نو آبادی قبضہ کر لیتی اور ایک نئے گاؤں کا مرکز بن جاتی ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قدر مستقل اور دور دراز تک پھیلی ہوئی بے چینی حکومت ہند کے لئے کتنی سخت پریشانی کا باعث ہوتی ہوگی۔ گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔ فی الحقیقت سرحد کی ہر ایک جنگ کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی حدود میں بھی ایک سیاسی مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت بھی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد جو دور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے اور اپنے جرموں کی سزا بھگت رہی ہے یا اپنے مقدمہ کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے۔ ان لوگوں کے متعلق کچھ کہنا ذرا مشکل ہوگا جن کو سزا ہو چکی ہے۔ کیونکہ یہ ان لوگوں کی رہائی کے امکانات پر ضرور اثر انداز ہوگی جن پر ابھی مقدمہ چلایا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ جو گواہیاں ہو چکی ہیں ان میں ان دونوں قسموں کے اشخاص کے نام ملے جلے ہیں۔ یہ سیاسی مقدمات ہندوستان کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب چیز ہیں۔ اور جو تفصیلات ان سے معلوم ہوئیں ان کو کام میں لائے بغیر بنگال میں اس پرانی سازش کی شاخوں کو معلوم کرنا ناممکن ہوگا۔ لہذا مثال کے طور پر میں اس مقدمے کا انتخاب کرتا ہوں جو وقت کے لحاظ سے موجودہ مقدمات میں سب سے پہلا ہے اور نہایت احتیاط سے ان چیزوں کو نظر انداز کر دوں گا جو ان بدقسمت انسانوں پر جن کو قانون نے ابھی تک مجرم ثابت نہیں کیا کسی طرح بھی اثر انداز ہوں۔

۱۸۶۴ء کا مقدمہ ۱۸۶۳ء کی تباہ کن جنگ کا قدرتی نتیجہ تھا۔ پچھلے سال کی طرح یہ محض ایک ہندوستانی رجمنٹ کے چند سپاہیوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ تھی۔ اور نہ کسی اکیلے بغاوت پھیلانے والے مبلغ کی باغیانہ سرگرمیوں کی تفتیش بلکہ ایک ہمہ گیر سازش جو دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی اور جس میں مدافعت کا کافی اچھا

انتظام تھا۔ جولائی ۱۸۶۴ء میں سر ہربرٹ ایڈورڈ نے انبالہ کے سیشن جج کی حیثیت سے ایک ایسے سیاسی مقدمہ کا فیصلہ سنایا جس میں عدالت کی بیس پیشیاں ہوچکیں تھیں۔ انگریزی حکومت کی مسلمان رعیت کے گیارہ افراد کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ اس میں مسلمان قوم کے ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے ان میں بہت بڑے عالم خاندان کے چشم و چراغ۔ ایک فوجی ٹھیکیدار۔ ایک فوجی تھوک فروش قصاب۔ ایک عرضی نویس۔ ایک سپاہی ایک دورہ کرنے والا مبلغ۔ ایک خدمتگار نوکر اور ایک کاشتکار تھا ان کی پیروی ایک انگریز وکیل نے کی۔ ان کو عدالت میں قانونی عذر خواہی اور مقدمے پر بہترین وکالت سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل تھا۔ ان کے چھ ہموطن بحیثیت اسیسر کے جج کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس۔ مقدمہ کے خاتمہ پر ان میں سے آٹھ کو عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور تین کو قانون کی انتہائی سزا دی گئی۔

شمالی احاطہ میں بہت سی قومیں آباد ہیں جو رنگ ڈھنگ میں مختلف اور الگ الگ زبانیں بولتی ہیں۔ ایک اطالوی کے لئے آسان سی بات ہے کہ لندن میں اپنے آپ کو انگریز ظاہر کرے اور پہچانا نہ جائے لیکن بنگالی کے لئے ناممکن کہ وہ پشاور میں اپنے آپ کو پنجابی ظاہر کرسکے۔ ۱۸۵۸ء کی سرحدی جنگ میں یہ امر اچھی طرح سے واضح ہوگیا تھا کہ وہ دشمن جو جنگ میں مارے گئے ان کے چہروں کا رنگ سانولہ سیاہی مائل تھا اور یہ نتیجہ ہے جنوبی بنگال کی دلدل اور مرطوب آب و ہوا کا۔ مگر اس وقت ان کا سراغ لگانا مشکل تھا۔ لڑائی کے اختتام پر بے قاعدہ سوار فوج کو منتشر کر دیا گیا اور جن سپاہیوں میں کچھ صلاحیت تھی ان کو سوار پولیس میں لے لیا گیا۔ ان میں سے ایک پنجابی بھی[۱] تھا۔

یہ شخص بہت ہی جلد انبالہ کے قریب ایک ضلع[۲] میں سارجنٹ کے رتبہ تک ترقی کرگیا مئی ۱۸۶۳ء میں ایک روز علی الصبح جب وہ گشت پر تھا تو اس نے چار اجنبیوں کو جرنیلی سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُن کے پست قد۔ میلے کچیلے چہرے اور چھوٹی داڑھیوں سے اس پرانے سپاہی کو وہ بنگالی غدار

---

[۱] خوزان خاں [۲] کرنال۔

یاد آ گئے جو اُس نے ۱۸۵۷ء میں میدان جنگ میں مقتولین کے درمیان دیکھے تھے۔ اس لئے اُن سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اور رفتہ رفتہ اُن کے رازوں کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر کار سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکا کے بنگالی سفیر ہیں اور اپنے وطنی صوبہ کو واپس جا رہے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر روپیہ اور آدمی مہیا کرنے کا انتظام کریں۔

اس قومی جوش میں شمالی باشندے نے ان چاروں کو گرفتار کر لیا۔ انہوں نے اس سے ایک مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے درخواست کی اور منہ مانگی رشوت دینے پر آمادہ ہو گئے۔ جس کے متعلق انتظام یہ تھا کہ پاس ہی تھانیسر کی منڈی میں جعفر نامی عرضی نویس کی معرفت ادا کر دی جائے گی۔ مگر یہ پرانا سپاہی بڑا نمک حلال تھا اُس نے ان کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ مجسٹریٹ اُس وقت ان بنگالیوں کو قید کر دیتا تو تمام سازش کا پتہ چل جاتا اور اُن مجاہدین کو ہمارے بدرقہ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا اور انگریزی حکومت ایک خونریز جنگ سے بچ جاتی۔ مگر اُس وقت سلطنت بڑے امن وامان میں تھی۔ تھانیسر اندرون ملک میں ایک پرامن ضلع ہے۔ جہاں بغاوت شاذ ونادر ہی ہوتی ہے۔ پھر ہندوستانی پولیس کا روپیہ بٹورنے کے لئے جھوٹے مقدمات بنا لینا روزمرہ کی بات ہے۔ مجسٹریٹ نے ان پرامن مسافروں کو قید کرنے سے انکار کر دیا اور اُس کا ایسا کرنا ننانوے فیصدی مقدمات میں انصاف کی منشا کے عین مطابق ہوتا ہے۔

بہرکیف یہ سوواں مقدمہ تھا۔ سوار پولیس کا سارجنٹ ان قیدیوں کے رہا ہونے پر بہت خفا ہوا۔ اس خیال نے کہ اس کی رپورٹ کو قابل اعتبار نہیں سمجھا گیا اُس کے پنجابی جذبات پر بہت بُرا اثر کیا اور اب بھی اُس کو پورا پورا یقین تھا۔ کہ ہماری سلطنت پر کوئی اچانک مصیبت نازل ہونے والی ہے جس کا وہم وگمان بھی ممکن نہیں۔

اُس نے ایک ایسے جان جوکھوں کے کام کی تجویز سوچی جس کی مثال سپارٹہ والوں کے استقلال

اور سعن وفاداری کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ بغیر چھٹی کے اپنی نوکری سے غیر حاضر ہو جانا غداری سمجھا جاتا۔ دور شمال کی طرف اُس کے وطن میں اُس کا ایک لڑکا تھا جس کو وہ خاندانی عزت کے بعد سب سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اس کے گاؤں اور سرحد کے درمیان ہماری سرحدی چوکیاں تھیں جو ہر وقت لوٹ مار کرنے والوں یا بھاگتے ہوئے غداروں کو پکڑنے کے لئے چوکنا رہتی تھیں۔ سرحد کے پار مجاہدین تھے جو انگریزی حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ کرنے کی تیاریاں تقریباً مکمل کر چکے تھے وہ ہر اُس شخص کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے جن کو اُن کے ایجنٹوں نے ہماری سلطنت سے باقاعدہ طور پر نہ بھیجا ہو۔ باپ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اُس کا لڑکا سرحدی چوکیوں سے بحیثیت ایک باغی کے جو مجاہدین کے کیمپ میں داخل ہونے کے لئے جا رہا ہو پھانسی پر چڑھنے سے بچ بھی گیا تو بھی اُس کو وہابیوں کے ہاتھوں جاسوس سمجھ کر مارے جانے کا خطرہ ہے۔ اُس نے اپنے لڑکے کو خاندانی عزت کے نام پر حکم دیا کہ وہ نکل جائے اور اُس وقت تک واپس نہ آئے جب تک کہ وہ اُن سازشی لوگوں کے نام معلوم نہ کر لے جو ہماری مملکت میں سرحد پار کے مجاہدین کی امداد کر رہے ہیں۔

لڑکے کو جونہی یہ خط ملا وہ دوسرے ہی دن گاؤں سے غائب ہو گیا۔ اُس نے کیا کیا تکلیفیں اُٹھائیں اور وہ کس طرح بال بال بچا اُس کا علم صرف اُس کے خاندان کو ہے مگر شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وہابیوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا جب انہوں نے سیتانا پر حملہ کیا تو وہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہ کسی نقصان کے بغیر ہماری سرحدی چوکیوں سے گزر گیا اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر ایک شام اپنے باپ کے گھر کے سامنے جو اندرون ملک میں سینکڑوں میل کی مسافت پر تھا سفر بھوک۔ بیماری کی وجہ سے نہایت خستہ حالی میں اس راز کو اپنے سینے میں محفوظ کئے ہوئے آموجود ہوا۔ تھانیسر کا منشی جعفر جو خلیفہ کہلایا جاتا تھا ایک بہت بڑا آدمی تھا وہ بنگالیوں اور اُن کے اسلحہ کو کیمپ تک پہنچاتا تھا۔ یہ جعفر تھانیسر شہر میں عرضی نویس تھا۔ اگر یہ سارجنٹ اُن چاروں مسافروں کو چھوڑ دیتا تو وہ اسے رشوت کا روپیہ فوراً ادا کر دیتا۔

میں اس سے بڑھ کر دردناک حالت کا تصور نہیں کر سکتا جو اس مضبوط پنجابی باپ کی ہوگی۔ وہ روزانہ گھوڑے پر سوار ہو کر بڑے سکون کے ساتھ گشت پر جاتا اور اپنی جھٹلائی ہوئی باتوں پر غور و خوض کرتا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا اس کا تردد اپنے بیٹے کی سلامتی کے متعلق بڑھتا گیا اس کی جان کو محض اس لئے خطرہ میں ڈالا تھا کہ وہ اپنی عزت کو برقرار رکھ سکے اور اپنے اُن غیر ملکی حاکموں کو بچالے جنہوں نے اس کی بات کو جھٹلا دیا تھا۔

جعفر کی سوانحعمری جو تھانیسر کی منڈی میں عرضی نویس تھا بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اپنی قابلیت کے صدقے بڑھتے بڑھتے اپنے قصبہ کا نمبردار ہوگیا۔ ایک دن وہ اتفاقاً ایک سفری وہابی مبلغ کا وعظ سننے کے لئے ٹھہر گیا اس خوشحال شہری انسان کے مذہبی جذبات برانگیختہ ہوگئے اُس نے ساجد کے بدعتی اعمال پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اور جان بنین (JOHN BUNYAN) کی طرح گہری روحانی تاریکی سے گزر کر آخر کار اپنے آپ کو علانیہ وہابی کہنے لگا اور ہمہ تن مذہبی اصلاح میں مشغول ہوگیا۔

اس نئے وہابی نے اپنا بہت سا وقت اپنے نفس کا جائزہ لینے پر صرف کیا اور اپنے نفس کی کیفیات کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ اُس نے اپنے مذہبی تجربات کو "جعفر کے نصائح" کے زیر عنوان لکھنا شروع کردیا اور وہ اُن دستاویزات میں سے ایک نہایت ہی دلچسپ دستاویز ہے جو کسی سیاسی مقدمہ میں پیش کی گئی ہے۔

میں نے یہ کتاب منگل کے روز ۱۸ ذوالحجہ ۱۲۷۸ھ میں لکھنی شروع کی ہے اس کا اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اس میں کسی خاص طریقہ کی پیروی نہیں کی میں نے صرف وہ واقعات لکھ

دیئے ہیں جن کا تعلق دین و دنیا سے ہے۔ اور جن میں میں نے وقتاً فوقتاً حصہ لیا۔ مزید براں میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے۔ انسان جن فرشتے۔ حیوانات۔ نباتات جو کوئی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا اپنے وقتِ مقررہ پر فنا ہو جائے گا۔ سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی ہمیشہ رہنے والا نہیں جو کوئی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا وہ ہزار سال تک کیوں نہ زندہ رہے آخر افسوس اور ندامت کے سوا اور کچھ نہ لے گیا۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہ کی۔ اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد جب کہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میرا چھوٹا بھائی چھ مہینے کا تھا ہم اپنی والدہ کی سرپرستی میں تربیت پانے لگے۔ میری والدہ بالکل ناخواندہ تھی اسے کوئی مذہبی تعلیم بھی نہ دی گئی تھی۔ لہٰذا لیکن میں میں نے تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور آوارہ پھرتا رہا۔ جب مجھے تھوڑی سی عقل آ گئی تو میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔

۱۸۵۰ء میں عرضی نویسوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ تمام وکیل اور عرضی نویس مجھ سے قواعد و ضوابط اور کونسل کے ایکٹ کے متعلق مشورہ کرنے لگے اور میں سب سے بازی لے گیا۔ یہ عرضی نویس ایک قسم کے غیر رجسٹر شدہ معمولی وکیل ہوتے تھے جو مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ بازوں کی عرضیاں لکھ دیا کرتے تھے اور چھ آنے سے ڈیڑھ روپے تک فیس لیتے تھے جعفر کی بہت اچھی پریکٹس تھی مگر کافروں کی عدالت سے جو روپیہ وہ اس طرح حاصل کرتا تھا وہ اس کے لئے کسی کام کا نہ تھا۔ اس کے برعکس اس پیشے میں میں نے اپنے مذہب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ایسا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں۔ اگر میں اس کو اختیار نہ کرتا تو میری مذہبی حالت بہت اچھی ہوتی۔ میرا روزی کمانے کا یہ طریقہ میری عبادت کے سرور اور میرے زہد و تقوے کے بالکل منافی تھا۔ جب مجھے عدالتوں سے فرصت ملتی خواہ دو دن ہی کے لئے تو میری حالت بہت اچھی ہو جاتی۔ کافروں کے سامان ملازمین کے ساتھ محض تعلق ہی کا ہونا میرے پیشے کا ایک بڑا نقص تھا اور میرے نفس کے

لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔

اگرچہ جعفر اس پیشے کو پسند نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی اسکی قانون دانی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ارد گرد کے طاقتور زمیندار خاندانوں نے اُس کو اپنا خاندانی قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ بہت ہی مخلص شخص تھا۔ وہ اپنی دنیاوی کامیابی کو اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں کبھی حائل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس کے پاس جو کوئی آتا اثر قبول کیے بغیر نہ رہتا۔ آنحضرت کی طرح اُس نے اصلاح کا کام اپنے ہی گھر سے شروع کیا۔ چنانچہ اُس کا ایک منشی اپنے آقا کے سخت امتحان کے وقت بھی وفادار رہا اور سانپالہ کے سیشن جج کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے کے اندر اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو مذہب کی حمایت میں گواہی دیتا رہا۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلےٰ قابلیت نے اُس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ اُن لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں تو جعفر عرضی نویسی کے کام پر تھانیسر واپس آ گیا اور خدا کی اُن پوشیدہ مصلحتوں پر غور کرنے لگا جس نے کفار کو فتح دی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ اِس کام سے دل برداشتہ ہو گیا تھا یعنی "عرضی نویسی کے نہایت ہی مذموم کام" سے کھلم کھلا جنگ میں تو شکست ہو چکی تھی دیکھنا یہ تھا کہ خفیہ سازشوں سے کیا کچھ مل سکتا ہے۔ جعفر بہت جلد دور دراز تک پھیلی ہوئی وہابی سازش میں داخل ہو گیا اُس کے خفیہ فرائض نے اس کے نفرت انگیز پیشہ کو بھی مقدس بنا دیا۔ کیونکہ وہ اُس کے متعلق لکھتا ہے "میں نے اس کام کو ایک خاص آدمی کے حکم کے مطابق اور ایک خفیہ مقصد کے لئے اختیار کر رکھا ہے"[۱]

---

[۱] سر ہربرٹ ایڈورڈ نے فیصلہ سناتے ہوئے جعفر کی قابلیت کی یوں داد دی تھی۔ اِس قیدی کی سخت دشمنی۔ باغیانہ حرکات اور اس کی شرارت انگیز قابلیت میں مبالغہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ لکھا پڑھا شخص ہے اور اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں اور اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔

یہ خاص شخص پٹنہ کا مولوی یحییٰ علی ہندوستان میں وہابیوں کا پیشوا تھا۔ اور خفیہ مقصد یہ تھا کہ مہاجرین کی وہابی نوآبادی کو رنگروٹ اور اسلحہ بہم پہنچائے جائیں جو اُس وقت علانیہ انگریزی حکومت سے برسرپیکار تھی۔

میں پٹنہ کے مرکزی دار الاشاعت کا حال بیان کر چکا ہوں۔ اُس وقت یہ شخص اُس کا رہنما تھا ۱۸۶۴ء کے مقدمے سے بہت پہلے تمام ہندوستان میں یہ ادارہ اصلاحی جماعت خانہ کے نام سے مشہور تھا اس کی عمارت محلہ صادق پور کے بائیں جانب واقع تھی اس کا حجرہ کافی بڑا تھا اور گلی میں پیچھے کی جانب بھی کافی دور تک چلا گیا تھا اپنی ظاہری صورت میں اس کا منظر ویسا ہی حسرت ناک اور ویرانی کا تھا جو ہندوستان کی ہر اینٹ چونے کی عمارت کا برسات کے مہینے کے بعد ہو جاتا ہے۔ یہ مشرق کے متعلق ہمارے عظیم الشان تصور کا کیسا حقیر جواب ہے اس تمام عمارت میں سب سے زیادہ اہم ایک معمولی سی مسجد تھی جس میں ہر وقت نماز باجماعت ادا کی جاتی اور جمعہ کے دن خطبہ بھی ہوتا۔ جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے ان میں سب سے زیادہ کفار کے خلاف جہاد کے فرض پر زور دیا جاتا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جاتا کہ عقیدہ کے بغیر ہر فعل عبث ہے۔ سامعین کو بہت بڑے روحانی خطرے سے آگاہ کیا جاتا اور اُن کو روحانی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ یہ لوگ پیغمبر اسلام کی سادہ عبادت کا مقابلہ اُن تکلیف دہ مراسم اور لاتعداد نقالیوں اور مساجد کے رکوع و سجود سے کرتے اور اُن لوگوں کو بہت بُرا کہتے جو وہابیوں کے جہاد یا ہجرت کے اصولوں کی مخالفت کرتے تھے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کا روحانی معیار عام لوگوں کی قابلیت سے بہت بلند تھا۔ اُن کے سامعین اگرچہ وقتی طور پر بہت گہرا اثر قبول کرتے لیکن اپنے دلوں میں بالعموم یہ خیال لے جاتے تھے کہ اُن کے لئے بڑی دشواریاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ شہر کی دوسری مساجد کے واعظ گو محلہ صادق پورہ کے واعظوں کے علم اور فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے تھے لیکن اس بنا پر اُن کی مخالفت کرتے کہ وہ متبرک روایات کے منکر اور سخت مواحد واقع ہوئے ہیں۔

یحییٰ علی مبلغین کا افسر اعلیٰ اور خلیفہ تھا۔ اس نے پٹنہ کے مرکزی دار الاشاعت کے نظام کو بڑی مضبوطی

لیکن نرمی کے ساتھ چلایا۔ اُن رنگروٹوں کا جو سفری مبلغ جنوبی بنگال کے مختلف اضلاع سے جوق در جوق بھیجتے تھے جماعت خانہ میں بڑا جوش سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کو فوراً مجاہدین کے کیمپ میں بھیج دینا مقصود ہوتا ان کو اُن کے دنیاوی بھائی کے سپرد کر دیا جاتا اور وہ اُن کو جماعت کے اصولوں سے زیادہ واقفیت پیدا کرنے کی تکلیف دیئے بغیر اُن کے جوش و خروش کو مستقل کر دیتا۔ یہ دنیاوی بھائی دارالاشاعت کا وظیفہ خوار اور بہت ہی کار آمد شخص تھا اُس نے جماعت خانہ کے تمام دنیاوی کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ اور رنگروٹوں کے سامنے ہر روز جہاد کے فرائض پر وعظ کہتا۔ وقتاً فوقتاً جب رئیس المبلغین کسی اور کام میں مشغول ہوتا تھا تو دینیات کے طالب علموں کو جو اصل میں اُس کے ماتحت نہ تھے الہیات پر درس بھی دیتا۔ وہ جو کچھ بھی کرتا پورے اخلاص کے ساتھ کرتا۔ اور انجام کار بڑی دلیری کے ساتھ اپنے آقا کے ہمراہ انبالہ کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے کے اندر کھڑا ہو گیا۔

یحییٰ علی[1] رئیس المبلغین کے بہت سے فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں تمام سفری مبلغین کا روحانی پیشوا ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت کرتا۔ پھر جملہ دستاویزات کو خفیہ زبان میں ترتیب دیتا اور لکھتا جس کے ذریعہ سے بڑی بڑی رقوم بلا خوف و خطر سلطنت کے دارالخلافہ سے سرحد پار کے مجاہدین تک پہنچ جاتیں ان کے ذمے تھا۔ وہ مسجد میں نماز باجماعت کی امامت کرتا۔ اور اُن بندوقوں کی جانچ پڑتال بھی جو مجاہدین کو روانہ کی جاتیں۔ وہ طالب علموں کو الہیات پر درس دیتا۔ اُس کا اپنا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ عربی مصنفین سے بھی اُس نے بہت کافی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

لیکن سازشیوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کے دارالاشاعت سے جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے رنگروٹوں کا پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی وہابی سے راستہ میں ہزاروں تکلیف دہ سوالات پوچھے جانے کا احتمال تھا۔ شمال

---

[1] عبد الغفار۔

مغربی صوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اُس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی اس کی اجنبیت ہرگاؤں میں اپنے قد اور زبان کی وجہ سے بہت جلد ظاہر ہو جاتی لیکن اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی قابلیت پوری طرح بروئے کار آئی اُس نے تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا اور ان کا انتظام معتبر مریدوں کے ہاتھوں میں رکھا۔ اُس نے جرنیلی سڑک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اس طرح سرحدی کیمپ کو جانے والا ہر راہی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا۔ اُس کو یقین تھا کہ ہر پڑاؤ پر اُس کو ایسے دوست مل جائیں گے جو اُس کے لیے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راہ میں پڑتے اُن کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے میں ہمہ تن مصروف اور ایک مقامی سازشی ان کا صدر ہوتا تھا۔ یحییٰ علی نے ایسے اشخاص کے انتخاب میں اپنی مردم شناسی کا بہترین ثبوت دیا تھا کیونکہ ان میں کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا لالچ کی ترغیب سے اپنے تباہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

سب سے زیادہ یہ کہ یحییٰ علی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پٹنہ میں انگریزی حاکموں کے ساتھ اُس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اُس کے خاندان میں سے ایک ہماری حکومت میں اعزازی عہدے پر مامور اور دوسرا ہماری سرحد پر مجاہدین کی چھاپے مارنے والی جماعت کی رہنمائی کر رہا تھا شاید ہی کسی عدالت نے ایسے پُر اثر الفاظ کہے ہوں گے جیسے کہ سر ہربرٹ ایڈورڈ نے اُس کے لئے سزائے موت تجویز کرتے ہوئے کہے سر ہربرٹ نے کہا کہ یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اُس سازش کا کرتا دھرتا ہے جس کا انکشاف اِس مقدمہ میں ہوا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا اور اس مذہبی رعایت کے ماتحت پٹنہ کی مسجد میں اسلام کے قابل نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ اُس نے اپنے ماتحت ایجنٹ رکھے ہوئے تھے جو روپیہ جمع کرتے اور جہاد کی تعلیم دیتے تھے۔ اُس نے اپنے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہموطنوں کو بغاوت کے جال میں پھانس لیا تھا۔ اُس نے اپنی سازشوں سے ہندوستانی حکومت کو ایسی سرحدی جنگوں

میں دھکیل دیا جس میں سینکڑوں جانیں ضائع گئیں۔ وُہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہے۔ اور اپنی لاعلمی کا عذر پیش نہیں کرسکتا۔ جو کچھ بھی اُس نے کیا سوچ سمجھ کر عمداً اور سخت باغیانہ طریقہ پر کیا۔ وہ موروثی باغی ہے۔ اور ایک متعصب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خواہش ایک مذہبی مصلح کے درجہ تک پہنچنے کی ہے۔ لیکن بنگال کے برہمو سماجی ہم وطنوں کی طرح دلیل اور فطرت صالحہ سے اپیل کے بجائے وہ اپنا مقصد سیاسی انقلاب سے پورا کرنا چاہتا ہے اور دیوانوں کی طرح اُس حکومت کے خلاف سازش کرتا ہے جس نے شاید ہندوستانی مسلمانوں کو تباہی سے بچایا اور یقینی طور پر مذہبی آزادی عطا کی۔

جعفر عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس انبالہ نے ۱۸۶۴ء کے قیدیوں میں سازش کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے نمایاں جگہ حاصل کی لیکن اُن کی باغیانہ قابلیت کا عملی پہلو دہلی کے تھوک فروش قصاب اور پنجاب میں انگریزی فوجوں کو گوشت مہیا کرنے والے ٹھیکیدار محمد شفیع کی قابلیت سے بہت کم تھا۔

محمد شفیع شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے تاجر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ گورنمنٹ کے ساتھ اس کے خاندان کے تعلقات کی بنا ہمیں وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کی جنگوں کی طرف لے جاتی ہے۔ محمد شفیع کے دادا پر دادا معمولی چرواہے تھے جنہوں نے کچھ تو اپنی ہوشیاری اور کچھ کفایت شعاری سے دنیا میں نام پیدا کر لیا تھا۔ یہ زمانہ دولت کمانے کا تھا نہ کہ اُس کو جمع کرنے کا۔ جنگ کے زمانہ کی قیمتیں رائج تھیں۔ فوجوں کی آمد و رفت متواتر جاری تھی۔ اس لئے کمسریٹ والوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ شمالی ہندوستان کے گڈریوں کے ساتھ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ ممکن ہے اس غدار خاندان کی برتری کا سبب ۱۷۶۹ء کا قحط ہو جس نے انگلستان کے باشندوں کو ہندوستان میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کے لیے بیدار کیا تھا۔ اس کا دادا اس صدی کے آخری دس سالوں میں بہت بڑی ذمہ وار حیثیت پر پہنچ گیا۔ وہ کمسریٹ کے افسر انچارج کی پوری تسلی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکے پورے کرتا رہا۔ محمد شفیع کے والد نے

اس تجارت کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔ اُس روپے کے علاوہ جو معمولی معمولی چرواہوں کو دھروشگی دے دیا کرتا تھا اُس کے پاس اور سرمایہ بھی تھا اس سرمائے کو اس نے قابل اعتماد ضمانتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سود پر لگا دیا۔ اُس کا لڑکا بہت بڑی جائداد کا مالک تھا لیکن والد ہی کا پیشہ اختیار کرنے والی ہندوستانی ذہنیت کی تقلید میں اپنی خاندانی تجارت میں پوری قوت کے ساتھ مشغول ہوگیا۔ وہ ایک ساہوکار اور تھوک فروش قصاب کی حیثیت سے ایسے ناجائز افعال کرتا رہا جن کی پاداش میں اس کو انبالہ کے جیل خانہ میں قید ہونا پڑا۔

چونکہ رئیس المبلغین سب کا سردار تھا اس لئے یہ شخص اس سازش کا دست راست تھا۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں تھیں اور جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اس کے خاندانی یا تجارتی تعلقات تھے وہ اپنے بڑھتے ہوئے ملازمین کے دائرے کا مرکز تھا جو شمالی ہند کے تمام حصّوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے تجارتی کاروبار نے ہماری سرحد پار کی گڈریہ اقوام کے ساتھ بھی اس کے تعلقات پیدا کر دیئے تھے وہ ہر سال انگریزی حکومت سے لاکھوں پاؤنڈ وصول کرتا اور اپنے کام میں وقت کا بڑا پابند تھا۔ وہ افسروں کا حکم خادموں کی طرح بجالاتا تھا اُس نے کمسریٹ کے افسر کو فریب دے کر فوجوں کو گوشت مہیا کرنے کے ٹھیکہ کی تجدید کرالی دراں حالیکہ وہ ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا

اس طرح ہمارا ملازم ہونے کی حیثیت سے جو عالمگیر اقتدار اُسے حاصل ہوگیا تھا وہ اُس کو ہماری تباہی اور بربادی کے لئے استعمال کرنے لگا۔ وہ اس سازشی جماعت کا ساہوکار تھا اور مجاہدین کو روپیہ پہنچانے کے لیے اُس نے اُن مراعات کو جو فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہایت چالاکی سے استعمال کیا اُس میں بذات خود کوئی مذہبی جوش نہ تھا۔ اُس نے کسی بیہودہ تعصب کو اپنی عقل پر غالب نہ آنے دیا۔ وہ کسی مجاہدانہ قربانی کا ملزم نہ تھا۔ وہ اس عرصہ میں بہت ہی ہوشیار، ذہین اور کمینہ تجاویز سوچنے والا ثابت ہوا۔ اُس نے بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے ۱۸۵۷ء سے اس خطرناک

کام میں ہاتھ ڈالا اور اپنی قابلیت اور اعلیٰ حیثیت پر اعتماد کیا جن کے متعلق خیال تھا کہ اسے راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ رکھیں گی۔

بعفر عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس المبلغین نے اپنی وفاداری کا کبھی جھوٹا دعوےٰ نہیں کیا۔ اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں۔ وہ بڑے مخلص اور با اصول انسان تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا جس کو ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ لہذا اب جبکہ انہوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی ہے تاریخ ان کے اس انجام کو پُر رحم جذبات کے ساتھ یاد کرے گی۔ مگر محمد شفیع جیسے شخص کے لئے اس قسم کے کوئی جذبات پیدا نہیں ہو سکتے اُس نے ہمارے ہاتھوں کو کاٹنے کے لئے چاٹا۔ وہ اُن لوگوں سے جو اس کے ساتھ سازش میں شریک تھے ناجائز سود وصول کرتا رہا۔ اس نے باغیانہ خطرے کے درمیان دلالی کا کام بہت زیادہ منافع پر کیا۔ یہ اُن تمام مذہبی اور چھوٹے موٹے غداروں کے درمیان جن کو ۱۸۶۴ء کے مقدمہ نے انبالہ جیل میں جمع کر دیا تھا بالکل ہی الگ حیثیت رکھتا تھا اُس کو اُن خطرناک بدمعاشوں کی یادگار سمجھئے جو روما کی جمہوریت کے زوال سے پیدا ہو گئے تھے اور جن کا حال مسٹر سسرو (CECERO) کی آتش بیانی نے ہم تک پہنچایا اُس میں اوپیونسیس (OPPIANCEINS) کی بے رحمی اور لینٹیولس (LANTULUS) کی احتیاط پائی جاتی تھی ایک بڑا مہلک قدم جو اُس نے اٹھایا یہ تھا کہ جنگی جہاز کے نمودار ہونے پر بھی اُس نے بحری ڈاکوؤں کا ساتھ نہ چھوڑا۔

اب میں نے غداروں کی جماعت کی اُن چار نمایاں شخصیتوں کا حال بیان کر دیا ہے جو ہر روز انبالہ کی عدالت میں اکٹھے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے تھے۔ باقی آٹھ کا حال میں جج کے اُن الفاظ میں جو اُس

لے یحییٰ علی۔ رئیس المبلغین ۲۔ عبد الغفار پٹنہ کے دارالاشاعت کا دنیاوی کاروبار سنبھالنے والا۔ جعفر تھانیسر کا عرضی نویس جو رنگروٹوں کو پنجاب سے گزارتا تھا اور محمد شفیع جو انگریزی فوجوں کو گوشت مہیا کیا کرتا تھا۔ اور باغیوں کو روپیہ پہنچاتا تھا۔ اور فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے فوجی نقل و حرکت کی اطلاع دیتا تھا۔

نے فیصلہ سناتے وقت کہے تھے مختصراً بیان کرتا ہوں۔ رحیم قیدی کے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُس کے مکان میں باغیانہ کام سرانجام پاتے رہے اُسی کے مکان میں بنگالی مجاہدین اکٹھے ہوتے اور رہتے تھے۔ اُسی کے خدمتگار کے پاس خزانہ ہوتا تھا وہی رنگروٹوں کے کھانے پینے کا انتظام کرتا اور مجاہدین کو روپیہ بھیجتا اُسی کا سالا یحییٰ علی اُس کے زنان خانہ کے دروازہ پر باغیانہ تبلیغ کرتا تھا یحییٰ علی سے کم قابلیت رکھتا ہے اور زیادہ مشہور نہیں لیکن حکومت کے خلاف جو کچھ اس سے ہو سکتا تھا اس نے کیا۔

الٰہی بخش کے متعلق ثابت ہو گیا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کے ذریعہ پٹنہ کے مولوی جمع شدہ سرمایہ کو تھانیسر میں جعفر کے پاس پہنچاتے تاکہ مُلکا اور ستیانا کو بھیج دیا جائے۔

پٹنہ کے ایک شخص حسینی کے متعلق ثابت ہوا کہ وہ الٰہی بخش کا نوکر ہے اور اُس نے اس کو باغیانہ مقصد کے لئے روپیہ پہنچانے کے لئے ملازم رکھا اُس نے یحییٰ علی کے حکم کے مطابق عبدالغفار سے سونے کی مہروں کی بہت بڑی تعداد وصول کی اور اُن کو اس نے اپنی واسکٹ میں سی لیا اور اس طرح ان مہروں کو پٹنہ سے دہلی لایا جہاں اس نے حسب الحکم جعفر قیدی کے حوالے کر دیں یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ اُس کے پاس چھ ہزار کے منی آرڈر تھے وہ ان باغیانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتا تھا جس کے لئے اسے ملازم رکھا گیا تھا۔

قاضی میاں جان کے متعلق ثابت ہو گیا ہے کہ اس کا کام جہاد کی تبلیغ اور بنگال میں مجاہدین بھرتی کرنا تھا وہ پٹنہ کے سازشیوں اور کوہستانی مجاہدین کا سرگرم کارکن تھا۔ وہ روپیہ جمع کرتا اور بھیجتا اور خطوط وغیرہ بھی پہنچاتا چنانچہ ایک نہایت اہم باغیانہ خط وکتابت جو پٹنہ اور مُلکا سے آئی ہوئی تھی اسی کے گھر سے دستیاب ہوئی معلوم ہوتا ہے اس کے تین چار فرضی نام تھے۔

عبدالکریم کے خلاف ثابت ہو چکا ہے کہ وہ محمد شفیع قصاب کا حقیقی ایجنٹ تھا اور باغیانہ مقاصد کے لئے پٹنہ کے منی آرڈروں کا روپیہ دلواتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے یحییٰ علی سے خط وکتابت بھی کرتا۔

تھانیسر کے حسینی قیدی کے خلاف ثابت ہوا ہے کہ وہ اس سازش میں محمد جعفر اور محمد شفیع قیدیوں کا

خفیہ ایجنٹ اور دلال تھا اور وہ جعفر سے محمد شفیع کی طرف ۲۹ طلائی مہریں کے لے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کے ذمے یہ بات تھی کہ ان مہروں کو ملک کے دشمنوں تک پہنچا دے۔

عبدالغفار[۵] نمبر ۲ کے خلاف ثابت ہوا کہ وہ پٹنہ میں یحییٰ علی کا مرید تھا اور یحییٰ علی نے جعفر قیدی کی مدد کے لئے اس کو تھانیسر میں رنگروٹ بھرتی کرنے والی جگہ پر مقرر کیا۔ اس نے اس کام میں ضرور معاونت کی نیز یہ کہ وہ یحییٰ علی کے ساتھ باغیانہ امور کے بارے میں خط و کتابت بھی کرتا تھا[۶]

اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے یہ ہیں۔ پہلی وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ دوسرے وہ راز داری جس کے ساتھ اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ تیسرے وفاداری کا وہ رویہ جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے عمدہ فرضی ناموں کی ترکیب اور خفیہ زبان پر تھا جس کا نمونہ میں ذیل میں پیش کرتا ہوں[۷]۔ لیکن میں اس یقین کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام سازشی سوا محمد شفیع فوجی ٹھیکیدار کے اپنا کام انتہائی خلوص اور فطرتی جوش کے ساتھ خدائی کام سمجھ کر کرتے۔ ان کا عہد تھا کہ مرتے دم تک اس فرض کو سرانجام دیں گے۔ انگریزی حاکموں نے بھی اس کا انتظام نہایت دانشمندانہ طریقے سے کیا۔ کیونکہ ان میں جو بدترین باغی تھا اسے بھی شہادت کا درجہ حاصل نہ ہوا۔ صوبے کی سب سے بڑی عدالت نے ان کی اپیل کو نہایت متانت کے ساتھ سننے کے بعد مسٹر ہربرٹ کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق کیا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں اور تین میں صورتوں میں بھی پھانسی کی سزا کو حبس دوام بعبور دریائے شور سے بدل دیا۔

---

[۵] اس نام کا ایک اور عبدالغفار بھی تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

[۶] ۱۸۶۴ء کے مقدمہ کی داستان کے سلسلے میں میں نے اپنے اس مضمون سے مدد لی ہے جو میں نے ۱۸۶۴ء میں لکھا تھا۔ تمام واقعات مقدمہ کے تصدیق شدہ ریکارڈ سے لئے گئے ہیں۔ یا وہ مقامی حاکم کے خطوط اور سرکاری رپورٹوں سے لئے گئے ہیں۔

[۷] جنگ کو مقدمہ کہا جاتا تھا۔ خدا کو قانونی ایجنٹ طلائی مہروں کو سرخ ہیرے یا دہلی کے بڑے سنہری جوتے باقی صفحہ ۶۲ پر

لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں ایسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلافات نے کچھ سالوں کے لئے انہیں سرحد پر خاموش رکھا۔ مگر اُس کے باوجود ہمارے علاقہ میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش کے ساتھ ہوتی رہی۔ مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لئے ہفتہ وار امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان نذرانوں کا اصلی حصہ جو سرحد پر پہنچا اُس کے متعلق بہت سے شکوک ہیں اس لئے کہ جوں جوں روپیہ پہنچانے کے راستے میں رکاوٹیں بڑھتی گئیں اسی اعتبار مبلغین اُس کی زیادہ مقدار اپنے استعمال میں لانے لگے جس کی ان کا پُرانا جوش ہرگز اجازت نہ دیتا تھا۔

دہانہ گنگا کے متعصب مسلمان اپنے آپ کو وہابی نہیں بلکہ فرازی[۱] کہتے ہیں یعنی زیادہ اعلےٰ مذہب کے پیرو۔ وہ اپنے آپ کو نو مسلم کہہ کر بھی پکارتے ہیں کلکتہ کے مشرقی اضلاع میں ان کی ایک کافی تعداد رہتی ہے ہم اس سے پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ۱۸۳۱ء میں ایک مقامی لیڈر نے تین چار ہزار آدمیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور کلکتہ کے ملیشا کی ایک جماعت کو شکست بھی دی تھی۔ یہاں تک کہ باقاعدہ فوج ہی کی مدد سے اُن کو دبایا جا سکا۔ ۱۸۴۳ء میں اس جماعت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی اور حکومت کو اس کی بالخصوص تحقیقات کرنا پڑی۔ بنگال کے پولیس افسر نے رپورٹ کی تھی کہ اُن کے صرف ایک واعظ نے اسی ہزار مرید جمع کر رکھے ہیں جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے اور ہر ایک کے منشا کو جماعت کا منشا سمجھتے ہیں۔ بعد کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) یا بڑے سرخ جانور۔ طلائی مہروں کی ادائیگی کو سرخ دانوں والی تسبیح کہتے تھے اور روپے پیسے کی ادائیگی کو کتابوں اور دوسری تجارتی چیزوں کی قیمت۔ ڈرافٹ اور منی آرڈر کو سفید پتھر اور اُن کی تعداد کو تسبیح کے دانوں سے ظاہر کیا جاتا (بقیہ؟) دی جاتی سرکاری رپورٹ پیراگراف ۱۸۷۰ء پنجاب میں جوڈیشل کمشنر میں اپیل کا فیصلہ مورخہ ۲۰ اگست ۱۸۶۴ء۔

[۱] افراز۔ بلند۔ وہ اپنی جماعت کا بانی تیطومیاں کو نہیں بلکہ شریعت اللہ کو جو ڈھاکہ میں ۱۸۲۸ء میں وعظ کیا کرتا تھا۔ قرار دیتے ہیں۔

غلطہ خصوصاً یحییٰ علی نے جنوبی بنگال سے فرازیوں کو شمالی ہندوستان کے وہابیوں میں مدغم کر دیا تھا۔ اور گذشتہ تیرہ برس سے ہم ان کو میدان جنگ کے مقتولین اور عدالتوں کے کٹہروں میں ساتھ ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں۔

۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک جمع شدہ سرمایہ اور آدمی حسب دستور سرحد جاتے رہتے چنانچہ اس سازش کو قابو میں لانے کے لئے ہمیں ایک علیحدہ محکمہ قائم کرنا پڑا۔ اُس وقت وہابیوں کی دیکھ بھال اور اُن کو اعتدال پہ رکھنے کے لئے صرف ایک ہی صوبے کا خرچ اِس قدر بڑھ گیا تھا جتنا ایک انگریزی ضلع کو جس میں سکاٹ لینڈ سے ایک تہائی انسان بستے ہیں۔ بندوبست، عدالت اور جرائم پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہ شرانگیزی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لئے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے اور اُن کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو اُن کے مرید ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ اپنے سردار سے غداری کی بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۸۶۸ء میں ہماری سلطنت میں پولیس کی تگ و دو اور سرحد پر فوجی چوکیوں کے باوجود ان مجاہدین کی سازشوں نے حکومت ہند کو ایک اور خونریز جنگ میں دھکیل دیا جس میں ہمارا بہت سا روپیہ خرچ ہوا۔ اُسی سال مالدہ کے مرکز نے بے خطر ہو کر پٹنہ کے خلیفہ کے لڑکے کو دعوت دی کہ وہ بنگال کے عین وسط میں پہنچ کر بغاوت کی تبلیغ کرے روزمرہ کی عدالتی کارروائیاں اس بحران کو روکنے کے لئے بالکل بے کار ثابت ہوئیں اور حکومت کو اُن اختیارات خصوصی سے کام لینا پڑا جن کے استعمال کا ایسے مواقع پر اُس کو اختیار دیا گیا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں مجلس قوانین ساز نے اس خطرہ کو باقاعدہ طور پر محسوس کر لیا تھا جو ہماری ایسی حکومت کو جس کی ترکیب چند اجنبی اشخاص سے ہو مفتوح قوم کے عوام کی بھاری اکثریت سے پیش آسکتا ہے۔ اِس بنا پر اُس نے محکمہ منتظمہ کو سازش کے وقت گرفتاریاں کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ ایسے قومی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اگرچہ انگلستان میں (HEBEA CARPS ACT) کو ملتوی کر دیا جائے گا مگر ہندوستان

میں اس التوا سے جو مصیبت نازل ہو گی وہ کسی صورت میں مارشل لا کے نفاذ سے کم خطرناک نہ ہو گی ۔ مثال کے طور پر موجودہ موقع پر مسلمانوں کی صرف ایک جماعت قابل مواخذہ ہے تمام مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں ۔ اگر کوئی قانون ایسا نافذ کر دیا جائے جس سے (HEPEA CARPS ACTS) کی طرح التوا ہو جائے تو نہ صرف ہندو جو ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں بجا طور پر شکایت کریں گے کہ اُن کے بدترین دشمن مسلمانوں کی غداری کی وجہ سے انہیں بھی تکلیف میں ڈالا جا رہا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں شیعہ اور سُنی جماعتیں پر زور احتجاج کریں گی کہ ان کو وہابی بدعتیوں کے ساتھ ایک ہی حکم امتناعی کے ماتحت کیوں رکھا گیا ہے ۔

یہ بے انصافی ایک اور قوت کے ماتحت جس کا خوش قسمتی سے انگلستان میں رواج نہیں لیکن ہندوستان میں عام ہے اور بھی بڑھ جائے گی ۔ ایک بنگالی خواہ امیر ہو یا غریب اپنے دشمن کے ساتھ بے حد کینہ رکھتا ہے وہ اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے کسی قسم کے تشدد کو کام میں نہیں لاتا بلکہ اس کو عدالتی مقدمات میں الجھا دے گا ۔ وہ عدالتوں کو اُس کام کے لئے استعمال کرتا ہے جس کام کے لئے ایک انگریز اپنا چابک اور کیلیفورنیا کا باشندہ اپنا مشت قبض استعمال میں لاتا ہے کسی کو ذاتی رنجش کی بنا پر سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا جائے ۔ اس لئے (HEPEA CARPS ACT) کا عام التوا ہر شخص کو اُس کے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دے گا ۔ ہندوستان میں پولیس کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹے مقدموں کی تعداد سچے مقدموں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے اور بنگالی تو جھوٹے مقدموں کو ظاہراً سچا ثابت کرنے کے خطرناک کام کو سائنس کے درجے پر لے گئے ہیں لہذا (H. C. A) کے حق کا باقاعدہ التوا اس امر کا مترادف ہو گا کہ جھوٹے مقدمات کے سلسلوں کو جاری رکھنے کا اعلان عام کر دیا جائے ۔ بے گناہوں کو ہر وقت خطرہ لگا رہے گا کہ وہ قید یا بغاوت کے الزام میں جیل خانوں میں پڑے رہیں گے انتقام پسند اور کینہ پرور لوگ ہمیشہ کامیاب ہوتے رہیں گے ۔

پھر بھی اگر بغاوت کے وقت گرفتار کرنے کا حق اُن کے پاس نہ ہو جیسا کہ انگلستان میں ملکہ کے

وزراء کو (H.C.A) کو ملتوی کرنے کا حق تھا ہے تو ہندوستان میں انگریزی حکومت ایک مہینہ تک بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے مجلس مقننہ نے محکمہ منتظمہ کو اس قسم کی ترمیم شدہ طاقت بطور استحقاق دے رکھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایسی قیود اور پابندیاں بھی لگا دی ہیں جن کی بنا پر اس قانون کا ناجائز استعمال نہ کیا جا سکے اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اس استحقاق سے صرف حکومت اعلےٰ ہی کام لے سکتی ہے اور وہ بھی اُس وقت جب اُس نے گورنر جنرل باجلاس کونسل سے منظوری حاصل کر لی ہو۔ پھر تمہید ہی میں اس قانون کے نفاذ کو صرف اُن سیاسی معاملات تک محدود کر دیا ہے جن کا اثر انگریزی حکومت کے خارجہ تعلقات یا دیسی ریاستوں میں جن کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں امن وامان قائم رکھنے سے ہو یا جن کا اثر انگریزی علاقے کو کسی بیرونی حکومت کے حملے یا اندرونی بغاوت سے محفوظ رکھنے سے ہے[1] اس قسم کے قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کے لئے خاص دفعات بنائی گئی ہیں۔ قانون میں اُن کی حیثیت کو اخلاقی مجرموں سے بالکل علیحدہ کر کے دکھایا گیا ہے اور اُن کو قیدی نہیں بلکہ نظر بند کہا جاتا ہے ان کو گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اُن کو گورنر جنرل با اجلاس کونسل کے پاس براہ راست عرضداشت بھیجنے یا مطالبہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔۔۔ جو افسر ایسے شاہی قیدیوں پر متعین ہوتا ہے وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کے افسر اعلےٰ کو اطلاع دیتا ہے کہ آیا نظر بندی سے کسی کی صحت کو نقصان تو نہیں پہنچا اور اُس کا وظیفہ اتنا ہے کہ اُس کی اور اُس کے اہل وعیال کی اُس کے معیار زندگی کے مطابق کفالت کر سکے۔ اس کی جائداد بھی عموماً اُس کے یا اُس کے خاندان ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن اگر گورنمنٹ کے لیے ضروری بھی ہو جائے کہ اُس کی جائداد پر قبضہ کرے تو اُسے مالگذاری کی ادائیگی یا دیوانی عدالت کی کسی ڈگری میں نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقتاً اس جائداد کو وہ تمام سہولتیں حاصل ہوتی ہیں جو کورٹ آف وارڈ میں آئی ہوئی جائدادوں کو دی گئی ہیں بروئے قانون اس بات کی خوب احتیاط کی جاتی ہے کہ اُن پر خواہ مخواہ زیادہ دیر تک قیود عاید نہ ہوں چنانچہ ہر افسر جو اُس شاہی قیدی پر مامور ہو جس کو محکمہ منتظمہ نے نظر بند کر رکھا ہے مجبور

---

[1] اس سے مراد بنگال گورنمنٹ ہے۔ جو قانون منظور کرتے وقت حکومت اعلےٰ کی قانونی اور تاریخی نمائندہ تھی۔ ریگولیشن نمبر ۱۱۱ ۱۸۱۸ء نمبر ۳ دفعہ V

ہے کہ اس کے چال چلن صحت اور سہولت کے متعلق براہ راست حاکم علاقے کے پاس سال میں دو دفعہ رپورٹ کرے تاکہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل اس امر کا فیصلہ کر سکے کہ آیا اس کی نظر بندی کے احکام جاری رہیں یا اُن میں کوئی ترمیم کردی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ قانون اُس اتحاد کے خلاف نافذ کیا جاتا جو ۱۸۵۸ء کی مہم اور اس کے بعد تحقیقات سے معلوم ہوا تھا تو انگریزی ہندوستان کو ۱۸۶۳ء کی تباہ کن سرحدی جنگ سے نجات مل جاتی۔ تھوڑی سی دانشمندانہ گرفتاریاں درہ امبیلا میں تقریباً ایک ہزار سپاہیوں کے قتل اور لاکھوں پونڈ کی رقم کو بچا سکتی تھیں پھر اس تباہ کن جنگ کے بعد بھی اگر اس سازش کو جو ۱۸۶۴ء کے سیاسی مقدمے سے منکشف ہوئی تباہ کرنے کے لئے محکمہ منتظمہ گرفتار کرنے کے استحقاق کو سختی کے ساتھ استعمال کرتا تو بہت ممکن تھا کہ ہمیں ۱۸۶۸ء میں کوہ سیاہ کی مہم سے نجات مل جاتی۔ لیکن اُن وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر میں نے کسی اور جگہ کیا ہے ہندوستان کی حکومت اپنے ارد گرد کے سیاسی خطرات کو خاطر میں نہیں لاتی اور اُس کی یہ عادت وقتاً فوقتاً اسے خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

انگلستان نے بہت بڑی بازی ہندوستان میں لگا رکھی ہے۔ انگریزی سرمایہ دار کروڑوں پونڈ ہر سال جب سے یہ ملک سلطنت کے زیر اقتدار آیا ہے۔ ریلوں۔ نہروں اور دیگر منفعت بخش کاموں پر لگاتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت میں عارضی طور پر بھی فرق آگیا تو یہ ایک عظیم الشان مصیبت ہوگی۔

سرحد پر تباہ کن جنگیں اور اندرون ملک میں عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کے اتحاد کو توڑ سکیں۔ آخر ۱۸۶۸ء میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے استحقاق گرفتاری کو سختی کے ساتھ استعمال کرے۔

یہ اقدام بے گناہوں کو ضرر پہنچائے بغیر کیا جا سکتا ہے اور اس میں عوام الناس کی طرف سے کسی قسم کی شورش کا اندیشہ بھی نہیں۔ غداروں کے سرداروں کی ضلع وار فہرست کئی سال سے حکومت کے پاس تھی۔ اور ہندوؤں

کو بھی اُن کے جلد یا بدیر گرفتار ہو جانے کی توقع تھی۔ سازش کے مشہور و معروف مبلغین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور وہ ساحرانہ اثرات جو انہوں نے اپنے مقلدین پر پیدا کر رکھے تھے زائل کر دیئے گئے رفتہ رفتہ اُن تمام خفیہ اور کمینہ غداروں کے خلاف شہادتیں جمع کر لی گئیں۔ جو لوگ امیر تھے اور روپیہ بہم پہنچانے کا کام کرتے تھے انہوں نے ۱۸۶۴ء والے مقدمے کے فوجی ٹھیکیداروں کی طرح باغیانہ خطرے کے ماتحت دلالی کا بہت ہی منفعت بخش کاروبار چلا رکھا تھا۔ میں اُن مقدمات میں سے ایک کا قصہ بیان کر چکا ہوں جو گذشتہ سال مالدہ کے مرکز اعلیٰ کے مقدمہ کے بعد شروع ہوا اس وقت قیدیوں کا ایک گروہ جس کو محکمہ متعلقہ نے گرفتار کیا مجسٹریٹ کی باقاعدہ تحقیقات کے بعد سیشن سپرد ہو چکا ہے اور ان کے خلاف پٹنہ میں قانونی کارروائی ہو رہی ہے۔

ان گرفتاریوں اور عدالتی کارروائیوں نے آخر مسلمانوں کو اُس خطرے سے آگاہ کر دیا جو مجاہدین کی یہ جماعت تمام اہل اسلام پر نازل کر رہی تھی انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان بدعتی سازشیوں سے اپنے آپ کو باقاعدہ اور کھلم کھلا بری الذمہ ثابت کیا جائے۔ اس بنا پر ہر ایک جماعت نے جہاد کے متعلق اپنے علما کے فتوے بھی شائع کر دیئے ہیں۔ اور وہابی بغاوت کی مذمت کی ہے یہ عجیب و غریب دستاویزات ہمارے آئندہ باب کا موضوع ہوں گی۔ سرانجام کار مجاہدین کی سازش میں بھی تباہی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کے نمایاں اور سرگرم لیڈر نظربند ہیں اور باقی ماندہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کبھی نمایاں ہونے کی کوشش کی تو ان کا بھی ویسا ہی حشر ہوگا بایں ہمہ اس بہت بڑے دینی اتحاد کا مرکز ابھی تک سرحد پر قائم ہے آج ہی صبح[1] جب میں اس باب کو ختم کر رہا تھا ایک معتبر ہندوستانی اخبار نے کوہ سیاہ پر ایک اور چھاپے کی اطلاع دی ہے۔ ۴ ؍ جون کو ایک قبیلہ کا حملہ ہوا جس نے آبادی کے سخت مقابلہ کے باوجود تین گاؤں کو جلا دیا[2]۔ اس فساد کے چار گھنٹوں کے اندر اندر ۳ پنجابی پیادہ اور پنجابی

[1] شملہ ۱۶ ؍ جون ۱۸۷۱ء۔ [2] پائنیر ۱۲ ؍ جون جو ۱۶ جون کو شملہ پہنچا۔

سواروں کے ایک حصّہ نے ہماری قریب ترین چھاؤنی سے کوچ کرنا شروع کردیا۔ اس کا کیا انجام ہوا اس کے متعلق ابھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ یہ حملہ مجاہدین کا تھا یہ کسی اور کا صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ انگریزی ہندوستان کے اخبارات کئی ہفتوں سے ایک اور افغانی جنگ کے امکانات پر بحث کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ مصیبت پھر ہماری قسمت میں لکھی ہے تو سب سے پہلے اندرون ملک میں وہابیوں کی سازش کو کلی طور پر نیست ونابود کرنا ایک بہت بڑے خطرے کو رفع کرنے کے مترادف ہوگا۔

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے

رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۶	مئی ۱۹۴۲ء	عدد ۵

سخنہائے گفتنی — پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی — ۲

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت — از ولیم ہنٹر (ترجمہ) ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم بی بی ایس لاہور — ۹

نقد و نظر

جان گنتھر کی مشہور کتاب ان سائڈ ایشیا پر ایک تنقیدی نظر — پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی — ۴۵

مثنوی اسرار خودی اور مولانا محمد علی مرحوم — پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی — ۵۵

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق"

ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

مسٹر این جی چیٹرجی ورکنگ پریزیڈنٹ بنگال پراونشل ہندو مہاسبھا نے اپنے اعلان محریہ یکم اپریل سنہ رواں میں یہ کہا کہ :-

"کوئی نیشنلسٹ (وطن پرست) خواہ اس کے سیاسی عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں (یعنی خواہ وہ کانگریسی ہو یا مہاسبھائی یا لبرل) سر سٹیفورڈ کرپس کی سکیم کو تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ اس کی رو سے صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ پسند کریں تو انڈین یونین سے قطع تعلق کر کے، جداگانہ متوازی یونین قائم کر سکتے ہیں۔" (اس کے بعد وہ اپنی مہاسبھائی ذہنیت کو بایں الفاظ بے نقاب کرتے ہیں)

"ایک کل کی حیثیت سے، ہندوستان کے ساتھ ہندوؤں کی عقیدت اور وفاداری صوبجاتی اور طبقاتی عقیدت مندیوں اور وفاداریوں سے بالاتر ہے اور ان پر غیر مبہم تفوق رکھتی ہے۔ ہندو دھرم نے ہندی شہریت کو مذہبی اور روحانی اعتبار سے زبردست استحکام عطا کیا ہے اور ہندوستان من حیث الکل کا وفاق، ہندی تصور اور ثقافت میں صدیوں سے بطور حقیقت ثابتہ و مسلمہ جاگزیں رہا ہے۔ اس لئے حکومت خوداختیاری کے پردہ میں ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینا، قومی خودکشی کا مرادف ہوگا اور بنگال اس سیاسی اور روحانی موت کو قبول کرنے کے لئے کبھی رضامند نہیں ہوگا"

اس اعلان سے حسب ذیل حقائق منطقی طور پر مستنبط ہو سکتے ہیں اولاً ہندوؤں کی اصطلاح میں یا اُن کے عقیدہ کی رُو سے نیشنلسٹ (قوم یا وطن پرست) وہ ہے جو مسلمانوں کو اس براعظم کے کسی گوشہ میں بھی باعزت زندگی بسر نہ کرنے دے، اور خدا کی اس وسیع زمین پر کسی جگہ بھی آزادی کی سانس نہ لینے دے۔

ثانیاً ہندوستانی اور ہندو یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں، اس لئے ہر وہ شخص جو اس براعظم میں رہتا ہے، ہندو مہاسبھا کے عقیدہ کی رو سے صرف ہندو بن کر ہی رہ سکتا ہے۔

ثالثاً ہندو دھرم نے صرف ہندوؤں ہی کو مذہبی استحکام نہیں عطا کیا بلکہ ہندی شہریت کو بھی استحکام عطا کیا ہے یعنی ہندو دھرم اس برّاعظم کے تمام باشندوں کی زندگی پر حاوی ہے

رابعاً ہندی تصور اور ہندو تصور دونوں ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں یعنی ہر ہندوستانی کو ہندو تصور اپنے دماغ میں قائم کرنا پڑے گا۔

خامساً، اگر ہندوستان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی (اور غالباً ہو کر رہے گی) تو وطن پرستی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مجھے امید ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوؤں کے ساتھ اتحاد یا اشتراک عمل کے حامی ہیں، ان حقائق پر سکون قلب کے ساتھ غور کریں گے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ یقیناً اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہندو کے ساتھ اشتراک عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنے مذہب (اسلام) کو خیرباد کہہ دیں کیونکہ انڈین کے معنی صرف ہندو کے ہیں۔

ہاں اس موقع پر، ارکان مہاسبھا کی خدمت میں اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح ان کا دعوے یہ ہے کہ،۔

"ہندوستان من حیث الکل کے ساتھ، ان کی عقیدت اور وفاداری تمام صوبجاتی اور طبقاتی عقیدت مندیوں اور وفاداریوں پر تفوق رکھتی ہے کیونکہ ہندو دھرم نے ہندی شہریت کو مذہبی اعتبار سے استحکام عطا کیا ہے اور ہندوستان من حیث الکل کا تصور، اُن کی ثقافت میں ایک حقیقت ثابتہ ہے ٹھیک اسی طرح اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت اور وفاداری تمام وطنی، نسلی، قبائلی، صوبجاتی اور طبقاتی عقیدت مندیوں اور وفاداریوں سے بالاتر ہے اور اُن پر زبردست تفوق رکھتی ہے کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کی جماعت کو مذہبی اعتبار سے مستحکم کر دیا ہے اور ایک زبردست ہیئت اجتماعیہ کی حیثیت سے، اسلام اُن کی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عنصر فعال اور زندہ حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے جس کو وہ کسی حال میں ترک نہیں کر سکتے۔ وہ وطن پرست نہیں ہیں بلکہ خدا پرست ہیں اور اس لئے مسلمان پہلے ہیں ہندوستانی بعد میں

اگر اپنے مذہبی قوانین کو نافذ کرنے کی غرض سے، انہیں اس ملک کی مفروضہ وحدت کو پارہ پارہ کرنا پڑے تو وہ ہزار

بار اس مقدس کام کو سرانجام دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ ہندوستان کی وحدت کا تصور ان کے تصورات مذہب و ملت سے بالکل خارج ہے: وہ کسی ملک کی وحدت کو اپنے مذہب کی تعلیمات یا اپنی ملی روایات کا جزو نہیں سمجھتے۔ ان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ مذہب ہے۔

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم

قوم ہے قرآن سے، قرآن رخصت قوم گم (اکبرؒ)

جن دو قوموں کے تصورات اور احساسات میں اس درجہ تباین اور تخالف ہو انہیں ایک مرکزی حکومت کے تحت رکھنے کی کوشش سیاسی کوتہ بینی کی وہ آخری حد ہے جس کے بعد اور کوئی حد متصور نہیں ہو سکتی۔ کاش ہندو اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اسلام مسلمانوں سے یہ کہتا ہے۔

بازو ترا توحید کی ہمت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے (اقبالؒ)

اگر ہندو اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں تو ہندوستان کی سیاسی گتھی چشم زدن میں سلجھ سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ اس گتھی کو سلجھانے کی اور کوئی صورت بھی نہیں ہے۔

آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم پنجاب نے ۲۲ مارچ کو، ایم اے۔ او کالج امرتسر میں اپنے کانوکیشن ایڈریس میں جن گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا وہ اس لائق ہیں کہ تمام سمجھدار اور صداقت پسند اصحاب انہیں غور سے پڑھیں۔ اقتباسات ذیل سے صاحب موصوف کی ژرف نگاہی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے فرمایا:۔

"اگر مذہب کی بدولت مجھے طمانیت خاطر حاصل ہو، تو میں بڑی خوشی کے ساتھ افلاس اور گمنامی کی زندگی بسر کر سکتا ہوں، جب اللہ تعالےٰ کے ساتھ روحانی رابطہ کی دولت حاصل نہ ہو، انسانی زندگی، خواہ کتنی ہی شاندار اور مشہور خاص و عام کیوں نہ ہو، میری نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ میں تو اسے زندگی ہی نہیں سمجھتا۔

"آج دنیا ہلاکت اور تباہی کے گرداب میں مبتلا ہے اس سے زیادہ خوفناک خونین ڈراما دنیا کے سٹیج پر اس سے پہلے کبھی نہیں کھیلا گیا، لاکھوں انسان لقمہ اجل بن چکے ہیں، لاکھوں خاندان تباہ ہو چکے ہیں، اور ابھی تک اس

جنگ کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کبھی آپ نے سوچا کہ دنیا پر یہ عذاب کیوں مسلط ہے؟ میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے خالق اور مالک کی نافرمانی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں خدا پرستی کے بجائے زر پرستی اور نفس پرستی میں مبتلا ہیں؛ بنی آدم نے اللہ تعالےٰ کو بھلا دیا ہے اور طاغوت کی غلامی اختیار کر لی ہے، اخلاق حسنہ اور روحانی اقدار کو پس پشت ڈال دیا ہے اور مادہ پرستی کو شعار زندگی بنا لیا ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت کی جس قدر ضرورت آج ہے شاید ہی اس سے پہلے، اس کی ضرورت اس قدر محسوس کی گئی ہو، کیونکہ ہر طرف مادیت اور الحاد کی رَو چل رہی ہے"

ہمیں، میاں صاحب موصوف کے ہر لفظ سے اتفاق ہے بلاشبہ موجودہ جنگ، جس میں انسان، بربریت اور سفاکی کے بدترین نمونے پیش کر رہا ہے۔ ایسے نمونے جن کے سامنے تیمور۔ ہلاکو۔ اور چنگیز کی ستم رانیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اس لئے اور محض اس لئے برپا ہوئی ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو بکلی فراموش کر چکا ہے، اور خدا پرستی کے بجائے، طاغوت پرستی کو اُس نے اپنا وظیفۂ زندگی بنا لیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی بصیرت نے اس دور کو آج سے کئی سال پہلے دیکھ لیا تھا۔

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہ گزر سیل بے پناہ میں ہے

میں علیٰ وجہ البصیرت، دنیا کو یہ پیغام سنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ سلامتی کی زندگی بسر کرنی چاہتی ہے تو اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سلامتی کا مذہب اختیار کرے، اور وہ مذہب اسلام ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ حکمرانی صرف اللہ کو سزاوار ہے۔

زیر گردوں آمری از قاہری است — قاہری از ماسوا اللہ کافری است (اقبالؒ)

کیوں؟ اس لئے کہ یہ زمین انسان کی ملک نہیں بلکہ خدا کی ملک ہے۔ الحکم للّٰہ ؛ الارض للّٰہ

اسلام ہی دنیا میں وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے دنیا کو یہ انقلاب آفریں پیغام سنایا۔

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری (اقبالؒ)

فتنہ و فساد، جنگ و جدل، اور قتل و غارت کی بنیاد ہی اس غلط نظریہ پر ہے کہ انسان اس زمین کا مالک ہے: حالانکہ غور سے دیکھا جائے، تو مالک وہ ہے جو خالق ہے اور وہ صرف اللہ تعالےٰ ہے اس لئے قرآن مجید نے حاکمیت کا حق صرف

اللہ کے لئے مخصوص کیا اور یہی وہ بنیادی تعلیم ہے جس سے فکر و عمل میں ایک خوش آیند انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

اس سے بڑھکر ہوگا کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔ بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اپریل کے پہلے ہفتہ میں، راقم الحروف کو مجلس یادگار حسینی کی دعوت پر کرنال جانے کا اتفاق ہوا، اور شرکت کے بعد اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ سُنی اور شیعہ دونوں ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ محض امام حسینؓ کی مظلومیت کی داستان سُننے اور سُنانے سے ان کی مشکلات رفع ہو سکتی ہیں۔ شرکت کے بعد اقبال کے اس شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا

حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔ یہ اُمت روایات میں کھو گئی

خدا جانے مسلمانوں کو کس دن یہ سمجھ آئے گی کہ زندگی میں انقلاب رونے دھونے سے پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ طرز قبیح سُنت اللہ کے خلاف ہے۔ غلامی کی زنجیریں یزید ابن معاویہ پر لعنت کرنے سے نہیں ٹوٹ سکتیں کہ یہ طریقہ آئین فطرت کے خلاف ہے؛

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ ۔ کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

اس سے بڑھکر ہماری شومی قسمت اور کیا ہوگی کہ ہم موجودہ یزید سے تو کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے لیکن جو یزید تیرہ سو سال ہوئے، فوت ہو گیا، اس پر لعنت کرنا موجب نجات اُخروی سمجھتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ہم اپنی نگاہ کا زاویہ بدلیں اور رونے دھونے کو بالائے طاق رکھکر حسینؓ کی طرح باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں نکلیں،

رونا، رلانا یا رونے والوں کی سی صورت بنانی، یہ امور ہرگز اسوۂ حسینی نہیں ہیں؛ عجب تماشا ہے کہ ہر شخص اُسوۂ حسینی کو آب و تاب کے ساتھ پیش کرتا ہے اور حسینؓ کی مظلومیت کی داستانیں سُنا کر گریہ و بکا کا منظر پیدا کرتا ہے لیکن یزید کا مقابلہ کرنے پر کوئی خطیب اپنے سامعین کو آمادہ نہیں کرتا غالباً اقبالؒ کی نظر میں اسی قسم کے خطیب ہوں گے جب انہوں نے یہ شعر کہا۔

تیغ و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست   با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

ایک ہزار سال سے، سنی اور شیعہ ماتم کر رہے ہیں، لیکن یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حسینؓ نے کربلا میں اپنی جان کسی مقصد کے لئے قربان کی تھی؟ اگر ہمیں وہ مقصد عزیز نہیں، تو خدارا مجھے بتائیے کہ پھر ہمیں حسینؓ سے کیا نسبت؟ غالباً اسی لئے اقبال کو یہ کہنا پڑا:۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں   گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

مسلم لیگ کی روز افزوں طاقت کا کچھ اندازہ اس تبدیلی سے بھی ہو سکتا ہے جو کچھ عرصہ سے ہندو لیڈروں اور اخباروں کے زاویۂ نگاہ میں پیدا ہو چکی ہے۔

۱۹۳۷ء میں جواہر لال نہرو نے لکھا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں انگریزی حکومت اور کانگریس لیکن ۱۹۴۲ء میں گاندھی کے سمدھی، اور مدراس کے سابق رئیس الوزراء مسٹر راجگوپال اچاریہ نے لکھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو زبردست جماعتیں سرگرم عمل ہیں ایک کانگرس دوسری مسلم لیگ۔

کچھ دنوں پہلے ہندو اخبارات یہ لکھا کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک اقلیت کی سی ہو گی؛ اور آئین سازی کا حق اکثریت کو حاصل ہو گا۔ لیکن ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے "ملاپ" میں مسلم لیگ کے مسلک کو بایں الفاظ تسلیم کیا گیا ہے۔

"نیشنل گورنمنٹ جو دوران جنگ میں حکومت کا کام چلانے کے لئے مرکز میں قائم ہو گی، مسلمانوں کو ناخوش کر کے، ...... آزاد ہندوستان کا آئین نہیں بنا سکے گی۔"

لائے اُس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

مقام مسرت ہے کہ اب ہندو بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ جب تک کسی آئین پر مسلم لیگ کی منظوری کی مہر ثبت نہ ہو گی، وہ آئین اس برِاعظم میں نافذ نہیں ہو سکے گا۔ وائسرائے نے بھی ۸ اگست والی پیشکش میں، اسی حقیقت کا اعتراف کیا

ہے کہ مسلمانوں کی منظوری کے بغیر کوئی جدید آئین اس ملک میں نافذ نہیں کیا جائے گا:

اب ہندو قوم اس حقیقت کو اور سمجھ لے کہ مسلمان چونکہ ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے جن صوبوں میں انہیں اکثریت حاصل ہے وہاں وہ آزادی کے ساتھ حکومت کرنی چاہتے ہیں اور اس لئے وہ اپنی اکثریت کے صوبوں کو مرکز کے تحت یا زیر اثر رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اب اگر اس کے جواب میں ہندو یہ کہتے ہیں کہ اس طرح بھارت ماتا کی وحدت پارہ پارہ ہو جائیگی تو ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی قومی اور ملی ہستی، اپنی ثقافت اور تہذیب کی ترقی اور اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کی خواہش، بھارت ماتا سے بڑھ کر عزیز ہے ہم ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے، اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے اور ہم بہانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ کبھی بھی دستبردار نہیں ہوں گے پاکستان، نہ سیاسی شعبدہ ہے نہ ذریعۂ دادو ستد کوئی تجارتی فارمولا، اور نہ کوئی خطرناک تحریک بلکہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا نصب العین ہے۔ ہمارا سیاسی مسلک ہے، ہمارا مقصود حیات ہے اور اس کے حصول کی خاطر اگر ہمیں جان سے ہاتھ دھونے پڑے، تو ہم بڑی خوشی کے ساتھ، ایسا کرنے کو تیار ہیں کیونکہ اب مسلمانوں پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ

"غلامی کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔"

زندگی را چیست رسم و دین و کیش ؟
یک دم شیری بہ از صد سال میش
(اقبالؒ)

جب ہم ہندوؤں کو بخوشی اجازت دیتے ہیں کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں، آزادی کے ساتھ حکومت کریں اور اپنی قوم کی زندگی بڑی خوشی کے ساتھ ویدانتی تصورات کے سانچہ میں ڈھالیں تو پھر ہمیں یہ حق کیوں حاصل نہ ہو کہ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور اپنی قوم کی زندگی قرآنی تعلیمات کے سانچہ میں ڈھالیں ؟

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت

تیسرا باب

مسلمان علماء کے فتوے

(سلسلہ کے لئے مئی ۱۹۶۲ء کا پرچہ ملاحظہ فرمائیں)

بنگال میں وہابی اپنے باغیانہ سلسلہ کی اشاعت برادران وطن کی مخالفت کئے بغیر نہ کر سکے علاوہ اُن دینی مباحث کے جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ایسی ہی سختی کے ساتھ جاری ہیں جیسے عیسائیوں میں وہابیوں کا کسی ضلع میں موجود ہونا بذات خود اس ضلع کے تمام مسلمان اور ہندو زمینداروں اور تاجروں کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ وہ سیاسیات اور مذہب دونوں میں انقلاب چاہتے ہیں۔ ان کا کام لوتھر اور کرومویل کی طرح تعمیری نہیں بلکہ رولیس پیر اور اینٹورپ کے ٹینخلین[1] (TANCHLIN) کے کام کی طرح تخریبی ہے جس طرح اُٹریخٹ (UTRECHT) کے پادری آخر الذکر مصیبت کے ظہور پر ڈر کے مارے چیخ اُٹھے تھے۔ بعینہ مسلمان مُلّا بھی جن کی مسجد کے ساتھ چند ایکڑ زمین یا کوئی خانقاہ[2] ضرور ہوتی گزشتہ نصف صدی سے وہابیوں کے خلاف پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۰ء کے درمیان کوئی وہابی مکہ معظمہ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر نہ پھر سکتا تھا۔ جہاں آج بھی اسے بے عزتی اور مار پیٹ کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی زمیندار اور مذہبی رہنما متفقہ طور پر ہر قسم کے انقلاب سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان زمیندار ایسے ہی مسجدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جیسے انگریز زمیندار قائم شدہ گرجوں کی

---

[1] ان کا خیال تھا کہ ان کی جماعت ہی صحیح عیسائی تھی۔ اُس کے ارد گرد تین ہزار مسلح سپاہی جمع رہتے تھے لوگ اُس کو فرشتہ سمجھ کر پرستش کرتے تھے۔ وہ اُس پانی کو پیتے تھے جس سے وہ غسل کرتا تھا میکلین کی تاریخ لیٹن کرسچیانٹی جلد ۵ صفحہ ۳۸۹ ایڈیشن ۱۸۶۷

[2] عام طور پر یہ ایک خانقاہ ہوتی تھی جس کے ساتھ کچھ زمین نیک کاموں کے لئے وقف ہوتی تھی۔

مسلمہ حقوق کے لئے جھگڑے کا وجود ہمیشہ خطرناک ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ ہندوستان کے وہابی دونوں پہلوؤں سے سخت انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ان کی مثال ایبا بیٹس کی ہے اور (ففتھ منارکی) ملوکیت پنجم کے ہوا خواہوں اور جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے اشتراکی اور سرخ جمہوریت کی۔ انہوں نے ابتدا ہی سے اُن مسلمانوں کی اچھی طرح سے خبر لی ہے جو ان کے عقاید کی مخالفت کے جرم کے مرتکب ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں ان کا روحانی امام پشاور کے سخت گیر گورنر کے خلاف اُسی سختی سے برسرپیکار ہوا جیسے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف ۱۸۳۱ء میں کلکتہ کے گردونواح میں جو بغاوت ہوئی اس میں یہ لوگ بلا امتیاز ہندو اور مسلمان زمینداروں کے گھروں میں گھس گئے اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمان زمینداروں کو کہیں زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لیڈروں کی عادت تھی کہ بعض اوقات اپنے کسی بدعقیدہ ہم مذہب کی لڑکی کو بدعات سے نجات دلانے کے خیال سے زبردستی اُٹھا کر لے جاتے اور اپنے کسی ڈاکو سردار سے اُس کا نکاح کر دیتے۔ پندرہ سال کے بعد اس جماعت کے متعلق سرکاری بیان تھا کہ یہ گروہ[1] اسی ہزار اشخاص پر مشتمل تھا ان میں کامل اخوت پائی جاتی تھی اور وہ ادنے طبقہ کے لوگوں سے بھرتی کئے گئے تھے یہ امر ہر شریف زمیندار کے لئے بہت بڑی پریشانی کا موجب تھا۔

اس قسم کے متعصب مذہبی لوگ سرمایہ دار قوم یا آرام پسند جماعتوں کے نزدیک بھی کسی قسم کی حمایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ مگر بنگال کی ایک خاص تجارت (جس میں بہت زیادہ کاروبار ہوتا ہے اور جسے بہت بڑا اثر حاصل ہے) ہمیشہ ان کی پشت پناہی کرتی رہی۔ ہندو قصابوں اور چرم فروشوں کو بہت بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ناپاک ہاتھ سے گائے ایسے پوتر جانور کے مردہ جسم کو مس کرتے اور اس کی موت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں ایسا انسان مادرزاد بھرشٹ اور مہذب سوسائٹی سے خارج تصور ہوگا۔ وہ دولت کی کثرت یا اپنے

---

[1] مسٹر ڈیمپیر (DAMPIER) بنگال کے پولیس کمشنر کے خطوط جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

نفرت انگیز پیشہ کی کامیابی کے باوجود کوئی عزت حاصل نہیں کرسکتا ایک سچے ہندو کی طرح اُسے اپنی اس ذلیل حیثیت کو بے چوں و چرا تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کی معاشرتی حیثیت کو اونچا کرنے میں کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس قسم کی کوشش کبھی کی ہی نہیں۔ وہ لاکھ دیانتدار اور نیک ہو اُس کے ہمسایوں کے دل میں اس کے لئے تعریف و تحسین کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ اندریں حالات وہ ان اوصاف کی سرے سے پرواہ ہی نہیں کرتا اگر گاؤں کی گائیں اتنی تعداد میں مرتی رہیں جس سے اس کو چمڑے کی مطلوبہ مقدار حاصل ہو جائے تو فبہا لیکن اگر ایسا نہ ہو تو سنکھیا اُن کی شرح اموات کو پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس قسم کا ناکارہ انسان خوردہ فروشی سے زیادہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اس لئے چمڑے کی تھوک فروشی کا کاروبار (جو ہندوستان کی ایک بہت بڑی تجارت ہے) مسلمان تاجروں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے مسلمان اُن جذبات سے مطلق اعتنا نہیں کرتے جو اس متبرک جانور کی کھال کی تجارت سے ہندوؤں کے دلوں میں برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ چمڑے کے مسلمان تاجر ہندوستان کے بہت بڑے مالدار اور تاجر قوم ہے لیکن ہندو ان کو انتہائی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کا خمیازہ ان کو ایک دوسری شکل میں اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ مسلمان تاجر خوب جانتے ہیں کہ اگر برہمنوں کو تھوڑی دیر کے لئے بھی غلبہ حاصل ہوگیا تو سب سے پہلے وہی ان کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنیں گے۔ لہذا وہ ہندو کفار کو اپنا دلپسند شکار سمجھتے ہیں اور وہابیوں کے نہایت طاقتور اور مالدار پشت پناہ بن گئے ہیں جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کفار کے خلاف جہاد کریں۔

مگر وہابی اپنی طاقت و اثر کے لئے کسی ایک جماعت کے دست نگر نہیں ہے خواہ وہ جماعت کیسی ہی طاقتور اور مالدار کیوں نہ ہو۔ وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام الناس میں تبلیغ کرتے ہیں ان کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسند دل کی امید و بیم کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں اُن میں ہزارہا اشخاص موجود ہیں جو واقعۃً بڑے ہی متقی اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں

تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں اور یہ انہیں کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بڑی عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بہترین وہابی وہ ہے جو نہ کسی سے ڈرے نہ کسی پر رحم کھائے۔ اُس کی زندگی کا راستہ صاف ہے کسی قسم کی تہدید یا تشدد اُس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی بنگال کے جیل خانوں میں ایک بہت ہی بزرگ اور سفید ریش انسان قید ہے اس کا دامن زندگی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے بجز اس کے کہ وہ بہت ہی سخت اور مستقل غدار واقع ہوا ہے حکومت کو تیس سال سے اُس کی ان باغیانہ سرگرمیوں کا علم تھا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ اس کے کارناموں سے بے خبر نہیں سنہ ۱۸۴۹ء میں اسے باقاعدہ تنبیہ کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۸۵۳ء اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں بھی اسے پھر تنبیہ کی گئی تھی۔ آخر سنہ ۱۸۶۴ء میں وہ مجسٹریٹ کی کھلی عدالت کے سامنے طلب ہوا تاکہ اُس کو آخری مرتبہ سرزنش کر دی جائے لیکن اُس کے لئے تمام پند و نصائح بیکار ثابت ہوئے حتیٰ کہ سنہ ۱۸۶۹ء میں اسے نظر بند کرنا پڑا۔ اس قسم کے افراد کے معاملہ میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حکومت انہیں جو راسخ العقیدہ ہوں اور اپنے اعتقادات کے مطابق صالح اور پاکباز بھی انتہائی سزا دینے سے اجتناب کرے۔ ان کے متعلق شاید بہتر ہے کہ تھوڑی سی قیود کے ساتھ نظر بند کر دیا جائے تاکہ وہ دوسروں کو ورغلا نہ سکیں۔

وہابی عقیدہ کا اختیار کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اول تو جو شخص اس مذہب کا پیرو ہوگا اُس کو سالانہ بہت سا مال اُس کی امداد کے لئے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ پھر کوئی اس میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لے اور سرحدی کیمپ میں داخل ہو جائے تو اُس کو اس سے بھی دشوار تر حالات پیش آئیں گے۔ میں نے اُن شہادتوں سے زیادہ اور کوئی قابل رحم چیز نہیں پڑھی جو اُن رنگروٹوں نے گذشتہ مقدمات کے دوران میں دی تھیں ججوں کے فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہابی مبلغین مشرقی بنگال کے تقریباً ہر ضلع سے سینکڑوں ہی بھگائے ہوئے نوجوانوں کو جن کی عمر بالعموم بیس برس سے بھی کم تھی۔ اُن کے والدین کی اجازت کے بغیر یقینی تباہی

کی طرف لے گئے۔ انہوں نے ہزاروں کسان گھرانوں میں مصیبت اور غم کی لہر دوڑا دی۔ اور کسان آبادیوں میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو اپنے ہونہار نوجوانوں کے متعلق دائمی تشویش میں مبتلا نہ ہو اس کا علم کسی دیہاتی باپ کو نہ تھا کہ اُس کا پاک باز اور تنومند لڑکا کب اچانک گاؤں سے غائب ہو جائے گا۔ ان نوجوانوں میں سے جو اس طرح راہ فرار اختیار کرتے اکثر متعدی امراض، قحط اور تلوار کے گھاٹ اُتر جاتے اور جو اُن میں سے واپس آتے وہ اس یقین کے ساتھ کہ انہیں محض قربانی کا بکرا بنایا گیا اور وقت گزرنے پر اُن سے بے اعتنائی برتی گئی۔ یہاں اُس شخص کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جس کو اس مہم میں کم سے کم مصائب برداشت کرنا پڑا ہو۔

"میں پٹنہ کے خلیفہ کا مرید ہوں دس بارہ برس کی عمر میں میں رام پور بولیا (جنوبی بنگال میں ایک قصبہ ہے گواہ کے گاؤں کے پاس ہیں) اُن کے یہاں تعلیم حاصل کرنے چلا گیا۔ میرے استاد جہاد کا نقشہ تیار کر رہے تھے اور روپیہ اور آدمی بھیجنے کے انتظام میں مصروف تھے۔ جب میری عمر پندرہ سال کی ہوئی تو مجھے بھی جہاد میں حصہ لینے کے لئے سرحد بھیج دیا گیا۔ ہم نے یہ سفر پٹنہ اور دہلی کے راستے طے کیا (جو سرحدی کیمپ سے تقریباً دو ہزار میل کے فاصلہ پر ہے) میں پٹنہ میں خلیفہ صاحب کے پاس صرف ایک رات ٹھہرا۔ دہلی میں میرے ساتھی تو آگے چلے گئے لیکن میں ایک عالم کے پاس ڈیڑھ سال اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد جب ایک گروہ سرحدی کیمپ جاتے ہوئے دہلی سے گزرا تو میں بھی اُن کے ساتھ گجرات تک چلا گیا۔ تھوڑی مدت کے بعد وہاں ایک گروہ اور پہنچ گیا اب میں اُن کے ساتھ پہاڑوں میں چلا گیا۔ یہاں پر مجھے یقین دلایا گیا کہ امام سید احمد صاحب نے دوبارہ ظہور فرمایا ہے۔ میں نے وہاں آٹھ نو ہزار آدمیوں کے مجمع کو دیکھا۔ ان کا سردار میرا وہ استاد تھا جس کے پاس میں اُس وقت پڑھا کرتا تھا جب میری عمر بارہ برس کی تھی وہ اب پٹنہ کا خلیفہ منتخب ہوا ہے لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ کسی امام نے ظہور نہیں کیا اور یہ سب کچھ محض دھوکہ ہے اس پر میں اور بعض دوسرے آدمی ناراض ہو گئے اور دہلی واپس چلے آئے۔ کچھ دنوں بعد ایک عرب دہلی آیا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ امام صاحب سیتانا میں ظاہر ہو گئے ہیں حتیٰ کہ اس نے مجھے جہاد میں شرکت کے لئے آمادہ کر

لیا جب میں ستیانا پہنچا تو امام صاحب کے ظہور کے متعلق پھر دریافت کیا لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ لہذا مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ہمیں پھر دھوکہ دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ جب انگریزی سپاہ ہم پر حملہ آور ہو رہی تھی تو میں دہلی بھاگ گیا اور پھر اپنے گھر چلا آیا۔[1]

یہ اس رنگروٹ کی کہانی ہے جس کی بہت دیکھ بھال کی گئی اور جو صحیح سلامت واپس آگیا تھا۔ میں اُن بدقسمت انسانوں کی تکلیف دہ حکایات کو بیان کرنا نہیں چاہتا جو راستہ ہی میں لڑی یا عزیمت کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ صرف ایک ہی مجاہد کا سرحد سے واپس آجانا اپنے اپنے ضلع میں وہابی تحریک کی تباہی کے لئے سیاسی مقدمات سے بھی کہیں زیادہ کارگر ہے اس کی موجودگی ان متعصب نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیتی ہے جو بھرتی ہونے پر مصر ہوں۔ کئی ایک سچے وہابی قانون کی ان تاویلات کو سننے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں جو اُن کو باغیوں کے حقوق سے سبکدوش کر سکے۔

پچھلے دو سال سے بنگال میں اس قسم کی تاویلات کی بہ کثرت اشاعت کی گئی۔ وہابی مبلغین نے عوام الناس کو اس رو میں بہائے جانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مصارف جہاد کا بوجھ بھی اپنے تمام ہم وطنوں کے کندھے پر ڈال دیا ہے اب اُس شخص کے لئے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتا ہو بڑی مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ یا تو وہ اس خطرناک سازش میں شریک ہو جائے یا کافر کہلائے۔ کچھ عرصہ تک تو اس تحریک میں چندے کی امداد سے اس کی شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ مگر جب سے محکمہ منتظمہ کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ اِن لوگوں کو گرفتار کرے باغیوں کی مدد کرنا ایک خطرناک جرم متصور ہوتا ہے لہذا اس خطرے میں صرف وہی لوگ پڑتے ہیں جو از حد متعصب ہوں۔ مستورات سے چندہ بہت کم ملنے لگا ہے اور وہ اُمراجن کا کاروبار ملک میں بہت زیادہ پھیل گیا ہے جہاد کے لئے مسجدوں میں چندہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہابی جماعت کے متعصب آدمیوں نے اُن لوگوں

---

[1] یہ خلاصہ ہے محمد عباس کی گواہی کا جو اُس نے دیناپور کے مجسٹریٹ کے سامنے ۱۵ اگست ۱۸۶۵ء کو دی جہاں تک ممکن تھا میں نے اصل نام کو ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔

کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ بڑھکا دی ہے جو کا فر حکومت سے ڈر کر دین کی حمایت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں وہ ان غداروں پر بزدلی اور خود غرضی کا الزام لگاتے ہیں اور اس اجتہاد کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں جس کے ماتحت اہل زر دین و دنیا دونوں کی خدمت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو دولتمند اور خوشحال مسلمان ان نا ملائم الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے مگر تمام مسلمان ملاؤں کی طاقت اُن کی پشت پر تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ایک علمی بحث کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے وہابیوں کے اصول جہاد پر ہی اصولی اعتراضات شروع کر دیئے اور اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ملکہ معظمہ کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور نہیں کئے جا سکتے پچھلے چند سالوں کے فتوے انہی کی طرفداری میں شائع ہوئے حتےٰ کہ مکہ معظمہ کے تین سب سے بڑے مفتیوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملکہ انگلستان کے خلاف بغاوت کرنے کے خطرناک فرض سے آزاد کریں[ل]

اگر ہم اصل حقیقت تک پہنچنا چاہیں تو بہت کافی غور و خوض کی ضرورت ہو گی۔ قرآن مجید کا کہنا صاف صاف یہ ہے کہ مسلمان تمام دنیا کو فتح کر لیں گے۔ اس کے بعد اقوام عالم کے لئے دو ہی راستے ہوں گے تبدیلیٔ مذہب یعنی ایسی فرمانبرداری کا اختیار کرنا جو غلامی کی حد تک پہنچ جائے اور یا موت۔ لیکن قرآن موجودہ قومی ضروریات کے مطابق تو لکھا نہیں گیا تھا بلکہ عربوں کے جنگجو قبائل کی اُن مقامی ضروریات کے مطابق جو اول مغلوبانہ ثانیاً قابو چیانہ اور پھر فاتحانہ حیثیت سے پیش آتی رہیں (نقل کفر کفر نباشد (مترجم) قرآن مجید کی جنگجو اور متعصبانہ ذہنیت کو مابعد کے علما اور شارحین نے بہت کچھ کم کرتے ہوئے اُس کے یکطرفہ پر جوش تعصب سے ایک ہمہ گیر نظام حکومت قائم کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی جہاد کے متعلق رسول اللہ کے بہت سے احکام شرع اسلامی

ل حنفی۔ شافعی اور مالکی مذہب کے مفتی۔ چوتھا فرقہ حنبلی ہے مگر وہ مکہ معظمہ میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اور اُن کا کوئی امام نہیں۔

میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے آگئے ہیں۔ ہندوستان کی مستند کتاب ہدایہ میں کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے فرائض اور ہدایات کے لئے ایک جداگانہ باب موجود ہے اور شرع اسلامی کے ہندوستانی علمانے اس کی ضرورت واہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ مگر پچھلے دنوں مسلمانوں میں جن مباحث کی بنا پر اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔ ان کا قرآن مجید میں کہیں ذکر نہیں آتا لہذا تمام جماعتوں نے خاموشی کے ساتھ اس سوال کے متعلق قرآن مجید سے قطع نظر کر کے اس کی بنیاد صرف قانون شریعت پر رکھی جو خود قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔

یہ بات ہمارے لئے اور مسلمانوں کے لئے باعث مبارک باد ہے کہ جو فتوے بھی دیئے گئے امن اور وفاداری کے حق میں دیئے گئے۔ اگر یہ فتوے بغاوت کے حق میں ہوتے تو ان کی وجہ ایسے ایسے خطرات پیدا ہو جاتے جن کے متعلق مبالغہ سے کام لینا ناممکن تھا مسئلہ جہاد کی بحث ہی اس امر کو صاف طور پر ظاہر کر دیتی ہے کہ ہندوستان میں ہماری حکومت کیسی خطرناک بنیادوں پر قائم ہے کیونکہ یہ بات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ جب کبھی کوئی ایسا فتویٰ حکومت کے خلاف شائع ہوا تو اس کا نتیجہ دنیا کی سخت ترین اور نہایت خون ریز بغاوتوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

علمائے جون پور کے اس فتوے نے کہ اکبر کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے اس زبردست بادشاہ کے شاہانہ جلال کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس وقت بنگال میں فوجی بغاوت رونما ہوئی تو اسی فتویٰ کی بدولت جس سے جنوبی بنگال کے متعدد زمینداروں کو رعیت کی بجائے جاگیردار تسلیم کیا گیا۔

یورپ میں جب کبھی باب عالی کو بلغاریہ یا کسی دوسرے صوبے میں جو آسٹریا کی سرحد پر واقع تھے فوج کشی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے بھی اپنے نوجیوں کے جوش وخروش کو بڑھانے کے لئے ایسے ہی فتوؤں سے کام لیا جن میں کافروں کے خلاف جہاد کے فرائض اور اس کے انعامات مرقوم ہوتے خود ہمارا عیسائیوں کا طرز کار بھی یہی تھا۔ جنگ ہائے صلیبی کے آخری دور میں متبرک رومن سلطنت کے جوش وخروش کو بڑھایا گیا تو اسی قسم کے حیلوں سے اسلامی ممالک میں اس قسم کے شرعی فتوؤں کو

کافروں کے تباہ کرنے کے لیئے ایک نہایت اہم قانونی فیصلہ تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو ان قوانین کا مجموعہ بڑی آسانی سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ پھر ابھی تھوڑی ہی مدت ہوئی جب مصر کے پاشا اور سلطان ترکی کو ان مذہبی باغیوں کے ساتھ خون ریز جنگ کرنا پڑی جن کا عقیدہ یہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا عمل شرع محمدی کے خلاف ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ایسے کافر خلیفہ اور اس کی فوج کو تباہ و برباد کر دیں۔ لہٰذا یہ بڑا ہی مبارک واقع ہے کہ جس ضلع[۵۴] سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتوے شائع ہوا تھا اُسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتوے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے[۵۵]۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس سوال کے مختلف نتائج کو بالاختصار بیان کروں جس پر مسلمانوں کے دو بڑے فرقے شیعہ و سُنی گزشتہ چند مہینوں میں پہنچ سکے ہیں۔

شیعہ حضرات نے حسب عادت ایک مومن کے لیئے ملکہ کے خلاف فرائض جہاد کے متعلق دوسرے امور کی طرح ایک بالکل ہی نئی راہ اختیار کی ہے۔ یہ اُس جماعت کے خیالات ہیں جس کی تعداد ہندوستان میں بہت ہی کم اور جس نے متعصب مسلمان حکمرانوں کے ماتحت ایسی ایسی اذیتیں اٹھائی جو کسی برطانوی حکمران کے ماتحت کبھی ممکن نہ تھیں۔ انہوں نے جہاد کے مضمون پر کچھ دن ہوئے ایک چھوٹا سا رسالہ فارسی زبان[۵۶] میں شائع کیا تھا گو سنیوں کے نزدیک جو ہندوستانی مسلمانوں کا ۹/۱۰ حصہ ہیں اس رسالے کی کوئی وقعت نہیں۔ بہرکیف یہ فیصلہ چونکہ ایک جید اور مستند شیعہ عالم کا ہے اور اسے جماعت کے دوسرے علماء کے صلاح و مشورے سے لکھا گیا اس لیئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شیعوں کی تعداد

---

[۵۴] جونپور

[۵۵] مولوی کرامت علی کا لیکچر جو انہوں نے ۲۳ نومبر ۱۸۷۰ء کو محمڈن لٹریری سوسائٹی میں پڑھا۔

[۵۶] لفظ جہاد کا مفہوم جو شیعہ فرقہ سمجھتا ہے۔ منشی امیر علی خاں بہادر کلکتہ ۱۸۷۱ء

اگرچہ بہت زیادہ نہیں بایں ہمہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں بہت سے نامور پیدا کئے پھر یہ جو چار سال سے ہر ضلع میں بغاوت کی فرضیت و عدم فرضیت کی بحث ہو رہی ہے اس میں بھی ان کی آواز کچھ کم بے اثر نہیں۔

شیعہ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے بارہ اماموں پر ایمان لانا جو رسول خدا کے الہامی جانشین ہیں لیکن اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے ایک امام کی آمد باقی ہے جو ابھی تک اِن گنہگار دنیاداروں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ جب تک اس کا ظہور نہیں ہو جاتا دنیا بدستور معصیت اور تکالیف میں مبتلا رہے گی اور شیعوں کو بے دین سنیوں۔ عیسائیوں اور دیگر لامذہبوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں پہنچتی رہیں گی۔ آخر جب امام موعود کا ظہور ہوگا تو اس وقت تمام خرابیوں کی اصلاح ہو جائے گی اور ساری دنیا اس خدائی مذہب کو قبول کرے گی۔

چنانچہ شیعوں کا یہ رسالہ بحث جہاد کے ضمن میں آگے چل کر کہتا ہے کہ اس وقت تک کسی قسم کی انسانی جدوجہد۔ بغاوت یا جنگ اس عظیم الشان مقصد کے حصول میں بے سود رہے گی۔ اس رسالہ کے نزدیک ہر وہ شخص بدعتی ہے جو اس عقیدہ سے اتفاق نہیں کرتا آج کل بعض بے وقوف اور شورش پسند[1] اشخاص جنہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے بالکل واقف نہیں اور حقیقت سے ناواقف ہیں محض فضول خواہشات کی بنا پر ایک ابلہانہ طریقہ سے فرائض جہاد اور اُس کے معنی و مفہوم سے بحث کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کے صرف دو فرقے راسخ العقیدہ ہیں ایک شیعہ اور دوسرے سُنی۔ مسلمانوں کے باقی فرقے خواہ وہ اپنے آپ کو وہابی کہتے ہوں یا رافضی، راہ راست سے بھٹکے ہوئے اور اس لئے ناقابل اعتماد ہیں۔ رسالہ مذکور میں لفظ جہاد[2] کے تین معنے بتلائے گئے ہیں اور پھر اس کے لئے سات شرطیں مقرر کی گئیں ہیں جن کے

[1] شورش پسند: شور سے۔

[2] جہاد بمعنی فلاح۔ خدا کی حمد و ثنا (ب) جہاد بالنفس آمارہ خواہشات کو قابو میں لانا اور ان کو عقل کے ماتحت رکھنا تاکہ ان کو ٹھیک راستہ پر لگائے گناہ سے بچائے اور وقت کو فضول ضائع نہ کرے (ج) جہاد فی الدین کا فروں کے خلاف جنگ۔

امام پر جہاد کفار سے مذہبی جنگ کے معنوں میں جائز ہو جاتا ہے۔ اول جب کہ سچا امام موجود ہو اور وہ اس کی اجازت دے دوسرے جب سامان حرب اور آزمودہ جنگجو مکملاً تیار ہوں۔ تیسرے جب اسے باغیوں اور خدا کے[1] دشمنوں کے خلاف اختیار کیا جائے۔ چوتھے جو امیر جہاد عقل سلیم رکھتا ہو پاگل نہ ہو نہ اس کے ہوش و حواس میں کوئی فرق آیا ہو اسے بیمار بھی نہیں ہونا چاہیئے، نہ اندھا نہ لنگڑا۔ پانچویں یہ کہ وہ اپنے والدین سے اس کی اجازت حاصل کر چکا ہو۔ چھٹے یہ کہ وہ مقروض نہ ہو اور ساتویں اس کے پاس اتنا مال ہو کہ زادراہ اور اپنے خاندان کی روزی کا کفیل ہو سکے۔

ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کی معقولیت سے قطع نظر اور اس جنگ میں فتح و شکست کے مواقع سے اعتنا نہ کرتے ہوئے بھی شیعوں کے نزدیک جہاد کے لئے امام کا موجود ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس امام من اللہ نے آج تک اپنے آپ کو فانی انسانوں کی نظروں سے پوشیدگی اختیار کر رکھی ہے اور اس بات پر رضامند ہی نہیں ہوتے کہ ظاہر ہو کر دینداروں کی فوج کی قیادت کریں لہذا ان کے ظہور تک جہاد کی کوشش بھی گناہ اور گستاخی میں داخل ہے رسالہ مذکور میں صاف صاف لکھا ہے کہ امام معصوم کب ظاہر ہو گا اس کا علم سوائے خدائے علیم کے اور کسی کو نہیں۔ اس امام کی ذاتی قیادت کے بغیر خون ریزی کرنا شیعہ عقائد کے خلاف ہے۔ جو شخص امام کے خدائی حکم کے بغیر خروج کرتا ہے وہ باغی اور گنہگار ہے

یہ آخری فقرہ ایک طرح سے سنیوں پر چوٹ ہے کیونکہ انہوں نے سچے امام کی عدم موجودگی میں کئی بار جہاد کا اعلان کیا۔ شیعوں کو ان سے بہت سی ایذاؤں اور شہداء کا انتقام لینا ہے پھر یہ چبھتا ہوا فقرہ کہ آخر کار تمام دنیا مسلمان ہو جائے گی ظاہراً بڑا معصومانہ اور دیندارانہ خواہش پر مبنی ہے لیکن فرقہ ثانی کے لئے حقیقتاً بہت ہی تکلیف دہ۔ ہندوستان کے شیعہ و سنی دونوں کو غلبۂ دین پر

---

[1] حربی کافر۔

ایمان ہے مگر اس میں تھوڑا اختلاف بھی ہے ۔ سنیوں کا ایمان ہے کہ وہ رسول اللہ کے جملہ احکام کی کاملاً پیروی کرتے ہوئے ساری دنیا کو اسلام کا مطیع کر لیں گے ۔ برعکس اس کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ سعید گھڑی دنیا کے دو بڑے مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت کے باہم مُدغم ہونے سے رونما ہوگی ۔ آخری زمانے میں تمام دنیا کا ایک ہی مذہب پر قائم ہو جانے کا خواب ہر اچھے مذہب نے دیکھا ہے ۔ ہندوؤں میں بھی آئندہ واقعات کے متعلق ایک کتاب ہے جس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تمام انسانوں کا ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی ذات وشنو پران میں بھی جو ہندومت کی بدھ مت پر فتح کے وقت تصنیف ہوا یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ عہد آہنی کے آخر میں جس میں ہم پہنچ چکے ہیں انسانوں کی نجات اُن کے مذہب یا اُن کی ذات کی بنا پر نہ ہوگی بلکہ اُن کی زندگی کی پاکیزگی اور اُن کی خوبیٔ اعمال پر شیعہ مسلمانوں کے یہاں بھی ایک ایسا ہی باسعادت وقت مقرر ہے مگر یہ عیسائیوں کے ساتھ جو سب کے سب شیعہ ہو جائیں گے باہمی اتحاد کے بعد رونما ہوگا ۔ یہ وقت غالباً بے دین سنیوں کا خون بہانے کے بعد آئے گا کیونکہ وہ اول اول امام آخرالزمان کو ماننے سے انکار کر دیں گے ۔ آگے چل کر اس رسالہ میں لکھا ہے کہ اسلامی قوانین میں صاف صاف مرقوم ہے کہ جب یہ امام ظاہر ہوگا تو اُس وقت حضرت عیسٰے بھی چوتھے آسمان سے نازل ہو جائیں گے نیز یہ کہ اِن دونوں عظیم الشان ہستیوں میں دشمنی نہیں بلکہ دوستی ہوگی ۔

بہر حال اِس بات کا علم تسلّی بخش ہے کہ ہماری مسلمان رعایا کا ایک چھوٹا سا طبقہ اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کی رو سے ملک کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور نہیں ۔ دوسرے مسلمان کچھ بھی کریں ہندوستان کے معدودے چند شیعہ مسلمانوں کا اعلان ہے کہ وہ محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہمارے سامنے ہمیں قتل یا غلامی کی شرمناک صورتیں پیش نہیں کر سکتے ۔ یہ وعدے تو بیشک اِس قابل ہیں کہ اُن پر

ؔ۵ بھاؤ لیشہ پورنا ۔

خوشی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن میں اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ تقیہ شیعوں کے اصول دین میں داخل ہے جس سے ہر وہ معاہدہ جو وہ حضرات ہم کافروں سے کریں مستحکم ہونے کی بجائے کمزور ہو جاتا ہے۔ ایران کے سوا شیعہ دنیا کے ہر حصے میں مظلومانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے مظلوم فرقوں کی طرح انہوں نے بھی اجتہاد کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس سے وہ اپنی جانوں کو بچا سکیں۔ خواہ ایک اجنبی کے سامنے انہیں اپنے دین سے دست بردار کیوں نہ اختیار کرنی پڑے۔ جب سُنی مسلمان اُن کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں تو شیعہ اپنی مذہبی خصوصیات کو فوراً ترک کر دیتے ہیں۔ بعض سخت مصیبتوں میں جیسا کہ پچھلے دنوں شام اور وقتاً فوقتاً ہندوستان میں پیش آتی رہیں انہوں نے اصول تقیہ کے ماتحت اپنے عزیز ترین اصولوں کو خیرباد کہہ دی تھی کہ بارہ اماموں کو گالیاں دینے لگے لیکن انگریزی حکومت کے ماتحت اُن کو ان مظالم سے نجات مل چکی ہے اور اس لئے اُس بے وفائی کا خطرہ بھی نہیں رہا جو ان مظالم کا قدرتی نتیجہ ہے بغاوت کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آگیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابل اعتماد شیعہ علما کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لئے مجبور رہے۔ اس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہندو یا کسی دوسرے مسلمان فرقے نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کر لیا تو شیعوں کے لئے پھر وہی مصیبت کے دن شروع ہو جائیں گے سُنی مسلمان اپنی فتح مندی کے وقت اُس فتوے کو فراموش نہیں کریں گے جو سابق شاہ اودھ کے محل سے شائع ہوا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ اسلام کو آخری فتح مسلمانوں اور عیسائیوں کے اتحاد سے حاصل ہو گی۔ لہٰذا اس خلش کی یاد جو اس شیعہ رسالہ سے ان کے وہابی اور سُنی ہم وطنوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے گی سابق بادشاہ اور اُس فریق کی وفاداری کو جس کا اسے نمائندہ تصور کرنا چاہیئے چار چاند لگا دے گی۔

اب میں مسلمانوں کے دوسرے بڑے فرقے کے باقاعدہ فتوؤں کا ذکر کرتا ہوں - ہندوستان میں سُنی ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عرصہ سے اس اعلان میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں کہ ہم پر مذہباً بغاوت کا کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا - اس مقصد کے لئے انہوں نے دو قسم کے فتوے حاصل کئے ہیں - کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی نے اس مسئلہ پر تمام سنیوں کی رائیں ایک زوردار رسالہ کی شکل میں جمع کر دی ہیں - میں اُن لوگوں کو یہ چھوٹا سا رسالہ پڑھنے کی تاکید کرتا ہوں جنہیں بنگالی مسلمانوں کی دماغی قابلیت پر شک ہے یا جو ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری حکومت کے ماتحت عدالتی منصبوں پر فائز ہونے کے قابل نہیں - یہ رسالہ اُن کی قانونی موشگافیوں کی ایک فتح ہے - اس میں دو مختلف مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کی ابتدا اگرچہ دو متضاد نظریوں سے شروع ہوتی ہے لیکن جن سے انسان ایک ہی خاطر خواہ نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے - شمالی ہند کے علماء ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے لئے جہاد غیر ضروری ہے - کلکتہ کے علماء نے ہندوستان کو دارالسلام تصور کیا اور اس بنا پر جہاد کو ناجائز قرار دیا - یہ نتیجہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ضرور تسلی بخش ہوگا - کیونکہ اس سے وہ مجاہدین کے کیمپ کے لئے جو ہماری سرحد پر قائم ہے چندہ دینے کی مصیبت سے بچ جائیں گے اور وہ ہمارے لئے بھی ایسے ہی باعث تسکین ہے کیونکہ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شریعت اور علماء دونوں کو وفاداری کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور بغاوت کے لئے بھی۔[1]

مگر بدقسمتی سے اس قسم کے فتوؤں کا وجود ضروری ہے تو دولت مند اور خوشحال مسلمانوں

---

[1] اس رسالہ کا عنوان ہے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے اجلاس منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۸۷۰ء بروز بدھ وار کی روداد - یہ مولوی کرامت علی جونپوری کا ایک لیکچر ہے اور اس کا موضوع اسلامی شریعت ہے یعنی انگریزی ہندوستان میں مسلمانوں پر حاکم قوم کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں -)

کی بجائے متعصب عوام کے لیے ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن کے ماتحت حکومت کو گرفتاری کے اختیارات حاصل ہیں اور وہ اس قابل ہوگئی ہے کہ دور دراز تک پھیلی ہوئی باغیانہ سرگرمیوں کا پورے طور پر مقابلہ کر سکے جو گذشتہ بیس سال سے بنگال میں جاری ہیں اور جن کی وجہ سے وقتاً فوقتاً پنجاب کی سرحد پر لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ ان اختیارات کی رو سے کسی باغیانہ سرگرمی میں محض سرسری حصہ لینا بھی ایک خطرناک جرم ہے۔ بحالت موجودہ تو سازشیوں کا مالدار گروہ خوش ہے کہ اسے اس کام سے کنارہ کشی کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ یہ لوگ اس فتوے کا یقیناً خیر مقدم کریں گے جس نے اُن کو اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا راستہ دکھلایا ہے انہیں اس کے جواز و عدم جواز کے متعلق مزید چھان بین میں پڑنے کی ضرورت نہیں وہ ان کے دُکھے ہوئے دلوں کے لیے بمنزلہ پیغام شفا ہے انہیں کیا پڑی ہے کہ اس مفید دوا کے مختلف اجزاء کے بارے میں تکلیف دہ سوالات کریں لہذا کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی اپنے ابنائے وطن اور ہمارے دونوں کے شکریہ کی مستحق ہے سوسائٹی مذکور کے سیکرٹری خان بہادر مولوی عبداللطیف کے ہم اور بھی ممنون ہیں کہ اب کوئی سُنی مسلمان خواہ ہندوستان کی مذہبی حیثیت کے متعلق اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اپنے ہی اصولوں کی رو سے یہ نتیجہ قائم کرے گا کہ وہ ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور نہیں۔ اگر اس کے خیال میں کہ ہندوستان اب تک دارالاسلام ہے تو اُس کو صفحہ چھ کھول کر دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ محض اس بنا پر اس کا ملک کے خلاف بغاوت کرنا ناجائز ہے۔ لیکن اگر اس کے نزدیک ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے تو اُسے چاہیئے کہ صفحہ گیارہ کا حاشیہ ملاحظہ کرے جس کی رو سے اسے معلوم ہو جائے گا کہ بغاوت غیر ضروری ہے[1]

---

[1] اس باب میں اور کسی دوسری جگہ میں نے اپنے ان سابقہ مضامین سے مدد لی ہے جو کلکتہ کے انگلش مین میں شائع ہوئے اور جن کے لیے میں پچھلے سات سال کے مختلف ایڈیٹروں کا ممنون ہوں جو میرے مضامین کو جو بہت زیادہ تعداد میں ہوتے تھے اور جن کا موضوع مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں اور اُن کی ضروریات ہوتا تھا اپنے اخبار میں درج کرتے رہے۔

سطور بالا سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مولوی عبداللطیف صاحب کی اس خدمت کو کسی طرح کم کر کے دکھاؤں جو انہوں نے اس رسالہ کی اشاعت سے سرانجام دی ہے مگر یہ ہماری سیاسی غلطی ہوگی کہ کسی چھان بین کے بغیر آنکھیں بند کئے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کی رائے کو تمام ہندوستانی مسلمانوں کی رائے تسلیم کر لیں۔ وہابیوں کے پرجوش انتہا پسند تو اس قسم کے دلائل سے مطلق اعتنا نہیں کرتے لیکن دیندار مسلمانوں میں بھی ایک بہت بڑی تعداد ایسی موجود ہے جس کی خواہش ہوگی کہ مذہبی قوانین کی کسی مستند تشریح کو اپنے لئے دلیل راہ بنائے۔

انسانی اعمال و عقائد میں اس وقت بین فرق پیدا ہو جاتا ہے جب اپنے اصولوں کی خود ہی پوری متابعت اسے بغاوت جیسے خطرات کی طرف لے جائے گو نیک آدمیوں کی ہر وقت یہ خواہش رہتی ہے کہ یہ فرق کسی نہ کسی طرح مٹ جائے اور ان کے عقیدے اور عمل کے درمیان کوئی تفاوت نہ رہے بجز متعصب وہابیوں کے ان اشخاص کے نزدیک ضرورت جہاد اس وقت بھی ایک ناخوشگوار فرض ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن سے سرحدی کیمپ کو مالی امداد پہنچتی ہے ان لوگوں کو امن اور وفاداری کی طرف بالخصوص دعوت دینی چاہیئے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ سُنی فتوؤں کی تحقیق اس نظر سے کروں کہ ان کا اثر ایسے پرجوش مسلمانوں پر ہوا جو مذہبی فرائض کی ادائیگی کو زندگی کا اصل الاصول مانتے ہیں اور جن کا دل کسی قسم کے خطرہ یا آرام و آسائش سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لینے میں کوئی فائدہ نہیں کہ ہماری مسلمان رعایا کی بہت بڑی تعداد مذکورہ بالا جماعت سے تعلق رکھتی ہے ایک تہائی صدی تک انہوں نے ایک باغی فوج کو اول راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف اور اس کے بعد اس کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ہمارے خلاف ہر وقت لڑائی کے لئے تیار رکھا۔ بنگال جیسے دور دراز صوبے نے اپنے خرچ پر سرحدی کیمپ کے لئے رنگروٹوں کے گروہ کے گروہ تیار کئے۔ اس کے ہر گاؤں بلکہ ہر خاندان نے اُن کی مثال کی پیروی کی اور مصارف جنگ میں حصہ لیا۔ ان بدنصیب

بہکائے ہوئے غداروں کے گروہ کے گروہ ہم نے قید خانوں میں ڈال دیئے اور عدالتوں نے یکے بعد دیگرے ان کے سرغنوں کو سمندر پار کے بے آب وگیاہ جزیروں میں بھیج دیا۔ لیکن اس کے باوجود سارے ملک نے ہماری سرحد پر اسلام کی یکساں امیدوں کی آب یاری روپیہ اور آدمیوں سے کی بلکہ اب تک عیسائی حکومت کے خلاف خونی احتجاج پر مُصر ہے۔

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کلکتہ کی سوسائٹی نے جو فتویٰ شائع کیا ہے اس کا اثر اس کثیر التعداد اور خطرناک جماعت پر مطلق نہیں پڑا۔ بہرحال اس رسالہ نے جہاد کے خلاف دلائل کے دو مختلف اور نمایاں راستے واضح کئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اس سوسائٹی کی اپنی رائے ہے اور دوسرے علمائے شمالی ہند کا باقاعدہ فتوے مگر اس دوسری رائے کو محض اس لئے درج کیا گیا ہے کہ اس کی تردید کی جاسکے۔ مگر اس کی اشاعت جداگانہ طور پر اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے اور جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا وہ بغاوت کے خلاف ایسے مستند دلائل پر مشتمل ہے جو اسلامی کتابوں کے حوالے سے قائم کی گئیں۔

اس رسالے کے فاضل مصنفین کو اول یہ بتلانا چاہیئے تھا کہ ان کے دلائل کن مواقع پر ناکام رہتے ہیں۔ رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کیا جائے تاکہ اسلامی رعایا کے لئے جہاد کا خیال ناجائز ٹھہرے۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صفحہ اول کی اس عبارت میں جس کی حیثیت بنیادی ہے۔ "اس لئے" کا لفظ موجود نہیں اور اس سے بھی زیادہ غور طلب یہ ہے کہ علمائے مکہ اور مولوی عبدالحی کا فتوے صرف اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے مگر بہ کمال ہوشیاری اس نتیجہ سے کہ لہذا یہاں بغاوت ناجائز ہے گریز کرتا ہے۔ حقیقت میں اسلامی شریعت کے مطابق ٹھیک فیصلہ اس کے برعکس ہوگا۔ علمائے مکہ نے بھی جب یہ فتوے دیا تھا تو وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے ان کا ندا اس امر پر ہے کہ ہندوستان فی الواقعہ دارالاسلام ہے اور یہ فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا ہے کہ بنا بریں انہیں جنگ یا دوسرے ذرائع سے اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ ان کافروں کو جو اس ملک کی حکومت پر متصرف

ہو گئے ہیں اور کئی ایک طریقوں سے پچھلے مسلمان بادشاہوں کی قانونی اور مذہبی سرگرمیوں میں دخل انداز ہو رہے ہیں لہٰ یہاں سے نکال دیا جائے۔

اس رسالہ کا انداز بحث یہ ہے۔ ہندوستان اب بھی دارالاسلام ہے کیونکہ یہاں پہلے اسلامی حکومت قائم تھی جسے گو اب ایک کافر قوم نے فتح کر لیا ہے۔ مگر وہ تین شرائط جو کسی ملک کے دارالحرب بننے کے لئے ضروری ہیں اُس پر عائد نہیں ہوتیں۔ ان تین شرائط کو اصل میں اسلامی شریعت کے مستند ترین فقیہہ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ نے بیان کیا تھا مگر وہ اس رسالے میں نقل ہوئیں تو پرانی اور مسلمہ کتابوں سے نہیں بلکہ فتاویٰ عالمگیری سے جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کی یادگار ہے پھر اس کتاب کا حوالوں اور قدیم تصانیف کے مفہوم میں فرق ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو شرائط امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ نے بیان کیں یا زمانہ سلف کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں وہ بجنسہ ہندوستان پر عائد ہو جاتی ہیں گویا قدیم اصولوں کے مطابق ہندوستان واقعی دارالحرب ہے۔ میں قانون کی ان دونوں تشریحات کو آمنے سامنے درج کر دیتا ہوں۔ اور اُس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔

وہ تین شرائط جن کی بنا پر کوئی ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔

سراج الوہاجیہ اور دیگر کتب جو فتاویٰ عالمگیری سے پہلے کی ہیں	رسالہ کی عبارت صفحہ ۳ بحوالہ فتاویٰ عالمگیری
(۱) جب کفار کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے	(۱) جب کفار کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے اور اسلامی قوانین کی پابندی نہ ہو۔
(۲) ایسا ملک جو دارالحرب کے ساتھ ساتھ اس طرح چلا جائے کہ اُس ملک اور دارالحرب کے درمیان کسی دارالاسلام سے اُسے کوئی امداد پہنچائی جا سکے۔	(۲) ایسا ملک جو دارالحرب کے ساتھ ساتھ اس طرح پیدا ہو جائے کہ اس ملک اور دارالحرب کے درمیان دارالاسلام کا کوئی شہر نہ ہو۔

لہٰ علمائے مکہ کا فتوےٰ ضمیمہ نمبر ۱

(۳) جب ہر مسلمان کی مذہبی آزادی سلب کرلی گئی ہو نہ ذمی رہ (وہ کافر جس نے ہمیشہ ہمیشہ اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے کی جملہ شرائط تسلیم کرلی ہوں) کو وہ مراعات حاصل ہوں جو اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھیں۔

(۴) جب مسلمانوں اور ذمیوں کو امان اول حاصل نہ ہو (یہ ایک اصطلاح ہے جس کو آگے چل کر بیان کیا جائے گا) [1]

یہ تین شرائط جو پرانی اور مستند کتابوں میں مرقوم ہیں ہندوستان پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ پہلی شرط کے مطابق آپ نے دیکھا ہوگا کہ فتوےٰ عالمگیری میں چند الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں۔ جن کو راقم الحروف نے باریک خط میں لکھ دیا ہے اور جن کی قدیم کتب شرعی یا براہ راست امام ابو حنیفہ سے کوئی سند نہیں ملتی [2] پہلی مستند شرط صرف یہ ہے کہ جب کافروں کی حکومت علانیہ قائم ہو جائے جو بلا شک و شبہ اس وقت ہندوستان پر عائد ہو جاتی ہے۔ دوسری شرط کو نقل کرتے ہوئے اس رسالے نے پہلی شرط میں ایک غیر ذمہ دارانہ اضافے کی طرح بغیر کسی سند کے کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ کتب سلف کے مطابق ہندوستان دار الحرب ہے کیونکہ اس کے اور انگلستان (دار الحرب زیر بحث) کے درمیان کوئی ایسا ملک نہیں جو ہندوستان کو دار الحرب

---

[1] ان حوالوں اور دوسرے فتووں کو جمع کرنے اور بعض دوسرے دلائل کے لئے جو اس سنی رسالہ کی شرح میں مندرج ہیں میں کلکتہ محمڈن کالج کے پروفیسر مسٹر بلوک کا ممنون احسان ہوں۔ وقت آئے گا جب اہل یورپ ان کو ہندوستانی علوم کا بہترین عالم تصور کریں گے۔

[2] امام ابو حنیفہ کے نزدیک اوپر کی تین شرائط پوری ہو جائیں تو دار الاسلام دار الحرب بن جاتا ہے۔ ان کے دو شاگرد شیخین یعنی امام محمد اور امام یوسف کا قول ہے کہ صرف ایک ہی شرط کا پورا ہونا کافی ہے۔ کلکتہ کے سنی مسلمان امام ابو حنیفہ کے قول کو شیخین کے قول پر ترجیح دینے میں حق بجانب ہیں (رسالہ صفحہ نمبر ۲) مگر میں یہ ثابت کروں گا کہ ہندوستان میں تینوں شرطیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کے مطابق ہندوستان دار الحرب ہے۔

پلٹنے سے بچائے اور اس کی امداد کر سکے۔ جب انگلستان نے ہندوستان کو فتح کیا تو ان دونوں ملک کے درمیان صرف سمندر کا راستہ تھا لیکن حموی اور طحطاوی میں صاف صاف مرقوم ہے کہ سمندر دارالحرب ہے۔ گویا اس وقت بھی جب یہ ملک فتح ہوا اور آج بھی ہندوستان اور انگلستان کی درمیانی شاہراہ پر کوئی ایسا اسلامی ملک واقع نہیں جو اس کی امداد کر سکے۔ کابل دارالاسلام اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے مگر اس کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ امام ابوحنیفہ کی شرط کے مطابق اُس ملک کا دونوں ملکوں کی شاہراہ پر واقع ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس ملک کی دارالحرب نہ بننے میں مدد کر سکے۔ ظاہر ہے کابل کے متعلق کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان واقع ہے یا اُس میں اتنی قوت ہے کہ ہندوستان کی مسلمان آبادی کی مدد کر سکے۔

مگر سب سے زیادہ خطرناک غلط بیانی جو اس رسالہ میں کی گئی ہے اس کا تعلق تیسری شرط کے بیان سے ہے۔ اس شرط کا سارا دارومدار "امان اول" کے معنوں پر ہے جس کا ترجمہ اس رسالہ میں مذہبی آزادی کیا گیا ہے۔ مگر یہ الفاظ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ امان کے لغوی معنے ہیں سلامتی اور حفاظت اور امان اول کے معنی جامع الرموز میں صاف صاف یہ بیان کئے گئے ہیں کہ ہر قسم کی سلامتی اور مکمل مذہبی آزادی جو مسلمانوں کو اپنی گذشتہ اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھی۔ کلکتہ کے سُنی مسلمان بھی اس سند کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ایک ملک دارالحرب بنتا ہے تو اُس وقت جب (۱) مسلمانوں اور ذمیوں کو صرف اس قدر امان (مذہبی آزادی) دی جائے کہ اس کا انحصار صرف کافروں کی مرضی پر ہو (۲) مسلمانوں کی وہ مذہبی حیثیت جو ان کو اپنی حکومت کے ماتحت حاصل تھی یا وہ مذہبی حیثیت جو انہوں نے حاکم قوم ہونے کی حیثیت سے اپنی کافر رعایا کو دے رکھی تھی برقرار نہ رہنے دی جائے۔ بحالت موجودہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں شرطیں اس وقت ہندوستان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ امان یا مذہبی آزادی جو اس وقت مسلمانوں کو حاصل ہے وہ تمام کی تمام اُن کے عیسائی حاکموں کی مرضی پر منحصر ہے اور وہ اُس کو اسی حد تک حاصل کر سکتے ہیں جس حد تک ہم اس کی اجازت دیں۔ لہٰذا یہ حالت امان

مل یا ان مذہبی مراعات سے کئی درجہ کم ہے جو ان کو پہلے حاصل تھیں۔ انگریزی حکومت مسلمانوں پر ٹیکس لگاتی ہے اور اُس کو عیسائی گرجوں کی تعمیر اور پادریوں کے لئے ضروریات زندگی بہم پہنچانے میں صرف کرتی ہے۔ اُس ے مسلمانوں کی بجائے جو اُس کی آمد کے وقت اضلاع اور صوبجات کے حاکم تھے انگریز حاکم مقرر کئے اُس نے یک باقاعدہ اعلان کے ذریعے مسلمان قاضیوں اور قانونی افسروں کو برطرف کر دیا[۱] اُس نے عدالتوں میں نگریزی زبان رائج کی اور اسلامی دستور العمل اور قوانین کو برطرف کر دیا۔ اُس نے بدنصیب اور بیمار ورتوں کو ایکٹ XVII مجریہ ۱۸۶۸ء[۲] کے ماتحت تکلیف اور مصیبت سے بچالیا۔ اُس نے کوئی ایسا طریقہ ختیار نہیں کیا جیسا کہ اسلامی شرع کی رو سے ایک بادشاہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے ہ تمام مسلمان فریضہ نماز کی ادائیگی کے لئے مساجد میں جاتے ہیں۔ ہماری عدالتوں میں دعووں پر ٹکٹ لگانا ہلائے قوانین میعاد۔ ہمارے ججوں کے یہ فیصلے کہ غیر ادا شدہ رقم پر سود ادا کیا جائے۔ ہمارا سارا قانونی ستور العمل ہماری مذہبی رواداری سب کی سب قوانین کے خلاف ہیں اور اُس امان یا مکمل مذہبی واداری اور شہری آزادی میں خلل انداز ہوتی ہیں جو ہماری رعایا کو اسلامی حاکموں کے تحت حاصل تھی۔ پھر اہل الذمہ یعنی مسلمانوں کی کافر رعایا کی مذہبی حیثیت میں بھی کافی تبدیلی و گئی ہے۔ عیسائی ذمی اب رعایا نہیں رہے بلکہ فاتح اور حاکم ہیں۔ ہندو ذمی اب جزیہ ادا نہیں کرتے اور سینکڑوں طریقے ہیں جن کے ماتحت ہم اُن کے مذہب میں دخل انداز ہوئے ہیں ثلاً گاؤکشی گناہوں کی پاداش میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے رواج کی منسوخی۔ ستی ی موقوفی۔ ذات پات کے رواج سے بے پروائی اور جو عیسائی ہو جائے اُس کی قانونی حفاظت۔ مختصراً یہ کہ سلمانوں اور ذمیوں کی امان اول یعنی پہلی حیثیت کو ہم نے بالکل بدل ڈالا ہے۔ سو امام ابوحنیفہ کی تیسری شرط

---

[۱] قاضی ایکٹ نمبر ۱۱ سنہ ۱۸۶۴ء کی رو سے۔

[۲] ہندوستان کی متعدی بیماریوں کا ایکٹ۔

سے ماتحت بھی ہندوستان کا ملک اب دار الحرب ہے۔

پھر اس مسئلے کا جیسا کہ بعض ملتے جلتے واقعات سے واضح ہو جائے گا کئی بار فیصلہ ہو چکا ہے یونان اُس وقت تک دار الاسلام تھا جب تک ترکوں کے ماتحت رہا پچاس سال کا عرصہ ہوا اُس نے اسلامی جُبہ اپنے کاندھے سے اُتار پھینکا لہٰذا اس زمانے سے یہ ملک دار الحرب تصوّر کیا جاتا ہے حالانکہ اُس میں بہت سے مسلمان آباد ہیں یہی کیفیت ڈینیوب کے دوسرے صوبجات کی ہے اور یہی صورت حالات جنوبی سپین اور ہر اُس ملک پر چسپاں ہوتی ہے جس میں کوئی ایسا انقلاب حکومت ہو چکا ہے۔ امام محمدؒ نے جو امام ابو حنیفہؒ کے مشہور و معروف شاگرد ہیں اپنی کتاب مبسوط میں اس اصول کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ "جب ایک اسلامی ملک کافروں کے قبضے میں آجائے تو وہ ملک اُس وقت تک دار الاسلام رہتا ہے جب تک کفار مسلمان حاکموں اور قاضیوں کو برقرار رکھیں اور اپنا کوئی نیا قانون جاری نہ کریں"۔ ہم نے مسلمان حاکموں کو برقرار نہیں رکھا اور قاضیوں کو برطرف کر دیا ہے گو عارضی طور پر سہی۔ مزید بر آں ہم نے اپنے قوانین نافذ کئے لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت کے عقیدے کو دیکھا جائے تو ہندوستان کو اب دار الاسلام کہنا غلط ہوگا۔

وہابی اپنی رائے کی ابتدا اس اعلان سے کرتے ہیں کہ ہندوستان اب دار الحرب ہے لہٰذا اس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہو گیا ہے کلکتے کا رسالہ شق اول سے انکار کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ ابھی تک دار الاسلام ہے۔ لیکن وہ اس مسئلے کے ثابت کرنے میں ناکام رہا اور اس لئے ان کثیر التعداد نیک مسلمانوں پر مطلق اثر انداز نہیں ہو گا۔ جن کو ہمیں اپنا طرفدار بنانے کی سخت ضرورت ہے شمالی ہندوستان کے علمانے اس مسئلہ پر دوسرے نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ وہ وہابیوں کی شق اول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان اب دار الاسلام نہیں رہا۔ مگر اس بات سے انکار کہ اندریں حالات جہاد فرض ہو گیا ہے

میرے خیال میں اس مصیبت کا صحیح ترین حل یہی ہے کہ اگر ہندوستان کو دار الاسلام تصور کیا جائے جیسا کہ مکہ معظمہ کے علمانے نہایت عیاری سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے تو دیندار مسلمانوں کی بہت

بڑی تعداد ہمارے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اگر ہندوستان اب بھی مجازی طور پر دارالاسلام ہے تو ہماری مسلمان رعایا کا زائد حصہ ہمارے خلاف بغاوت کرنا لازم ٹھہرائے گا۔ تاکہ اسے حقیقی طور پر دارالاسلام بنایا جائے۔ اسلامی قانون کی ہر کتاب میں مرقوم ہے کہ اگر کافر دارالاسلام کے کسی شہر پر حملہ کر دیں یا اس پر قابض ہو جائیں تو ہر مسلمان مرد۔ عورت بچے پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ کرے اور وہاں سے نکال دے۔ یہ اصول بالکل طے شدہ ہے کیونکہ جب روسی اسلامی ترکستان میں داخل ہوئے تو امیر بخارا کو اس کی رعیت نے مجبور کر دیا تھا کہ ان کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ اگر ہندوستان واقعی دارالاسلام ہے تو ضرور ہے کہ آئے دن بغاوت کی کوئی نہ کوئی وجہ پیدا ہوتی رہے۔ ہماری مذہبی رواداری ہی ہمارا سب سے بڑا جرم ہے۔ مثال کے طور پر (زیادہ سنگین جرموں کو چھوڑ کر) اسلامی کتابوں کی تعلیم ہے کہ اگر اسلامی ملک کا بادشاہ مذہب کی بقا اور اس کی اشاعت میں دلچسپی نہ لے تو اس کے خلاف بھی جہاد واجب ہو جاتا ہے جب اکبر نے اپنے زمانہ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ رواداری برتی اور اس کے ماتحت اسلامی قوانین میں ترمیم کر دی تو بغاوت کے جواز میں باقاعدہ فتوے شائع کیا گیا اور ایک خونریز جنگ مترتب ہوئی۔ موجودہ حالت میں بغاوت اور بھی ضروری ہو گئی ہے کیونکہ اگر ہندوستان ابھی تک دارالاسلام ہے تو انگریزوں نے طرح طرح سے اسلامی قوانین میں دخل اندازی کی ہے۔ انہوں نے قاضیوں کو برطرف اور اسلامی دستور العمل کو منسوخ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے مکہ معظمہ کے فتوے کو جو تعصب اور ناروا داری کا مرکز ہے بڑے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اور کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی کی طرح یہ نتیجہ قائم کرنے کے برعکس کہ اس لئے یہاں بغاوت ناجائز ہے انہوں نے اس بات کو اپنے ہندوستانی ہم مذہبوں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ خود ہی اس کے مخالف نتیجہ اخذ کر لیں اور وہ یہ کہ ان حالات ان کے لئے بغاوت کرنا فرض ہے۔

بہر حال ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو یہ نتیجہ اخذ کرنے سے گریز کرے گی

وہ مطمئن ہے کہ کلکتے کی محمڈن لٹریری سوسائٹی ایسی معتبر انجمن نے مشہور علماؒ کے ذریعہ اس امر کا باقاعدہ اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان اب بھی دارالاسلام ہے اور اس لئے یہاں بغاوت پھیلانا فضول اور بے معنی ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح اصولی جھگڑے بے شمار ہیں اس لئے قارئین کو اس جماعت کے ٹھیک ٹھیک جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے ذیل میں اُس ذی عزت شیخ کی تقریر نقل کرتا ہوں جو انہوں نے اُس جلسہ میں ارشاد فرمائی جس کی روداد کے طور پر یہ رسالہ قلمبند ہوا ہے۔

لہ مولوی کرامت علی جونپوری۔ شیخ احمد آفندی انصاری۔ مولوی عبدالحکیم اور ان کے علاوہ معززین اسلام میں سے ایک جس نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی ہے اور عملی ذہانت کا مالک ہے یعنی خان بہادر مولوی عبداللطیف۔

ٹہ شیخ احمد آفندی انصاری نے مدینہ منورہ کے ایک معزز شہری اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد جن کا شمار صحابہ رسول اللہ صلعم سے ہوتا ہے) جو کچھ مدت سے اس شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے اٹھ کر فرمایا میں اس سوسائٹی کا رکن نہیں لیکن چونکہ خوش قسمتی سے اس جلسہ میں موجود ہوں اس لئے اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں کیونکہ زیر بحث مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس سے مسلمانوں کے بہت سے دینی اور دنیاوی اعمال کا جائز و ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر اُن کے شخصی اعمال پر بھی پڑے گا۔ کیونکہ وہ اس ملک میں آئے اور کئی سالوں سے یہاں قیام پذیر ہیں۔

جناب صدر نے کہا ہمیں ان کے خیالات کو سنکر بے حد خوشی ہوگی اور ہم اس کے لئے ان کا شکریہ ادا کریں گے جو کچھ بھی وہ کہیں ہمارے نزدیک اس کی بڑی وقعت ہے ہو گی۔

شیخ محترم نے فرمایا کہ انہوں نے اکثر ممالک کی سیر کی ہے اور وہ دو مرتبہ قسطنطنیہ بھی جا چکے ہیں اول سلطان محمود خاں مرحوم کے زمانے میں اور پھر موجودہ شہنشاہ سلطان عبدالعزیز خاں کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے وقت اس دفعہ انہوں نے وہاں صرف چودہ مہینے قیام کیا۔ انہوں نے مصر شام اور ایشائی ترکی کے دوسرے شہروں کی سیر بھی کی اور وہاں مختلف مقامات میں قیام بھی کیا ہندوستان میں اب وہ چوتھی بار آئے ہیں۔ پہلے پہل انتیس سال ہوئے وہ اس ملک میں آئے تھے اور اس وقت انہوں نے مختلف شہروں میں تقریباً سات ساڑھے سات برس گزارے

انگریز چونکہ ہندوستانی معاملات کو مغربی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور غلط سمجھتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اُن کی ایشیائی رعایا بھی جو برطانوی جزائر کی آبادی سے چھ گنا زیادہ ہے ہندوستانی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے یوروپین سیاست کو اُسی جہالت اور سختی کے ساتھ مروڑ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتے کا فتویٰ اپنی غلطی کے باوجود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) اڑھائی سال دہلی۔ دو سال اور نو مہینے لکھنؤ میں جب محمد علی شاہ مرحوم یہاں حکومت کر رہے تھے۔ وہ جب تک وہاں رہے شاہی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ شاہ مرحوم اُن سے بڑی تعظیم و تکریم اور مہربانی سے پیش آتے۔ دو سال تک ان کا قیام حیدرآباد دکن میں رہا۔ یہاں سے وہ بڑودہ چلے گئے اور بڑودہ سے افغانستان گئے۔ چار ساڑھے چار برس وہ اس ملک کی سیاحت کرتے رہے افغانستان میں ان کا جانا امیر دوست محمد خاں والیٔ کابل کے بھائی کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ جب تک کابل میں رہے بادشاہ کے مہمان رہے۔ دو اور موقعوں پر بھی وہ ہندوستان آئے مگر صرف حیدآباد دکن اور سندھ میں ٹھہرتے ہوئے واپس چلے گئے اور اب ایک سال کا عرصہ ہوا وہ پھر ہندوستان آئے ہیں۔ انہوں نے بمبئی۔ بھوپال۔ رام پور۔ الہ آباد۔ پٹنہ گیا وغیرہ کا سفر کیا اور کلکتہ میں تشریف فرما ہوئے۔ اس دفعہ بھی اُن کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت کی گئی ان کے ساتھ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال۔ ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور جس مہربانی اور مہمان نوازی سے پیش آئے اس کا شکریہ وہ کماحقہ ادا نہیں کر سکتے۔ اس طویل داستان سیاحت کے بیان کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خوش قسمتی سے جو تجربہ ان کو مختلف ممالک کی سیر سے ہوا خصوصاً ہندوستان میں چار مرتبہ آنے سے اُس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق جو اس جلسہ میں پیش ہے جو کچھ بھی ان سے پہلے آنے والے مقررین نے کہا بالکل ٹھیک کہا۔ بالخصوص سیکرٹری صاحب کا وہ بیان جو انہوں نے ہز مجسٹی ملکہ انگلستان اور ہز میجسٹی سلطان ترکی کی دوستی کے متعلق دیا بالکل ٹھیک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر دوستی سلطان ترکی اور انگریزی قوم کے درمیان ہے ویسی سلطان ترکی اور دنیا کی کسی قوم کے درمیان نہیں پائی جاتی۔ انہیں یعنی مقرر کو حال ہی کا ایک واقعہ یاد آیا جس سے سلطان اور انگریزی قوم کی محبت کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے خدیو مصر نے سلطان سے نافرمانبرداری اور بے وفائی کے جذبات کا اظہار کیا جس سے بعض خطرناک واقعات کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ آخر الامر سلطان نے ایک سخت اور قطعی فرمان خدیو کے نام (باقی اگلے صفحہ پر)

بہت سے خوشحال اور آرام طلب مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگا۔ البتہ علماء شمالی ہند کے مستند فتوے کی اشاعت بہت زیادہ ہوگی کیونکہ اس میں وہابیوں کی اس رائے سے اتفاق کیا گیا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اور اس سے منطقی طور پر وہ یہ نتیجہ اخذ کیا کرتے ہیں کہ اندریں صورت مسلمانوں کا فرض ہے کہ پُرامن رعایا کی زندگی بسر کریں۔ میں نے اس فتوے کو جو ایک اصطلاحی شے ہے ضمیمہ میں درج کر دیا ہے اب میں اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) جاری کیا اور حکم دیا کہ اگر اس کے طرزِ عمل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے تو صرف اس کی متابعت سے لیکن خدیو نے سلطان کے احکام کے بارے میں لیت و لعل سے کام لیا اور یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اس کے احکام کی متابعت سے قطعاً انکار کر دیتا مگر ایسا کرنے سے پہلے اُس نے انگریزی قونصل جنرل کو تمام حالات سے مطلع کر دیا اور اس کی رائے کا انتظار کرنے لگا جو اسے بہت ہی جلد معلوم ہو گئی۔ قونصل جنرل کا جواب خدیو کو یہ تھا کہ اسے وزیر انگلستان سے ہدایات پہنچ گئی ہیں کہ اگر اس نے سلطانی احکام کو پورا نہ کیا تو وہ ایتھنز کے بحری بیڑے کو تار دے گا کہ وہ فوراً اسکندریہ پہنچ جائے خدیو نے یہ سنتے ہی اطاعت قبول کی اور اپنے دل سے بغاوت کا خیال نکال دیا۔ اُس نے سلطان کے قطعی اور ذلت آمیز فرمان کی شرائط کو پورا کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کی بلکہ اس کے اطاعت گزاروں میں داخل ہو گیا۔ اس سے سلطان اور انگریزی قوم کی گہری دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سلطان کے بیرونی دشمنوں سے بھی جنگ کر چکے ہیں اور سلطان کے ان اندرونی دشمنوں سے بھی جو بغاوت پر آمادہ تھا لڑنے کو تیار تھے بیشک سلطان کی اپنی ذات ہی خدیو مصر کو ہوش میں لانے کے لئے کافی تھی لیکن انگریزی قوم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ اس کو خواہ مخواہ مصیبت اور پریشانی میں ڈالا جائے یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انگریز اُس وقت خدیو مصر سے بھی دوستی کا دم بھرتے تھے مگر یہ دوستی صرف اس لئے تھی کہ وہ سلطان کا نائب ہے۔ انہوں نے سلطان کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے اُس کی دوستی کی کچھ پرواہ نہ کی مختصر یہ کہ اگر انگریزی حکومت خدیو کے ساتھ لڑنے کو تیار نہ ہو جاتی تو خدیو ضرور سلطان کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے کی جرأت کرتا۔ حاضرین اُن آفات کا اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس اندرونی جنگ و جدل سے پیدا ہو جاتے۔ انگریزی حکومت کی فوری کارروائی سے سلطان اور خدیو دونوں خانہ جنگی کے بڑے نتائج سے بچ گئے کیا اُس نے بھی زیادہ اسلام کا کوئی (باقی اگلے صفحہ پر)

مسئلہ کے تاریخی حالات مختصراً بیان کروں گا جو یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں بھی یہی مسئلہ پیش آیا تھا جس کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں مرہٹہ کافروں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو برباد کر دیا تھا۔ اسلامی قوانین کے مطابق جن صوبجات پر پہلے مسلمان یا ہندو حاکم تھے اب اُن پر کفار کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا دیندار مسلمانوں کے سامنے دفعتہً یہ سوال پیدا ہو گیا کہ فاتحین کے ماتحت اُن کی حیثیت کیا ہے اور کیا اُن کے خلاف بغاوت جائز ہے یا ناجائز۔ اُس وقت اس مسئلے کا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ چونکہ مرہٹے آمدنی کا چوتھائی حصہ لینے پر اکتفا کرتے ہیں اور دراصل نظام حکومت میں کسی طرح بھی دخیل نہیں اس لئے ہندوستان دارالاسلام ہے۔ انہوں نے صوبجات کے مسلمان

دشمن ہو سکتا ہے جو خلیفہ اسلام کے ایسے سچے دوست کے خلاف جنگ کرے بالخصوص جب انگریزی ہندوستان کو دارالاسلام تسلیم کر لیا گیا ہے اس جلسہ میں مقررین نے جو سندیں پیش کیں ہیں اُن کے علاوہ مکہ و مدینہ ایسے متبرک شہروں کے صالح علماء کا فتوے بھی شائع ہو چکا ہے جو کافی سے زیادہ ہے کیونکہ یہ قابل عزت علما تمام ملک کا جائزہ لیتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچے کہ انگریزی ہندوستان دارالاسلام ہے

اس فتوےٰ کی بنا پر عرب کا ہر باشندہ بلا روک ٹوک یہاں آسکتا اور انگریزی حکومت سے شہری اور مذہبی آزادی کا پروانہ لئے بغیر جتنا عرصہ بھی چاہتا ہے رہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انتیس سال پہلے جب وہ اس ملک میں آئے تھے تو اُس وقت دہلی اور لکھنؤ میں سینکڑوں علمائے حق موجود تھے۔ جن کے ساتھ اُن کے مراسم نہایت دوستانہ تھے۔ باایں ہمہ انہوں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ ہندوستان دارالحرب ہے وہ سب ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے اور دارالاسلام میں رہنے کے تمام احکام کو پورا کرتے تھے مقرر خود اس بات کا تجربہ کر چکا ہے کہ اُن دنوں بھی آج کی طرح جمعہ اور عیدین کی نماز ادا ہوتی تھی اب بھی یہاں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی جس سے اس ملک کے دارالاسلام ہونے میں فرق آگیا ہو معلوم ہوتا ہے اس ذی علم شیخ کو دوران سفر میں ایسے اچھے ساتھی میسر آگئے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے طبقہ عوام الناس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا انہیں خیال بھی نہیں آیا۔

حاکموں کو بالکل نہیں چھیڑا اور مسلمان مفتیوں اور قاضیوں کو اپنے عہدے پر بدستور بحال رکھا اگر کوئی مسلمان حاکم مرجاتا تو اس کی جگہ اس کے کسی ہم مذہب کو حاکم مقرر کرتے حقیقت میں اُس کے خاندانی وارث کی جانشینی ان تحائف پر منحصر تھی جو اس حق کی تصدیق کے لئے وہ دور دراز کے مرہٹہ دربار میں بھیج دیتے۔ ذیل میں وہ فتوے منقول ہے جو اُس وقت کے سب سے بڑے عالم نے دیا تھا ۔[1]

اب یہ فرض کیجئے کہ دارالاسلام پر کافروں کا قبضہ ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے نہیں روکتے۔ مسلمانوں کے قوانین کو برقرار رکھتے اور قاضیوں کو مقرر کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے حسب خواہش ان کے قوانین کو نافذ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کفار سے التجا کرنی پڑتی ہے کہ مسلمان حاکموں کا تقرر کافروں کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان حالات میں اُس کے لئے کیا احکام ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی اسلامی صوبہ کافروں کے ہاتھ میں چلا جائے تب بھی دارالاسلام رہتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ کوئی دارالحرب ملا ہوا نہیں نہ اُس میں کافروں کے قوانین کا اجراء ہوا اس کے حاکم اور مفتی سب مسلمان ہیں اور جو فیصلہ کرتے ہیں شرع اسلامی کی رو سے۔ کافر بھی اپنے معاملات کا فیصلہ شرع اسلامی کے مطابق کرتے ہیں۔ بلکہ مسلمان قاضی کافروں کو سزائیں بھی دیتے ہیں۔

لیکن اس طرح ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے میں جس قدر وجوہ دیئے گئے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی اس وقت موجود نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبجات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا۔ انہوں نے شرع اسلامی

---

[1] اس فتوے کے لئے مجھے پھر پروفیسر بلوک مین کا شکریہ ادا کرنا ہے انہوں نے اس فتوے کو قاضی محمد اللہ بن مولوی شیخ علی بن قاضی محمد حمید بن مولوی تقی الدین محمد صابری جو ترنوبا کے عمر کی اولاد سے ہیں۔ اس کا عنوان ہے احکام الاراضی یعنی زمینداری کے احکام اور اس کا موضوع ہے دارالاسلام میں اصلی جائداد کی بحث۔

کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لئے مسلمان قاضی مقرر کئے اس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرا سے امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کی ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہر داری نے آخر ایک قابل نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم اس زمانے میں بھی جب ہمارا ریذیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا[1] تو حکم جاری کرتے اسی کے نام پر کرتے۔

چونکہ اب تک جو لوگ[2] ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرز عمل کو سمجھ سکیں گے۔ جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے باقاعدہ بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے۔ ہماری اپنی حالت بھی ایک ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دار الاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ ان دنوں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے رہے ہیں اس سے پہلے بیان کر آیا ہوں کہ شریعت اسلامی کی رو سے ہر مرد، عورت اور بچے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کافر حکمرانوں کی بیخ کنی کرے

---

[1] ۱۸۱۲ء میں سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی جو ناموں کے تغیر کے ساتھ متواتر جاری رہی۔ بادشاہ شاہ عالم۔ پاسبان دین محمد سایہ رحمت الٰہی نے یہ سکہ ہفت اقلیم میں جاری کرنے کے لئے ڈھالے اور دوسری طرف یہ کندہ ہوتا تھا۔ مرشد آباد میں تخت نشینی کے انیسویں سال ہمایوں میں ڈھالا گیا۔

[2] سورے مارش اور مونسرات کی کتاب کے اور کتاب اس وقت کی نہیں ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

اور انہیں ملک سے باہر نکال دے[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت بھی نہیں کی جائے اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔ ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔ شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لئے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصے حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکے اُسی کے نام جاری ہوتے[2] پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دے دی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج مٹ گئیں حتےٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا۔ میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا۔ یعنی مجلس قوانین ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا جس کی تعمیر پوری ایک صدی (۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء) سے ہو رہی تھی اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہونے گئے پیشتر اس کے کہ ہندوستان دارالحرب بن سکے مسلمانوں کے ان فرائض میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہوتی گئی جن کی ادائیگی دارالاسلام میں ضروری ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر آیا ہوں ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ کافر فاتح کے خلاف جہاد کریں

---

[1] مبسوط امام محمد۔ [2] ۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپے پر جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی ساور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا۔

مگر اب جب کہ صورت حالات بدل چکی ہے اُن پر فرائض کا ایک نیا مجموعہ عاید ہوگیا ہے مسلمانوں کی حیثیت یک قلم تبدیل ہوگئی ہے اور موجودہ نسل اس تبدیلی کی مطلق ذمہ دار نہیں بجائے اس کے کہ وہ ہندوستان کے مالک ہوئے ان کے حقوق اچانک چھین لئے گئے جن کا اب اُن کو دوبارہ حاصل کرنا ضروری ہوگیا ہے اصطلاحاً اب ان کا شمار مستامین یعنی امان چاہنے والوں میں کرنا چاہیے چنانچہ اس حالت میں انہوں نے اپنے انگریزی حاکموں سے کچھ نہ کچھ شہری اور مذہبی مراعات حاصل کرلی ہیں (یعنی امان)۔ یہ سچ ہے کہ اُن کو وہ حیثیت نہیں ملی جو اسلامی حکومت کے ماتحت حاصل تھی پھر بھی انہوں نے اتنے حقوق ضرور منوا لئے ہیں جو اُن کے مال وجان اور مذہب کی حفاظت کے لئے کافی ہوں۔ اُن کی نماز اور نماز باجماعت سے تعارض نہیں کیا جاتا اُن کی مذہبی عمارتوں اور مقامات کی تعظیم کی جاتی ہے اس شہری اور مذہبی آزادی (امان) کے بدلے وہ ہماری رعایا ہونے کا اقرار کرتے ہیں جیسا کہ ان کے آباؤ اجداد پچاس سال سے کرتے آئے ہیں۔ وہی مستند علما جو کبھی اُن کو اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ دارالاسلام کے باشندے ہیں اس لئے انہیں کافر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا چاہئے اب اس بات پر مصر ہیں کہ دارالحرب کی رعایا کی حیثیت سے اُن کو اپنے عہد وپیمان کا پاس اور کافر حکومت کے ماتحت امن وامان کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔

بعینہ اب جہاد کا فرض بھی معطل ہو رہا ہے۔ لہذا مسلمانوں کی موجودہ نسل اپنے ہی قوانین کی رُو سے مجبور ہے کہ موجودہ حالت پر راضی ہو جائے۔ وہ اس صورت حالات کی ذمہ دار نہیں۔ حکمت خداوندی کی بنا پر اور اس خیال سے کہ بغاوت دین اسلام کو کن کن خطرات میں مبتلا کردے گی اُن کو جنگ وجدل برپا کرنے سے روک دیا۔ لہذا وہ مجبور ہیں کہ اُن تعلقات کو جو فاتح اور مفتوح کے درمیان پیدا ہوچکے ہیں قائم رکھیں بحیثیت رعایا انہیں اپنے فرائض اُس وقت تک پوری طرح ادا کرنے چاہئیں جب تک کہ ہم ان کی (امان) حیثیت کو اس حد تک برقرار رکھیں کہ ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔ لیکن اگر اُن کے انگریز حکام اُن کے اس خاموش معاہدے کو توڑ ڈالیں یعنی اُن کی نماز باجماعت

یا جائز شرعی رسومات یا مسجدوں کی تعمیر یا ادائے حج یا علما اور پیروں کی تعظیم و تکریم یا اسلامی شخصی قوانین میں دخل انداز ہوں تو پھر اُن پر جہاد فرض ہو جائے گا۔ اگر ان حالات میں جہاد فرض ہو جائے لیکن نا قابل عمل ہو تو پھر ہر دیندار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان تمام حالات کو تحریر فرما دیا ہے جن میں ہجرت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں میں بھی یہ سب باتیں مندرج ہیں۔

آئندہ باب میں میں یہ ثابت کروں گا کہ ہم کن خطرناک حالات سے گذر رہے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مسلمان رعایا کو وہ فرائض یاد دلائے جو حکام کی طرف سے اُن پر عائد ہوتے ہیں بلکہ حکام پر بھی یہ امر اچھی طرح سے واضح کر دے کہ محکوموں کی طرف سے اُن کے ذمے کیا فرائض ہیں شمالی ہندوستان کے علما کا فتوے جس کے تاریخی حالات میں گذشتہ صفحات پر بالوضاحت بیان کر چکا ہوں اُن جماعتوں پر گہرا اثر رکھتا ہے جن کی خیر خواہی کی ہم کو اشد ضرورت ہے مگر اس میں وزن پیدا ہوگا تو اسی وقت جب ہم اُن کے حقوق اور مذہبی مراسم میں دخل انداز نہ ہوں۔ ہندوستان کے تمام وہابی اور دیندار مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس ملک کو دار الحرب قرار دیتی ہے۔ گو مسلمانوں کی وہ اکثریت جو زیادہ ہوشمند ہے تبدیلی حالات پر آنسو بہاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان فرائض کی انجام دہی پر آمادہ ہے جو فی زمانہ ان پر عائد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان ایک فاتح قوم ہے نہ کہ مفتوح۔ جیسا کہ اس سے پہلے واضح کر دیا گیا تھا۔ قرآن مجید کو عرصہ سے سیاست تمدن کے لئے ناکافی سمجھا جا رہا ہے اور اس لئے مسلمان اقوام کی ضروریات کے مطابق شریعت اسلامی اور قوانین عامہ میں مزید اضافے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے لئے اگرچہ اپنی مسلمان رعایا سے پُر جوش وفاداری کی توقع رکھنا عبث ہوگا۔ لیکن اُن سے یہ اُمید رکھنا بھی غیر معقول نہیں کہ جب تک ہم پابندی کے ساتھ اُن کے حقوق پورے کرتے رہیں گے وہ بھی ایمانداری کے ساتھ اس صورت حالات میں اپنے فرائض سرانجام دیتے

رہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہمارے زیرِ نگیں کر دیا ہے۔

عُلما میں سے جو لوگ زیادہ زیرک تھے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیّر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیّر اب ایک حقیقت بن چکا ہے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتووں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویہ کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقہ پر جاری نہ تھا چنانچہ اُن میں سے ایک فتویٰ میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اُس وقت دارالاسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں اُن میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اور دوسرا اُن کے بھتیجے مولوی عبدالحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں۔ جب ہم نے نظام حکومت کو بتدریج اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اُس وقت دیندار مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ اُن کے تعلقات کیا ہونے چاہیں لہٰذا انہوں نے ہندوستان کے سب سے زیادہ مستند علما سے رجوع کیا اور اوپر کے دونوں مشہور و معروف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے جو حرف بحرف مندرجہ ذیل ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اُس ملک اور ملحقہ اضلاع کے مسلمانوں کے لئے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس سے باہر نکال سکیں یا اُن کو باہر نکالنے کی کوئی امید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مالگزاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اس امن و امان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دارالحرب ہو جائے گا۔ جوں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب

ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے اٹک سب کی سب دارالحرب ہے۔ کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پاچکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے" یہاں ان تمام شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا جن کے ماتحت جملہ فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ کلکتہ اور اس کے ملحقات دارالحرب ہیں۔

ان فتووں سے عملی نتائج بھی مترتب ہوئے۔ وہابیوں نے جن کا جوش اُن کے علم کی نسبت بہت زیادہ ہے اس اصول سے کہ ہندوستان دارالحرب ہے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے حاکموں کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔ زیادہ روشن خیال مسلمان گو اس حقیقت پر بہت غمگین ہیں مگر اس کو وجہ بغاوت قرار نہیں دیتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان روحانی مراعات میں کمی واقع ہوگئی ہے مثال کے طور پر دارالاسلام میں جہاں مسلمانوں کی مذہبی حیثیت تمام و کمال قائم ہوتی ہے نماز جمعہ فرض ہے لیکن ہندوستان میں صرف دیندار مسلمان ہی اس نماز کی شرکت سے گریز نہیں کرتے ہیں بلکہ چند ایک مساجد میں اس کی ممانعت بھی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کلکتہ کے دو مسلمان جو اپنی طرز زندگی میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں ہمارا یعنی محمڈن کالج کے سابق ہیڈ پروفیسر[۱] اور سابق قاضی القضاۃ[۲] جمعہ کی نماز سے احتراز فرماتے رہے۔ وہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہوئے اس بات کے قائل تھے کہ اس طرح ہماری روحانی مراعات میں کمی واقع ہوگئی ہے لیکن ان کی زندگی وفادار رعایا اور باوقار ملازموں کی تھی۔ بہت سے مسلمان جو ہندوستان کی بدلی ہوئی حالت کا اقرار کرتے ہیں اس حد تک نہیں بڑھتے کہ نماز جمعہ کی روحانی تسکین سے بھی احتراز کریں۔ لہذا عام مسلمانوں کو اگر یہ پتہ چل جائے کہ وہ اپنی روح کو اذیت پہنچائے بغیر نماز جمعہ میں شریک

---

[۱] مولوی محمد وجیہ صاحب۔ [۲] قاضی القضات مولوی فضل الرحمٰن صاحب۔

ہو سکتے ہیں تو یقینی ہے کہ وہابیوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیں گے۔ علمائے شمالی ہند کا باقاعدہ فتویٰ جس کو شائع ہوئے کچھ عرصہ ہوا اور جس کے تاریخی حالات میں نے بیان کر دیئے ہیں ہزاروں مسلمانوں کی تسکین و تسلی کا باعث ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے ہماری حکومت پر یہ خاموش رضامندی انہیں نکتوں کا معمولی سا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو بے چین کر رہی ہیں۔ مگر اسلام کا متعصبانہ جذبہ اپنے پیرؤں کو اس رضامندی سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیا دار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔

مسلمانوں کی یہ دو جماعتیں سیاسی طور پر کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں مجھے ہندوستان میں اس بات کو دیکھ کر بہت ہی رنج ہوتا ہے کہ اس ملک کے بہترین آدمی ابھی ہمارے طرفدار نہیں۔ وہ اب تک متواتر ہماری مخالفت کرتے چلے آئے ہیں اور یہ بات کہ انہوں نے کچھ دنوں سے اس پرانی دشمنی کو ضروری فرائض سے خارج کر دیا ہے۔ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم اُن سے آج بھی زیادہ سے زیادہ جو توقع کر سکتے ہیں صرف یہ کہ ہماری مخالفت نہ کریں

لیکن اگر کوئی حکومت صحیح معنوں میں حکومت ہے تو وہ اس خاموش رضامندی پر جو مذہبی فرائض کی بنا پر قائم ہو زیادہ اعتبار کرسکتی ہے بہ نسبت اُس وفاداری کے جس کی بنا ناپائدار خود غرضی پر ہو۔[1]

---

[1] اگر حکومت یہ مناسب خیال کرے تو اُس کو علمائے اسلام کے سامنے یہ سوال قطعی شکل میں پیش کرنا چاہیئے تاکہ وہ ایک فیصلہ کرسکیں۔ خوش قسمتی سے سردست اس قسم کے طرز عمل کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کبھی اس کی ضرورت ہوئی تو یہی سوال عوام کی وفاداری کو آزمانے کی بہترین شکل ہوگی۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مسلمان اس صورت میں جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہے حملہ آور ہو تو کیا اُس وقت مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ انگریزوں کی امان کو خیرباد کہہ دیں اور حملہ آور کی امداد کریں؟

نقد و نظر

جان گنتھر کی مشہور کتاب "ان سائڈ ایشیا" پر ایک تنقیدی نظر

(از پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

کتاب مذکورہ بالا انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں بہت مشہور ہوئی ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کتاب کی ذات میں ایسی خوبیاں موجود ہیں بلکہ اس کی عبارت میں افسانہ یا رومان کا سا لطف آتا ہے۔ اور عام طور سے لوگ اسی کتاب کو پسند کرتے ہیں جس کو پڑھتے وقت، دماغ پر بہت کم زور دینا پڑے۔ دنیا میں ناولوں کی کثرت اشاعت کا سبب بھی یہی ہے کہ ان کا انداز بیان شگفتہ اور دلکش ہوتا ہے: مثنوی زہر عشق کا نام، بچہ بچہ کی زبان پر ہے مگر افق المبین کا نام تک بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا لیکن اس کے معنے یہ تو نہیں نکل سکتے کہ زہر عشق بذاتہ افق المبین سے افضل ہے۔

جان گنتھر کی اس کتاب میں صدہا غلط بیانیاں ہیں: مغالطہ آفرینیاں ہیں تعصب ہے پاسداری ہے یک طرفہ فیصلے ہیں، عدم واقفیت کے شواہد ہیں لیکن انداز بیان میں دلکشی ہے اور تنقید میں ظرافت کا پہلو پوشیدہ ہے اس لئے مصنف اور ناشر دونوں کو کافی فائدہ حاصل ہوگیا اور تجارتی زاویۂ نگاہ سے یہ کوشش بہت کامیاب رہی۔

ہندوستان کا ذکر خیر، مؤلف نے نو ابواب میں قلمبند کیا ہے اور میں، اس مضمون میں، انہی ابواب پر تبصرہ کروں گا۔

ہندوستان کی اکثریت میں قبول عام کی سند حاصل کرنے کی غرض سے، مولف نے سب سے پہلے مسٹر گاندھی کا ذکر کیا ہے، اور ایسے انداز میں جو پڑھنے والے کے دماغ پر ڈرامائی تاثرات مرتب کرنے والا ہے ملاحظہ ہو:۔

"عظمت کے لحاظ سے گوتم بدھ کے بعد، ہندوستان میں اگر کوئی شخص پیدا ہوا ہے تو وہ مسٹر ایم کے گاندھی ہیں"

یہ دعویٰ کسقدر غیر ذمہ دارانہ بلکہ شاعرانہ انداز میں کیا گیا ہے! محض اس لئے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہو کر رہ جائے اور مولف کی ژرف نگاہی کا سکہ اس کے دل پر جم جائے۔ گاندھی کی تعریف بھی ہو گئی، ہندو بھی خوش ہو گئے، اپنی شہرت اور کتاب کی فروخت بھی ہو گئی۔

قتل میں تیرے فوائد سوچ رکھے ہیں کئی
غیر کی تسکین، اپنی مشق، تیرا امتحان

سچ پوچھئے تو عظمت کے لحاظ سے، گوتم بدھ کے بعد اگر کسی کا نمبر ہے تو شنکر آچاریہ کا: لیکن مولف کو تحقیق سے کیا غرض؟

سوال یہ ہے کہ گوتم بدھ اور مسٹر گاندھی میں مماثلت یا مناسبت کیا ہے؟ ذیل میں دونوں کی زندگیوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

(۱) گوتم بدھ نے دنیا کے سامنے ایک مخصوص طریق نجات پیش کیا۔

(۲) ایک مخصوص فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔

(۳) نفسیات میں ایک نیا نظریہ پیش کیا

(۴) الٰہیات کے باب میں بالقصد خاموشی اختیار کی نہ خدا کا اقرار کیا نہ انکار۔ یا یوں سمجھئے

کہ ان کے نظام فکر میں خدا کی کہیں گنجائش ہی نہیں ہے۔

(۵) ہیئتہ اجتماعیہ انسانیہ کو تباہ کرنے والا فلسفۂ حیات پیش کیا۔

(۶) حیات انسانی کا مقصد "نروان" قرار دیا یعنی فنا رشعور ذاتی۔

(۷) ساری عمر ویدوں اور برہمنوں کے خلاف جہاد کیا۔

(۸) اُن کے فلسفہ میں وطنیت اور قومیت کا تخیل کہیں نظر نہیں آتا بلکہ انہوں نے عالم ہمدردی کا درس دیا ہے۔

(۹) ان کا ظاہر اور باطن ساری عمر یکساں رہا۔

(۱۰) ان کی جدوجہد کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ

سنسار میں جیو آتما کے دکھی ہونے کا کارن کیا ہے

اب مسٹر گاندھی کو دیکھیے۔

(۱) وہ کسی مذہب کے بانی نہیں ہیں۔

(۲) نہ انہوں نے کسی فلسفہ اخلاق کی بنیاد رکھی اور نہ ان میں اس کی صلاحیت ہے۔

(۳) وہ خدا پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

ان کا اسلوب فکر سراسر مذہبی ہے اور وہ ہر بات کو ہندو دھرم کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں

(۶) انہوں نے زندگی کا کوئی فلسفہ مدون نہیں کیا اور نہ ان میں یہ صلاحیت ہے۔

(۷) وہ ہندو دہرم کے پیرو ہیں۔

(۸) ویدوں اور برہمنوں کے خلاف آج تک ایک لفظ نہیں کہا بلکہ وہ تو گائے کی پوجا تک کرتے ہیں اور گئو رکھشا کو ارتقائے انسانیت کا ایک زبردست مظہر یقین کرتے ہیں۔

یعنی جب تک انسان، اس حیوان کی عبادت نہ کرے، اس کی انسانیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

(۹) وہ وطنیت اور قومیت دونوں بتوں کے زبردست پجاری ہیں بلکہ ذات پات اور ورن آشرم کے بھی حامی ہیں جو تہذیب و تمدن کے حق میں سم قاتل ہے۔

ان کی ہمدردی کا دائرہ صرف ہندو قوم تک محدود ہے۔ دیگر اقوام کو صرف "بلینک چیک" دینے پر اکتفا فرماتے ہیں۔

(۱۰) انہوں نے ساری عمر اس مسئلہ کے حل کرنے میں بسر کر دی کہ ہندوستان میں زیر سایۂ برطانیہ، وہ رام راجیہ کیونکر قائم ہو سکتا ہے جس میں ویدانتی تصور حیات حکومت کا مذہب اور ہندی اتھوا ہندوستانی حکومت کی زبان قرار پائے۔

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ گوتم اور گاندھی میں کوئی مناسبت پائی جاتی ہے یا نہیں، مصنف نے یہ "(DRAMATIC TOUCH) محض اس لئے لگایا کہ ہندو ناظرین ذرا خوش ہو جائیں۔

باایں ہمہ بعض پتہ کی باتیں بھی مصنف کے قلم سے نکل گئی ہیں مثلاً

(۱) "گاندھی بیک وقت مہاتما بھی ہے اور سیاست دان بھی پیغمبر بھی ہے اور ایک اعلیٰ درجہ کا ابن الوقت بھی۔ اس لئے یہ فیصلہ دشوار ہے کہ اُسے دراصل کس خانہ میں رکھا جائے؟"

میری رائے میں یہ فیصلہ کرنا بالکل دشوار نہیں ہے۔ مسٹر گاندھی ہندوؤں کے لیڈر ہیں اور فرقہ پرستوں کے سرتاج ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کو سب سے پہلے مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۲۷ء میں واشگاف کیا تھا۔

(۲) "مسٹر گاندھی، برت کے روزے سے اپنے بعض سیاسی مقاصد بھی حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ جب وہ جیل میں فاقہ کشی شروع کرتے ہیں تو حکومت مجبوراً انہیں رہا کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کی موت کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کر سکتی"

شاید مصنف کو یہ معلوم نہیں کہ مسٹر گاندھی برت رکھتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ان کا سیاسی مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور ضمنی طور پر ان کی "مہاتمائیت" کا پروپاگنڈا بھی ہو جاتا ہے

"مسٹر گاندھی کسی زمانہ میں برطانیہ کے سخت دشمن تھے لیکن آج ۱۹۲۹ء میں اس کے بہترین دوست ہیں"

خدا جانے مصنف کو یہ مغالطہ کس وجہ سے لاحق ہو گیا، میرا بیست سالہ مشاہدہ تو اس کے بالکل برعکس ہے: انگریز یا برطانیہ سے دشمنی تو بڑی بات ہے، مسٹر گاندھی نے تو برطانیہ سے جدائی کا تصور بھی کبھی ذہن میں نہیں آنے دیا۔ جب ۱۹۲۶ء میں مولینا حسرت موہانی نے، کانگرس میں پہلی مرتبہ مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کیا تھا، تو اس وقت مسٹر گاندھی نے، یہ فرمایا تھا کہ مولینا ہمیں ایسے پانی میں لے جانا چاہتے ہیں جس کی گہرائی کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور کچھ عرصہ ہوا انہوں نے ہریجن میں لکھا تھا کہ کانگرس سے بڑھ کر، انگریزوں کی خیر خواہ، اور کوئی جماعت نہیں ہے۔ نیز اُن کے "جائز وارث" پنڈت نہرو بھی فرما چکے ہیں کہ انگریزوں کے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ گاندھی کا مقصد، برطانیہ سے دشمنی کر کے حاصل بھی تو نہیں ہو سکتا۔ وہ مقصد کیا ہے؟ اُسے جنت آشیانی مولانا محمد علی مرحوم کی زبان سے سُن لیجئے۔

"خلق خدا کی، ملک انگریز کا حکومت ہندو کی"

مسٹر گاندھی کو رات دن یہ غم کھائے جاتا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو پنجاب سے پنجابی (مسلمان)، اور نیپال سے گورکھے، ہندوستان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

"اگرچہ مسٹر گاندھی زبان سے اچھوتوں کی فلاح و بہبود کے بہت لمبے چوڑے دعوے کرتے رہتے ہیں لیکن دراصل انہیں، اُن کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے کیونکہ جب برطانیہ نے ان کے لئے جداگانہ حقوق تسلیم کر کے، ان کی حقیقی بہبود کا انتظام کرنا چاہا تو انہی بزرگوار نے، بون برت

کی دھمکی دے کر بیچارے اچھوتوں کے سیاسی مستقبل کو پھر تاریک کر دیا۔ اور ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بظاہر مسٹر گاندھی اچھوتوں کے عاشق زار نظر آتے ہیں لیکن ایسی کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں جس سے ان کی سیاسی اور مجلسی حالت بہتر ہو جائے۔ مثلاً اچھوتوں کی فلاح و بہبود اس امر پر منحصر ہے کہ یا تو انہیں ہندو قوم میں داخل کر لیا جائے، اور جس قدر سیاسی عمرانی مجلسی اور تمدنی حقوق دوسرے ہندوؤں کو حاصل ہیں، انہیں بھی عطا کئے جائیں اور اگر یہ ممکن نہیں تو پھر انہیں ایک جداگانہ قوم تسلیم کیا جائے۔ اور جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے لا صد ۲۸۳ میں کہتا ہوں کہ مصنف کو کیا پتہ کہ انسان کتنی مشکل سے مہاتما بن سکتا ہے: مسٹر گاندھی کی سب سے بڑی خوبی یہی تو ہے کہ ان کی ساری زندگی ایک معا ہے، ایک راز ہے، انسانوں کی عقل و فہم سے بالاتر! وہ عام انسانوں کے برخلاف "اندرونی روشنی" کی مدد سے دیکھتے ہیں اسی لئے ہم سطحی نظر والوں کو اُن کے قول اور فعل میں تطابق نظر نہیں آتا: ہماری رائے میں تو امسٹر موصوف سے بڑھکر اچھوتوں (ہریجنوں) کا اور کوئی بدخواہ نہیں ہے کہ وہ نہ انہیں اپنے ساتھ ملاتے ہیں نہ جدا کرتے ہیں، جہاں تک زبانی جمع خرچ کا سوال ہے، گاندھی جی اُن کے بہت بڑے ہمدرد ہیں دیکھئے اُن کو کتنا دلکش لقب عطا کیا ہے "خدا کے فرزند" لیکن کوئی ایسی بات کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں جس سے ان فرزندان الٰہی کو انسانیت کے ابتدائی حقوق حاصل ہو جائیں۔

"اگرچہ مسٹر گاندھی دن رات زبان سے ہندو مسلم اتحاد کی رٹ لگاتے رہتے ہیں لیکن وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی قوم یا اُن کے خاندان کا کوئی فرد مسلمان ہو جائے" صد ۲۸۳

۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ جب الہ آباد کے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی ایک مسلمان نوجوان سے جو اسی شہر میں ایک انگریزی روزنامہ کا اڈیٹر تھا، شادی کرنی چاہتی تھی تو اُسی مہاتما نے مولانا شوکت علی مرحوم سے کہا تھا کہ مولانا ایشور کے لئے اس شادی کو روک

دیجئے ورنہ ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کٹ جائے گی، لیکن جب ۱۹۳۳ء میں شردہانند نے جاہل مسلمانوں کو ورغلا کر ناپاک کرنے کی ناپاک کوشش شروع کی، تو اس مہاتما کو، سانپ سونگھ گیا تھا۔ جھوٹوں کی بھی یہ نہ کہا کہ اس مُسلم کش پروگرام سے "ہندو مسلم اتحاد" ختم ہو جائے گا۔

"مسٹر گاندھی بباطن کانگریس کی روح رواں ہیں اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، اس کی آنکھیں بلکہ اس کی انگلیاں ہیں لیکن بظاہر یعنی از روئے آئین اس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں ہیں" صہ ۲۸۲

مصنف کو شاید علم نہیں کہ اسی دو رنگی چال میں تو مسٹر موصوف کی "مہاتمائیت" کا سارا راز پوشیدہ ہے گو بظاہر وہ اس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں لیکن دراصل وہ اس آل انڈیا ہندو جماعت کے ڈکٹیٹر ہیں باپو کی مرضی کے خلاف کوئی کانگریسی چھینک بھی نہیں لے سکتا۔ ورنہ سوبھاش بوس کی طرح بیک بینی و دو گوش، تخت صدارت سے معزول کر دیا جاتا ہے اور اسی لئے تو ارباب نظر صدر کانگریس کو شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔

"مسٹر گاندھی ہر چیز کو مذہبی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہندو دہرم سے قطع نظر کر کے آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کا مذہب کیا ہے" صہ ۲۸۳

ممکن ہے مصنف کو اس باب میں کوئی دشواری لاحق ہو، ہمارے لئے تو یہ مسئلہ بالکل صاف ہے مسٹر گاندھی، خالص ہندو ہیں اور آہنسا کے فلسفہ پر عامل ہیں چنانچہ انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ "میں آہنسا کے ذریعہ سے ہندوستان کی خدمت کرنی چاہتا ہوں"

اگرچہ ابتداً انہوں نے مُسلم دوستی کا جامہ زیب تن فرمایا تھا لیکن عرصہ ہوا یہ پیراہن تار تار ہو چکا ہے کچھ عرصہ ہوا مسلمانوں کے اس دوست نے صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان اگر پسند کریں تو اسے زندہ رکھیں بھارت ورش کی زبان تو ہندی ہے۔ چنانچہ اردو کی اسی مخالفت نے اُن کے اکثر ثناخوانوں کو ان سے

بدظن کر دیا۔

بقول خالدہ ادیب خانم "اگرچہ مسٹر گاندھی زبان سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ میں فرقہ پرستی سے بالاتر ہوں لیکن ان کی ساری سرگرمیاں، اُن کو خالص فرقہ پرست ثابت کرتی ہیں"

"اگرچہ مسٹر گاندھی نہ گوشت کھاتے ہیں نہ انڈا، اور نہ مرغن غذائیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ تقلیل غذا پر عامل ہیں کیونکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ بہت کچھ کھا پی لیتے ہیں مثلاً دیگچی بھر بکری کا دودھ کھجور، منقے، بادام، انجیر، شہد، لہسن، ترکاریاں، سنترے نارنگیاں، اناناس آنار، امرود خوبانی اور سوڈا بائی کارب۔ یہ ان کی روزانہ غذا ہے" ص ۳۹۷

حقیقت حال تو یہ ہے جو مصنف نے آشکار کی ہے لیکن اخباروں میں دن رات یہی پروپیگنڈا ہوتا رہتا ہے کہ مہاتما جی صرف بناسپتی اور دودھ پر گزارا کرتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو ان کی ساری زندگی پروپاگنڈا کی تصویر ہے بظاہر وہ موسم گرما میں تیسرے درجہ میں سفر کرتے ہیں لیکن پورا کمپارٹمنٹ، اُن کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور اس کی کھڑکیوں میں خس کی ٹٹیاں لگا دی جاتی ہیں یعنی بظاہر صرف ایک لنگوٹی نظر آتی ہے لیکن اندرونی کاروبار سب وہی ہے جو سرمایہ داروں کے لئے کیا جاتا ہے!

"اگرچہ مسٹر گاندھی نے تعلقات زناشوئی عرصہ چالیس سال سے منقطع کر دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عورتوں کی صحبت کو بہت پسند کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ دل لگی بھی روا رکھتے ہیں" ص ۳۹۹

مصنف کے اس قول پر میں کوئی تنقید کرنی مناسب نہیں سمجھتا مبادا چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہو جائے۔

"گئو رکھشا کے متعلق مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ گائے کی حفاظت کا جذبہ، ارتقائے انسانیت کا ایک حیرت انگیز مظہر ہے یہ جذبہ انسان کو، فوق النوع مرتبہ عطا کرتا ہے، گائے میری نظر میں

تمام تحت انسانی کائنات کا خلاصہ ہے ... وہ لاکھوں ہندیوں کی ماں ہے ... گائے رحمدلی کی زندہ تصویر ہے، اور اس کی حفاظت، تمام حیوانات مطلق کی حفاظت ہے" ص۴۲۴

اس عبارت کو غور سے پڑھئے اور پھر یہ سوچئے کہ کیا آپ کو گاندھی کے خالص ہندو ہونے میں کوئی شک باقی رہ جاتا ہے؛ دراصل انہی باتوں نے تو گاندھی کو مہاتما اور اوتار کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بھینس میں کیا کمی ہے کہ اُسے گائے کے برابر مرتبہ نہیں دیا جا سکتا؛ لیکن تو ہم پرستی میں عقل کی گنجائش کہاں؛

"مسلمان کہتے ہیں کہ جب تک ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز موجود ہے، ہندوستان سیاسی اعتبار سے کوئی ترقی نہیں کر سکتا، اور اس ملک کے مختلف طبقات میں نہ سیاسی مساوات پیدا ہو سکتی ہے، اور نہ سب افراد کو یکساں حقوق حاصل ہو سکتے ہیں" ص۴۳۸

اس میں کیا شک ہے کہ جو قوم اپنے بھائیوں (اچھوتوں) کو ناپاک سمجھتی ہے اور انہیں انسانیت کے ابتدائی حقوق دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہے وہ حقیقی جمہوریت اور مساوات پر کبھی عامل نہیں ہو سکتی۔

"مسٹر گاندھی، جو واقعی ایک معما ہیں، ذات پات کے امتیازات میں پورا پورا الیقین رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود چھوت چھات کو، بنی آدم کے لئے موجب تذلیل سمجھتے ہیں" ص۴۴۰

"جب ۱۹۳۲ء میں بعض مدبرین نے یہ فیصلہ کیا کہ اچھوتوں کی اصلاح حال کے لئے، انہیں جداگانہ قوم تسلیم کر کے جداگانہ حقوق دیئے جائیں تو مسٹر گاندھی نے سر سموئیل ہور کو لکھا، "جناب من! میں آپ کی اس تجویز کے خلاف، اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ آپ اس طرح ہندو قوم کے حصے بخرے نہیں کر سکتے اچھوت ہندو ہیں، اس لئے ان کی اصلاح حال، ہندو سوسائٹی کے اندر ہی کی جائے گی، یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں جداگانہ قوم بنا دیا جائے"۔ ص۴۴۰

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اچھوت ہندو ہیں تو (۱) ہندو، انہیں مندروں میں داخل کیوں نہیں ہونے دیتے؛ (۲) ہندو انہیں وید کیوں نہیں پڑھنے دیتے؛ (منوجی نے لکھا ہے کہ شودر اگر وید منتر سن پائے تو پگھلا ہوا سیسہ

اس کے کان میں بھر دیا جائے۔) (۳) ہندو انہیں اچھوت کیوں سمجھتے ہیں؟ (۴) ہندو انہیں زُنار بندی سے کیوں محروم رکھتے ہیں؟ (۵) ہندو انہیں کس ذات میں شمار کرتے ہیں؟
یعنی یہ اچھوت برہمن ہیں یا چھتری یا ویش یا شودر؟

مصنف نے صفحہ۴۵ پر پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ قول نقل کیا ہے۔
"اشتراکیت، میری نظر میں محض کسی ایسے معاشی یا اقتصادی پروگرام کا نام نہیں ہے، جس کا میں حامی ہوں بلکہ ایک زندہ مذہب ہے جس پر میں دل و جان سے ایمان رکھتا ہوں"
بڑی خوشی کی بات ہے کہ پنڈت جی اشتراکیت پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔
لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس مذہب کو سیاست سے کوئی علاقہ ہے یا نہیں؟
اگر ان کے مذہب (اشتراکیت) کو سیاست ملکی سے کوئی علاقہ نہیں تو براہ کرم اس کا صاف لفظوں میں اعلان کر دیں۔
اور اگر ہے تو پھر وہ مسلمانوں سے کس مونہہ سے کہتے پھرتے ہیں کہ اپنے مذہب کو سیاست ملکی سے علیحدہ رکھو؟
انہیں اور دوسرے کانگرسی زعماء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی نظر میں، اسلام محض نجات آخروی کے پروگرام کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس پر وہ دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں۔
اگر وہ، ہندوستان کا دستور اپنے مذہب کے اصولوں کی روشنی میں مرتب کرنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اُس دستور پر کس طرح متفق ہو سکتے ہیں؟
تعجب ہے مسٹر نہرو مسلمانوں کو تو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اپنے مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھو اور خود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ ہندوستان کا سیاسی دستور اپنے مذہب کی روشنی میں مرتب کرنا چاہتے ہیں، سچ کہا حکیم الامتؒ نے

برہمن خوب داند کار خود را — نمی گوید بکس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوش خود بُرد زنار خود را

مثنوی اسرار خودی اور مولینا محمد علی مرحوم

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

حال ہی میں مسٹر افضل اقبال ایم۔ اے نے رئیس الاحرار فدائے ملت مولینا محمد علی جنت آشیانی کی ایک نا تمام انگریزی کتاب کے مسودہ کو بہت محبت اور محنت کے ساتھ مرتب (EDIT) کر کے شائع کیا ہے۔ فاضل مرتب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مولانائے مرحوم نے مشہور مقدمہ کراچی میں سزایاب ہونے کے بعد، جیل کی تنہائی میں اسیر ہوئی پر انگریزی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھنی شروع کی تھی چنانچہ پہلے تین سو صفحات میں، انہوں نے صرف اس کتاب کا مقدمہ ہی لکھا تھا لیکن اس اثنا میں زمانۂ اسیری ختم ہوگیا اور مرحوم اپنے سیاسی مشاغل میں مصروف ہو گئے لہٰذا اصل کتاب لکھنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ سیاسی لیڈروں کی زندگی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حکیم الامۃؒ نے اپنی ساری زندگی ایک گوشہ میں بسر کر دی تاکہ قوم کو "بال جبریل"، "زبور عجم" "ضرب کلیم" اور "جاوید نامہ" جیسی زندہ جاوید کتابیں عطا کر سکیں۔

اس مقدمہ میں، مولینا نے پہلے اپنے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں، جن کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک پہنچتا ہے اس کے بعد بعض اہم قرآنی اور کلامیہ مباحث پر افکار حاضرہ اور تاریخ قدیمہ کی روشنی میں بحث کی ہے اور ضمناً مسیحی عقائد اور تاریخ کلیسا پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

اپنے سوانح حیات کے سلسلہ میں، مرحوم نے اُن تاثرات کو بھی قلمبند کیا ہے جو اسرار خودی اور رموز بیخودی کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کے دل و دماغ پر طاری ہوئے اُس تعلق خاطر کی بنا پر جو مجھے حکیم الامتؒ کے ساتھ ہے میں چاہتا ہوں کہ ان کا اُردو میں ترجمہ کر کے، پیغام حق کے ذریعہ سے اعلائے کے عقیدتمندوں تک پہنچا دوں۔

لیکن اس حصّہ کا ترجمہ کرنے سے پہلے، میں اُس حیرت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں جو کلیسائی مسائل اور مسیحی عقائد کی بحث پڑھ کر مجھ پر طاری ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب میں یہ غور کرتا ہوں کہ مولینا "کل ہند" پایہ کے سیاسی لیڈر ہے اور ان کی ساری عمر اس طرح گزری کہ ایک قدم کراچی میں تو دوسرا کلکتہ میں، آج لاہور میں تو پرسوں بنگلور میں، دن رات سیاسی تقریریں کرتے یا سیاسی مضامین لکھتے رہتے تھے کبھی نظر بند ہیں، کبھی عدالت میں ہیں، کبھی جیل میں ہیں تو کبھی سارے ملک کا دورہ کر رہے ہیں۔

علاوہ بریں ان کی توجہات تمام دنیائے اسلام پر مبذول رہتی تھیں۔ امیر لکھنوی کا یہ شعر

خنجر لگے کسی کے تڑپتے ہیں ہم امیر ۔۔۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

بیسویں صدی میں، اقبالؒ کے بعد اگر کسی مسلمان پر صادق آسکتا ہے تو وہ محمد علی تھے؛ کبھی فلسطین کے حال زار پر آنسو بہاتے تھے تو کبھی طرابلس کے شہیدوں پر نوحہ خوانی کرتے تھے۔ گولیاں مراقش کے مسلمانوں پر برستی تھیں لیکن ٹیس محمد علی کے جگر میں اٹھتی تھی: حصّے بخرے ترکوں کی سلطنت کے ہوتے تھے، دل محمد علی کا تڑپتا تھا۔

جس شخص کی مصروفیت کا یہ عالم ہو، صد ہزار استعجاب ہے کہ وہ شخص مسیحیت کے عقاید، اور کلیسا کی تاریخ، پر اس قدر مجتہدانہ نظر کیونکر اور کس وقت پیدا کر سکا؟

ناظرین اگر اسبات کو خود ستائی پر محمول نہ فرمائیں تو میں اس حقیقت کا اظہار کر دوں کہ موازنۂ مذاہب عالم، مدۃ العمر سے اس ہیچمدان کا خاص مضمون رہا ہے: ع عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں

لیکن بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ میں نے آج تک انگریزی زبان میں کسی ہندوستانی مسلمان کے قلم سے، ان پیچیدہ اور دقیق، غیر معروف اور خشک مسائل پر ایسا عالمانہ اور محققانہ تبصرہ نہیں پڑھا۔ مرحوم کی ژرف نگاہی اور بیان کو دیکھکر، بار بار دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے اپنی ساری عمر اسی موضوع کے مطالعہ میں بسر کی ہو گی لیکن ناظرین خوب جانتے ہیں کہ ان کی عمر عزیز جن مشاغل میں گذری، ان کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس موضوع پر ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔

سچ ہے وہ غیر معمولی دماغی قابلیت لے کر اس دنیا میں آئے تھے۔

ان کی روح پر اللہ تعالیٰ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں انہوں نے اپنی جادو بیانی اور بے نظیر قربانی سے سوئی ہوئی قوم کو جگا دیا: مولینائے مرحوم اپنی سرگذشت میں یوں رقمطراز ہیں:-

"اسی زمانہ (دسمبر ۱۹۱۸ء) میں، جبکہ میں زندگی بخش کتابوں کے مطالعہ کا تمنائی تھا، میرے دوست ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے اپنی دو مثنویاں اسرار خودی اور رموز بیخودی مجھے تحفۃً بھیجیں۔ میں اقبالؒ سے۔ جن کو اس نام سے ہندوستان کے لاکھوں وہ مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں جنہوں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ایک عرصہ سے واقف تھا، اور جب کبھی لاہور گیا، تو ان کی مہمان نوازی سے بہرہ اندوز ہوا، وہ لاہور میں وکالت کرتے تھے لیکن صرف اس قدر، جس سے قوت لایموت کا سامان مہیا ہو سکے تاکہ انہیں اتنا وقت مل جائے کہ وہ گوشۂ تنہائی میں آرام سے حقہ پی سکیں اور ادب، فلسفہ کا مطالعہ کر سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی الہامی شاعری کی بدولت مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑا سکیں اگرچہ ہندوستان کے بعض افراد، مجھ سے پہلے اقبالؒ کی عظمت فکر کا اعتراف کر چکے تھے لیکن یہ بات میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت ان کا بلند مقام مجھ پر منکشف ہو گیا اور ان کی منزلت میرے دل میں جاگزین ہو گئی، تو پھر میں نے تلافیٔ مافات کرنے میں کوئی دقیقہ یا لمحہ فروگزاشت نہیں کیا، اور ان کے کلام معجز نظام کے مطالعہ کو اپنی زندگی کا محبوب مشغلہ بنا لیا اور اس بات کا تہیہ کر لیا کہ ان کی کوئی تحریر میری نظر سے اوجھل نہ رہنے پائے۔ بلکہ میں نے اس امر کا بھی التزام کیا کہ اپنے اخباروں کے ذریعہ سے، ان کے پیغام کو عامۃ المسلمین سے روشناس کرا دوں۔ تاکہ وہ بھی اس مسرت میں میرے ساتھ شریک ہو سکیں جو ان کا کلام پڑھنے سے مجھے حاصل ہوتی تھی، میں کامریڈ اور ہمدرد میں، عموماً غالب اور میر کے اشعار درج کیا کرتا تھا اور ان اخباروں کے ناظرین اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس سے پہلے صحافت کے میدان میں کسی شخص نے مجھ سے زیادہ، ان دونوں کے اشعار کو پیش نہیں کیا، لیکن اب، اقبالؒ — جو غالب کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے، اس عزت میں ان کے ہمسر ہو گئے، میں نے کامریڈ کے صفحات کو ان کے افکار عالیہ سے مزین کرنا شروع کر دیا اور خود اقبالؒ نے بھی ہمدرد کے لئے

لہ میں نے آخری مرتبہ انہیں ۲۰ فروری ۱۹۲۸ء کو دیکھا تھا جبکہ وہ محترمی و مکرمی خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے خسر کی وفات پر رسم فاتحہ میں شرکت کے لئے مسجد درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں تشریف لائے تھے ۱۲

کئی دفعہ مضامین لکھ کر بھیجے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال بیسویں صدی میں احیائے ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں پنجاب کے اس منکسر المزاج عزلت پسند اور گوشہ نشین بیرسٹر سے بڑھ کر کسی شخص نے حصہ نہیں لیا۔ لاریب ملت اسلامیۂ ہندیہ اُن کے احسانات سے قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اقبالؒ کی شاعری اس قدر مقبول ہو چکی تھی کہ ان کا نام اسلامی ہند کے بچے بچے کی زبان پر تھا، اور میں بھی اُن کے کلام کا بہت گرویدہ تھا بلکہ شیدائی تھا لیکن میرے بڑے بھائی (شوکت علی) مجھ سے بڑھ کر اُن کے مداح اور عقیدت مند تھے چنانچہ وہ اپنی تقریروں میں، اقبالؒ کے اشعار نہایت جوش و خروش کے ساتھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے، اور میں اکثر اُن سے کہا کرتا تھا کہ آپ کی تقریروں کی ساری دلکشی کلام اقبالؒ پر منحصر ہوتی ہے: بہر حال جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اقبال کی یہ تازہ تصانیف فارسی زبان میں ہیں، تو انہوں نے تہیہ کیا کہ بچپن کی پڑھی ہوئی فارسی کو از سر نو تازہ کریں تاکہ ان مثنویوں سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکیں۔

پہلے ہم دونوں نے اسرار خودی شروع کی اور بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ اقبالؒ نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ، بانگ درا سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور چونکہ فارسی میں ہے اس لیے اس تصنیف کے پڑھنے والوں کا دائرہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی محیط ہو سکے گا۔ اقبال کی اردو شاعری میں آتش بیانی کا عنصر زیادہ تھا، اور جب ہم نے اس کتاب کو شروع کیا، تو ابتداءً ہمیں اس میں وہ گرمی نظر نہ آئی، لیکن جب ہم ابتدائی صفحات ختم کر چکے، اور خودی کی تشریح شروع ہوئی جہاں اقبالؒ نے اس لفظ کو اپنے افکار خصوصی کا لباس پہنایا ہے اور اس جگہ ہمیں اقبال ڈاکٹر آف فلاسفی کے رنگ میں نہیں بلکہ ایک حقیقی شاعر کے رنگ میں نظر آتے ہیں — تو ہمیں یہ محسوس ہوا کہ، اس فلسفیانہ نظم کے اندر بھی وہی آگ بھری ہوئی ہے — یعنی سنگ مرمر کی رگوں میں بھی ایک دریائے آتشیں بہہ رہا ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں جبکہ کامریڈ کی ضمانت کے سلسلہ میں، مجھے اکثر چیف کورٹ لاہور میں، پیروی کے لئے جانا پڑتا تھا، میں نے اس مثنوی کے جستہ جستہ مقامات خود اقبالؒ کی زبان سے سُنے تھے، لیکن جس طرح قرآن مجید کو پہلی مرتبہ پڑھنے کے بعد مجھے اس کے

وفات غالب ۱۸۶۹ء۔ ولادت اقبالؒ ۱۸۷۳ء۔

مطالب پر وقوف حاصل نہیں ہو سکا تھا، اسی طرح میں پہلی مرتبہ اس کتاب کے متفرق اشعار کو سُنکر، اس کے حقائق سے آگاہ نہ ہو سکا، اب جو اس تنہائی میں از اول تا آخر غور کے ساتھ پڑھا تو مصنف کا پورا نظامِ فکر میرے ذہن میں جلوہ گر ہو گیا، اور یہ دیکھکر میری روح رقص کرنے لگی کہ اقبالؒ نے اپنے خاص انداز میں، اسلام کی بنیادی صداقت کی وہی تصویر کھینچی ہے، جس کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں موجود تھے۔ اس موقع پر اس امر کی صراحت لازمی ہے کہ اسلامی مذہبی ادب میں یہ بات کہ اسلام کا مطلب، خدا کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے، اور وہ اس کائنات کا حاکمِ اعلیٰ ہے، بطور حقیقتِ ثابتہ مسلّم تھی، اسی لئے علمائے اسلام نے، اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تھا اور عامۃ المسلمین اس صداقت کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھ کر اُس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے حالانکہ دراصل ہم اس کی قدر کے صحیح انداز سے بالکل بیگانہ تھے۔ کیونکہ اس کی حقیقت تحت الشعور کے پردہ میں پوشیدہ ہو چکی تھی۔ اور اس کو واضح کرنے اور اس کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے، اس پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت تھی۔ پس اگر عصرِ حاضر کے مسلمان مقصدِ حیات سے آگاہ ہونا، اور سچی اسلامی زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں تو انہیں اپنا زاویۂ نگاہ بدلنا پڑے گا۔ یہ تھی وہ زبردست حقیقت، جو مجھ پر قرآن کے مطالعہ سے ایک حد تک منکشف ہو چکی تھی اور اقبالؒ نے اس مثنوی میں، اسی حقیقتِ کبریٰ کو اپنی شاعری کی پوری قوت کے ساتھ، مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے، بلکہ انہوں نے اسلامی ذہنیت کے دروازہ پر دستک دی ہے تاکہ اسلام کا پیش کردہ تصور حکومتِ الٰہیہ، مسلمانوں کے دماغ میں از سرِ نو جاگزیں ہو سکے۔

توحید کی عظمت اور اس کی قیمت کا صحیح احساس کرنے کی جس قدر اشد ضرورت ہماری قوم کو تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ نے، رموزِ بیخودی کے آخر میں یہ بات قسم کھا کر بیان کی ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ تمام کا تمام، قرآن مجید پر مبنی ہے، اور فلسفۂ مغرب سے اُسے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جیسا نام نہاد علماء نے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

اسرارِ خودی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اذہان کو تمام فاسد اور غیر اسلامی تصورات سے پاک کر دے،

اس کے بعد رموزِ بیخودی کا کام یہ قرار پایا کہ وہ ان کو صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی دعوت دے۔ یہ مثنوی اپنے مطالب کے لحاظ سے اس قدر واضح اور سلیس ہے کہ موٹی سمجھ کا آدمی بھی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

اقبال کی نظر میں وہ زندگی، جس کے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو، بالکل مہمل اور بے حقیقت ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے۔ اور دنیا میں خلافتِ الٰہیہ کے قیام سے، اللہ تعالیٰ کی غرض بھی یہی ہے کہ انسان اسرارِ خودی سے آگاہ ہو سکے اور جب ایک شخص مشیئتِ ایزدی کو اپنا مطمعِ نظر بنا لے اور اپنے مقصدِ حیات کو اس کے سانچے میں ڈھال لے، تو پھر وہ تمام رکاوٹیں جو کامیابی کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں یک قلم کافور ہو جاتی ہیں۔ انسان جب خودی کے اسرارِ نہاں سے واقف ہو جاتا ہے اور مخفی قوتوں کو اپنی تکمیل کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے، تو گویا وہ تمام اوہامِ باطلہ کے طلسم کو پاش پاش کر دیتا ہے، اور زندگی کی متضاد قوتوں کی باہمی کشاکش ختم ہو کر اس کو وہ طمانیت حاصل ہو جاتی ہے جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔

واضح ہو کہ "اسلامی تعلیمات اور ضابطۂ اخلاق کی تفسیر کے سلسلہ میں اقبالؒ نے بھی وطنیت اور قومیت کے اس ناپاک عقیدہ کی اچھی طرح مذمت کی ہے، جس کا داعیہ یہ ہے کہ انسانی ہمدردیوں کا دائرہ تنگ جغرافیائی حدود میں محدود ہو جائے اور انسان، انسان کا دشمن بن جائے۔"

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے | رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۶ و ۷	جون و جولائی ۱۹۴۲ء	عدد ۶ و ۱

سخنہائے گفتنی — پروفیسر یوسف سلیم چشتی بریلوی — ۲

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت — از ولیم ہنٹر (مترجمہ) ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس لاہور — ۱۷

سید محمد شاہ ایم۔اے پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے دین محمدی پریس بیرون اکبری گیٹ میں طبع کراکے
دفتر "پیغام حق" ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اگرچہ اپنی مخصوص سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہندو آئے دن، یہ کہکر دنیا کو مبتلائے فریب کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم آباد ہے لیکن کبھی کبھی ان کی زبان سے غیر شعوری طور پر حقیقت کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پچھلے مہینہ جب لاہور میں ہندوؤں نے ٹیگور میموریل لائبریری کا افتتاح کیا، تو افتتاحی رسم ادا کرتے وقت، آنریبل مسٹر این ار سرکار نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔

"ہمارے لئے ٹیگور محض ایک شاعر ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہمارا رہنما فلاسفر اور دانش آموز بھی ہے، ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ میں۔ ادبیات، فنون لطیفہ، عمرانی اور سیاسی فلسفہ میں۔ ہماری قوم کا مہا پروہت بھی ہے اس کا فلسفہ، ہمارے تمام تخیلات کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے آدمیوں مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے بلا سبب تو اس کو "اپنا گرودیو" تسلیم نہیں کیا؟ بلاشبہ وہ سچے معنوں ہماری قوم کا گرودیو ہے" (منقول از ٹریبیون مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ٹیگور کو "اپنا گرودیو" تسلیم نہیں کرتے اور نہ اُسے اپنی قوم کا "مہا پروہت" مانتے ہیں لہذا صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب مسٹر سرکار نے "ہماری قوم" کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے تو اس وقت اُن کے ذہن میں ہندو قوم مراد تھی۔ ہندوستان کی جملہ اقوام مراد نہ تھیں کیونکہ ٹیگور کو "گرودیو" کہنا، صرف اس قوم کے خیالات کی ترجمانی ہو سکتی ہے جو انہیں ایسا سمجھتی ہے اور جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں مسلمان ٹیگور کو اپنا گرودیو، ہرگز نہیں سمجھتے۔ پس ہماری قوم سے صرف ہندو قوم مراد ہو سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔

کاش ہندو قوم اس حقیقت کو سیاسیات میں بھی باریابی کا موقع دے سکے تاکہ اس برِّ اعظم کی گتھی جلد سلجھ سکے ۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے متعدد موقعوں پر اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ اس برِّ اعظم کے مخصوص اور پیچیدہ حالات کی موجودگی میں مغربی طرز کی جمہوری حکومت (ڈیماکریسی) یہاں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اولاً، مغرب کا جمہوری نظام یوں بھی کوئی پسندیدہ شے نہیں کیونکہ حکیم الامتہ رح فرماتے ہیں۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ثانیاً یہ طرز حکومت وہاں کسی حد تک کارآمد ہو سکتی ہے جہاں اقلیت اور اکثریت کی بنیاد محض سیاست ہو مذہب نہو۔ لیکن ہندوستان کے حالات بالکل مختلف ہیں، یہاں کم از کم دو قومیں آباد ہیں، ہندو اور مسلمان۔ ہندو مستقل اکثریت میں ہیں اور مسلمان مستقل اقلیت ہیں، یعنی اگر ہندوستان میں مرکزی حکومت قائم ہو جائے تو مسلمان سیاسی اکثریت کے نحت نہیں ہوں گے بلکہ مذہبی اکثریت کے، جو کسی اقلیت میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح یورپین ممالک میں سیاسی اکثریت کا حال ہے جب تک سارے ہندو مسلمان نہ ہو جائیں یا سارے مسلمان کافر نہ بنجائیں، سیاسی اکثریت، ایک مذہبی اکثریت ہی ہوگی جو دوسری مذہبی اقلیت پر حکومت کرے گی۔ اور اس طرح وہ اقلیت رفتہ رفتہ اپنے مذہب اور تمدن، اپنی تہذیب اور زبان غرضکہ ہر اس شے سے جو اُسے عزیز ہے، بیگانہ ہو جائے گی۔

اپنے ۲½ سالہ عہد حکومت میں، اس مذہبی اکثریت نے، سیاسی اکثریت کے پردہ میں سی۔ پی۔ یو۔ پی اور بہار کی مذہبی اقلیت پر جو مظالم روا رکھے، اور اُس کی زبان، تہذیب، اور ملی روایات کو فنا کرنے کی جو ناپاک کوششیں کیں، وہ تاریخ ہند کا تاریک ترین صفحہ ہے جس کی یاد مسلمانوں کے قلوب کو ہمیشہ مجروح کرتی رہے گی۔

اس لئے قائد اعظم کا فیصلہ (یعنی ملت اسلامیہ کا فیصلہ) یہ ہے کہ ہم مرکز یا مرکزی حکومت گوارا نہیں کریں گے کیونکہ وحدانی طرز حکومت میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو اقلیت کا درجہ دیا جائے گا اور سیاسی اکثریت دراصل خالص ہندو اکثریت ہو گی، جو مسلمانوں سے محمود غزنوی کے زمانہ کا انتقام لے گی۔ اور یورپین ممالک کی طرح، اس سیاسی اکثریت کے، اقلیت میں مبدل ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ یہ سیاسی اکثریت مذہبی اکثریت بھی تو ہے ۔

اس لئے یا تو مرکز بالکل نہ ہو یا اگر ہو تو مسلمان قوم کو ہندو قوم کے برابر حقوق ملیں۔

یہ نکتہ ہندو کی سمجھ میں تو ابھی تک آیا نہیں، اور آئے بھی کیسے؟ اس نکتہ نے تو اس کی مدتوں کی مخفی آرزوں پر پانی پھیر دینے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے ہاں انگریز مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ کو سمجھنے لگا ہے اور اس کے زاویۂ نگاہ میں یہ تبدیلی، قائد اعظم کی سیاسی بصیرت اور مدبرانہ روش کی ایک بین دلیل ہے۔

گزشتہ ماہ سر جارج شسٹر نے، جو چھ سال تک وائسرائے کی مجلس عاملہ میں بحیثیت رکن مالیات کام کر چکے ہیں، کرپس مشن کی ناکامی پر اظہار خیالات کے سلسلہ میں، اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اس وقت مدبرین برطانیہ کے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ ہندوستان کو حکومت دی جائے یا نہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ ایسی جمہوری حکومت کس طرح قائم کی جائے جو ہندوستان جیسے ملک میں نافذ ہو سکے، جہاں ایک قوم آباد نہیں ہے، بلکہ ایک سے زیادہ قومیں پائی جاتی ہیں جن میں شدید نسلی، مذہبی اور تمدنی اختلافات پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ لازمی طور سے یہ ہوگا کہ محض اکثریت کی حکومت، ایک قوم کی اکثریت کی حکومت نہیں ہوگی بلکہ ایک مذہبی اکثریت کی دوسری مذہبی اقلیت پر حکومت ہوگی" (ٹرہبون مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء)

ہم بھی سر جارج سے اس معاملہ میں متفق ہیں کہ جمہوری طرز حکومت اس ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتی، جہاں اکثریت اور اقلیت، سیاسیات کے بجائے، مذہب پر مبنی ہوں، بالفاظ دگر جہاں دو مختلف قومیں آباد ہوں جن کے مذہب، معاشرت، تمدن، اخلاق اور افکار میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہو۔ پس اس گتھی کے سلجھانے کی صرف ایک ہی صورت ہے جو قائد اعظم بالقابہ نے نہایت سنجیدگی اور وضاحت کے ساتھ ہندو اور انگریز دونوں کے سامنے پیش کر دی ہے یعنی چونکہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں اس لئے اس براعظم کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ ان میں وہ حکومت کریں اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں وہ حکومت کریں۔

کوئی مفاہمت کامیاب اور پایدار نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیاد اس حقیقت پر نہ رکھی جائے گی کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں مسٹر ایمری سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر راجگوپال اچاریہ نے مختلف الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے اور خدا کو منظور ہوا تو ایک دن کانگرس بھی اس صداقت کبریٰ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گی اور اسی دن یہ ملک آزاد ہو جائے گا۔ مفروضہ "ہندوستانی قوم" کا طلسم تو ٹوٹ چکا ہے لیکن ویدانتی مثالیت (VEDANTIC IDEALISM) کی آغوش میں پروردہ قوم کو حقیقت سے دوچار

ہونے میں ابھی کچھ اور مدت لگے گی۔ محبوب تخیلات خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، ایک لحنت دماغ سے نہیں نکل سکتے۔

۱۸۸۵ء میں جب ایک برطانوی ریٹائرڈ آفیسر کے دست ابیض سے کانگریس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، تو اس جماعت کے قیام کا بنیادی اصول یہ قرار دیا گیا تھا، کہ "اُن مختلف متضاد اور مخالف عناصر کو، جن سے اس ملک کی آبادی مرکب ہے، ایک قوم کے سانچہ میں ڈھالا جائے"۔

دنیا جانتی ہے کہ کانگریس اس مقصد میں بُری طرح ناکام رہی بلکہ کانگریس کے ارباب لبست وکشاد نے اپنی خالص آریہ سماجی ذہنیت کی بنا پر جس کی ادنیٰ سی جھلک کانگریسی "مدینہ" کو بھی سمپورنانندی ہندی میں نظر آگئی تھی، اُس اختلاف کو جو ہندو اور مسلمان کے درمیان فطری طور پر موجود تھا اور ہے، اور بھی شدید کر دیا۔

دنیا جانتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں اور جب تک سارے ہندو کلمہ طیبہ کا اقرار نہ کریں، ان کے ایک ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے لیکن اس حقیقت ثابتہ کے باوجود ٹریبون کی صداقت شعاری اور حقائق نگاری ملاحظہ ہو کہ وہ ۱۹۴۲ء میں بھی "متحدہ قومیت" یا "ایک ہندی قوم" کا راگ الاپ رہا ہے۔ جب میں ہندو اخبارات میں اس قسم کے مغالطہ آمیز اور شرارت انگیز الفاظ اور تصورات کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے بہت رنج ہوتا ہے۔ رنج اس لئے نہیں ہوتا کہ ہندو اخبارات غلط بیانی اور فریب دہی کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ اس موجودہ زمانہ کی آغوش میں بھی دقیانوسی خیالات کے لوگ ابھی تک زندہ ہیں، جو صحافت کے مدعی ہونے کے باوجود افکار عصریہ سے بے خبر ہیں جو مسلمانوں میں رہنے کے باوجود انکے تصورات سے ناآشنا ہیں!

ہم بارہ سال سے شب و روز اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ہندی مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں کیونکہ وہ تمام لوازم، جو کسی انسانی جماعت کو ایک قوم بنا سکتے ہیں، سب ہمارے اندر موجود ہیں۔

ہم بارہ سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں کہ "متحدہ قومیت" کے سمندر میں غرق ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں، ہم اپنی ملی ہستی کو کسی ہندی قوم کی اجتماعی ہستی میں مدغم نہیں کر سکتے۔

ان حقائق کے باوجود ٹریبون نہایت اطمینان کے ساتھ لکھتا ہے کہ "کانگریس مسٹر جناح کے ساتھ کس طرح تعاون کر سکتی ہے جبکہ وہ "انڈین نیشن" کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں؟" ۲۵ اپریل ۴۲ء

گویا ٹیپوؤں کی نظر میں "ہندوستانی قوم" ہندوستان میں موجود ہے! واقعی مسٹر جناح کا یہ جرم ناقابل معافی ہے کہ وہ معدوم کو موجود اور نیست کو ہست کیوں نہیں کہتے۔

تعجب اگر ہے تو پنڈت جواہر لال نہرو کی ذہنیت پر ہے کہ مذہب فی الواقع موجود ہے لیکن انہیں دکھ ہوتا ہے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف مذاہب کے پیرو ہیں اور "ہندی قوم" معدوم ہے اس کے باوجود انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص اس صریح غلط بیانی کا ارتکاب کرتا ہے ؏

لبسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مسٹر راجگوپال اچاریہ سابق وزیر اعظم مدراس کی اخلاقی جرأت قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کا صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے ہمیں ان کے قومی مطالبہ کو تسلیم کر لینا چاہئے" یعنی "اگر وہ علیحدگی پر مصر ہیں تو ان کے اس حق کی معقولیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہئے"۔

جب راجہ جی کا یہ ریزولیوشن، آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوا تو پندرہ ارکان نے اس کی تائید کی اور اگرچہ یہ تجویز بالآخر مسترد ہو گئی لیکن ہمیں اتنا تو معلوم ہو گیا کہ کانگرس میں کچھ صاحب بصیرت افراد بھی موجود ہیں۔ نیز راجہ جی نے اپنی تقریر میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ میری تجویز، کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دہلی ریزولیوشن کے خلاف نہیں ہے جس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ "ورکنگ کمیٹی کسی علاقہ کے باشندوں کو اس امر پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف "انڈین یونین" میں شامل ہوں نیز مہاتما گاندھی نے بھی ہریجن میں اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ اگر مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت کا فیصلہ یہ ہے کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت، ان کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ ایسا نہ سمجھیں"۔

اب ضمناً مسلم لیگ یا ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کا فیصلہ بھی سامنے رکھ لیجئے تا کہ راجہ جی کے ریزولیوشن کی معقولیت واضح ہو سکے:۔

(۱) ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔

(۲) ہم، ہندوستان کے لئے مغربی طرز کی دستوری جمہوری حکومت پسند نہیں کرتے کیونکہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہو گی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی میں آ جائیں گے۔

(۳) اس لئے ہم مسلمان انڈین یونین میں شامل نہیں ہوں گے بلکہ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے ان میں ہم مرکز سے آزاد رہکر حکومت کریں گے اور اپنی یونین علیحدہ بنائیں گے۔

(۴) اگر ہمارے اس (SELF DETERMINATION) حق خود اختیاری سے ہندوستان کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو ہمیں اس کی مطلق پرواہ نہیں کیونکہ ملت کا مفاد، ہندوستان کے مزعومہ اور مفروضہ مفاد پر مقدم ہے۔

اس آخری فقرہ کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھئے کہ اگر ہندو اپنے مفاد کے مقابلہ میں، مسلمانوں کی وحدت ملی کی، جو ایک حقیقت ثابتہ ہے، کوئی پرواہ نہیں کرتے تو ہم اپنے مفاد کے مقابلہ میں، ہندوستان کی وحدت کی، جو محض ایک اعتباری شے ہے، کیوں پرواہ کریں ہندوستان ہم سے ہے نہ کہ ہم ہندوستان سے، جب ملت فنا ہو گئی تو پھر ہندوستان کا عدم اور وجود یکساں ہے۔

راجہ جی کے ریزولیوشن کی مخالفت تو یقینی تھی لیکن مخالفین نے اپنی جوابی تقریروں میں جس منطقی افلاس اور فراوانی مغالطات اور فقدان استدلال کا مظاہرہ کیا وہ واقعی قابل افسوس ہے۔ ان تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کے پاس اچھے ہتھیار دغا بازیوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا ذیل میں ان تقریروں کے بعض اہم اقتباسات درج کر کے ان پر تنقیدی نظر ڈالتا ہوں تاکہ میرے دعاوی پر شواہد مہیا ہو سکیں:۔

(۱) ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر کانگرس) نے فرمایا۔

"مسلم لیگ کا مطالبہ سراسر مبہم ہے۔۔۔ میں نے مسٹر جناح سے درخواست کی تھی کہ اپنے مطالبہ کی تفصیلات سے مطلع کیجئے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔۔۔ ہندوستان ایک وحدت ہے اور قدیم الایام سے ایک وحدت رہا ہے، اس لئے اس وحدت کو پارہ پارہ نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ مسلمانوں کے خلاف ہم نے کوئی منصوبہ اپنے دل میں نہیں باندھا ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہندوستان میں تیسرا فریق موجود ہے اور وہ ہم دونوں کے درمیان فرقہ وارانہ منافرت کی آگ کو ہوا دے رہا ہے۔۔۔ پاکستان نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے نہ ہندوؤں کے لئے اور نہ ہندوستان کے لئے۔ پاکستان کوئی کھلونا نہیں جسے کسی روتے ہوئے بچہ کے ہاتھ میں دے دیا جائے بلکہ موت اور زندگی کا سوال ہے" ۲ مئی ۱۹۴۲ء۔

یہ اقتباسات سرتاپا، غلط بیانی اور مغالطات سے لبریز ہیں۔

(۱) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "پاکستان کا مطالبہ مبہم ہے" اگر یہ مطالبہ واقعی مبہم اور غیر واضح ہے تو پھر ڈاکٹر صاحب نے کس

طرح کہہ سکتے ہیں کہ "پاکستان مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے"؟ ان کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ "پاکستان کوئی کھلونا نہیں ہے"؟ انہوں نے یہ فیصلہ کیونکر صادر کر دیا کہ "وہ موت اور زندگی کا سوال ہے"؟

ناظرین انصاف کریں کیا ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنے قول کی تردید نہیں کر دی؟ اگر وہ ابھی تک یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسٹر جناح کا مطالبہ کیا ہے تو اس پر ایک نہیں بلکہ تین فیصلے کس طرح صادر کر سکے؟ پس معلوم ہوا کہ یا تو ان کا پہلا قول سراسر غلط ہے یا تینوں فیصلے سراپا غلط ہیں۔

(۲) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "میں نے مسٹر جناح کو لکھا کہ اس کی تفصیلات سے آگاہ کیجئے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا" میں کہتا ہوں مسٹر جناح نے بالکل ٹھیک کیا، ڈاکٹر صاحب کے اس خط کے جواب میں قائد اعظم نے وہی لکھا جو ایک منطقی انسان کو لکھنا چاہیئے تھا یعنی یہ کہ پہلے تقسیم ہند کے بنیادی اصول کو تسلیم کر دیا اس پر بحث کر دو۔ اگر تم عقلی، تاریخی اور سیاسی دلائل سے لیگ کے اس بنیادی مطالبہ کو ناواجب ثابت کر دو تو جزئیات سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہیں کر سکتے تو پھر ایک معقولیت پسند انسان کی طرح، لیگ کے معقول مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اس کے بعد تفصیلات پیش کر دی جائیں گی۔

فرض کیجئے راجن بابو مسٹر مصر سے یہ کہتے ہیں کہ اپنی لڑکی کی شادی میرے لڑکے کے ساتھ کر دیجئے، جو ایسا ایسا ہے، اس قدر تعلیم ہے، اسقدر تنخواہ ہے، یہ خیالات ہیں، یہ مزاج ہے، ایسی صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر مسٹر مصرا، اُن کو یہ لکھیں کہ۔

(۱) آپ کا لڑکا کس قسم کا لباس پہن کر آئے گا؟ (ب) آپ ریل سے آئیں گے یا لاری سے؟

(ج) باجہ، انگریزی ساخت کا ہو گا یا دیسی؟ (د) برات کتنے دن قیام کرے گی؟

(ہ) آپ میز پر کھانا کھائیں گے یا چٹائی پر؟ (و) کھانے میں آلو اور مٹر ہو گی یا نہیں؟

تو کیا راجن بابو اس کے جواب میں اپنے دوست کو یہ نہیں لکھیں گے کہ بندۂ خدا پہلے یہ تو بتاؤ کہ رشتہ بھی منظور ہے یا نہیں؟ فرض کرو میں تمہیں یہ تمام تفصیلات لکھ بھیجوں اور تم اس کے بعد انکار کر دو تو کیا میرا وہ تمام بیان، فضول اور لغو قرار نہ پائے گا؟

دنیا کا قاعدہ ہے کہ پہلے اصول طے کئے جاتے ہیں، جزئیات اور تفصیلات کا نمبر بعد میں آتا ہے۔

بعینہ یہی پوزیشن راجن بابو کی ہے۔ انہیں سب سے پہلے یہ بتانا چاہیئے کہ تقسیم ہند کا اصول منظور ہے یا نہیں؟ اُن کو

عقلاً اور عرفاً اور قانوناً ہر طرح حق حاصل ہے کہ وہ اس اصول کے ما لہ و ما علیہ پر بحث کریں، اور اگر ہو سکے تو اس بنیادی اصول کو بدلائل عقلیہ رد کر دیں وہ ہم سے پوچھ سکتے ہیں کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ اور ہم اس کا جواب بخوشی دیں گے بلکہ دو سال سے لگاتار اس کا جواب دے رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور اس لئے من حیث القوم کسی دوسری قوم کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اب راجن بابو کا فرض یہ ہے کہ وہ بدلائل عقلیہ یہ ثابت کریں کہ (۱) مسلمان ایک جداگانہ قوم نہیں ہیں اور (۲) اس لئے وہ آئینی طور پر تقسیم ہند کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

اس فرض سے تو وہ عہدہ برا ہو نہ سکے، اور نہ ہو سکتے ہیں، فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ راجن بابو ایک قابل وکیل ہیں، اس کے باوجود ان کی نگاہ امور تنقیح طلب تک نہیں پہنچ سکتی۔ فروعات میں الجھی ہوئی ہے سب سے پہلے جس چیز کا فیصلہ ہونا چاہئے وہ یہ نہیں کہ پاکستان میں بدھ کے دن لوگ انڈے کھائینگے یا آلو؟ بلکہ یہ کہ تقسیم ہند کا اصول منظور ہے یا نہیں؟

ہمارا مطالبہ تو اس قدر واضح ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اور منطق اُسے رد نہیں کر سکتی۔ ہمارا اصول اس قدر صحیح ہے کہ مسٹر ایمرے، سر جارج شسٹر، وائسرائے، گاندھی، کانگرس ورکنگ کمیٹی کا دہلی ریزولیوشن، راجگوپال اچاریہ، ایم این رائے، سر چمن لال ستیلواد، ڈاکٹر محمود، میاں افتخار الدین، اور سر سٹیفورڈ کرپس تک اُسے صحیح تسلیم کر چکے ہیں۔ اور تو اور جمعیتہ العلماء کے صدر بھی صاف لفظوں میں اعلان کر چکے ہیں کہ دس کروڑ مسلمانوں کو ایک اقلیت سمجھنا بیسویں صدی کا سب سے بڑا FRAUD (فریب) ہے دنیا کی کوئی طاقت، دس کروڑ نفوس کی قوم کو کسی منطق اور کسی آئین کی رو سے مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی قسمت، اس بر اعظم کی دوسری کسی قوم کے حوالہ کر دیں۔ یا بالفاظ واضح تر ہندوؤں کے غلام بن کر رہیں۔ ریت میں سے تیل نکل سکتا ہے اور خرگوش کا سینگ مل سکتا ہے لیکن، ہندوستان کا مسلمان ہندو کے رحم پر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہم صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں کہ ہم نہ انگریز کی غلامی گوارا کریں گے نہ ہندو کی۔ اگر ایک قوم دوسری قوم کی غلام ہو سکتی ہے تو، ہندو انگریز کی غلامی سے کیوں نکلنا چاہتا ہے اگر ہندو کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزادی حاصل کر

کرے، تو مسلمان کو یہ حق کیوں حاصل نہیں؟ ہندوؤں کو لازم ہے کہ وہ "ایک قوم" یا "ہندوستانی قوم" یا "متحدہ قومیت" کے مہمل اور غلط تصورات کو یک قلم دماغ سے نکال دیں: یہ طلسم اب ہمیشہ کے لئے باطل ہو چکا ہے

(۳) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "ہندوستان ایک وحدت ہے اور قدیم الایام سے ایک وحدت رہا ہے اس لئے اس وحدت کو پارہ پارہ نہیں کیا جاسکتا" میں کہتا ہوں یہ قول بھی بالکل غلط ہے اور تاریخ ہند سے محض عدم واقفیت ہی کا ثبوت نہیں بلکہ فریب دینے کی ایک سعی لاحاصل بھی ہے۔ حضرات راجن بابو جواہر لال و دیگر اکابر کانگرس کی آگاہی کے واسطے ذیل میں ایک مختصر تاریخی نقشہ پیش کرتا ہوں جس کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کبھی جغرافیائی حدود کے لحاظ سے ایک ملک نہیں رہا اور اس کی وحدت کا دعویٰ، بیسویں صدی کا دوسرا بڑا فریب ہے۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں اور لیگ کی مخالفت میں عقل و خرد کے علاوہ تاریخ سے بھی بیگانہ ہو گئے ہیں!

آن فلاطون سادی باطل پرست سرمۂ او دیدہ مردم شکست (اقبالؒ)

(ا) چوتھی صدی قبل مسیح میں موجودہ پنجاب۔ کشمیر۔ سرحد اور سندھ چاروں صوبے، "اکھنڈ بھارت" سے منقطع ہو کر سکندر اعظم کی سلطنت میں شامل ہو گئے اور بھارت ماتا "ستلج" تک رہ گئی۔

(ب) تیسری صدی ق م میں، اشوک نے ان صوبوں کے علاوہ افغانستان اور بلوچستان بھی فتح کر لیا، یعنی یہ دو ملک بھی ہندوستان میں شامل ہو گئے۔

(ج) دوسری صدی عیسوی میں کنشک نے دریائے جیحون سے لیکر مالوہ اور دریائے نربدا تک سارا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب اگر اس کو ہندوستان کا بادشاہ قرار دیا جائے تو بھارت ماتا کی حدود ترکستان تک وسیع ہو گئیں اور اگر اس کو وسط ایشیا کا حکمران تسلیم کیا جائے تو بھارت ماتا نصف رہ گئی۔

(د) چوتھی صدی میں کنشک کی حکومت کے حصے بخرے ہو گئے، ترکستان، افغانستان، بلوچستان تینوں میں علیحدہ علیحدہ مستقل حکومتیں قائم ہو گئیں یعنی بھارت ماتا، دریائے سندھ تک رہ گئی۔

(ہ) چھٹی صدی عیسوی میں (WHITE HUNS) نے دریائے نربدا اور دریائے جمنا تک ہندوستان کا علاقہ اپنی

سلطنت میں شامل کر لیا یعنی بھارت ماتا پھر سکڑ کر آدھی رہ گئی۔

(و) ساتویں صدی میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد دریائے سندھ تک پہنچ گئی یعنی پنجاب پھر ہندوستان میں شامل ہو گیا۔

(ز) گیارہویں صدی میں پنجاب سرحد اور کشمیر تینوں صوبے پھر ہندوستان سے علیحدہ ہو کر دولت غزنویہ کے صوبے بن گئے۔

(ح) تیرہویں صدی سنہ ۱۲۱۱ء میں پنجاب کشمیر اور سرحد پھر ہندوستان میں شامل ہو گئے اور بھارت ماتا دریائے سندھ تک پھیل گئی۔

(ط) چودہویں صدی سنہ ۱۳۱۸ء میں تاریخی اعتبار سے پہلی مرتبہ ہندوستان از دریائے سندھ تا دریائے کاویری ایک ملک بنا۔

(ی) لیکن اسی صدی کے آخر میں بھارت ماتا پھر بہت آزاد حکومتوں میں منقسم ہو گئی اور اس کی مفروضہ اور مزعومہ وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

(ک) پندرہویں اور سولہویں صدی میں بھی اس ملک کی وحدت مفقود تھی۔

(ل) سترہویں صدی کے آغاز میں سنہ ۱۶۰۵ء پھر شمالی ہندوستان ایک ملک بن گیا بلکہ افغانستان بھی "بھارت ماتا" کا ایک صوبہ تھا لیکن دکن میں پانچ آزاد حکومتیں موجود تھیں گویا دکن یا جنوبی ہند بھارت ماتا سے علیحدہ تھا۔ ہندوستان کی جنوبی سرحد احمد نگر تھی نہ کہ راس کماری

(م) اٹھارہویں صدی کے آغاز میں، ہندوستان، دوسری مرتبہ ایک ملک بنا لیکن شمالی سرحد بلخ تھی نہ کہ پشاور۔

(ن) اس صدی کے وسط میں، پنجاب کشمیر سندھ اور سرحد، چاروں صوبے پھر ہندوستان سے علیحدہ ہو کر سلطنت افغانستان کا جز بن گئے یعنی بھارت ماتا پھر سکڑ کر رہ گئی۔

(س) اور یہ حالت اس صدی کے آخر تک قائم رہی سہارنپور اور پانی پت تک زماں شاہ کی حکومت تھی۔

(ع) انیسویں صدی کے آغاز میں، بھارت ماتا، پھر پشاور تک وسیع ہو گئی لیکن کشمیر پھر بھی ہندوستان یا اکھنڈ بھارت سے خارج تھا

(ف) اس صدی کے وسط میں، آسام، اراکان اور تناسرم، ہندوستان میں شامل ہو گئے یعنی بھارت ماتا مشرق میں قدرے پھیل گئی۔

(ص) اس صدی کے آخر میں برما بھی ہندوستان میں شامل ہو گیا۔

(ق) بیسویں صدی کے آغاز میں سارا ہندوستان مع برما تیسری مرتبہ ملک بنا، اور اس مرتبہ اس کی وسعت انگریزوں کی مرہون منت تھی۔

(ر) سنہ ۱۹۳۷ء میں برما بھارت ماتا سے جدا ہو گیا۔

اگر انگریز نیپال اور افغانستان فتح کر لیتے تو شاید، ہمارے دوست، آج ان کو اکھنڈ بھارت ہی کہتے

ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ ہندوستان کی "وحدت" نہ قدرتی ہے نہ جغرافیائی نہ مذہبی نہ ثقافتی بلکہ محض ایک امر اتفاقی ہے۔ جہاں تک انگریزوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا، وہاں تک، ہندو آج "بھارت ماتا" قرار دے رہے ہیں پس ہندوستان کی وحدت ایک فرضی اور خیالی شے (MYTH) ہے۔

شمال مغربی صوبے دس مرتبہ ہندوستان سے جدا ہوئے اور دس مرتبہ اس میں شامل ہوئے۔ لہذا اگر یہ علاقہ پھر ہندوستان سے علیحدہ ہو جائے تو کون سی قیامت برپا ہو جائے گی؟

علاوہ بریں، ہم ہندوؤں سے ایک سوال کرتے ہیں:- اگر تم، اپنے مفاد کے مقابلہ میں، مسلمانوں کی وحدت، کی پرواہ نہیں کرتے جو ایک امر واقعی ہے تو ہم اپنے مفاد کے مقابلہ میں ہندوستان کی وحدت کی پرواہ کیوں کریں جو ایک امر مفروضہ ہے؟

مسلمانوں کا ملی مفاد اس امر پر منحصر ہے کہ، وہاں صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے، اپنی آزاد حکومتیں قائم کریں تاکہ وہ اپنے منشاء کے مطابق زندگی بسر کریں اور اپنی تہذیب اور ثقافت کو ترقی دے سکیں اگر اُن کے اس فعل سے ہندوستان کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو بجوئے نمی ارزد۔ مقدم اور اہم شے ملک نہیں ہے بلکہ ملت ہے اگر اس ملک کی "وحدت" قائم رکھنے میں، ملت اسلامیہ کو خسارہ ہو تو ہم ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ اس مفروضہ وحدت کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ یا اس کوشش میں جان دے دیں گے۔ اغیار کی غلامی سے (خواہ وہ ہندو ہوں یا انگریز) موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ سنو حکیم الامتؒ کیا فرماتے ہیں۔

کھول کے کیا بیاں کروں سرّ مقام مرگ و عشق	عشق ہے مرگ باشرف، مرگ حیات بے شرف

پس ہندوؤں اور خصوصاً راجی بابو اور نہرو کو حقائق کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش اب بالکل بے کار ہے

(۴) ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، "مسلمانوں کے خلاف ہم نے کوئی منصوبہ اپنے دل میں نہیں باندھا ہے" میرا یہ خیال ہے کہ بیسویں صدی میں کسی قوم کو فریب دینے کی اس سے بڑی کوشش آج تک نہیں کی گئی اور غلط بیانی کے لحاظ سے تو یہ فقرہ صاحب موصوف کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں اس قول کی تردید میں ایک کتاب لکھ سکتا ہوں لیکن سردست صرف چند سوالات دریافت کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(ا) کیا، کانگرس کا مسلمانوں سے یہ کہنا کہ اپنے مذہب کو ملکی سیاست سے جدا رکھو، اُن کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی نہیں ہے؟ جبکہ کانگرس اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام، مذہب و سیاست دونوں کے مجموعہ کا نام ہے

(ب) کیا کانگرس کا مسلمانوں سے یہ کہنا کہ اجتماعی حیثیت سے نہیں بلکہ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں داخل ہو، اُن کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی نہیں ہے؟ جبکہ ارباب کانگرس اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں (اقبالؒ)

"لا اسلام الا بالجماعہ من شذّ شُذّ فی النار" (حضرت عمرؓ)

(ج) کیا پنڈت جواہر لال نہرو نے، یہ لکھکر کہ "مسلمان کی کوئی مخصوص تہذیب یا ثقافت ہے ہی نہیں، ملت اسلامیہ کے ساتھ اپنی انتہائی دشمنی کا ثبوت نہیں دیا؟ جبکہ دنیا جانتی ہے کہ مسلمان، ایک مخصوص تہذیب اور تمدن کے حامل ہیں اور قرآن نے خدا، انسان اور کائنات کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

(د) کیا کانگرس نے "تحریک رابطۂ عوام" کی ناپاک اور شرارت آمیز تحریک شروع کرکے مسلمانوں سے انتہائی دشمنی کا ثبوت نہیں دیا؟ کیا مسلمانوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنے کی مذموم کوشش اُس دشمنی کا ثبوت نہیں ہے جو ارباب کانگرس کو مسلمانوں کے ساتھ ہے؟

(ہ) کیا مسٹر گاندھی کی "ودیا مندر سکیم" اور "واردھا سکیم" مسلمانوں کے خلاف، کانگرس کی انتہائی دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کے کلچر اور تمدن کو مٹانے کی کوشش اُس دشمنی کا ثبوت نہیں جو ارباب کانگرس کو مسلمانوں کے ساتھ ہے؟

(و) کیا کانگرسی اصحاب کی اُردو کُش حکمت عملی، مسلمانوں کے خلاف دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟

(ز) کیا ارباب کانگرس کا صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کی مخالفت کرنا مسلمانوں سے دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟

(ح) کیا کانگرس کا مسلمانوں کے اس مطالبہ کی کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں مخالفت کرنا مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟

(ط) کیا کانگرس کا اُڑیسہ میں خالص ہندو وزارت قائم کرنا، مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟

(ی) کیا کانگرس کا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کرنا مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا ثبوت نہیں ہے؟

برہمن خوب داند کار خود را　　نمی گوید بکس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر　　بدوش خود برد زنار خود را　　(اقبالؒ)

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہندوستان میں ایک تیسرا فریق موجود ہے، جو ہم دونوں کے مابین فرقہ وارانہ منافرت پھیلا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بات بھی بالکل غلط ہے اور دنیا کو فریب دینے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے اپنے معاندانہ طرز عمل کو چھپانے کے لئے یہ غیر شریفانہ حربہ ایجاد کیا ہے جب مسلمان یا کوئی اور شخص، ہندوؤں سے، اُن کے جارحانہ معاندانہ، اتحاد کش اور نفرت انگیز طرز عمل کی شکایت کرتا ہے تو ہندو نہایت معصومانہ انداز میں یہ ترشا ترشایا فقرہ اپنی زبان سے ادا کر دیتا ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو انگریز اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہے: میں راجن بابو سے پوچھتا ہوں۔

(ا) کیا ہندوستان میں شدھی سنگھٹن کا جھگڑا انگریزوں نے پیدا کیا؟

(ب) کیا ہندوؤں کو نماز کے وقت مساجد کے سامنے باجہ بجانے اور شور و غل کرنے کا حکم انگریزوں نے دیا؟

(ج) کیا عید الاضحیٰ کے موقع پر بیگناہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اُن کے گھروں میں آگ لگانے کا مشورہ انگریزوں نے دیا؟

(د) کیا تلک کو انگریزوں نے یہ صلاح دی تھی کہ گنپتی کا جلوس نکالا جائے اور ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی جانب سے نفرت کا جذبہ پیدا کیا جائے؟

(ہ) کیا مسٹر مصرا وزیر سی۔پی کو انگریزوں نے یہ حکم دیا تھا کہ ایک معصوم مسلمان لڑکی کی آبرو ریزی کی جائے؟

(و) کیا موتی لال نہرو کو انگریزوں نے یہ رائے دی تھی کہ صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کی مخالفت کرو؟

(ز) کیا تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرانے کے لئے ہندوؤں کو ایجی ٹیشن کرنے کا مشورہ انگریزوں نے دیا تھا؟

(ح) کیا ہندوؤں کو بندے ماترم کا گیت گانے کی صلاح، انگریزوں نے دی؟

(ط) کیا واردھا سکیم انگریزوں کے ایما سے بنائی گئی تھی؟

(ی) کیا رابطۂ عامۃ المسلمین کی ناپاک تحریک، انگریزوں کے ایما سے شروع کی گئی تھی؟

تلك عشرة كاملة

اگر یہ تمام اتحاد کش تحریکیں، انگریزوں نے نہیں بلکہ خود ہندوؤں نے دیدہ و دانستہ جاری کیں، تو پھر وہ کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ، تیسرا فریق ہندو مسلمانوں میں منافرت کے جذبات پھیلا رہا ہے؟ عجب تماشا ہے کہ، مسلمانوں سے دشمنی تو خود کریں، اور نام بدنام انگریزوں کا ہو! لیکن میں پھر وہی بات کہونگا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہندوؤں کی تمام چالیں اب بے نقاب ہو چکی ہیں اس لئے اب ہمارے ان دوستوں کو اس فریب دہی کی کوشش سے باز آجانا چاہیئے۔ آپ محض زبانی جمع خرچ سے جھوٹ کو سچ نہیں کر سکتے۔ کہنے کو تو گاندھی جی بیس سال سے کہہ رہے ہیں کہ میں مسلمانوں کا دلی خیر خواہ ہوں لیکن اصلی چیز قول نہیں بلکہ عمل ہے اور طرز عمل گاندھی جی کا یہ ہے کہ آج ان کے پرانے عقیدتمند بھی اُن کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اردو ہندی قضیہ میں جس ہندو ذہنیت کا انہوں نے ثبوت دیا، اُس کو دیکھکر کانگرسی مسلمان بھی اُن سے بدظن ہو چکے ہیں یقین نہ ہو تو ۳۹ء کا "مدینہ" کا فائل ملاحظہ کیجئے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "پاکستان نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے نہ ہندوؤں کیلئے اور نہ ہندوستان کیلئے" میں کہتا ہوں کہ اول تو آپکو یہ کہنے کا حق ہی حاصل نہیں کہ پاکستان مفید ہے یا نہیں کیونکہ آپ خود لکھ چکے ہیں کہ یہ سکیم مبہم ہے؛ علاوہ بریں آپ مسلمانوں کے غم میں کیوں دُبلے ہوئے جاتے ہیں؟ اگر پاکستان مسلمانوں کیلئے مفید نہیں ہے تو آپ فی الحال اس اصول کو تسلیم کر لیجئے جب مسلمانوں کو اس سکیم سے نقصان پہنچیگا وہ خود ہی اس سے دستبردار ہو جائینگے تیسری بات یہ ہے کہ ہندو یہ حق حاصل نہیں کہ مسلمانوں کیلئے نصب العین تجویز کرے۔ اسے عرف عام میں دخل در معقولات کہتے ہیں مسلمان اپنا نفع نقصان خود بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ پاکستان ہندوؤں کیلئے مفید نہیں ہے ایک لحاظ سے صحیح ہے کیونکہ اس سکیم کی وجہ سے انکی پچاس سالہ کھیر لیا ہو کر رہ گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب آپ ہمارے ہی خاطر اپنے اصولوں سے دستبردار نہیں ہو سکتے تو ہم سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ ہم آپ کی غلامی میں زندگی بسر کرنا پسند کریں گے؟ کیا مرکزی حکومت میں ہندوؤں کی دائمی مذہبی اکثریت نہ ہوگی۔ "آنچہ برائے خود نمی پسندی برائے دیگراں ہم مپسند"

ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مخصوص سیاسی حالات کی نوعیت یہ ہے کہ یہاں مغربی طرز کی جمہوری حکومت مناسب نہیں ہے کیا آپ ہمارے اس مشورہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ ہم سے کیوں توقع کرتے ہیں کہ ہم آپ کا مشورہ قبول کریں۔

راجہ جی کی مخالفت میں بمبئی کے اشتراکی مسٹر یوسف مہر علی نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی جس میں انہوں نے یہ فرمایا۔

"میں اس ریزولیوشن کی مخالفت اس لئے کرتا ہوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے پاکستان کی سکیم اُن کیلئے

تباہ کن ہے یہ پوری سکیم سیاسی عقبیٰ سے رجعت پسندانہ ہے، اقتصادی نقطۂ نگاہ سے ناقص ہے اور ثقافتی نقطۂ نظر سے مضحکہ خیز ہے۔"

مسٹر موصوف نے اپنی مختصر تقریر میں تین عظیم الشان دعوے کئے لیکن کسی دعوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی اس لئے اس پر تبصرہ کرنا بے سود اور لا حاصل ہے۔ دعویٰ بغیر دلیل عند العقلاء درخور اعتنا نہیں ہو سکتا ہاں اس بات پر ضرور حیرت ہوتی ہے کہ مسٹر مہر علی کو مسلمانوں کے مفاد سے اس قدر دلچسپی کس لئے اور کب سے پیدا ہو گئی ہے؟ وہ تو خالص اشتراکی ہیں اور اس لئے اسلام درکنار ان کی نظر میں تو مذہب ہی کا وجود دنیا اور ہندوستان کیلئے تباہ کن ہے سامدین حالات، مسلمانوں کا ناصح بننا نہ ان کو زیب دیتا ہے اور نہ یہ پوزیشن عقلاً ان کے لئے جائز ہے ان کو اپنے مذہب سے واسطہ رکھنا چاہئے، مسلمانوں پر کرم فرمانے کی ضرورت نہیں مسلمان اپنے مفاد کو اشتراکیوں سے بہتر سمجھتے ہیں اس لئے انہیں دشمنان دین کے مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مولینا آزاد کا میرے دل میں بڑا احترام ہے اور مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ وہ میرے اساتذہ میں سے ہیں لیکن اگر امام ابو یوسف اپنے استاد امام ابو حنیفہ رح سے اختلاف کر سکتے ہیں تو یہ فقیر حقیر بھی اپنے استاد سے اختلاف کر سکتا ہے:۔

مولینا نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ "پاکستان کی سکیم، اسلام کی روح کے خلاف ہے"

میں باادب سوال کرونگا کہ مولینا اس دعوے پر دلیل کیا ہے اور سوءِ ادب نہو تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ

(۱) کیا، ہندو کی غلامی میں رہنا اسلام کی روح کے مطابق ہے؟ (۲) کیا گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد کرنا اسلام کی روح کے مطابق ہے؟

(۳) کیا اس ملک کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش واقعی اسلام کی روح کے خلاف ہے؟

اگر ایسا ہے تو مولینا قرآن اور سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح فرمائیں، تاکہ کم از کم راقم الحروف اس کوشش سے باز آجائے۔

اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ تبلیغ اسلام ضروری نہیں کیونکہ "بنیادی صداقتیں ہر مذہب میں موجود ہیں" لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کا قیام بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے

چوں شیخ مکتب با حدیث دلنشیں
برمرادِ او کند تجدید دیں (اقبالؒ)

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت

باب چہارم

انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں سے ناانصافیاں

(سلسلہ کے لئے ماہ مئی کا پیغام حق ملاحظہ فرمائیں)

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمان خود اپنے قوانین ہی کی رو سے مجبور ہیں کہ ہماری حکومت کے ماتحت پُر امن زندگی بسر کریں لیکن یہ مجبوری صرف اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک ہم بھی معاہدے کے اُس حصے کو پورا کرتے رہیں جس کا تعلق ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے لئے اُن کے حقوق اور روحانی مراسم کا احترام ضروری ہے۔ جب کبھی ہم اُن کے شہری اور مذہبی حقوق (یعنی امان) میں دخل دیں گے جس کی بنا پر وہ اپنے مذہبی احکام کو پورا نہ کر سکیں تو اُس وقت وہ فرائض بھی جو ہمارے متعلق اُن پر عائد ہوتے ہیں ختم ہو جائیں گے۔ ہم اُن کو زبردستی اپنا مطیع بنا سکتے ہیں مگر اُن سے اطاعت کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت کا یہ طرز عمل نہایت درجہ قابل تعریف ہے کہ اُس نے گذشتہ فاتحوں کی طرح فوجی حکومت قائم نہیں کی بلکہ ایک آئینی حکومت کی بنیاد رکھی ہے۔ جو لوگوں کی ضروریات کے عین مطابق اور اُن کی خیر خواہی کے لئے قائم ہے۔ اگر مسلمانوں پر ناواجب سختیاں کی گئیں تو وہ اس حکومت کے قیام کو ناممکن کر دیں گی۔ اُن کے معاملہ میں تو معمولی سے معمولی شکایتیں بھی عظیم الشان سیاسی غلطیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی فاش غلطیوں کا مجموعی اثر اسلامی قوانین کی رو سے یہ ہو گا کہ حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات یکسر بدل جائیں۔ اور وہ اُن فرائض کی بجا آوری سے جو بحیثیت رعایا اُن پر عائد ہوتے ہیں اپنے آپ کو بری الذمہ تصوّر کریں

لہذا یہ امر اُن کو سازش اور بغاوت پر مجبور کرے گا۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ حکومت ہند اس قسم کی فاش غلطیوں کا ایک سے زیادہ مرتبہ ارتکاب کر چکی ہے۔ البتہ اپنی کوتاہیوں کو بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ میرے بیانات کا تعلق اُن مسلمانوں سے ہے جو انگریزی حکومت کے ماتحت پُرامن رہنے کا اقرار کر چکے ہیں۔ پچھلے ابواب میں دو حقیقتیں ثابت کی گئی تھیں اول یہ کہ ہماری سرحد پر ایک باغی کیمپ بدستور قائم ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ ہماری سلطنت کی حدود کے اندر بھی ایک دیرینہ سازش کام کر رہی ہے انگریزی حکومت مسلح غداروں کے ساتھ کسی قسم کی گفت و شنید کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جن لوگوں کا ہاتھ قبضۂ شمشیر پر ہے اُن کو تلوار کے گھاٹ ہی اتار دینا چاہئے۔ ہر ٹوفلس ڈروک[لہ] کی تمثیل جو کوہ ایلپس کی چوٹی سے متعلق ہے ہندوستانی سلطنت پر نہایت ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتی ہے اور وہ یہ کہ امن صرف طاقت کے سہارے قائم ہو سکتا ہے جب انگریز اس قابل نہیں رہیں گے کہ اس ملک میں اپنی مالی حالت یا بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر حق کے لئے تلوار اٹھا سکیں تو ان کے لئے یہی بہتر ہوگا کہ قریب ترین بندرگاہ سے اپنے ملک کو واپس لوٹ جائیں۔

رہا اُن غداروں کا معاملہ جو ہماری حدود سلطنت کے اندر رہ کر مصروف سازش ہیں تو اُن کے لئے بھی انصاف کی تمام راہیں کھلی رہنی چاہیں پھر انصاف بھی ایسا ہونا چاہئے جس میں رحم کا امتزاج ہو اور جو اس علم کی بدولت نرمی اختیار کر سکے کہ یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے اور انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنٰے مقصد کے لئے نہیں لیا۔ مجلس قوانین ساز نے گرفتاری کا جو حق محکمہ منتظمہ کو دے رکھا ہے اُس سے بے شک حکومت اِس قابل ہو گئی ہے کہ اِس شر کا مقابلہ کر سکے۔ وہ سرغنوں کو صرف نظر بند کر دیتی ہے اور انہیں یہ عزت نہیں دیتی کہ مذہب کی خاطر قید و بند کی سختیاں برداشت کریں۔ حکومت اُن لوگوں کے ساتھ بھی جن کو عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی ہو حقارت آمیز

[لہ] (HER TEUFELS DROCKH)

ملاطفت کا برتاؤ کرنی ہے جس سے یہ مجرم چند سال بعد ہی مسلمانوں میں وہابی مذہب کے منکرین کی حیثیت سے واپس آجاتے ہیں۔ اگر اس سازش کو تباہ کرنے کی کوشش دھڑا دھڑ گرفتاریوں سے کی جاتی تو متعصب لوگوں کے جوش و خروش کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی اور تمام دیندار مسلمانوں کی ہمدردی اُن کے ساتھ ہو جاتی لہذا اس شورش پسند جماعت کو کسی قسم کی نفرت پیدا کئے بغیر نہایت نرمی لیکن پوری قوت کے ساتھ دوسرں سے الگ کر دینا چاہیئے۔

جب ہم غداری کے خلاف اس قدر سختی سے کام لے رہے ہیں تو ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ بے اطمینانی کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ اس قسم کی تحقیقات کی ابتدا کسی بیرونی دباؤ سے پہلے ہی ایک باعزت طریق پر عمل میں لانی چاہیئے۔ جب ایک بہت بڑی سازش کی روک تھام مراعات سے کی جائے تو اُن کو شرافت اور سخاوت سے تعبیر کرنا غلطی ہوگا۔ اگر ہم نے مسلمانوں سے کسی معاملہ میں ناانصافی کی ہے تو اب اُس کی تلافی کے لئے کسی بے جا خود پسندی کو ہمارا سدِ راہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو بہت کافی طاقت حاصل ہے اور اُسے اس بات سے نہیں ڈرنا چاہیئے کہ اُس کا یہ طرزِ عمل کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔ وہ چاہتی تو سب غداروں کو جیل میں بند کر سکتی تھی لیکن اُس کے پاس ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے کا زیادہ بہتر طریقہ موجود ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی ہمدردی کا سلسلہ ان سے منقطع کر دے مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہم ان متواتر اور مسلسل ناانصافیوں کے احساس کو دور کر دیں جو انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔

اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کئے گئے ہوں۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے اُن پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے اُن کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اور جو اُن کی ذلت و

خواری کا سبب بن گیا ہے وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے یہ قاضی نکاح کے لئے مذہبی اجازت دیتے تھے اور اُن کا کام زمانہ قدیم ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ عمل میں لانا تھا۔ اُن کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لیے اور اس طرح روحانی اعتبار سے اُن کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔ ہمارا بڑا جرم اُن کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق اُن کو یقین ہے کہ بآسانی ثابت کئے جاسکتے ہیں اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو محض جذبات پر مبنی ہیں اور شاید انگریزوں کے تصور سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بدظن رکھتی ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت اُن کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم۔ جذباتِ شجاعت سے معرا اور سرمایہ میں کمینوں کی طرح بددیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھہراتے ہیں۔

یہ الزامات کہاں تک صحیح ہیں اور ہم اُن میں کہاں تک مجبور اس امر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے لیکن اول قارئین سے استدعا کروں گا۔ کہ مسلمانوں کے متعلق ہمارے رویہ کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے دلوں سے اُس غم و غصہ کو دور کردیں جو ایک جماعت کی فرو گذاشتوں نے جن کا ذکر گذشتہ ابواب میں آچکا ہے پیدا کر دیا تھا۔ بغاوت اور متعصبانہ جوش غیر ملکی حکومت کے لازمی نتائج ہیں۔ جب تک انگریز دل میں یہ صلاحیت رہے گی کہ ہندوستان پر حکومت کرسکیں وہ اندرونی غداروں اور

سرحدی باغیوں دونوں سے بخوبی نپٹ سکیں گے۔ لہٰذا جہاں تک میرا تعلق ہے مسلمانوں کی شکایات کرتے ہوئے گم کردہ راہ وہابیوں کا کوئی ذکر نہ کروں گا، اور پھر چونکہ آگے چل کر بھی اُن کا تذکرہ نہیں کیا جائے گا اس لئے یہاں اُن دو انگریزوں کی رائیں نقل کرنا بہتر ہوگا جو اس امر پر کہ مسلمانوں کی بغاوت کو اُن کی شکایات سے کیا تعلق ہے بہترین رائے دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں خاموش احتجاج اور پُرجوش بے چینی میں بہت کم فرق کیا جا سکتا ہے ہم نے پُرامن مسلمانوں کی ضروریات سے غفلت برت کر اُن کی ہمدردی کو ایک ایسی جماعت سے وابستہ کر دیا ہے جس کی آتش بیانی اور باغیانہ جذبات سے وہ بصورت دیگر پرہیز کرتے تھے۔

وہابی مقدمات کے ایک ذمہ وار افسر[۵۱] نے پچھلے دنوں لکھا تھا "میرے خیال میں مسلمان کاشتکاروں کے دلوں پر وہابی اصولوں کا بہت زیادہ اثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اُن کی تعلیم سے بالکل غافل ہیں، اس کے بعد وہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے طور طریقوں کے ماتحت چونکہ زندگی کے بہتر ہونے کی کوئی صورت نہیں اس لئے وہ اعلیٰ جماعتیں بھی جن کی تعلیم کے لئے ہم نے کچھ نہ کچھ انتظام کر رکھا ہے اُن سے متاثر ہو جاتی ہیں مقدمہ انبالہ میں اس قسم کے ایک واقعہ کا انکشاف ہو چکا ہے جس سے یہ قیاس پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔ میں عثمان علی کو بذات خود جانتا ہوں اُس کا بیان تھا" تین سال کا عرصہ ہوا مجھے جیسور جانے کا اتفاق ہوا جہاں میری ملاقات ناظر عدالت سے ہوئی۔ اُس نے میرا حال احوال پوچھا میں نے جواب دیا کہ میں بڑا بدقسمت انسان ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگا تم لکھے پڑھے آدمی ہو تم کو اس مصیبت میں پڑے رہنے کی ضرورت۔ میری بات سنو اگر پسند آجائے تو تمہاری حالت سدھر جائے گی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے اُس نے جواب دیا قرآن مجید کو ہاتھ میں لو اور سا تھ کے ضلع میں چلے جاؤ اور لوگوں میں اپنے دین کی تبلیغ کرو۔ پھر اُن میں سے جن لوگوں کو حسب منشا دیکھو اُن کو جہاد پر آمادہ کرو۔ چنانچہ میں نے اُس ضلع میں تبلیغ کی اور بہت سے آدمیوں سے روپیہ بھی حاصل کیا" یہ ہے وہ شخص جس کے متعلق میں اپنی دانست کے مطابق یقین

---

[۵۱] مسٹر جیمز او کنیلے J.C.S.

سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو کچھ اپنے عقاید کے زیرِ اثر اور کچھ روپے کے لالچ میں آکر۔ اور اس قسم کے آدمی تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کاشتکاروں کو اُکساتے ہیں اور درہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے مزید یہ کہ بعض حالات کے ماتحت ایک بنگالی بھی اُسی بے جگری سے لڑ سکتا ہے جس طرح ایک افغان۔

ایک اور انگریز جس کا بیان اس سے بھی زیادہ قابلِ وثوق ہے لکھتا ہے[1] "یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اُس طریقہ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اُن کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ حقیقت میں اس طرح اُن کی ضروری سے ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں یہ طرزِ تعلیم لازماً اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی مدنی روایات کے منافی ہے۔"

تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ تعلیم پر ناز ہے حکومت کے اُن عہدوں اور ملازمتوں میں کوئی جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے پیشتر اُن کی اجارہ داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابلِ نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا جا رہے ہیں۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی ہے وہ بھی نالاں ہیں گو اُن کا یہ احساس مذہبی ایذا رسانی کی حد تک نہیں پہنچا گو اُن کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اُن کے تعصب کو جس کا جواز قرآن مجید سے ہر وقت ثابت کیا جا سکتا ہے یہاں تک برانگیختہ کر دیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب گروہ کی شکل اختیار نہ کر لے دوسری طرف صرف چند تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہوں گے جو کسی متعصبانہ اور ناواجب رنگ میں مضطرب نہیں اور جو اپنی قوم میں بہت کچھ اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔

---

[1] مسٹر بیلے۔ حکومتِ ہند کے محکمہ داخلیہ کا سکرٹری جس کی ہمدردی کے لیے مسلمان بہت ہی شکرگزار ہیں۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے تک (موجودہ وائسرائے سے زیادہ کسی نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا) ہر شخص کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے اس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے آج نان جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اپنے انحطاط کا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا کیونکہ اُن کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مترتب ہوا جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ نہیں آگئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہ ہی مذہب تھا۔ وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور جملہ ضروریات زندگی میں ویسا ہی طرز بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں۔ وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس قومیت اور جنگی اولعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ برباد کر دیا گیا ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے حقوق سے بے پرواہ ہو کر حکومت کی ملازمتوں میں اپنی گذشتہ اجارہ داری قائم نہیں رکھ سکتے۔ دولت و ثروت کا یہ پرانا چشمہ اب خشک ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے لاپرواہ اور پرجوش فاتحوں کے نظام حکومت میں ماتحت عملہ تو ہندو تھا۔ لیکن بڑے بڑے عہدوں کی تقسیم یوں تھی۔ سب سے اعلیٰ بارہ عہدوں میں سے جن کا منصب پانچ ہزاری سے زیادہ تھا[۱] ایک بھی ہندو کو نہیں ملا[۲]۔ اس سے نیچے کے عہدے جن کی منصبداری پانچ

---

[۱] مغلوں کے ماتحت ہندو راجہ یہ بہت ہی دلچسپ مگر چھوٹا سا رسالہ ہے جس کو پروفیسر لوک مین نے لکھا ہے اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔

[۲] شاہ جہان کے وقت۔ یاد رہے کہ یہ فوجی اعزازات سول افسروں کو بھی ملتے تھے۔

ہزار سے لے کر پانچ سو تک بھی کل ۲۵۲ افسر تھے جن میں ۳۱ ہندو تھے۔ یہ اکبر کے زمانے کا حال ہے۔ بعد کے زمانے میں اس درجہ کی منصبداری پر کل ۲۰۴ افسر فائز ہوئے جن میں ایک سو دس ہندو تھے اعلیٰ ملازمتوں کے آخری درجہ یعنی پانچ سو سے دو سو کی منصبداری میں بھی کل ۱۶۳ منصبدار تھے اور ان میں ہندو صرف ۲۶۔

انگریزی حکومت کے ماتحت اگرچہ مسلمانوں کے لئے اس قسم کی اجارہ داری کی توقع رکھنا لایعنی سی بات ہے مگر نہ انہوں نے اس کی درخواست کی اور نہ اس پر کوئی اظہار شکایت۔ انہیں یہ رنج نہیں کہ حکومت کی نوازشوں سے حسب دستور سابق انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا بلکہ یہ کہ وہ اس سے بتدریج خارج کئے جا رہے ہیں وہ اس بات کا گلہ نہیں کرتے کہ اب زندگی کی دوڑ میں انہیں ہندوؤں کا مقابلہ درپیش ہے انہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں ان کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ مختصر اً یوں کہئے کہ یہ وہ قوم ہے جس کی روایات بہت شاندار ہیں مگر جس کا اس کے باوجود کوئی مستقبل نہیں۔ اگر اس قوم کی تعداد تین کروڑ ہے تو یہ محض اس قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ اُس کے حاکموں کے لیے بھی ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔

مشرقی بنگال میں کاشتکاروں کی بہت زیادہ تعداد مسلمان ہے ان اضلاع میں جہاں دریاؤں اور دلدلوں کی کثرت ہے اچھوتوں کو کبھی ہندو والیی معزز قوم میں شامل نہیں کیا گیا۔ آریہ قبائل نے جنوب کی طرف نہ ساحل بحر کے ساتھ ساتھ اور نہ دہانہ گنگا کے علاقہ میں اتنی تعداد میں ہجرت کی تھی کہ وہاں کی قدیم آبادی کو برہمنی روپ دے سکے یہ لوگ یعنی چنڈال ذات پات کے دائرے سے بالکل باہر ہے۔ چنڈال دور دراز کی دلدلوں میں مچھلیاں پکڑتے اور اپنے سیلاب زدہ علاقوں میں کہیں کہیں چاولوں کی فصل بھی تیار کر لیتے تھے مگر اُن کی سماجی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔ اور نہ اُن کے ذمہ کوئی مذہبی فرائض تھے۔ ان کی ناپاکی کا یہ عالم ہے[۱] کہ اعلیٰ ذات کا کوئی برہمن اپنے آپ کو بھرشٹ کئے

[۱] میرا روئے سخن اُن اضلاع کی طرف ہے جو ڈھاکہ اور مدکرم لپور جو برہمنوں کی ٹولی بڑی غیری آبادی ہے کے جنوب میں واقع ہے

کئے بغیر اُن میں بود و باش اختیار نہیں کر سکتا لہ اور اگر کہیں ایسا کرے تو چند نسلوں کے بعد اُن کی اولاد کا دوسرے برہمنوں سے کوئی تعلق نہ رہے گا جن کی حقیقتاً وہ اولاد ہیں۔ اور چند دنوں کی مسافت پر شمال کی طرف رہتے ہیں۔ مسلمان اس قسم کے نسلی امتیازات نہیں رکھتے وہ ان اضلاع میں داخل ہوئے تو فوجی نوآبادکار یا اُن مہموں کے سرکردہ افسروں کی حیثیت سے جو زمین کی بازیافت کے لئے اِس طرف بھیجی گئیں۔ زمانہ قدیم کے آباد اضلاع مثلاً جلیسور وغیرہ کی قدیم ترین روایات بھی اس قسم کی مہمات سے شروع ہوتی ہیں جس طرح اندرون ہند میں قدیم سورماؤں نے بڑے بڑے ہیبتناک جانوروں کو نکالتے لگا یا۔ وہ شیطانی اقوام کو مطیع کرتے اور بڑے بڑے جنگلوں کو کاٹتے تھے۔ بعینہ زمانہ قبل تاریخ کے افق پر سب سے نمایاں حیثیت اُس انسان کو حاصل ہے جس نے ان علاقوں میں جو کبھی سمندر کی دست بُرد کا شکار رہتے تھے ہل چلایا۔

مسلمانوں نے جنوب کی طرف اِس قسم کی بہت سی بازیافتہ زمینوں میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں اور مشرقی بنگال میں بھی اول اول سمندر کو خشکی سے علیحدہ کیا تو انہوں نے۔ اگر کوئی سیاح اُس علاقہ کی سیر کرے گا تو اُسے آج بھی دور دور تک کے بے آباد جنگلوں میں اُن کے تعمیر کردہ ندعی تالاب، مساجد، گذرگاہیں، حوض اور خانقاہیں نظر آئیں گی۔ مسلمان جہاں بھی گئے اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے کچھ تو بذریعہ تلوار لیکن زیادہ تر انسانی فطرت کے دو نہایت ہی اہم احساسات کی تحریک سے۔ ہندوؤں نے دہانہ گنگا کی قدیم اقوام کو کبھی اپنی برادری میں شامل نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے جملہ اسلامی مراعات کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ ان پرجوش مبلغوں نے ہر جگہ یہ پیغام سنایا کہ ہر شخص کو خدا کے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھک جانا چاہیئے، خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں اور مٹی کے ذروں کی طرح ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، فتح کے بعد فاتح کا نعرۂ جنگ

لہ یہ معلومات میں نے خود فرید پور، بکر گنج اور سندربن کے اضلاع میں حاصل کیں۔

لہ اس وجہ سے کہ وہ چنڈالوں میں رہتے ہیں یا اُن کے پروہت ہیں۔

ایک الہامی اور متبرک حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

دہانہ گنگا کے کاشتکار آج بھی مسلمان ہیں۔ اسلام جنوبی بنگال میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ وہاں ایک خاص مذہبی ادب اور خاص زبان پیدا ہو گئی ہے: "پیتوس" زبان یعنی اسلامی بنگالی شمالی ہند کی اردو سے ایسی ہی علیحدہ ہے جیسے اردو ہرات کی فارسی سے۔ ان کاشتکاروں کے درمیان پرانے زمیندار گھرانے آباد ہیں اور اُن میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ حقیقت میں سارا صوبہ مسلمان اُمراء سے جو کبھی طاقتور اور برسر اقتدار تھے بھرا پڑا ہے۔ وہ گذشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں۔ اس وقت بھی مرشد آباد میں ایک اسلامی عدالت ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پُر از غارتالابوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روی سے خون جگر پیتی نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذات خود جانتا ہوں۔ اُن کے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اُن کے پوتے پوتیاں بھی ہیں اور اُن کے نواسے نواسیاں بھی لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے ہی لئے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔ وہ غلیظ برآمدوں اور ساتھ کے ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اُداس زندگیاں بسر کر رہے ہیں اور دن بدن قرض کے تباہ کن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ پاس ہی کا ہندو مہاجن ایک دن اُن سے جھگڑا مول لے لے گا اور چند لمحوں میں قرضخواہوں کا ایک جم غفیر عدالت کے حکم سے بیع قطعی کا حق حاصل کر کے قدیم مسلمانوں کے اس خاندان کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر لے گا۔ یہاں تک کہ صفحہ ہستی سے اُس کا نشان تک مٹ جائے۔

اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگر کے راجاؤں کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ پہلے پہل جب انگریزوں کو اُن سے واسطہ پڑا تو اُن کی سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ یہ راجہ اپنے ستونی شامیانے میں بیٹھ کر اپنی اُس ریاست کا نظارہ کیا کرتے تھے جو آج کل دو انگریزی اضلاع پر منقسم ہے۔ اُن کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں

اور صاف و شفاف پانی میں جس کے اندر ایک بھی خودرو پودا نظر نہیں آتا تھا منعکس ہوتی تھیں۔ راجہ کی خانگی سیڑھیوں سے ہر روز ایک سنہری بجرا مستانہ وار اس جزیرہ کا رُخ کرتا ہے جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور زنگار رنگ کے پھولوں سے پٹا پڑا ہے محل کے دروازہ پر سپاہی پہرہ بدلتے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شہزادیوں کے باغات سے بچوں کے کھل کھلانے اور خواتین کی شیریں آوازیں سننے میں آتیں ہیں۔ مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کی بے بام و در دیواروں سے استر کاری کی تمام زیبائشیں مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور اُن کی صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں۔ اب اُن میں چاولوں کی کاشت ہوتی ہے اور اُن کے زنگار رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے۔ کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصہ نظر آجاتا ہے تو عربی وضع کی کسی محراب دار کھڑکی سے اس نظارے پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

مگر ان میں سب سے زیادہ حسرتناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی ایستادہ ہے جو پُرانے زمانہ کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر ہے۔ اس کی خراب و خستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے[۱]۔ وہ بدنصیب خواتین جو کبھی رانی کہلاتی تھیں اب کبھی شام کی سیر کو پردہ دار بجروں میں نہیں نکلتیں۔ اُن کے زنان خانوں پر چھت تک باقی نہیں۔ اُن کے مکین اب اُن معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں جو تباہ شدہ اصطبل کے پاس واقع ہیں ناگر خاندان کی گزشتہ عظمتوں کی یاد صرف ایک نہر سی باقی ہے جو اب بھی دلدلوں کے بیچ میں اُسی راستے سے بہتی ہے جس سے کبھی محلوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور جسے دیکھ کر قدیم الایام روما کی خاموش یادگاروں کی ایک ہلکی سی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

---

[۱] میں عمارت اور تالاب کا وہ نقشہ بیان کر رہا ہوں جو میں نے ۱۸۶۴ء میں دیکھا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تالاب کو صاف کیا گیا ہے اور محل اور بھی خستہ ہوگیا ہے۔

دریائے تاپتی کے سوار دریا کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شے مضبوطی سے قائم کی جائے وہی تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور جو نقل مکانی کرتی رہے اُس کو ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے

اس خاندان کے نمائندے خستہ محل کے ایک کونے میں دبکے ہوئے اپنی عسرت زدہ زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ نشہ آمیز مٹھائیوں کو چوستے اور خودرو پودوں سے اَٹی ہوئی جھیل پر حسرت بھری نگاہوں سے تکتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی سیاستدان ایوان عام میں سنسنی پیدا کرنا چاہتا ہو تو اُس کے لئے یہ کافی ہے کہ بنگال کے کسی ایسے مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کرے۔ وہ اپنی کہانی کو اس طرح شروع کرے گا۔ ایک قابل عزت شہزادہ بہت بڑے علاقہ پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وہ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے اُس کے بے شمار خدمتگار ہیں۔ وہ مشرقی شاہانہ دربار کی تمام روایات کو برقرار رکھتا ہے اور بستر مرگ پر مسجدوں کی تعمیر اور مذہبی اوقاف کا حکم دے کر اپنی روح کو تسکین دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے موجودہ بے عقل جانشین کی تصویر کھینچے گا۔ وہ اُن جنگلوں میں جب انگریز شکاریوں کی آمد کی خبر سنتا ہے تو اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اور اگر اُس کے خادم مجبور بھی کریں۔ کہ اجنبیوں کی عزت افزائی کرنا ضروری ہے تو وہ اُن سے ملاقات پر ہمیشہ ایک ہی بات دہراتا ہے اور وہ یہ کہ فلاں تاجر نے ابھی ابھی اس کے محل کو چند سو روپوں کے بدلے قرق کر لیا ہے۔

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کئے ہیں تاکہ انگریزوں کے سامنے اُن لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں کیا جائے گا۔ میں یہ بھی بتلا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانان ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔

میری رائے میں اگر کسی قوم کی حالت کو درست کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہوگی تو وہ جنوبی بنگال کے مسلمان نواب ہیں۔ اُن کی دولت و ثروت کے پرانے ذرائع ختم ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ہمسایہ ہندو راجاؤں کے علاقوں

کو تاخت و تاراج نہیں کر سکتے نہ بے شمار سپاہیوں کو اس غرض سے بھیج سکتے ہیں کہ کاشتکاروں کو لوٹیں۔ وہ تجارت کے قافلوں پر محصول بھی عاید نہیں کر سکتے نہ عدالت سے اپنے دوستوں کے ذریعے مالگذاری سے معافی حاصل کر سکتے ہیں نہ مقامی طور پر شادی، پیدائش اور فصل جمع کرنے کے موقعوں یا اسی قسم کی دوسری دیہاتی تقریبات پر ٹیکس لگا سکتے ہیں۔ اُنہیں یہ حق حاصل نہیں کہ محصول آبکاری جمع کریں یا رمضان شریف کے متبرک مہینے میں ممنوعات کی فروخت سے اغماض برتنے کے لئے رشوت قبول کر سکیں۔ بنگال میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ دیوانی کا محکمہ ہے جس پر مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ محکمہ پولیس بھی آمدنی کا اچھا خاصا بڑا ذریعہ ہے اور اس کے تمام افسر بھی مسلمان تھے۔ آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی عدالتیں ہیں اور یہاں بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے اور ان سب سے بڑھکر فوج۔ اس کے عہدے داروں میں وہ لوگ نہیں آسکتے تھے جو اپنے فرائض کو معمولی منافع پر بجالاتے بلکہ فاتحوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اپنے کاشتکاروں کا نام فوج میں درج کرتے اور اُن کی تنخواہیں شاہی خزانے سے خود اپنے لئے وصول کرتے۔ گویا آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں۔

مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اسی حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہندو ماہر اقتصادیات یا کوئی ہندو جرنیل بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ ان مثالوں کی موجودگی ہی اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا[۱]۔ ایک نواب کے خزانے میں ہر سال تین ذرائع سے دولت جمع ہوا کرتی تھی۔ فوج کی افسری، مالگذاری جمع کرنے کی خدمت اور سیاسی و قانونی خدمات کی سرانجام دہی سے۔

[۱] جب کبھی ایسا ہوتا تھا تو مسلمان ناراض ہو جاتے تھے۔ سب سے نمایاں دو مثالیں ہیں۔ راجہ ٹوڈرمل کے وزیر مالیات اور جرنیل مان سنگھ کے جرنیل ہونے وقت دربار میں احتجاجی نوٹ بھیجے گئے۔ رانا پرتاپ کے خلاف مہم میں جرنیل مان سنگھ کے ماتحت بہت سے مسلمان افسروں نے خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ہندوؤں کے اعداد و شمار بیان کر چکا ہوں جو سب سے کم متعصب بادشاہوں کے زمانے میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

یہ اُس کی عظمت کے جائز ذرائع تھے لیکن اس کے علاوہ عدالتی خدمات اور سینکڑوں اور ذرائع بھی تھے جو فراہمی دولت میں کام آتے اور جن کا ذکر میں پچھلے باب کے شروع میں کر آیا ہوں۔ لہٰذا اُن کا اعادہ غیر ضروری ہے بایں ہمہ سرکاری زندگی کی اِن تین جائز اور نمایاں اجارہ داریوں تک محدود رکھتے ہوئے بھی یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ جنوبی بنگال کے مسلمان نوابوں کے پاس برطانی حکومت کے ماتحت کیا کچھ باقی رہ گیا ہے۔

سب سے پہلے جنگی خدمات کو لیجئے جن کا دروازہ اُن پر تمام و کمال بند ہے۔ اچھے گھرانے کا کوئی مسلمان فرد ہماری فوج میں داخل نہیں ہو سکتا اور اگر وہ ہو بھی جائے تو وہ اُس کے لئے دولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی[1]۔ ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی امراء کو جلد یا بدیر بعض شرائط کے ماتحت انگریزی فوج میں کمیشن افسر کی حیثیت سے داخل کر لینا چاہیئے۔ آج کل کوئی کمشن افسر ملکہ کی فوج میں ملازمت سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کو مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک فوجی زندگی کے اعزازات اور معقول تنخواہ کے خواہشمند ہیں اور اس بات کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کا آبائی پیشہ ہمیشہ کے لئے اُن سے چھن گیا ہے۔

مسلمان امراء کا دوسرا ذریعہ آمدنی تھا مالگذاری کا جمع کرنا۔ اِس اجارہ داری کی بنیاد اسلامی قوانین پر قائم کی گئی تھی۔ ٹیکس کی ادائیگی مغلوبیت کی نشانی ہے۔ فاتح صرف ٹیکس ہی وصول نہیں کرتا تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا پُر نفع کام بھی انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اِس بات کے بار بار دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں فاتح اور مفتوح کے تعلقات اسلامی قوانین کے ماتحت اس قدر نہ تھے جتنے سیاسی اغراض کے۔ اِس کے پُر جوش اور غیر ملکی فاتحوں کو دیوانی کی تفصیلات میں اُلجھنا ناپسند تھا۔ وہ کاشتکاروں سے براہ راست معاملہ کرنے

---

[1] بہت ہی کم مسلمانوں کے پاس گورنر جنرل کی کمیشن ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ کی کمیشن کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہندوستانی صرف سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں اور شاذ و نادر اگر کوئی افسری تک پہنچ بھی گیا ہے تو اُس نے بھی درجہ بدرجہ ہی ترقی کی ہے اور اس قاعدے سے کوئی بھی مستثنا نہیں۔ صرف ایک مسلمان انگریزی کپتان (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی ذمہ داری اپنے ہندو پیادوں پر چھوڑ دیتے۔ یہ طریقہ اس قدر عام تھا کہ اکبر نے جب ایک ہندو کو وزیر مالیات کے عہدے پر فائز کیا تو اسی عذر کے ماتحت ٹوڈرمل نے مالیات کا قلمدان ہاتھ میں سنبھالا تو مسلمان شہزادوں نے احتجاج کے طور پر ایک وفد دربار شاہی میں بھیجا۔ لیکن شہنشاہ نے جواب دیا "تمہاری جاگیروں اور معافی کی زمینوں کا انتظام کن کے ذمے ہے؟" انہوں نے جواب دیا "ہمارے ہندو دلالوں کے" "بہت اچھا تو مجھے بھی اپنے ریاست کے انتظام پر ایک ہندو کو مقرر کرنے کی اجازت دیجیے"

مالیات کے بڑے بڑے عہدے تو مسلمانوں ہی کے پاس رہے لیکن کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا دستور ہندو پیادوں کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں یہ ہندو ملازمین محکمہ مالیات کا ماتحت تھا جو مالگزاری کو مسلمان افسروں تک پہنچاتے مگر اس سے پہلے منافع کی رقم سے خود اپنا حصہ وضع کر لیتے۔ محکمہ مالیات شہنشاہ اکبر کے سامنے جواب دہ تھا اور اسلامی نظام مالیات کی ایک بہت ہی اہم کڑی۔ وہ مالگذاری کے قوانین نافذ کرتا لیکن یہ نفاذ عدالتوں کے ذریعے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوتا۔ اگر مالیہ وصول نہ ہوتا تو سپاہیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی غارت گری سے دیہاتیوں کی زندگی کو اس وقت اجیرن بنائے رکھیں جب تک کہ اُن سے آخری پائی تک وصول نہ ہو جائے۔ کاشتکار اور ہندو پیادے دونوں کا وطیرہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ رقم پر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اس کے برعکس اعلیٰ مسلمان عہدیداروں کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ رقم سے زیادہ وصول ہو۔ لے

(بقیہ صفحہ پچھلا) کے درجہ تک پہنچا ہے اور وہ کپتان حیات علی ہے جس کی سفارش کرنل روتھری نے غدر کے زمانہ میں کی تھی یہ مسلمان ملکہ کی پنشن لینے کا ہر طرح حقدار ہے کیونکہ میں ذاتی طور پر اس سے اور اس کے کارناموں سے واقف ہوں۔ لے اس خیال کی تائید کرنے والوں میں بنگال کیولری کے کپتان اوسبورن کو پیش کرتا ہوں جنہوں نے حال ہی میں ایک بہت اچھا مضمون کلکتہ ریویو میں لکھا ہے۔

لے اس عجیب کش مکش کی مثال مسٹر ویسٹ لینڈ کی جیسور پر موجودہ رپورٹ میں ملے گی اور بنگال کے ہر ضلع کی رپورٹ میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔

بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افسر[۵] اسی بنا پر مسلمانوں کا دعوےٰ ہے کہ ہم کو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہیئے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقعہ یہی تھا[۲] انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدے داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اُس کے اثرات کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا۔ اس بندوبست سے اُن مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آ گیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگذاری جمع کرنے کا جائز حق پہنچتا تھا۔

مسلمان تعلقداروں اور ان کے سپاہیوں اور شمشیر زنوں کے بجائے اب ہم نے ہر ایک ضلع میں ایک انگریز کلکٹر مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلح خاصہ دار بھی جیسا کہ اس سے پہلے عام طور پر عدالتوں کے پیادے کام کرتے تھے۔ مسلمان امراء کا یا تو مالگذاری سے کوئی تعلق نہیں رہا یا وہ محض زمیندار ہیں جن کو زمین کی آمدنی سے ایک مقررہ حصہ مل جاتا ہے۔

---

[۱] مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان دیکھیئے یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۱۲ء کو دیکھیں ص ۱۴ سے لے کر ص ۲۰ تک۔

[۲] وہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے "ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے برقرار رکھیں گے اور ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔

بہرحال اِن تبدیلیوں کو دوامی بندوبست نے رائج نہیں کیا اس نے صرف اُن کی تکمیل کی تھی البتہ اس نے مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہنچایا مگر ایک دوسرے رنگ میں۔ اس بندوبست کا عام رجحان اس طرف تھا کہ اُن ماتحت ہندو افسروں ہی کو زمین کا مالک قرار دیا جائے جو براہ راست کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرتے تھے میں نے ۹۰-۱۷۸۸ء کے بندوبست کے مسودات کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا ہے اور میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ اُن دفعات کے باوجود جو ۱۷۹۳ء کے قانون میں دلالوں کے بارے میں درج ہیں اُس وقت کے افسرانِ مال کی نظروں میں پچھلے نظام مالگذاری کی صرف تین ہی کڑیاں تھیں یعنی حکومت۔ مقامی ایجنٹ یا زمیندار جو کاشتکاروں سے براہ راست مالگذاری جمع کرتے اور کاشتکار جو زمین میں ہل چلاتے۔ اور انہی تین کڑیوں کو ہم نے نظام میں داخل کیا مسلمانوں کے نظام دیوانی کی دوسری کڑیوں کو ہم نے بالکل نظرانداز کردیا یا وہ خود بخود مفقود ہو گئیں مثلاً خود مختار تعلقداروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ یہ خاندان اپنی ریاست کے کچھ حصے کی کاشت کا دوامی پٹہ دوسروں کے نام لکھ دینے کے باوجود اپنے ماتحت زمینداروں پر ایک قسم کا قانونی حق رکھتے تھے اور پھر جب کبھی موقع ہوتا اُن سے نذرانہ کے طور پر نقدی یا جنس ہتھیا لیتے۔ ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے لکھتا ہے "اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہوگیا ہے اور اب وہ اُس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔

سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امرا انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ دعوے ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جونہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کردیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر بیک طرفہ اس قدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار

رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے۔ ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔ مالگذاری جمع کرنے والوں کے ذمے نظام حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے اُن کو اس بات کی اجازت تھی جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگذاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا ہے۔ اُن کو اس لئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولتمند ہوجائیں۔ اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اُس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سُنے یا نہ سُنے۔ اُن کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کرکے گرفتار بھی کرلیا جاتا تو اُن کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں لہ

بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ماتحت حکومت کی حیثیت ایسی مشین کی تھی جس سے تھوڑے آدمی دولتمند ہوجائیں یہ نہیں کہ بہتوں کی حفاظت ہوسکے معلوم ہوتا ہے اس پر نہ کبھی حاکموں کے دل میں رحم پیدا ہوا۔ نہ اُن کے ضمیر نے کبھی سرزنش کی کہ غریب کاشتکاروں کی بہت بڑی تعداد موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اور موسم خزاں کی بارشوں میں اپنے تن کو اچھی طرح ڈھانپے بغیر زمین میں صرف اس لئے ہل چلاتا ہے کہ ضلع کے چند گھرانے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرسکیں جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھتے

لہ مسٹر ولیم ہنٹر کی کتاب ضلع جیسور صفحہ ۶۷۔ میں اپنی کتاب (ANNALS OF RURAL BENGAL) کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور صرف یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک اضلاع کے ریکارڈ کو واضح طور پر ترتیب دے کر یورپین اقوام کے سامنے پیش کرنے کا انتظام نہ کیا جائے گا اُس وقت تک ہندوستانی حکومت انگریزی قوم کے ساتھ تاریخی ناانصافیاں کرنے کی مجرم ٹھہرے گی۔ مگر شاید وہ حکومت جس نے ایسی وسیع حکومت کو تہ و بالا کیا ہے جس سے کم درجہ کی حکومت کے مقابلہ میں جولیس سیزر کا بہادرانہ کام رہا تھا اور جس نے ہندوستان کے مظلوم باشندوں اور تباہ شدہ مذاہب کی ایک خوشحال سلطنت قائم کردی ہے اپنی شاندار خدمات کی تحریری تاریخ سے اغماض کرے تو وہ قابل معافی ہے۔

کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بے چاروں کی جان میں جان آگئی سب سے بڑی ناانصافی جو ہم نے مسلمان امراء سے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے اُن کے حقوق کی تعیین کر دی اِس سے پہلے نہ اُن کے حقوق کوئی مستقل حیثیت رکھتے اور نہ متعین تھے۔ حکومت وقت کے بہت سے تسلیم شدہ حقوق کی بیش بہا قربانی کے بعد ہم نے ملکیت زمین کو موروثی کر دیا گو یا وہ اب مستقلاً اُس کے مالک تھے۔ مگر جو قوم صدیوں سے قابل نفرت لوٹ مار کی عادی ہو چکی ہو محض گورنر جنرل کے لکھ دینے سے اپنی جاگیروں کے انتظام کا پُرامن مشغلہ اختیار نہیں کر سکتی۔ دیہاتیوں پر مسلمانوں کے ظلم ختم ہو گئے اور تیس سال بعد داگذاری کے قانون نے اُن کی قسمتوں پر اخیری مہر لگا دی۔ ان قوانین کی مزید وضاحت آگے چل کر کی جائے گی یہاں صرف اتنا بتلا دینا کافی ہوگا کہ پٹوں کے باقاعدہ لکھے جانے سے حکومت کی آمدنی میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا جتنا کہ مسلمان اپنے شہنشاہوں کے ماتحت گمان بھی نہ کر سکتے تھے۔ گذشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمان گھرانے یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا اُن لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے سربلند کیا ہے لیکن پھر بھی اُن کی سرکشی گستاخی اور کاہلی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ایسا کیوں نہ ہو آخر وہ نوابوں اور فاتحوں کی اولاد ہیں

مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اُس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز عمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان امرا کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے اُن کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کیونکہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا۔ مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پُرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پُرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی۔

اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات و واقعات پہ زیادہ زور دینا ناواجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہونے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں مسلمان کلکٹر ہی مالگذاری جمع کرتے تھے۔ مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا محکمہ جس کا صدر مقام نظام کے محل واقع مرشد آباد میں تھا اور صوبے کے تمام اضلاع میں اُس کے افسروں کا جال بچھا ہوا تھا فوجداری قوانین نافذ کرتا تھا مسلمان جیلر بنگال کے تمام قیدیوں سے رشوت لیتے تھے یا اپنی مرضی سے بھوکوں مرتے تھے۔ قاضی یعنی اسلامی قوانین کے ماہر دیوانی اور خانگی عدالتیں قائم کرتے تھے یہاں تک کہ جب ہم نے تربیت یافتہ انگریز افسروں کے ذریعے انصاف کرانا چاہا تو یہی قاضی قانونی نکات پر مشورہ دینے کے لئے اُن کے ساتھ بیٹھتے۔ اسلامی شریعت ہی ملک کا قانون تھا اور حکومت کے تمام کارپرداز اور ماتحت افسر بدستور مسلمان ہی تھے۔ وہی سرکاری زبان بول سکتے تھے اور وہی سرکاری دستاویزات پڑھ سکتے تھے جو فارسی کے شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانونی میں اُس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اُس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دور حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا۔ لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رُخ بدل گیا۔ پہلے تو اُس کی رفتار کمزور تھی لیکن جوں جوں کاروبار سلطنت کو دیسی زبان میں نہ کہ "توس" میں جو مسلمان فاتحوں کی غیر ملکی زبان تھی چلانے کی ضرورت کا احساس بڑھتا گیا یہ رفتار بھی بتدریج تیز ہوتی گئی اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں بھی جہاں اب بھی پرانے طریقہ کے مطابق دوستی کی بنا پر ملازمت مل جانے کا امکان ہے بہت کم مسلمان افسر ہیں[1]۔ جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں باقی ہیں وہ بہت بوڑھے

[1] عملہ۔

ہیں ان کا کوئی جانشین نہیں۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر یا مالگذاری کے افسر کی اسامیاں مسلمانوں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب جیل کی ایک دو غیر مشہور اسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار اسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلےٰ ملازمتیں بھی سرکاری سکول کے چالاک ہندو لڑکوں سے پُر کی جاتی ہیں۔[1]

اگر غیر مشہور نان گزیٹڈ افسروں کے جم غفیر سے لے کر اعلےٰ عہدوں تک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سوال شخصی آرا کی حدود سے نکل کر یقینی طور پر اعداد و شمار کی حد میں پہنچ جاتا ہے۔ دو سال کا عرصہ ہوا میں نے ایک سلسلہ مضامین میں ثابت کیا تھا کہ بنگال کے قانونی اور مالگذاری کے محکمے میں جس کی ملازمت کی بڑی خواہش کی جاتی ہے اور جس میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو رہے ہیں۔ ان مضامین کا ترجمہ بہت جلد فارسی میں ہو گیا۔ اور بہت سے دیسی اور اینگلو انڈین اخبارات نے اُن کو نقل کیا تھا یا اُن پر بحث کی۔[2] حکومت بنگال نے مسلمانان کلکتہ کی اعلےٰ تعلیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کی تھی لیکن اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس بیان کے ساتھ ذیل کے اعداد و شمار زیر نظر رکھئے۔ سب سے اعلےٰ عہدوں کی جو اسامیاں پچھلی نسل سے پُر کی گئی تھیں اُن میں مسلمانوں کو زیادہ شکایت کی گنجائش نہیں کیونکہ اپریل ۱۸۶۹ء میں ہر دو ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان تھا۔ اور اب ہر تین ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے۔ دوسرے درجہ میں اُس وقت تناسب دو مسلمان اور نو ہندوؤں کا تھا اور اب ایک مسلمان اور دس ہندوؤں کا ہے۔ تیسرے درجہ میں اُس وقت چار مسلمان اور باقی ستائیس ہندو اور انگریز تھے اور اب تین مسلمان اور باقی چوبیس ۲۴ ہندو اور انگریز ہیں۔ جب ہم چھوٹے درجوں میں جاتے ہیں تو ۱۸۶۹ء میں تمام اقوام کے لوگوں کی کل تعداد تیس تھی جن میں چار

---

[1] یہ تمام بیانات تمام صوبہ پر عموماً راست آتے ہیں لیکن بھاگلپور اور پٹنہ کے ڈویژن کو چھوڑ کر باقی تمام اضلاع پر خصوصاً راست آتے ہیں

[2] شمال مغربی صوبے کے بہترین اخبار پانیر میں۔ اس باب میں میں نے اُن مضامین سے بہت مدد لی ہے۔

مسلمان تھے اور اب انتالیس کی کل تعداد میں صرف چار ہیں۔ امیدواروں میں جن سے اسامیاں پُر کی جاتی ہیں کل دُو مسلمان تھے اور اُن کی کل تعداد اٹھائیس تھی لیکن اب اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں۔

بہرحال غیر مشہور محکموں میں جہاں بنگال کی سیاسی جماعتیں تناسب کا بہت زیادہ خیال نہیں کرتیں مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہے ۱۸۶۹ء میں ان محکموں میں تناسب یہ تھا۔ اسسٹنٹ گورنمنٹ انجینئرز کے تین درجوں میں چودہ ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ نو آموز طبقہ میں چار ہندو دو انگریز مسلمان ایک بھی نہیں۔ محکمہ پبلک ورکس کے سب انجینئروں اور اوورسیروں میں چوبیس ۲۴ ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف ایک مسلمان تھا اور سیروں میں تریسٹھ ہندو تھے اور دُو ۲ مسلمان تھے۔ اکوٹنٹ آفس میں پچاس نام ہندوؤں کے تھے اور مسلمان کا صفر۔ اپر سبارڈینیٹ محکمہ میں بائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہیں۔

لیکن اس تسلیم شدہ حقیقت کی اور مثالیں پیش کرنا جو سول لسٹ کے ہر صفحہ سے عیاں ہیں غیر ضروری ہے میں نے اُن گزیٹڈ ملازمتوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جن پر ہندو مسلمان اور انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں۔

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۸۷۱ء میں	یورپین	ہندو	مسلم	کل تعداد
کوونٹ سول سروس جن کا تقرر انگلستان میں بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے	۲۶۰	×	×	۲۶۰
عدالت ہائے دیوانی کے افسر (غیر منظور شدہ) اضلاع میں	۴۷	×	×	۴۷
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۲۶	۷	×	۳۳
ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
انکم ٹیکس اسیسر	۱۱	۴۳	۶	۶۰
رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۱	۱۷۸	۳۷	۲۱۶

محکمہ پولیس۔ تمام گریڈ کے افسر	۱۰۶	۳	x	۱۰۹
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ انجینئر	۱۵۴	۱۹	x	۱۷۳
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	۷۲	۱۲۵	۴	۲۰۱
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اکوئنٹ	۲۲	۵۴	x	۷۶
میڈیکل ڈیپارٹمنٹ۔ میڈیکل کالج جیل۔ خیراتی ڈسپنسری۔ حفظان صحت	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
چیچک کا ٹیکہ اور اضلاع کے میڈیکل افسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً چنگی۔ بحری افسر۔ افیون سروے	۴۱۲	۱۰	x	۴۲۲
کل تعداد	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے جو اُن کے سابق فاتح اپنے دسترخوان سے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اب ایک اور سات کا ہے ہندوؤں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور دو کا۔ مسلمانوں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا۔ تمام نظام حکومت میں اُس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تیئیس رہ گیا ہے اور وہ بھی اُن گزیٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی تو پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے۔ دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اِس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپڑاسی۔ دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنیوالا کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں۔

کیا ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ کیا اُن کو صرف ایک ایسے غیر جانبدار ماحول کی تلاش تھی جس میں رہ کر مسلمانوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائیں؟ کیا مسلمانوں کے پاس سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے دوسرے ذرائع بکثرت موجود ہیں اس لئے وہ سرکاری ملازمتوں سے بے اعتنائی برتتے اور ہندوؤں کے لئے اس میدان کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں؟

بے شک ہندو مسلمانوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ مگر ابھی تک انہوں نے اُس عام اور نمایاں فوقیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا جو گورنمنٹ کی ملازمتوں میں اجارہ داری کے لئے ضروری ہے اور ایسا کرنا اُن کی گذشتہ تاریخ کے بالکل خلاف بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلےٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکومت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔

اعلےٰ خاندان مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی پیشہ باقی رہ گیا ہے اور وہ پیشہ وکالت کا ہے طبابت کا پیشہ جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا۔ بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہز میجسٹی کے ہائیکورٹ آف جوڈیکیچر میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں ہے، اس زمانہ میں انگلو انڈین اور ہندو اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہائی کورٹ کے جج کبھی اُس قوم میں سے مقرر کئے جائیں گے جو تمام عدالتی محکموں پر قابض تھی پچھلی دفعہ جب میں نے ۱۸۶۹ء میں اعداد و شمار جمع کئے تھے تو ان کا تناسب حسب ذیل تھا۔ سرکاری قانونی افسر کل چھ تھے جن میں چار انگریز تھے اور دو ہندو اور مسلمان ایک بھی نہیں۔ ہائی کورٹ کے ملازمین جن کا عہدہ اتنا وقیع تھا کہ اُن کا نام شائع کیا جائے کل اکیس کی تعداد میں تھے اُن میں سے سات ہندو تھے مسلمان کوئی نہ تھا بیرسٹروں میں سے تین ہندو تھے جن کی تعداد اب یقیناً اور زیادہ بڑھ گئی ہوگی لیکن مسلمان

ایک بھی نہیں۔

اگر ہائی کورٹ کے وکلاء کی فہرست دیکھی جائے جن کا درجہ بیرسٹروں سے ذرا کم ہے تو یہ داستان اور بھی زیادہ عبرتناک ہو جائے گی۔ یہ اُس پیشہ کا ایک شعبہ ہے جو تمام کا تمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا اور اُس زمانہ کے کئی ایک آدمی ابھی تک بقید حیات موجود ہیں ذیل کی فہرست ۱۸۳۴ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۸۶۸ء کے وکلاء میں سے ایک انگریز ایک ہندو اور دو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں۔ ۱۸۳۸ء تک مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھی اور اُن کا تناسب تھا چھ مسلمان اور سات ہندو اور ایک انگریز۔ جتنے وکلاء ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان (ان دونوں سالوں کو شامل کرتے ہوئے) داخل فہرست کئے گئے ہیں اُن میں سے ۱۸۶۹ء کے زندہ وکلاء میں سے سب کے سب مسلمان ہیں ۱۸۵۱ء تک بھی مسلمان اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے اور حقیقت میں وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھے لیکن ۱۸۵۱ء سے یہ صورت حالات بدلنا شروع ہوتی ہے اب نئے نئے آدمیوں نے میدان میں آنا شروع کیا۔ قابلیت کے مختلف معیار قائم ہوئے چنانچہ اب فہرست کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۸ء تک کل دو سو چالیس ہندوستانی داخل کئے گئے جن میں دو سو اٹھتالیس ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان۔

اب ہم اس قانونی پیشہ کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۱۸۶۹ء میں ہائی کورٹ کے قانونی پروکٹر اور سالیسٹروں میں سے ستائیس ہندو تھے اور مسلمان ایک بھی نہ تھا آئندہ قانون داں بننے والوں میں سے چھبیس ہندو ہیں مسلمان کوئی نہیں غرضیکہ اس پیشے کے کسی شعبے کا ذکر کیا جائے نتیجہ ہر حال میں یکساں ہوگا جب ۱۸۶۹ء میں جب ہائی کورٹ کے دفتر میں سترہ ملازمین کی یہ حیثیت تھی کہ اگر اُن کے نام شائع کر دیئے جائیں تو اُن میں چھ انگریز یا ایسٹ انڈین ہوں گے گیارہ ہندو اور مسلمان صفر۔ ریسیور کے دفتر سے چار نام ملے ہیں جن میں دو انگریز۔ دو ہندو اور مسلمان کوئی نہیں۔ کلرک اوف دی کراؤن اور ٹیکس افسر کے دفتر میں انگریزوں کی تعداد چار تھی ہندوؤں کی پانچ لیکن مسلمان مفقود۔ محکمہ قانون کے کونے کونے سے اکوٹس رشرف۔ کورونر اور مترجمین کے دفاتر سے بیس نام بھیجے گئے

اُن میں آٹھ انگریز گیارہ ہندو اور صرف ایک مسلمان اس فہرست میں اپنی قوم کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن یہ بے چارہ ایک ملا تھا جسے ہفتہ میں صرف چھ شلنگ تنخواہ ملتی ۔ لے

اب طبابت کی باری آتی ہے بدقسمتی سے یہ پیشہ جیسا کہ ہندوستانی اطبا میں رائج ہے اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے نزدیک پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک معزز مسلمان کے ہمیشہ دو طبی مشیر ہوں گے۔ ایک تو وہ جسے انگریزی میں عام طور پر معالج کہتے ہیں اور جسے اپنے آقا کی نظر میں بڑی عزت اور وقعت حاصل ہوتی ہے دوسرا جراح جس کو عرف عام میں حجام کہتے ہیں۔ داڑھی مونڈنے سے لے کر عضو کاٹنے تک تمام اعمال جراحی یہی کرتا ہے پھر طب و جراحت کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ جس طبیب کی حالت ذرا بھی اچھی ہے وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ البتہ حجام جراح اس قسم کی حدود کا پابند نہیں۔ عملی طور پر ہر قسم کی طب اس کی حدود میں داخل ہے۔ حقیقی مسلمان اطبا بہت ہی کم ہیں اور روز بروز کم ہوتے چلے جاتے ہیں شمالی ہندوستان کے شہروں میں گو ابھی تک اُن کا چرچا ہے مگر بنگال کے اضلاع میں وہ بالکل معدوم ہیں طبابت کا پیشہ اب ان پڑھ حجاموں کے ہاتھ میں ہے یا ہندو ڈاکٹروں کے ۔ ٢ے

دراصل پرانے مسلمان طبیب جو اب تک شمالی ہندوستان میں موجود ہیں عالم اور گوشہ نشین ہیں اور اس پیشے میں سرگرمی سے حصہ نہیں لیتے وہ اس فن کو عربی اور فارسی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں، انگریزی فن طبابت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اس کو حجام جراحوں کا پیشہ سمجھتے ہیں۔ بنگال میں تو یہ حال ہے کہ جہاں کہیں بھی حکومت نے طب کی تعلیم کا کوئی بہتر انتظام کیا وہاں اس فن کو سیکھنے کے لئے اعلیٰ خاندان کے مسلمان داخل ہی نہیں ہوتے ادنےٰ طبقے بلکہ رذیل زندگی بسر کرنے والے غریب اور نادار لڑکوں کا ایک جم غفیر اس غرض کے لئے جمع ہو جاتا ہے کہ انہیں صرف اس قدر مفت تعلیم دے دی جائے جس سے اس قابل ہو جائیں کہ فوجوں میں دوا فروشی

لے (تقریباً چھ روپے ماہانہ (مترجم))

٢ے ہندو ڈاکٹر بھی دو قسم کے ہیں کویراج جو دیسی طریق علاج پر قائم ہیں اور دوسرے انگریزی کالجوں کے مستند ڈاکٹر۔

کرسکیں مختصراً یہ کہ وہ پہلے زمانہ ہی کے حجام جراح ہیں جن کو مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جن کی حیثیت مسلمان طبیب تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ بڑے ناشکر گزار ہیں اور اگر ان کو فوجی پابندیوں کے تحت نہ رکھا جائے تو وہ اپنے استادوں کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آئیں گے۔ خوش قسمتی سے مجھے بہت سے ہندو ڈاکٹروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اُن کے علم اور اخلاق نے ان کو اُس عزت کا مستحق بنا دیا ہے جو اُن کے شریف پیشہ کے شایان شان ہے لیکن اس قسم کے کسی مسلمان ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دراصل مسلمان فن طب کے کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کے متمنی معلوم نہیں ہوتے بہرحال ۱۸۶۹ء میں اعداد و شمار حسب ذیل تھے

کلکتہ یونیورسٹی سے طبی سند حاصل کرنے والوں میں چار ڈاکٹر تھے تین ہندو اور ایک انگریز لیکن مسلمان سرے سے ندارد۔ ایم۔ بی کی سند حاصل کرنے والوں کی کل تعداد گیارہ تھی یعنی دس ہندو اور ایک انگریز۔ ایل ایم کی سند ایک سو چار نے حاصل کی اُن میں پانچ یورپین تھے اور اٹھانویں ہندو اور صرف ایک مسلمان حال ہی میں حکومت نے دو ملکی ڈاکٹروں کو جن کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے ہے بہادر کے دو خطاب عطا کئے ہیں سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری تھا کہ ایک خطاب کسی ہندو کو دیا جاتا اور دوسرا کسی مسلمان کو اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان خطابات کو کس قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود سننے میں آیا ہے کہ جس مسلمان کو یہ خطاب دیا گیا ہے وہ اس خطاب اور ذاتی قابلیت کے باوجود برادران وطن کی اعلیٰ سوسائٹی میں کوئی وقعت حاصل نہیں کرسکا حقیقت میں مسلمان اس طب کو جو ہمارے سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے شرفا کا پیشہ ہی تصور نہیں کرتے۔ یہ قومی تعصب اعلیٰ خاندان کے مسلمان لڑکوں کو اس فن کے سیکھنے سے اسی طرح باز رکھتا ہے جس طرح کہ دوسرے پیشوں اور سرکاری ملازمتوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی کثیر تعداد اُن کو باز رکھتی ہے۔

مسلمانان بنگال کے پرائیویٹ خطوط اور اخباری مضامین سے زیادہ کوئی شے قابل رحم میری نظر سے نہیں گذری۔ کچھ مدت ہوئی کلکتہ کے ایک فارسی اخبار نے لکھا تھا[۱] "آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ

---

[۱] اخبار دوربین جولائی ۱۴، ۱۸۶۹ء۔

چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے خصوصاً ہندوؤں کو۔ حکومت اپنی تمام رعایا کو برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔ لیکن وقت ایسا آگیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند اسامیاں خالی ہوئیں تھیں اُس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔ [1]

الغرض مسلمان اب یہاں تک قعر مذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی اُن کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے اُن کی قابل رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا اعلیٰ حکام تو اُن کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں [1]

ذیل کے فقرات اُس درخواست سے لئے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانان اڑیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی۔ اُن پر تکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آجائے مگر اس صوبے کے سابق فاتحین کی حالت زار جس سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لئے التجا کی ہے بڑی ہی افسوسناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی۔

"ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جا رہا ہے اور اُن کے سربلند ہونے کی کوئی اُمید نہیں۔ مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پرسان حال نہیں۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کے حضور میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ کے ڈویژن میں ہز مجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالا ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا اپنی

---

[1] فارسی اخبار کے اس بیان کی تصدیق کرنے کے لئے میرے پاس اس وقت سرکاری ذرائع موجود نہیں۔ اس بیان پر اس وقت ضروری کچھ نہ کچھ توجہ کی گئی تھی اور اب تک اُس کی تردید نہیں کی گئی۔

سابقہ سرکاری ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مفلس اور قلاش اور اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رخ کرنے کے لئے تیار ہیں ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے مستعد ہیں ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ خطوں میں مارے مارے پھرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں ۔ اسٹلنگ (۱۰ روپے) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز ا جائے گا"

آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں پر اس طرح سرکاری ملازمتوں اور تسلیم شدہ پیشوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے؟ بنگال کے مسلمانوں میں ذہانت کی کمی نہیں اور عزت کی خلش ہر وقت ان کو اس بات پر اکساتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ حکومت نے تمام بنگال میں سکولوں کا جال پھیلایا ہوا ہے اور اس کے بہت سے اضلاع میں مسلمان آبادیں اس کے باوجود یہ اسکول ایسی مسلمان جماعت پیدا کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے جو یونیورسٹی کے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو یا کسی پیشہ ہی میں داخل ہو سکے انہی سکولوں سے ہر سال اچھے لکھے پڑھے ۔ بلند ہمت اور ذہین ہندو نوجوانوں کی کثیر تعداد یونیورسٹی میں داخل ہوتی اور اس کے بعد زندگی میں دولت و عزت کے ہر شعبہ پر قابض ہو جاتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم جس نے ہندوؤں کو ان کی صدیوں کی نیند سے جگایا اور ان کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ جذبات پیدا کر دیئے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور ان کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے ۔ بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے ۔ ہندو اسلامی حکومت کے ماتحت بھی اپنی قسمت پر ایسے ہی مطمئن تھے جیسے کہ اب ہماری حکومت میں ۔ آج کل ترجیح صرف اُس شخص کو دی جاتی ہے جو انگریزی زبان جانتا ہو اور ہندو انگریزی خوب سیکھتے ہیں ۔ اس سے پہلے ترجیح اُس شخص کو دی جاتی تھی جو فارسی زبان جانتا تھا ۔ لہٰذا ہندو اُس وقت فارسی بھی خوب سیکھ لیا کرتے تھے یہاں تک کہ ۱۵۰۰ء ہی میں انہوں نے اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا ۔ اُس زمانہ کے ہندو مصنفین کے اشعار اب بھی ملتے ہیں ۔ ہندو اگرچہ کافر تھا لیکن ایک مسلمان نوجوان کا اتالیق ہونے کی حیثیت سے سرکاری عہدہ دار

بنتا اور پھر مسلمانوں ہی کے علوم کا درس بھی دیتا۔ اکبر کے عہد میں ہندوؤں نے اپنے روشن ضمیر بادشاہ سے پورا پورا تعاون کیا اور بعض نے اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی پیدا کئے۔ البتہ عوام میں فارسی کا چرچا اُس وقت ہوا جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ فارسی کا پڑھنا نفع بخش ہے۔ سولھویں صدی کے اخیر میں حکومت کے وزیر مالیات نے جو خود بھی ہندو تھا حکم جاری کیا کہ اب سے تمام حسابات فارسی زبان میں لکھے جائیں گے۔ چنانچہ محکمہ مالیات کے تمام ہندو ملازموں نے فارسی زبان سیکھ لی۔ بعینہ جب ہم نے سرکاری دفاتر میں انگریزی زبان رائج کی تو ابن الوقت ہندوؤں نے فوراً اس زبان کو اس حد تک سیکھ لیا جہاں تک زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اس کا سیکھنا ضروری تھا۔ ہم سے پہلے مسلمانوں کی حکومت میں جو زبان سرکاری طور پر رائج تھی اور اب ہماری حکومت میں جو زبان سرکاری ہے اُن کے لئے دونوں کی حیثیت اجنبی ہے اور وہ ان سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے مگر یہ کہ وہ اُن کے لئے ترجیح حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ پھر چونکہ سرکاری سکول انہیں کامیابی کا یہ طلسم اُس خرچ کے نصف سے بھی کم پر دے دیتے ہیں جو حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے لہٰذا انہوں نے ہمارے طریقہ تعلیم کو پچھلے طریقہ تعلیم پر ترجیح دے رکھی ہے لیکن مسلمانوں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے۔ پھر اُس ہندوستانی مدبر کے الفاظ میں جو اُن سے بخوبی واقف تھا، ”اُن کا تعلیمی نظام اگرچہ اُس نظامِ تعلیم کے مقابلہ میں کم درجے پر ہے جسے ہم نے رائج کیا ہے لیکن پھر بھی اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے کیونکہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا۔ اُس کی بنیادیں بالکل ہی ناقص اصول پر نہ تھیں گو اُن کے پڑھانے کا طریقہ بہت پُرانا تھا۔ لیکن یقینی طور پر وہ ہر اُس طریقہ سے برتر تھا جو اُس وقت ہندوستان میں رائج تھا۔ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے پھر یہی اور صرف یہی ایک واسطہ تھا جس کے ذریعہ ہندو اپنے ملک کی حکومت میں کم سے کم حصہ لینے کی صلاحیت پیدا کر سکتے تھے“ ۱؎ ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے پچھتر سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی

۱؎ مسٹر ای رسی بے کلے سی۔ ایس آئی۔

طریقہ تعلیم سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے گو اس دوران میں ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقے کو خیر باد کہہ دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگر مسلمان ذرا بھی عقلمند ہوتے تو وہ اس تبدیلی کو بھانپ جاتے اور اپنی قسمت پر قناعت کرتے مگر ایک پورانی فاتح قوم اپنے شاندار ماضی کی روایات کو جلد فراموش نہیں کر سکتی۔ مسلمانان بنگال نے اُس نظام کو ٹھکرا دیا جس سے وہ اُن لوگوں پر کوئی فضیلت نہیں رکھ سکتے جو صدیوں سے ان کے محکوم تھے اور جن کو بت پرست سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا یا غلام قوم سمجھ کر نفرت کا اظہار ہوتا۔ مزید برآں مذہب نے بھی اس جدید نظام کے خلاف جلتی آگ پر تیل کا کام دیا۔ مدت تک تو اس بات کا ہی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ایک مسلمان اپنی روح کو اذیت پہنچائے بغیر سرکاری اسکولوں میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ جدید نظام انگریز استادوں کے ماتحت رائج کیا جاتا یا زیادہ جرأت سے کام لے کر اپنی زبان کو سرکاری زبان قرار دیتے تو مسلمانوں کی مذہبی دشواریاں کم از کم ایک لحاظ سے آسان ہو جاتیں۔ کیونکہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عیسائی مذہب اگرچہ بالکل صداقت پر نہیں جیسا کہ پیغمبر اسلام واضح فرما چکے ہیں بہرکیف ایک الہامی مذہب ہے جسے انسان کے لئے نازل کیا گیا۔ البتہ ہندو دھرم اُن کے نزدیک ایک قابل نفرت چیستان ہے۔ بھوتوں اور بتوں کی پرستش کا ایک نظام جس میں خدائے واحد کی پہچان کے لئے روشنی کی ایک شعاع بھی نہیں ملے گی۔ [1] جنوبی بنگال میں ہمارے سرکاری سکولوں کی زبان ہندی ہے اور معلم بھی ہندو لیکن مسلمانوں نے بت پرستی کی تعلیم کو بت پرستوں ہی کی زبان میں حاصل کرنے کو بحقارت ٹھکرا دیا۔

لیکن اس نفرت نے رفتہ رفتہ زندگی کی بدلی ہوئی ضروریات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مذہب جس نے شروع شروع میں ہمارے سکولوں کے خلاف عوام کے جذبہ نفرت و حقارت کو دو چند کر دیا تھا متذبذب

[1] مجھے یہاں یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں اس بیان کے بالکل مخالف ہوں میرے خیال میں اب تک غیر تربیت یافتہ عیسائیوں کا بھی یہی خیال ہے۔ مسلمانوں کو اُن لوگوں کے مذہب سے جس پر وہ حکومت کرتے تھے بے خبری کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے

ہوگیا۔ اور وقت کے سب سے بڑے عالم دین شمس الہند کے فتوؤں کی تاویل جن کا ذکر اس کتاب میں کئی بار آچکا ہے اس طرح کی جانے لگی کہ وہ انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں۔ اس مشہور و معروف عالم دین نے ایک فتوے انگریزوں کی ملازمت کے متعلق اس سے پہلے بھی دیا تھا۔ اُن کا فیصلہ تھا کہ بعض سرکاری ملازمتوں میں کوئی عیب نہیں بعض ایسی ہیں جو نہ اچھی ہیں اور نہ بُری لیکن بعض بالکل ممنوع۔ اگر انگریز مسلمانوں کو قابل تعریف کاموں کے لئے ملازم رکھیں۔ مثلاً شرع محمدی کے مطابق مفتی۔ سڑکوں اور غریبوں کے لیے مسافر خانوں کے اور سیر یا جائداد کی حفاظت اور چوروں کا قلع قمع کی خدمت تو یہ ملازمتیں جائز ہیں کیونکہ حضرت یوسف مصر کے کافر بادشاہ کے خزانچی اور پولیس کے افسر اعلےٰ تھے۔ اور اسی طرح حضرت موسیٰ نے حضرت موسےٰ کو دودھ پلانے کے لئے فرعون کی ملازمت کی تھی۔ لیکن اگر کوئی ملازمت انسانوں کو بے دینی کی طرف لے جائے تو جو مسلمان اسے اختیار کرے گا گنہگار ہوگا۔

ایسے ہی جب ان کے مریدوں نے سوال کیا کہ کیا منطق یا انگریزی کا پڑھنا جائز ہے تو اُنہوں نے کہا منطق اگرچہ نجات کے لئے ضروری نہیں مگر صرف و نحو کی طرح اس سے علم حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر کوئی شخص منطق کو اس لئے پڑھتا ہے کہ دین پر اعتراضات کرے تو گنہگار ہے اور اگر محض علم کی حیثیت سے پڑھے تو پھر اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ انگریزی کو اس لئے پڑھنا کہ انسان کتابیں پڑھ سکے، خط لکھ سکے اور الفاظ کے مخفی معنوں کو معلوم کر سکے جائز ہے کیونکہ زید ابن ثابت نے رسول کریمؐ کے حکم سے یہود اور نصاریٰ کی زبان اور اُن کی لغت پڑھی تھی تاکہ وہ اُن خطوط کا جواب لکھ سکیں جو رسول کریمؐ کو یہود اور نصاریٰ کی طرف سے آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انگریزی زبان کو اس لئے پڑھتا ہے کہ اُس سے عیش و عشرت حاصل ہو یا اس لئے کہ انگریزوں سے اتحاد پیدا کیا جائے تو وہ گنہگار ہے اور قانون کی حدود کو توڑتا ہے جیسا کہ لوہے کے ہتھیار کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اگر اس لئے بنایا گیا کہ اُس سے چوروں کو نکالا یا گرفتار کیا جائے تو کار ثواب ہے لیکن اگر اس لئے بنایا گیا ہے کہ ان کی مدد کی جائے تو یہ معصیت اور گناہ میں داخل ہے

مگر زیادہ پُرجوش مسلمانوں نے سرکاری سکولوں کی تعلیم کو کبھی جائز نہیں سمجھا جہاں دنیا دار مسلمانوں نے ہمارے سلسلہ تعلیم سے کچھ رعائتیں لیں وہاں زیادہ متعصب لوگ اُس سے اور بھی دور بھاگنے لگے۔ گذشتہ چالیس سال میں انہوں نے سپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کر لیا ہے مثلاً اُن کا لباس الگ۔ سلام کرنے کا طریقہ الگ علی ہذا البعض دوسرے بیرونی امتیازات جن کی اپنی عظمت کے ایام میں انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی تھی ۱۸۶۰-۶۲ء میں ہمارے سکولوں میں ایک مسلمان کے مقابلے میں دس ہندو تھے اور یہ نسبت اب پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے لیکن اس زیادتی کی وجہ ہمارے ضلع کے سرکاری اسکول نہیں بلکہ دیگر امدادی ادارے ہیں۔ انگریزی سکولوں میں طلباء کی مجموعی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور وہ افسر جو وہاں مقدمات کا انچارج تھا اور جس کی سند پر میں یہ بیان لکھ رہا ہوں کہتا ہے کہ مسلمان طالب علموں کی تعداد کو ان کی مجموعی آبادی سے کوئی معقول نسبت نہیں۔

بات یہ ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم مسلمانوں کے تین ایسے رجحانات کو جو سراسر طبعی ہیں بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اول یہ کہ ذریعہ تعلیم بنگال کی دیسی زبان ہے جس سے تعلیم یافتہ مسلمان نفرت کرتے ہیں اور ماسٹر ہندو جن کو ساری مسلمان قوم حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بنگالی سکول ماسٹر جب اپنی دیسی زبان اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں گفتگو کرتا ہے تو وہ مسلمانوں کے لئے بھی ایسی ہی اجنبی ہے جیسی ہمارے لئے۔ پھر اس کے عاجزانہ اور بزدلانہ طور طریق اس قابل نہیں کہ مسلمان بچوں میں ضابطہ قائم رکھ سکے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک مسلمان زمیندار نے ایک انگریز افسر سے کہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ اپنے بچوں کو بنگالی سکول ماسٹر کے پاس بھیجے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیہاتی سکول اس قابل نہیں کہ یہاں مسلمان اُن زبانوں کو حاصل کر سکیں جو زندگی میں قابل عزت جگہ کے حصول اور مذہبی فرائض کی بجا آوری کے لئے ضروری ہیں۔ ہر شریف مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تھوڑی بہت فارسی جانتا ہو۔ لیکن فارسی وہ زبان ہے جو ہمارے اضلاع کے اعلیٰ سکولوں میں بھی پڑھائی نہیں جاتی۔ مسلمان خواہ دیہاتی ہو خواہ شہزادہ اس بات پہ مجبور ہے کہ اپنی نماز

کسی متبرک زبان یعنی فارسی[لہ] یا عربی میں ادا کرے مگر ان زبانوں کو ہمارے اسکولوں نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک فتوے لے شائع ہوا تھا کہ مسلمانوں کی نماز اُس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہیں ہوگی جبتک کہ انکو خاص زبان میں ادا نہ کیا جائے تیسرے ہمارے طریقہ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کیلئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہم اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے ایک بہت بڑی اور طاقتور ذات چلی آتی ہے جو بچوں کی تعلیم کے اس حصے کو پورا کر دیتی ہے لیکن مسلمانوں میں اس قسم کی کوئی مذہبی جماعت نہیں ہر مسلمان گھر کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں جو شخص سب سے زیادہ بزرگ ہے وہ مذہبی فرائض کو کما حقہ جانتا ہے بلکہ مذہباً پورے خاندان کی رہنمائی کرتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ نماز با جماعت مسجدوں ہی میں ادا کی جاتی ہے مگر یہ صرف اسلام ہی کی شان ہے کہ اُس میں مساجد کی تعمیر ضروری نہیں کیونکہ نماز خدا کی زمین اور اُس کے آسمان کے نیچے ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے ایسی تعلیم کا طریقہ جو سراسر دنیاوی ہو بہت ہی تھوڑی قوموں کے مزاج کے مطابق ہے چنانچہ بڑے بڑے قابل مدبروں کے نزدیک ایسے طریقہ تعلیم کو آئرلینڈ میں بالکل ناکامی ہوئی۔ پھر اسلامی بنگال کے متعلق تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس جاہل اور متعصب کاشتکاروں کی افتاد طبیعت کے سراسر منافی ہے۔

ایک اعلےٰ افسر لکھتا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے پرہیز کر رہے ہیں جو اُن کے طبعی رجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے از حد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر اُن کے مفاد کے خلاف ہے اور اُن کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے۔

لیکن اس کے باوجود اکثر انگریزوں کی یہ عادت ہے کہ دوران ملازمت میں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ کے لئے غم و غصہ کے جذبات پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ کیوں اُس تعلیم کو ٹھکرا رہے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچا دینے کی کوشش کر رہے ہیں پھر جس آسانی سے ملک کی دوسری قوموں نے اس تعلیم کو حاصل کرنے

لہ بنگالی مسلمانوں کے نزدیک فارسی بھی بہت حد تک متبرک ہے کیونکہ اس زبان کے ذریعے اُن میں اسلام کے قوانین اور احکام پہنچے ہیں۔

پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ انکار اور بھی زیادہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ اہل وقت ہندو کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا نہیں لہذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان خواہ مخواہ کیوں اپنے لئے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں دراصل ہم نے اُس امتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو بذات خود اتنا ہی پُرانا ہے جتنا انسان کا مذہبی رجحانِ طبیعت۔ یعنی وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اور ہر قوم میں خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے جدا رکھا۔ مشرک اپنی پرستش کے لئے بہت سے خدا رکھتے ہیں اور اس بنا پر ان کے اعتقادات کے بھی کئی ایک حصے ہو جاتے ہیں۔ گبن نے یونانیوں کے متعلق جو آخری فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت ہندو پر کہیں زیادہ ٹھیک عائد ہوتا ہے "وہ ناقابل تقسیم اور باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے اعتقاد پسند دل و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے۔ یونانی علم الاصنام کی بناوٹ ہزارہا قسم کے آزاد اور لچکدار حصوں کا ایک مجموعہ ہے لہذا ان معبودوں کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اور درجے مقرر کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے اس قسم کی آزادی ناممکن ہے۔ مذہب ان سے غیر مشروط، سرگرم حتٰے کہ پُرتعصب اعتقاد کا خواہاں ہے لہذا جو طریقہ تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کرے کسی سچے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

حکومت کی مذہبی حیثیت کو صدمہ پہنچائے بغیر ہم مسلمانوں سے اس معاملہ میں کہاں تک انصاف کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق بعد میں بحث کی جائے گی لیکن سردست مسلمانوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ جو روپیہ تعلیم کے لئے سرکار آبادی سے بغیر کسی امتیاز کے حاصل کرتی ہے وہ صرف ایسے طریقہ پر خرچ کیا جاتا ہے جس کا فائدہ ہندوؤں کو پہنچتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے خلاف یہی ایک الزام نہیں جو سب سے زیادہ سنگین ہو۔ ہم نے صرف ایک ایسا طریقہ تعلیم ہی رائج نہیں کیا جو مسلمانوں کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے ہم نے اُن کے طریقہ تعلیم کو بھی اُس سرمایہ سے محروم کر دیا جس پر اُس کی بقا کا دارومدار تھا۔ مسلمانان بنگال کا ہر اعلےٰ خاندان ایسے سکول کا خرچ

بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اُس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر اِدبار چھاتا گیا یہ خاندانی سکول کم ہوتے اور اُن کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے۔ یہ ہمارے عہد حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابل مدافعت قوت کو اُن کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کرتے۔ حکومتِ وقت ان معاملات پر ہمیشہ ناقابل سوال اور غیر مشروط اقتدار رکھتی۔ مغلوں کی بے پرواہ حکومت کے ماتحت اور اُس بدامنی کے دوران میں جس میں اس سلطنت کا خاتمہ ہوا یہ قوت کسی حد تک بارضا و رغبت اور بڑی حد تک زبردستی حاکمان صوبہ اور ان کے ماتحتوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ دہلی کے دور دراز دربار نے اس بات کو معلوم کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ جنوبی بنگال میں کیا ہو رہا ہے۔ اُن کو غرض تھی تو صرف خراج کی وصولی سے۔ ڈھاکہ اور مرشدآباد کے گورنر بھی ویسے ہی سست اور عیاش تھے اور ضلع کے انتظام کی تفصیلات سے بالکل بے پرواہ مالگزاری جمع کرنے والا زمیندار یا مقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے بشرطیکہ مالگزاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق مندر یا مسجد کے ساتھ کچھ علاقہ معافی کا وقف کر دیتا اور کوشش کرتا کہ ساری عمر کے ظلم و تعدی کا کفارہ بستر مرگ پر مختلف قسم کے نیک کاموں سے ہو جائے۔

جب ہم نے صوبہ بنگال پر قبضہ کیا تو اُس وقت کے قابل ترین افسر مال[1] کا تخمینہ تھا کہ صوبے کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگ کو اس انتہائی بے ایمانی کا حال معلوم ہوا تو ان علاقوں کی واپسی کے خلاف عوام کا جذبہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی کارروائی نہ ہو سکی۔ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو بڑی شدومد سے اٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق حکومت وقت سے منظوری نہ لی گئی ہو اُس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہیئے مگر اُس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس اصول

---

[1] مسٹر جیمز گرانٹ۔

پر کار بند ہونے کا حوصلہ نہ کرسکی۔ پھر یہ معاملہ بیس سال تک یونہی کھٹائی میں پڑا رہا اور ۱۸۱۵ء میں حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس حق پر اصرار کیا لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۲۸ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا جس کے ماتحت خاص عدالتیں مقرر کی گئیں اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبے میں مخبر، جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگزاری گشت کرتے رہے۔

واگزاری کے مقدمات پر ۸ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کی مالگزاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ منتقل ہو گیا یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فیصدی سالانہ کے حساب سے۔ اس رقم کا بہت بڑا حصہ اُن زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں اس سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے دیہاتی دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ[۱] سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ لہٰذا جو شخص غیر جانبداری سے اس کی تحقیق کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جب واگزاری کے قوانین کا مقصد محض ایسے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پرزور طریقہ پر اپنے لئے محفوظ رکھا تو پھر واگزاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں برتی گئی تھی[۲] در اں حالیکہ وہ ہندوستانیوں کی عام رائے کے بالکل خلاف تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف و صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم و رواج کا حق ایک غلط سی بات ہے لیکن پچھتر سال کا مسلسل قبضہ اس امر کا پرزور حق پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے واگزاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اُن دنوں کا خوف و ہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے

---

[۱] فرینڈ آف انڈیا۔ ۳۰ راپریل ۱۸۷۱ء جس کے حسابات کو افسران مالگزاری نے بھی تسلیم کیا ہے۔

[۲] شروع میں واگزاری کے مقدمات میں انتہائی سختی سے کام لیا گیا تھا۔ پھر کچھ سالوں تک معمولی رفتار سے چلنے کے بعد آخر کار حکومت کے حکم سے ۶ رمارچ ۱۸۴۶ء سے میں بالکل بند کر دیئے گئے۔

اس سے ہمارے خلاف نفرت و حقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہو گئی۔ اُس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا بنگال میں ہمیشہ کے لئے بند ہے سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہنچا کیونکہ ہندوستان کے سابق فرمانرواؤں نے اپنے قبالوں سے ایسی ہی بے پروائی کی تھی جیساکہ دوسرے معاملات میں لیکن جن کا چالاک اور عاقبت اندیش ہندوؤں کے ہاں کوئی امکان نہیں تھا ہم نے اُن کی معافیات کے جو ثبوت طلب کئے ان کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ قانونِ ملکیت غیر یقینی تھا اور ان کی تسلیم شدہ ذاتی جائدادوں کے معاملے میں بالکل ناکارہ پچھتر سال تک ہم نے اس انتہائی بے ایمانی کو جس کے خلاف ہم احتجاج بھی کرتے رہے جاری رہنے دیا لیکن اس کی مجموعی سزا ایک ہی نسل کو بھگتنا پڑی۔ اس دوران میں بنگال کی آب دہوا اور بنگال کی دیمک ان کی سندوں اور قبالوں کا ستیاناس کرتی رہی اس میں کچھ شک نہیں کہ واگذاری میں ہمیں اُس سے بہت کم ملا جتنا ہم سے چرایا گیا تھا لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگذاری ہی سے شروع ہوتی ہے۔ دہانی مقدمات کے ذمہ دار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔

بہرحال ان مقدمات کو تو حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے اُن کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں اُن کے پاس آج بھی نہایت اعلےٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے۔ ۱۸۰۶ء میں ہگلی کا ایک دولتمند مسلمان فوت ہو گیا اُس نے اپنی جائداد کا بہت بڑا حصہ مصرف خیر کے لئے چھوڑا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُس کے دو امانتداروں نے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا جو ۱۸۱۰ء میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ ایک دوسرے کے خلاف بددیانتی کے مقدمات دائر ہو گئے۔ اس پر ضلع کے انگریز کلکٹر نے عدالت کے فیصلہ تک اس جائداد کو اپنے قبضے لے لیا۔ یہ مقدمات ۱۸۱۶ء تک چلتے رہے۔ آخر کار گورنمنٹ نے ان دونوں

امانتداروں کو بے دخل کر دیا اور جائداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں کیا۔ ایک امانتدار تو خود گورنمنٹ بن بیٹھی اور دوسرا امانتدار وہ جسے مرضی کے مطابق نامزد کیا گیا ہو۔ اگلے ہی سال اس ساری جائداد کا دوامی پٹہ لکھا گیا اور ہر دوامی پٹہ دار سے ایک معقول رقم حاصل کر لی گئی۔ ان ادا شدہ رقوم کی میزان معہ اُس آمدنی کے جو دوران مقدمہ میں جمع ہوتی رہی ایک لاکھ ستاون ہزار پونڈ تھے (تقریباً اکیس لاکھ روپیہ) مزید برآں ۱۲ ہزار پونڈ (تقریباً ڈیڑھ لاکھ) سے کچھ اوپر کی رقم وہ جو اس وقت تک جائداد مذکورہ کی سالانہ آمدنی سے بچائی گئی۔

جیساکہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں یہ وقف مصرف خیر کے لئے کیا گیا تھا اور اس کے مصارف وصیت نامہ میں درج بھی تھے۔ مثلاً بعض مذہبی فرائض اور رسوم کی ادائیگی، امام باڑہ یعنی ہگلی کی عظیم الشان مسجد کی مرمت۔ ایک قبرستان۔ بعض وظائف اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی ادارے وغیرہ وغیرہ۔ ایک تعلیمی ادارہ بھی اس وصیت کے مقاصد کے تحت میں آتا تھا مگر وہ تعلیمی ادارہ ایسا ہونا چاہیئے تھا جو مسلمانوں کے خیال کے مطابق ہو جیساکہ وصیت کرنے والے نے خود منظور کیا ہوتا۔ اسلامی ممالک میں غریب نادار لڑکوں کے لئے کالج قائم کرنا ہمیشہ ایک نیک کام سمجھا جاتا ہے مگر اس سرمایہ سے ایک غیر مسلم کالج بنانے کی ہر کوشش وصیت کنندہ کی منشاء کے مطابق ایک الحادی کام تھا۔ اور اس سے امانتداروں کی سخت بددیانتی کے سوا اور کچھ متصور نہیں ہوتا۔ دراصل اسلامی اوقاف سے مذہب اس قدر لازم و ملزوم ہے کہ حکومت کو ایک معزز شیعہ کے قائم کردہ وقف سے سنیوں کی تعلیم پر خرچ کرنا بھی پوری چھان بین کے بعد چاہیئے۔

اب ہم اُس غم و غصہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر اس بات سے پیدا ہوا کہ انگریزی حکومت ایک انگریزی کالج کی تعمیر سے اس سرمایہ کو غلط استعمال کرنے والی ہے۔ بہرحال اُس نے ایسا ہی کیا اور اُس جائداد کو جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مصرف خیر پر خرچ کرنے کے لئے وقف کی گئی تھی ایسے ادارے میں صرف کر دیا گیا جو اپنی ساخت ہی میں اسلامی اصولوں کے خلاف تھا اور جس سے مسلمان عملی طور پر مکمل خارج ہو گئے۔ اس

لہ کالج کی بلڈنگ اسی رقم سے بنائی گئی تھی۔

وقت اس کالج کا پرنسپل ایک معزز انگریز ہے جو عربی اور فارسی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا۔ وہ ایک خالص اسلامی وقف کو ایسی تعلیم میں صرف کر رہا ہے جس کو ہر مسلمان نفرت سے دیکھتا ہے۔ اس کی تنخواہ پندرہ سو پونڈ سالانہ ہے مگر یہ اُس کی غلطی نہیں اگر یہ غلطی ہے تو اُس حکومت کی جس نے اس کو اس عہدے پر مقرر کیا ہے اور جو پینتیس[۳۵] سال سے متواتر اس بہت بڑے تعلیمی فنڈ کا جان بوجھ کر غلط استعمال کر رہی ہے۔ انگریزی کالج کے ساتھ ایک چھوٹے سے اسلامیہ سکول کا قائم کر دینا اس انتہائی بد دیانتی کو چھپانے کی ایک فضول سی کوشش ہے۔ کالج کی عمارت میں جمع شدہ سرمایہ کے غلط استعمال کے علاوہ اس میں سے ہر سال پانچ ہزار پونڈ کالج پر خرچ کر دیتی ہے گویا پانچ ہزار دو سو ساٹھ پونڈ کی سالانہ آمدنی میں سے صرف تین سو پچاس پونڈ اُس اسلامیہ سکول پر خرچ کیے جاتے ہیں جو اس وقف کے اصلی مصرف کی واحد یادگار ہے۔

اس بد دیانتی کے الزام پر زیادہ کچھ لکھنا تکلیف دہ ہے کیونکہ اُس کی تردید کی کوئی صورت نہیں مسلمان علانیہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انگریزوں ہی نے مسلمان امتداردں کی بدعنوانیوں سے فائدہ اٹھایا اور ان کے بڑے بڑے مذہبی اوقاف کو کافر حکومت کے ہاتھ میں دے دیا جو اُس وقت سے مصرف خیر کے بجائے جیسا کہ مسلمان وصیت کنندوں کا اصلی مقصد تھا ایک ایسے ادارے پر خرچ ہو رہے ہیں جس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا یوں ان کی ابتدائی غلطی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چند سال ہوئے اس انگریزی کالج کے تین سَو طلباء میں سے ایک فیصدی بھی مسلمان نہ تھے اور گو یہ شرمناک تناسب اُس وقت سے بتدریج کم ہو رہا ہے لیکن مسلمانوں کے دل میں اس بے انصافی کا خیال بدستور باقی ہے۔ ایک سول افسر جس نے اس معاملہ کا بغور مطالعہ کیا لکھتا ہے "مجھے یقین ہے کہ اُس حقارت اور بے عزتی میں مبالغہ سے کام لینا بہت ہی مشکل ہے جو برٹش حکومت نے خود اپنے طرز عمل سے پیدا کر رکھی ہے۔" اس فقرے کی زبان کو شاید بہت سخت کہا جائے لیکن مجھے خود بھی اس حقیقت کا اعلان کرنا ہے کہ اپنے اٹھائیس سالہ قیام ہندوستان میں میں نے اس سوال کو حل کرنے کی بار بار کوشش کی۔ ہندوستان میں آنے کے بعد میں چند

ہفتوں ہی میں ہنگلی گیا تھا) اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستانیوں اور انگریزوں سے اِن حالات کے ماسوائے اور کچھ نہیں سنا۔ یہ بات صحیح ہو یا غلط مگر مسلمانوں کو بہر حال یقین ہے کہ حکومت نے اس معاملہ میں ان سے ایک بہت بڑی ناانصافی ہی نہیں کی بلکہ کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جذبات افسوس اور شکائت اسی طرح قائم ہیں۔

لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں اُن پر مسدود کر دی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم نے اُن کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی فرائض کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم اُس غم و غصہ کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں جو انگریزوں کو اُس وقت ہو گا جب کہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اِس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپنے مذہبی تہواروں کی تعظیم کرتے ہیں اور اُن کے متعلق بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ہم نے ان جذبات کا احترام کیا ہے لیکن معلوم نہیں جنوبی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ عرصے سے کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے اول تو اُن کی مذہبی ضروریات سے بتدریج اغماض کیا پھر ان کو بالکل بُھلا دیا اور آخر کار اُن سے قطعی منکر ہو گئے۔ پچھلے سال کلکتہ ہائی کورٹ کے مسلمان وکلا نے اس بارے میں دو عرضداشتیں بھیجی تھیں۔ انہوں نے اِس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دی جاتی ہیں اور ہندؤں کو باون تو پھر مسلمانوں کو بارہ کیوں ملتی ہیں اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے منظور شدہ چھٹیاں اکیس تھیں اس کے باوجود عرضی گذاروں کی التجا صرف یہ تھی کہ اُن تعطیلوں کی کم سے کم تعداد کو جو اب گیارہ تک پہنچ چکی ہے اور کم نہ کیا جائے۔ اس میموریل کا یہ اثر ہوا تھا کہ گورنمنٹ نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ آئندہ ہائیکورٹ میں بھی اتنی ہی چھٹیاں ہونی چاہئیں جتنی کہ گورنمنٹ کے دفاتر میں ہوتی ہیں اب گورنمنٹ دفاتر میں کسی اسلامی تہوار پر چھٹی کی اجازت ہی نہیں البتہ ہر محکمہ کے افسر کو اِس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ماتحت مسلمانوں کو

اُن کے چھوٹے بڑے تہواروں پر غیر حاضر ہونے کی اجازت دے دے اس طرح کہ سال میں کل بارہ چھٹیاں ہو جائیں مگر دفتر بدستور کھلے اور روزانہ کام حسب دستور جاری رہے

لیکن مسلمان وکلا نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس قسم کی اجازت سے ہائی کورٹ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ عدالتوں کو صرف اپنے افسروں اور وکیلوں کا خیال نہیں کرنا چاہئیے بلکہ عوام الناس کا بھی جن کی سہولت کے لیئے ان کا وجود قائم ہے انہوں نے اِس بات پر زور دیا کہ گو مسلمان وکیلوں کی تعداد میں بہت زیادہ کمی ہو گئی ہے لیکن مقدمہ باز مسلمانوں کی تعداد اُس تناسب سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے ریل کے جاری ہونے سے وہ اپنے مقدمات کی نگرانی کے لئے بہ آسانی آجا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان پلیڈروں کو اسلامی تہواروں پر حاضری سے معاف کر دیا جائے تب بھی وہ اپنی توجہ اُن مقدمات کی طرف سے ہٹا نہیں سکتے جو اس دوران میں جاری رہیں گے کیونکہ اُن کے ساتھ ہندو اور انگریز پلیڈر بھی مقدمے میں پیش ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ اس حکم سے اُن کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممانعت اُس حکومت کی ہنر سالہ روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اور اُن کو مذہبی فرائض کی بجا آوری سے باز رکھتی ہے۔ اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو اُن کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دی جا سکتی ہیں تو آپ کے سائل عرض پرداخت ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی [1]

گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔ بہر حال یہ جاننا تسلی بخش ہے کہ اور نہیں تو اس بے انصافی پر عمل درآمد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومت اعلےٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے مگر اتنے ضرور جو اُن کے مذہبی تہواروں کے لیئے کافی ہوں اور سرکاری کام کی ضروریات بھی اُن کی اجازت دے سکیں۔

---

[1] ہائی کورٹ کے مسلمان پلیڈروں کا میموریل جو انہوں نے چیف جسٹس اور اُس کے ہمراہی ججوں کے سامنے پیش کیا۔

ایک الزام ابھی باقی ہے۔ مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے اُن کو قانونی پیشہ ہی سے خارج نہیں کردیا بلکہ مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رو سے ان کے مذہبی اور شخصی قوانین کو پورا کرنے والے ضروری منصب ادارے سے بھی محروم کردیا ہے۔ اسلامی حکومت میں قاضی کے فرائض منصبی میں فوجداری دیوانی اور شرعی عدالت کے فرائض داخل تھے۔ پہلے پہل جب ہم نے ملک پر قبضہ کیا تو عدالتی نظام کو جاری رکھنے کے لئے بڑی حد تک انہیں پر بھروسہ کیا تھا۔ ہمارے سب سے پرانے قوانین میں ان کی اہمیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ہم نے قاضی کے عہدے کو برقرار رکھا۔ اس کے فرائض کے متعلق پچیس[25] دفعات کی طویل فہرست ہندوستان کی قانونی کتابوں میں اب بھی مل سکتی ہے [1] حقیقتاً قاضی کی حیثیت مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قوانین میں اس قدر ضروری ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہوگیا تھا کہ جب تک قاضی برقرار رہیں گے ہندوستان دارالسلام کہلاتا رہے گا لیکن جب ان کو علیحدہ کر دیا گیا تو یہ ملک دارالحرب بن جائے گا۔ مسلمانوں کی بے اطمینانی سے ہم اس بات پر مجبور ہوگئے ہیں کہ عام مسلمان کے جذبات کی تحقیقات کریں۔ بدقسمتی سے ان تحقیقات کی ابتدا بہت تھوڑے دنوں سے ہوئی ہے ۱۸۶۳ء میں صوبجات کے گورنروں میں سے ایک نے اعتراض کیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت اُن کی مقدس حیثیت کو تسلیم کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مسلمانوں کو اس امر کا حق دیتے ہیں کہ وہ ان کا تقرر بطور خود کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بہت کچھ بحث و تمحیص اور حکومت بمبئی کی طرف سے پر زور احتجاج کے بعد اس مضمون پر تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور حکومت نے قاضیوں کا باقاعدہ تقرر بند کر دیا[2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے[3] سات سال سے مسلمانوں کا بہت بڑا اور ہمیشہ بڑھتا ہوا حصہ ایک ایسے عہدے دار سے محروم ہوگیا جس کا وجود شادی بیاہ اور دوسری خاندانی رسم و رواج کو منانے کے لئے از حد

---

[1] بنگال کوڈ آر نمبر ۴ ۱۷۹۳ء و آر XII ۱۷۹۳ء وغیرہ۔

[2] ایکٹ نمبر ۱۱ ۱۸۶۴ء جو بعد میں ۱۸۶۸ء کے ایکٹ نمبر VIII کے ضمیمہ کی رو سے منسوخ کر دیا گیا تھا مگر اس نے اُن قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا۔

ضروری ہے۔ شروع شروع میں اس مصیبت کا احساس زیادہ نہیں ہوا تھا کیونکہ پرانے قاضی ابھی موجود تھے۔ اور قانون مذکور کا اطلاق صرف اُس وقت ہوتا تھا جب کوئی قاضی مرجاتا یا پنشن پا لیتا اور پھر اس کی جگہ از سرِ نو قانون پر نہیں کی جاسکتی تھی۔ اوّل اوّل موجودہ وائسرائے نے اس معاملہ پر غور و خوض کرنا شروع کیا تھا۔ مگر کوئی قطعی فیصلہ کئے بغیر چھوڑ ۱۸۷۰ء میں مدراس ہائی کورٹ نے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس کا فیصلہ کر دیا مسٹر جسٹس کوبٹ کے فیصلے[2] کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صرف حکومت وقت ہی قاضیوں کو مقرر کر سکتی ہے۔ اگر قاضی کا تقرر نہ ہو تو مسلمان اس بات کے مجاز نہیں کہ از خود کسی کو قاضی منتخب کر لیں۔ گویا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نے اس قوم سے اُنکے قوانین کا ایک اہم عہدیدار چھین لیا۔ جسکے فرائض تھے انتقال ناموں کی تشویہ و تعریف عقد نکاح اور دوسرے مذہبی فرائض اور مراسم کی بجا آوری۔ اب صورت حالات یہ ہے کہ جنوبی بنگال میں سب سے بڑی مصیبت جو ایک مجسٹریٹ پر آسکتی اور جس سے چھٹکارا پانے کا اسے کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات کچھ عرصے سے بہت ہی نازک ہو گئے ہیں۔ زناکاری اور اغوا کے مقدمات (یہ دونو جرم تعزیرات ہند کے ماتحت آجاتے ہیں) اضلاع دہانہ کی عدالتوں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں۔ ان دس مقدمات میں سے نو ایسے ہوتے ہیں جن میں نکاح کو قانونی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی بنگال کے دو حلقوں میں ۱۸۶۱-۶۲ء کے اندر یعنی جب حکومت نے قاضیوں کا تقرر بند کر دیا ہے اس سے دو سال پہلے کل مقدمات کی تعداد ۱۵۶ تھی ۱۸۶۶ء میں یعنی قاضیوں کا تقرر بند ہو جانے کے دو سال بعد یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۹۸۴ تک پہنچ گئی۔ لیکن اس وقت سے فوجداری اعداد و شمار میں اُن کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ واقعۃً نہیں بلکہ اس لئے کہ اب یہ دستور ہے۔ کہ ایسے مقدمات کو دیوانی عدالت میں منتقل کر

عہ[1] ایکٹ نمبر ۱۱ ۱۸۶۴ء جو بعد میں ۱۸۶۸ء کے ایکٹ نمبر VIII کے ضمیمہ کی رو سے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس نے اُن قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رُو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا۔

عہ[2] اصل مقدمہ نمبر ۲۵۳ محمد ابوبکر بخلاف میر غلام حسن اور دیگر

دیا جاتا ہے[1]

یہ اعداد و شمار وہابی مقدمات کے ذمہ دار افسر کی قیمتی دستاویزات سے لئے گئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابل اعتماد اور تجربہ کار افسر نے قاضیوں کی اسامی کو سرکاری طور سے اڑا دینے پر جو سیاسی خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ یوں رائے زنی کی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اُن کی برطرفی یقیناً وہابی تحریک پر دو پہلوؤں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سے ان پُر جوش پڑھے لکھے اور قدرے تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جو کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات سے نالاں ہو کر جاہل مسلمانوں میں بغاوت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے کہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے مطابق بسر کر سکیں اُن کی اجازت بعض مذہبی مراسم ہی کے لئے ضروری نہیں مسلمانوں کو روزمرّہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے شرعی مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا صحیح حل صرف قاضی ہی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے منصب کی غیر موجودگی میں ہر اُس شخص کو جو حکومت کا وفادار نہیں مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کا بہت کافی موقع مل جاتا ہے کہ موجودہ حکومت اس قابل ہی نہیں کہ ہم اس کے ماتحت اچھی زندگی بسر کر سکیں۔ برعکس اس کے حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں کو ماننا اور اُن سے کام لینا فی الحقیقت اس حکومت کے با اختیار اور جائز ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔"

یہ سوال اُن تمام سوالوں سے اہم ہے جو اب تک مجلس وضع قوانین میں پیش ہو چکے ہیں لیکن اس کے متعلق کوئی صحیح نتیجہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس سوال کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح سے

---

[1] ازدواجی مقدمات کے بڑھ جانے کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ اب لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ تعزیرات ہند سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اسی لئے ہم نے ازدواجی تعلقات میں رخنہ اندازی کو فوجداری گناہ قرار دے دیا ہے۔ اب یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ازدواجی قوانین زیادہ وضاحت کے ساتھ بنائے جائیں۔ ہم نے مسلمانوں کے قاضیوں کو برطرف کرنے کے لئے ایسا بُرا وقت منتخب کیا ہے کہ اس سے بُرا وقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

غور و خوض کر لیا جائے۔ پھر اُن دس صوبجاتی حکومتوں سے بھی مشورہ لینا ضروری ہے۔ جن میں ہندوستان تقسیم ہے۔ موجودہ وائسرائے کا دیانتدارانہ رویہ جس پر وہ سختی سے قائم ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گذشتہ غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت کا مسلمانوں سے ہر قیمت پر انصاف کرنے کا عزم اس امر کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے۔ کہ یہ الزام بھی انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں کے عائد کردہ الزامات کی فہرست سے بہت جلد خارج ہو جائیگا۔

جنوبی بنگال کے مسلمانوں سے جس حقارت اور لاپروائی کا سلوک پچھلی نصف صدی سے ہو رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی موجودہ ادبیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مشرق کے سابق فاتحین ہمارے مشرقی ماہانہ رسالوں اور کتب خانوں سے اسی طرح خارج کر دیئے گئے ہیں جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں سے۔ سابقہ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بڑی عقلمندی سے ہندو اور مسلمانوں کو اپنی عنایات سے یکساں طور پر نوازا تھا۔ ہندوستانی مخزن العلوم کے سلسلہ میں جس حیرت انگیز عربی اور فارسی دانی کا ثبوت دیا گیا تھا وہ اُس وقت کی سیاسی غیر جانبداری کا ادنیٰ سا پہلو تھا۔ مگر گذشتہ پچاس سال سے ہندو مسلمانوں کو حکومت کی ملازمتوں اور حکومت کے پیدا کردہ لٹریچر سے یکساں طور پر خارج کر رہے ہیں اور چھ سو پونڈ کی سالانہ رقم جو کورٹ آف ڈائرکٹر ہندوستانی مخزن العلوم کے لئے دیا کرتے تھے بنگال کی حاکمانہ نوازشات کی طرح یک طرفہ خرچ کی جا رہی ہے۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۲ء تک ڈاکٹر روئیرا (ROER) کے زمانے میں غیر آریائی علوم کے متعلق کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا لیکن ڈاکٹر اشپرنگر (SPRENGER) کے مختصر عہد میں اس کا رد عمل بھی شروع ہو گیا اور دو نہایت ہی اہم کتابیں شروع کی گئیں جو آج تک نامکمل پڑی ہیں۔

ڈاکٹر ہورس ہیمن ولسن کی سنسکرت دانی کے ذوق و شوق نے اس امداد کا عربی ادبیات پر خرچ ہوتا برداشت نہیں کیا ان کے سمجھانے بجھانے پر کورٹ آف ڈائرکٹر نے ایک فرمان جاری کیا کہ ہندوستانی مخزن العلوم کی تمام کوششیں ہندوستانی مباحث پر مرکوز ہونی چاہیں ورنہ ۶۰۰ چھ سو پونڈ کی سالانہ امداد بند کر دی جائے گی۔ اس وقت

شاید یہی بہتر تھا کہ ایسے اخلاقی جرات رکھنے والے اور اپنے مضمون میں لائق ترین انسان کی بات عارضی طور پر مان لی جائے کیونکہ ڈاکٹر ایچ۔ ایچ ولسن ہی نے موجودہ سنسکرت ادبیات کی بنیاد رکھی جس پر اب میکس مُلر (MAX MULLAR) استادانہ کام کر رہا اور ایسی شاندار اور ضیا پاش عمارت کے بلند سے بلند درجے تعمیر کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کسی عالم نے ایسی کوشش نہیں کی تھی پھر گولڈ اشٹوکر (GOLD STUCLER) اور اوفرشٹ (AWFRCLET) فیز ووڈ ہال (FETZEDWORD HALL) اور میور (MUIR) ایسے فضلا اُس کی بنیادوں کو اور زیادہ مضبوط کر رہے ہیں اور اس کے پشتوں اور بازوؤں کو مستحکم سے مستحکم بنا رہے ہیں تاکہ یہ خوبصورت عمارت بقائے دوام حاصل کرے۔

مگر عربی علوم کے ماہرین کا ایک چھوٹا سا گروہ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور اپنی حیثیت کی آخر دم تک مدافعت کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ہر اس کام کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا جو خالص ہندوستانی نہ ہو عربی علوم کے ماہرین اس معاملہ میں زیادہ کامیابی کے ساتھ جھگڑ نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے عربی مباحث کو بالکل چھوڑ دیا اور اسلامی سلطنت کی فارسی ادبیات میں پناہ لے لی۔ سر ہنری الیٹ (SIR HENIRY ELLIOT) سب باتوں سے بے پرواہ ہو کر اپنے کام میں مشغول رہا۔ مسٹر تھومس (THOMAS) مسٹر ہیمنڈ (HAMOND) سر ولیم میور (SIR WELLAIM MUIR) اور کچھ اور سول افسروں نے مل کر ایک شاندار جماعت بنالی اس طرح جو کچھ دور دراز کے کورٹ آف وارڈز نے اُن سے چھینا تھا انہوں نے مقامی حکومت سے حاصل کر لیا۔ ۱۸۵۵ء میں شمال مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر نے حکومت کے خرچ پر فارسی مسودات کو جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک ہی کوشش میں سر سٹھ مسودات حاصل ہو گئے سر ہنری الیٹ (SIR HENIRY ELLIOT) کی تصانیف جو مسٹر تھامس اور پروفیسر ڈواسن (DOWSON) اور مسٹر ہیمنز کی قابل تعریف مگر ذرا بے پرواہ ادارت میں شائع ہوئیں وہ ترقی کی طرف بہت بڑا قدم سمجھی جاتی ہیں پھر لکھنؤ کے اسلامی مطابع بھی ہر سال مختلف قسم کی کتابیں شائع کر رہے ہیں گو اُن کی طباعت میں اچھی طرح غور و خوض نہیں کیا جاتا۔

کرنل ناساؤلیز (Nassan Lees) نے اپنا تمام اثر و رسوخ اور علم اِس تحریک کے لئے وقف کردیا ہے اور انڈیا آفس کے نئے لائبریرین ڈاکٹر روسٹ (ROST) کی ذات میں مستشرقین کو ایک ایسا نایاب فاضل ہاتھ آگیا ہے جس میں بہت سی علوم و فنون کے ساتھ دقیق نظری اور کامل اعتمادی جمع ہوگئی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کارِ عمل نمایاں ہے اور مسٹر بلوک مین کی شخصیت میں ایک ایسا فاضل پیدا ہوگیا ہے جس کی محنت، ذہانت اور مشرقی علوم کی تحصیل کا شوق پرانے زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

میں نے مسلمانوں کی عرضداشت اور حکومت برطانیہ کے خلاف ان کی شکایات کو بیان کردیا ہے۔ بددیانتی اور مخصوص ناانصافیوں کے الزامات کے متعلق کارروائی کرنے کو بغیر کسی خدشہ کے حکومت پر چھوڑا جا سکتا ہے ایسی حکومت جو گذشتہ دو سال سے متواتر بداعتمادی اور اس کے اسباب کو دور کرنے کے لئے اپنے اخلاص کا اظہار کر رہی ہے۔ مگر عام لاپروائی کے غیر معقول الزامات کے متعلق میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔ اگر ہم ان الزامات کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارا طریقہ تعلیم ہی ان سب باتوں کی جڑ ہے۔ مسلمانانِ بنگال کامیاب زندگی بسر کرنے یا حکومت کی سرپرستی میں مناسب حصہ حاصل کرنے کی اُس وقت تک کوئی امید نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کریں اور وہ اپنے آپ کو اُس وقت تک اس قابل نہیں بنا سکتے جب تک ہمارے سکولوں میں اُن کی تعلیم کے لئے بہتر انتظام نہ کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے جو تبدیلیاں درکار ہیں وہ بالکل آسان اور کم خرچ ہیں۔ اُن کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر میں اُس کوشش کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اب تک ہم نے اس سلسلہ میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے متعلق اپنے فرائض کی ادائیگی کامیابی سے نہیں کی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن تکالیف اور ناکامیوں کو بھی بیان کردیا جائے جو اُن کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کی کوشش میں پیش آئیں۔ گذشتہ نوّے سال سے ہم کلکتہ میں ایک اسلامیہ کالج حکومت کے خرچ سے چلا رہے ہیں[1]۔ رفاہ عام کی دوسری کوششوں کی طرح جو انگریزوں نے کیں اس کی بنیاد بھی وارن ہیسٹنگ ہی نے رکھی ۱۷۸۱ء

---

[1] جو بنگال میں مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔

میں گورنر جنرل نے اُس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق لامحالہ ہونے والی تھی یہ کوشش کی کہ ان کو پیش از وقت اُس کے لئے تیار کیا جائے۔ جوں جوں بڑے بڑے مسلمان خاندانوں کی مالی حالت کمزور ہوتی گئی اُسی تناسب سے اُن کی وہ طاقت بھی کم ہوتی گئی جس سے وہ اپنی اولاد کو حکومت کے بڑے بڑے عہدوں کے لئے تعلیم دلا سکتے تھے۔ اُن کو زیادہ مواقع بہم پہنچانے کے لئے وارن ہیسٹنگز نے دارالخلافہ میں ایک اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی اور مصارف کے لئے ایک جاگیر بھی ہمیشہ کے لئے وقف کر دی لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس کا انتظام مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دیا لہٰذا اُس میں آج بھی فارسی اور عربی پڑھائی جاتی ہے حالانکہ بہت عرصہ ہوا فارسی و عربی کے ذریعے سرکاری ملازمت سے روٹی کمانا ناممکن ہو گیا ہے اس کالج میں ہر قسم کی بدعنوانیاں جاری ہیں جن کو دیکھکر ۱۸۱۹ء میں ایک اور کوشش کی گئی اور وہ یہ کہ اس ادارے کو وقت کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنا دیا جائے چنانچہ انگریزی تعلیم کے لئے ایک درجہ اور کھولا گیا مگر بدقسمتی سے پھر جلد ہی اسے توڑ بھی دیا گیا تین سال بعد ایک اور مگر زیادہ مستقل کوشش کی گئی مگر اُس کے نتائج بھی غیر تسلی بخش رہے۔ اس کے بعد چوتھائی صدی تک اس کالج کی قسمت وہی رہی جو پوری مسلمان قوم کی ہے مطلب یہ کہ اسے بالکل فراموش کر دیا گیا پھر اگر مقامی حکومت کبھی اس کے متعلق لب کشائی کرتی بھی ہے تو اُس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اسے بند کر دینے کے لئے بے چین ہے۔

آخر ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان حکومت اِس ضرورت کی طرف متوجہ ہوئی کہ اِس ادارے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے جو اب عام بدنامی کا باعث ہو رہا ہے۔ اُس وقت جو تجاویز پیش کی گئی تھیں[4] اُن کا لب لباب یہ تھا کہ کالج کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے اس کے نچلے درجہ میں جس کا نام انگلو پرشین برانچ تھا اردو، فارسی اور درمیانہ درجہ کی انگریزی کی تعلیم ہو[5] اور اونچے درجہ میں صرف عربی کی اس تجویز کے عیوب جلد ظاہر ہو گئے جس وقت نوجوان خالص عربی جماعت میں جاتے تھے تو جو کچھ انہوں نے نچلے درجہ کے متفرق شعبے میں پڑھا ہوتا بالکل بھول جاتے ۱۸۵۸ء میں اس سلسلہ کے نتائج کو اس طرح بیان کیا گیا "کالج نے بہت تھوڑے فاضل

---

[4] مرتبہ مسٹر جے۔ آر کولون۔ وہ ایک ایسا شہری تھا جس کو مسلمان قوم کا اعتماد حاصل تھا اور وہ اپنی فارسی اور عربی دانی کی وجہ سے اس کا مستحق بھی تھا مسٹر تھامسن کے مرنے کے بعد وہ شمال مغربی صوبجات کا لفٹنٹ گورنر بن گیا تھا اور غدر کے زمانہ میں قلعہ آگرہ میں مر گیا۔

[5] کلکتہ یونیورسٹی کے معیار انٹرینس تک۔

پیدا کئے ہیں اور وہ اپنے محدود دائرے میں اچھے ہیں مگر عام یا سرکاری ملازمتوں کے مقابلہ میں جگہ پانے کے ناقابل لہذا وہ ایک ایسی جماعت بن گئے جو متعصب، مغرور، مایوس اور غدار نہیں تو ناراض ضرور تھی [۵۵]

اس کالج کی اصلاح کے لیے پھر ایک کوشش کی گئی تھی جس میں سال دو سال کے لئے تھوڑی بہت کامیابی ہوئی مگر تھوڑے ہی دنوں میں وہ پرانی حالت پر آگیا۔ ۱۸۶۹ء میں بنگال گورنمنٹ نے ایک کمیشن جو ابھی تک اپنے اجلاس منعقد کر رہا ہے اس غرض سے مقرر کیا کہ اس کی کمزوریوں کے اسباب کی تحقیقات کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامیہ کالج نے اپنے طلبا کو نہ تو یونیورسٹی کے لئے تیار کیا اور نہ زندگی میں سرگرم حصہ لینے کے لئے۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک مشہور مسلمان مصلح نے کہا ہے اس تمام طریقہ نے ان کو آدھا بیترا اور آدھا ملیریا بنائے رکھا ہے۔ صرف عربی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ اس انگریزی تعلیم کے فوائد سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو پہلے ان کو دی جاتی ہے کیونکہ کالج میں انگریزی تعلیم کو جاری رکھنے کا کوئی انتظام نہیں۔ پھر جو تھوڑی بہت انگریزی انہوں نے پڑھی تھی وہ چند ہی دنوں میں ان کے دل سے محو ہو جاتی ہے۔

اب میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس قدر مخلصانہ کوشش سے اس قدر افسوسناک نتائج کیوں برآمد ہوئے پہلی بات تو یہ ہے کہ شروع ہی سے اس کالج کی نگرانی بالکل ناقص تھی حتیٰ کہ اس تھوڑے سے وقفہ میں بھی جب ایک انگریز پرنسپل کام کرتا تھا اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ اس کا تقرر اور اس کا اختیار محض نمائشی تھا وہ اصل میں بعض دوسرے اہم محکموں کا انچارج تھا اور بنگال کے سب سے بڑے اسلامیہ کالج کے پرنسپل کا اعزازی عہدہ اس کے نام سے وابستہ کرتے ہوئے اس کی سابقہ تنخواہ میں معمولی سا اضافہ کر دیا گیا تھا مثال کے طور پر موجودہ پرنسپل کا اصلی عہدہ سیکرٹری بورڈ امتحانات کا ہے۔ اس کو پریذیڈنسی کے تمام فوجی افسروں کا امتحان لینا پڑتا تھا جو اپنے عہدوں پر تقرر حاصل کرنے کی قابلیت کے لئے سول عہدہ داروں کے ساتھ جو اعزازی دیسی زبانیں سیکھنے میں تعلیم حاصل کرتے تھے وہ حکومت کے محکمہ داخلیہ کا قائم مقام اسسٹنٹ سیکرٹری اور مترجم بھی ہے اور اس کے علاوہ ایسے کام بھی کرتا ہے جو وقتی طور پر اس کے سپرد کر دیئے جائیں۔ مثلاً کسی کمیٹی یا حکومت کی طرف سے متفرق تحقیقات۔ مگر اس کے علاوہ وہ محمڈن کالج کا پرنسپل بھی ہے لیکن وہ اپنے مختلف فرائض کے اس حصے کو کتنے بھی انہماک سے کیوں نہ ادا کرے اس انتظام سے کسی مستقل فائدے کی امید رکھنا عبث ہے۔

---

[۵۵] مسٹر ای۔ ڈی۔ بیلی ہے جس کی تحریروں سے میں نے بہت سے خیالات اس باب میں نقل کئے ہیں۔

کالج کا اندرونی انتظام اس سے بھی بدتر ہے ۔ ایک قابل اور سرگرم فاضل ایک ادنیٰ شعبہ کا صدر ہے ۔ لیکن اس کا اختیار اُس جگہ پر آکر ختم ہو جاتا ہے جہاں اس قسم کی نگرانی کی سخت ضرورت ہے یعنی اعلیٰ عربی محکمہ میں یہ وہ محکمہ ہے جس پر تمام ادارے کی کامیابی کا دارومدار ہے ۔ اس کا انتظام ملک کے مولویوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ مذکورہ بالا حضرات میں سے ایک کو باقی تمام اُستادوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کو ہیڈ مولوی کہتے ہیں مگر اس کے ماتحت کوئی نظام قائم نہیں کیا گیا نہ اُستاد اُس کے سامنے جوابدہ ہیں اس ہیڈ مولوی کا سارا وقت اپنے درجے میں گذرتا ہے ۔ سکول میں کوئی ماہانہ یا سہ ماہی امتحان نہیں ہوتا نہ کسی درجے کا روزانہ یا ہفتہ وار معائنہ ۔ ان دنوں حالات صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کا انتظام کسی فائدے کا موجب نہیں ہو سکتا ۔ پرنسپل کو یہ فرصت نہیں کہ صحیح معنوں میں درس گاہ کی نگرانی کرے کیونکہ اسے اور بھی بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں اور ہیڈ مولوی نے کبھی نگرانی کرنے کی کوشش کی نہیں ۔ اس روش کے عملی نتائج عیاں ہیں ۔

اس بے احتیاطی سے بنگال کے مسلمان نوجوانوں میں جو نقص پیدا ہو گئے ہیں اُن میں مبالغہ کرنا ناممکن ہے ۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک نسل گزری جب ہم نے ہگلی کے وقف میں بددیانتی کی تھی اور اب کلکتہ کالج ہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی امید رکھ سکتے ہیں ۔ ہم نوجوان مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو تعداد میں سو سے کم نہیں ہوتی ایک عیاش مشرقی دارالخلافہ میں جمع کر دیتے اور اجازت دیتے ہیں کہ وہ سال تک بُرے سے بُرے اثرات قبول کریں ان کے چال چلن کی نگرانی نہیں کی جاتی ان کے ماحول میں باعزت اثرات کی کوئی مثال نہیں ملے گی آخر الامر زندگی کے کسی شعبہ میں ملازمت لینے کے قابل بنائے بغیر انہیں گاؤں میں واپس بھیج دیا جاتا ہے اُن طلبا میں سے اسّی فیصدی متعصب مشرقی اضلاع سے آتے ہیں[۵] ۔ بنگال کے زیادہ دنیادار حصوں کے نوجوان اس کالج میں اس لئے نہیں آتے کہ انگریزی تعلیم کے بغیر اچھی آمدنی کی ملازمت کا ملنا دشوار ہے ۔ یہ طالب علم اپنے لڑکپن کا زمانہ بے اطمینانی کے ماحول میں بسر کرتے ہیں ۔ اُن میں سے بہت سے غریب ہوں گے اور جب کلکتہ آئیں گے تو انگریزوں کے خانساماؤں کے گھروں میں پڑے پڑے ان کی خیرات پر بسر اوقات کریں گے[۶] یہ خانساماں لوگ مسلمانوں میں کافی مال و دولت رکھتے ہیں

---

[۴] ممکن ہے کہ کمیشن کے تقرر نے ان حالات اور آئندہ بیان کردہ حالات کو بدل دیا ہو ۔ مگر میں اپنے بیانات کی سچائی کی ضمانت دینے کے لئے تیار ہوں ۔ کمیشن کے تقرر سے پہلے کالج کی یہی حالت تھی ۔ [۵] اکثریت چٹاگانگ ، سلہٹ اور شاہباز پور سے آتی ہے ۔ [۶] خانساماں غریب طالب علموں کو اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں ۔ اس طرح یہ کھانے پینے اور رہنے سہنے کو جاگیر کہتے ہیں ۔ یہ وہ نام ہے جو اسلامی سلطنت کے فوجی متعلقے کو دیا جاتا تھا ۔

اور ادنےٰ ملازمین کی اُس دبی ہوئی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ جو غلام قوم کا خاصہ ہے اپنے آقاؤں کی ان کی پیٹھ پیچھے تحقیر کرتے رہتے ہیں۔ پھر طالب علم کی عمر بالعموم سولہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی گو بعض کی بیس سال سے اوپر لیکن مجھے بتلایا گیا ہے کہ ان میں تیس تیس برس کے طالب علم بھی ہوں گے۔ یہ طلبا جن خانساماؤں کے پاس رہتے ہیں وہ ان کی امداد سے مذہبی ثواب ہی حاصل نہیں کرتے بلکہ اکثر اپنی لڑکیوں کو بہت سا جہیز دے کر انہی مسلمان طلباء سے ان کا نکاح بھی کر دیتے ہیں۔ نوجوان طلبا معمولی زمیندار گھرانوں سے آتے ہیں۔ وہ انگریزی یا سائنس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے انہیں فارسی کا بھی زیادہ خیال نہیں ہوتا۔ وہ صرف عربی صرف و نحو اور قوانین کی اصطلاحات کو رٹتے رہتے ہیں۔ گھروں میں ان کے کام چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں ہل چلانا یا کشتی رانی کرنا ہے۔ وہ دہانہ گنگا کے زمینداروں کی اکھڑ زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ جس کا سمجھنا کلکتہ کے مسلمان کے لئے ناممکن ہے۔

یہ اس مسلمان طالب علم کا نقشہ ہے جو ابھی کالج میں داخل ہوا تھا۔ وہ چند سالوں میں اپنی وحشیانہ عادات کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی داڑھی ترشوا کر شریعت اسلامی کے عالم ہونے کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ہماری فیاض حکومت سو میں سے اٹھائیس کو وظیفہ دیتی ہے۔ اس طرح ہر طالب کو جو تھوڑا بہت کام بھی کرے جلدی یا بدیر وظیفہ مل جاتا ہے اس اثنا میں جو طالب علم زیادہ ہوشیار مگر کم محنتی ہوں گے وہ معمولی سا تجارتی کاروبار بھی شروع کر دیں گے۔ اُن کا زیادہ بہتر حصہ لغلوں کے اندر کتابیں دبائے کلکتہ کے بازاروں میں پھرتا ہے وہ اپنی وظیفہ خوارانہ حیثیت اور ناداری کو بھولتے ہوئے انہی خانساماؤں سے جن کے طفیل ان کی زندگی بسر ہوتی ہے اُسی تعظیم و تکریم کا مطالبہ کرتے ہیں جو ایک عالم دین کی ہونی چاہیئے قاضیوں کی تنگ نظرانہ برطرفی کی وجہ سے اسلام کے شخصی قوانین کا نفاذ غیر تربیت یافتہ کارکنوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے کالج کے طالب علم ادنےٰ طبقہ کے مسلمان گھرانوں میں نکاح خوانی کرتے اور وراثت کے تصفیے حل کرتے ہیں۔ وہ ہدایہ اور جامع العروض کے مطابق غلط سلط فتوے صادر کرتے پھرتے ہیں۔

محمڈن کالج کے ان نادار طلباء سے بڑھ کر نوجوانوں کی کوئی جماعت صحیح رہنمائی کی محتاج نہیں۔ جس قسم کی رہنمائی انکو میسر ہے اس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ہماری تربیت کا یہ اندازہ ان کو ہر سال اپنے محدود طریقہ تعلیم پر اور زیادہ مطمئن اور ان کے اخلاق کو اور زیادہ مستوار زندگی کے کسی شعبے میں سرگرمی سے حصہ لینے کے اور زیادہ ناقابل اور ہماری حکومت کے خلاف بے وفائی کے جذبات پیدا کر دیتا ہے وہ انگریزوں کی صورت سے بیزار ہوں گے جب یہ نقائص زبان زد خاص و عام ہوئے تو لامحالہ ایک مستقل

انگریز پروفیسر کا تقرر ضروری ہو گیا جیسے رات کی تاریکی میں نہایت خاموشی کے ساتھ کالج کے اندر لانا پڑا[۵۵]۔ نوے سال سے زیادہ عرصہ ہوا یہاں کافروں کے خلاف جہاد کی پسندیدہ تعلیم دی جارہی تھی ۱۸۶۸ء یا ۱۸۶۹ء تک (صحیح تاریخ کا مجھے علم نہیں) امتحان کے سوالات باقاعدگی سے اسی اصولِ جہاد میں سے آیا کرتے تھے۔ ایک باغیانہ تعلیم دینے والی مسجد اسی کالج کے سایہ میں پرورش پا رہی ہے[۵۶]۔ یہ طالب علم کلکتہ میں باغیوں کی تمام مساجد میں آتے جاتے رہتے ہیں موجودہ ہیڈ مولوی اُن عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیئے جائیں۔ اس غدار عالم دین کا کتبخانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کالج کے ایک مقیم انگریز پروفیسر نے ایک عرب کو نکال دیا تھا کیونکہ وہ یہاں مذہب کی تبلیغ کرنے آیا تھا بالفاظ دیگر اُن اصولوں کی جن کی بدولت ہمیں تین سرحدی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور ہماری سلطنت میں سازش کا جال پھیلا ہوا ہے۔

اس قسم کی ہفت سالہ تعلیم کے بعد ہم مسلمان نوجوانوں کو اُسی مشرقی صوبجات میں بھیج دیتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ بدقسمتی سے اس سے بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حالات کا بیان کرنا ابھی باقی ہے میں پچھلے دو سالوں کا ذکر نہیں کروں گا جب کہ خاص کمیشن اپنا کام کر رہی ہے مگر صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ریکارڈ پر ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ کچھ عرصہ ہوا بعض لڑکے فاحشہ عورتوں کو کالج میں لے آئے[۵۷]۔ ان میں سے تقریباً چھبیس کو باقاعدہ الگ الگ کمرے ملے ہوئے تھے گویا حکومت نے جو زمین ان کو رہنے کے لئے عطا کی تھی اسے بدکاری کے اڈوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر ان عورتوں کے علاوہ جو کارلائل کے نزدیک ناقابلِ ذکر ہیں یہ طلبا فطرت کے خلاف اُن خطرناک گناہوں میں بھی پھنسے ہوئے تھے جن کو عیسائیت نے یورپ میں بالکل نیست و نابود کر دیا۔ مگر جن کا ارتکاب ہندوستان کے ہر ایک شہر میں ابھی تک جاری ہے گذشتہ پانچ چھ سالوں میں تین وارداتیں پکڑی گئی اصل میں کتنی وارداتیں ہوتی ہوں گی ان کا علم کبھی نہیں ہو سکتا۔

---

[۵۵] مسٹر بلوک ہیں۔ بدقسمتی سے انگریز پروفیسر جو وہاں رہتا ہے اُس کو عربی کے لائق محکمہ پر کوئی اختیار نہیں۔

[۵۶] فرازی مسجد [۵۷] یہاں اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرنل لیسی جو کالج کا وقتی پرنسپل تھا اس کا ذمہ دار نہ تھا اور اس کو ان فاحشہ عورتوں کا پتہ چلا تو اس نے ایسا انتظام کیا کہ پھر اس کا اعادہ نہ ہوسکے۔

اُن طلبا میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوشش کریں گے کہ ضرور اپنے آپ کو بہتر بنا سکیں لیکن ان کے لئے بھی کوئی ایسا انتظام نہیں ملے گا جو کسی صحیح یا کارآمد عملی تعلیم کا ذریعہ بن سکے پہلی بات تو یہ ہے کہ پڑھائی کا روزانہ وقت بہت ہی کم رکھا گیا ہے مقررہ وقت دس بجے سے دو بجے تک کا ہے جس میں سے بیس منٹ تو اس کام کے لئے وضع کر لینے چاہیئے جو استادوں اور شاگردوں کے حُقہ پینے میں گزرتا ہے اور جسے کالج کی خاص اصطلاح میں عصائے موسیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آدھ گھنٹہ حاضری کے لئے کیونکہ یہ رسم دن میں دو دفعہ ادا کرنی پڑتی ہے اس لئے کہ بہت سے طالب علم بارہ بجے کے بعد ہی چلے جاتے ہیں۔ جو طلبا زیادہ محنتی ہوتے ہیں وہ کالج کے معمولی نصاب کے علاوہ مسلمانوں کے نجی اسکولوں میں بھی دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن کالج سے باہر کی یہ تعلیم احادیث اور متعصب زمانے کی پرانی فقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور نوجوانوں کے دماغ میں ہیچمدانی کا خیال ہم مادیگرے نیست کا خیال پیدا کر رہی ہے خود کالج کی چار دیواری میں معمولی معمولی مسئلوں پر انتہائی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایک مقیم انگریز پروفیسر کو شام کے گشت میں لڑکوں کے کمروں سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ تمہارا ایمان ٹھیک نہیں اور اسی قسم کے بہت سے جملوں کی آواز برآمدے میں پہنچ رہی تھی معلوم ہوتا تھا ہر طرف سخت لے دے ہو رہی ہے یہ پروفیسر اسی وقت موقع پر پہنچ گیا اور جب اس نے شور و غل کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ کسی طالب علم نے فقہ کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ نماز میں دونوں ایڑیاں ملی ہونی چاہئیں ورنہ اس سے دین اور دنیا میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس پر وہ لوگ جو ایڑیاں کھول کر نماز پڑھتے تھے اس نئے طرز کے حامی کو بدترین ملحد کہنے لگے۔ لہٰذا اس کے جواب میں وہ اور اُس کے چند ساتھی پرانے طرز والوں کو دوزخی اور جہنمی ٹھہراتے رہے۔

یہ طلبا کالج کے استادوں سے ہر روز زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ایک شخص نے جو عملی طور پر ان سے واقف ہے مجھ سے ذکر کیا کہ اصل پڑھائی صرف اڑھائی گھنٹے ہوتی ہے۔ گھر پر کسی قسم کی تیاری کرنا وہ جانتے ہی نہیں یوں بھی یہ بات مسلمانوں کے اصول کے خلاف ہے۔ ہر استاد ایک عربی فقرہ پڑھتا ہے پھر اُس کے پہلے دوسرے تیسرے لفظ کے معنی بتلاتا ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ آخری فقرے تک پہنچ جائے جو طالب علم محنتی ہوگا وہ استاد کے بتلائے ہوئے معنوں کو بین السطور میں لکھتا جائے گا اور پھر تھوڑا تھوڑا کر کے فقرے کے معنی اور شرح کو حفظ کرے گا۔ ان کے لئے

گھر پر لغت کے استعمال کا طریقہ بتلانا یا فقرے کے معنی از خود دریافت کرنے کی ترغیب دینا ایک بالکل اجنبی ایجاد ہے جو شاید اُن کے مذہب کے لیے بھی خطرناک ہو۔ بہر حال کلکتہ کالج میں اس طریق درس کو کوئی نہیں جانتا سات سال کے بعد طالب علم کو چند کتابیں حفظ ہو جاتی ہیں یعنی ان کا متن اور اُن کی شرح۔ اگر اُن کے محدود نصاب سے باہر کوئی معمولی سی تحریر بھی اُن کے سامنے آجائے تو وہ اُس کو بالکل نہیں سمجھتے لہذا اس امر سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیم ہر اُس چیز کے متعلق جو انہوں نے حاصل نہیں کی ناقابل برداشت حقارت پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا کچھ نہ جاننا ہی اُن کو زیادہ خود پسند بنا دیتا ہے۔ وہ اس کو قطعی حقیقت جانتے ہیں کہ عربی صرف و نحو۔ فقہ۔ علم اشعار اور منطق ہی دنیا میں پڑھنے کے لائق ہیں۔ انہوں نے یہی پڑھا ہے کہ دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں پہلے عرب تھے۔ پھر انگلستان فرانس اور روس مکہ۔ مدینہ اور قاہرہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا شہر لندن ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انگریز کافر ہیں اور اگلی دنیا میں اپنے آپ کو دوزخ میں پائیں گے جن طلباء میں اتنی بڑی فراست جمع ہو جائے وہاں اور کیا چاہئے؟ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پرنسپل نے جب نفس کا ناپاک مضمون رائج کرنا چاہا اور وہ بھی انہی کی زبان یعنی اردو میں تو کیا وہ اُس پر پتھر اور بوسیدہ آم پھینکنے میں حق بجانب نہ تھے؟

میں نے اس تکلیف دہ تفصیل کو اس لئے بیان کیا ہے کہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اب جب کہ حکومت مسلمانوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کے معاملے میں واقعۃً بیدار ہو چکی ہے اُس کو چاہئے کہ ایسے طریقوں سے پرہیز کرے جن کے ماتحت اُس کی سابقہ عظیم الشان کوششیں خاک نامرادی میں مل گئیں۔ کلکتہ کا محمڈن کالج عملی طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ انہیں کے انتظام کا نتیجہ ہے کہ وہ اتنا بدنام اور بے عزت ہوا۔ مسلمان قوم کی انحطاط پذیر قسمت کے ساتھ شروع میں ہماری ہمدردی اور بعد میں لاپروائی نے حکومت کو اس ادارے میں دخل انداز ہونے سے روکے رکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ادارہ بالکل ناکارہ ہے مگر اس کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اُس کو کس طرح سدھارا جائے۔ سو سال کے ہندوستانی انتظام نے اس نظام کو مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق بنانے کی بجائے اس کو ان کی بدگمانیوں کے مطابق بنا دیا۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے محمڈن کالج کا انتظام بہت کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا یہاں تک کہ ۱۸۱۹ء میں اوپر کی سب باتیں صاف طور پر نظر آنے لگیں مگر اُس وقت کی حکومت امید کے خلاف یہ امید لگائے بیٹھی تھی

کہ وقت آنے پر محض یورپین سیکرٹری کا نمائشی اختیار کافی ہوگا۔ گذشتہ بیس سال سے کالج کی اصلاح میں باہمی دخل اندازی ناخوشنودی کا موجب ہوتی رہی اور اسی نے تمام کوششوں کو ناکام بھی رکھا۔ آخر کار جب پرنسپل کا تقرر ہوا بھی تو محض اعزاز اور نمائش کے لئے پھر جب مقیم انگریز پروفیسر کی باری آئی تو اس کا احاطہ اقتدار اُس شعبہ پر جا کر ختم کر دیا گیا جہاں اسکی سب سے زیادہ ضرورت تھی

اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ حکومت بہت تھوڑے خرچ کے ساتھ مسلمانوں کے جملہ طبقات کے لئے خاطر خواہ تعلیمی انتظام کر سکتی ہے یہ نظام ادنےٰ۔ وسطی اور اعلےٰ تعلیم پر مشتمل ہوگا۔ ادنےٰ تعلیم کے لئے امدادی سکولوں میں گرانٹ ان ایڈ کے قانون کا فیاضانہ استعمال کافی ہے یہاں پہلے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی مسلمانوں کی خاص ضروریات کے خیال کی حکومت نے بڑی عقلمندی سے اِس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اُن سکولوں کی امداد نہیں کرے گی جو ایک دوسرے سے پانچ میل سے کم فاصلہ پر ہونگے کیونکہ اس قسم کی امداد حکومت کو نقصان پہنچا کر بے فائدہ رقابت پیدا کرے گی۔ چالاک ہندو اس میں بھی دیگر امور کی طرح سب سے پہلے میدان میں موجود ہے اُس نے تمام ملک میں ایسے سکولوں کا جال پھیلا دیا ہے جو اُس کی ضروریات کے عین مطابق ہیں اور مسلمانوں کی ضروریات کے بالکل خلاف ۔ اس لئے اِس پانچ میل کے قانون کو ذرا نرم کر دینا چاہیئے تاکہ اُن اسلامیہ سکولوں کو گرانٹ مل سکے جو ہندوؤں کے سکول سے اس فاصلہ کے اندر واقع ہوں۔ جہاں علیحدہ اداروں کی ضرورت نہیں وہاں حکومت کو مسلمانوں کے لئے انتظام کرنا چاہیئے اور موجودہ ہندو سکولوں میں ایک کم تنخواہ کا مسلمان استاد مقرر کر دینا چاہیئے اِس قسم کے مسلمان اُستاد پانچ شلنگ ہفتہ پر مل سکتے ہیں۔

جہاں تک متعصب مشرقی اضلاع کا تعلق ہے میرے خیال میں حکومت کے لئے یہ امر از حد مفید ثابت ہوگا کہ وہ مسلمان کاشتکاروں تک پہنچنے کے لئے ایک خاص محکمہ قائم کرے۔ ایک وقت میں ایسا محکمہ ہندوؤں کے لئے بھی ضروری خیال کیا گیا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے اُن اضلاع میں تعلیم پھیلانے کے لئے بہت سے سکول کھولے تھے جہاں ایسے سکول جاری نہ ہو سکتے تھے جو اپنا خرچ خود برداشت کر سکیں ۱۸۶۶ء میں اس طرح کے صرف اڑتیس سکول بنگال کے تعلیمی حلقے میں میرے ہی ماتحت تھے ان پر گورنمنٹ کے ۱۰۰۰ پونڈ سالانہ خرچ ہوئے فیس ان کے علاوہ تھی جس کی کل رقم ۲۶۷ پونڈ ہوتی تھی ظاہر ہے کہ یہ سکول گو اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کے بالکل ناقابل تھے مگر ان سے جو فائدہ پہنچا اُس میں مبالغہ کرنا مشکل ہے جہاں کہیں بھی زمیندار

بہت جاہل، بہت غریب یا امدادی سکولوں کے جاری کرنے میں بہت زیادہ تعدد سے کام لیتے تھے وہاں عارضی طور پر ہارڈنگ انسٹیٹیوٹ قائم کردی جاتی۔ پہلے پہل تو دیہاتی اپنی تعلیم مفت حاصل کرتے مگر جوں جوں تعلیم یافتہ جماعت پیدا ہوتی گئی اور وہ زیادہ تعلیم کی خواہش کرنے لگے تو اس وقت اُن سے فیس بھی لے لی جاتی تھی۔ اس طرح چند سالوں میں خود امدادی کا کچھ ذریعہ پیدا ہو جاتا اب اس انسٹیٹیوٹ کی جگہ ایک ہائی سکول لے لیتا اور وہ ملک کے کسی دوسرے پس ماندہ علاقہ میں منتقل ہو جاتی۔ اس طرح تعلیم کا سلسلہ جنوب مغربی بنگال کے دور دراز جنگلوں میں رائج کیا گیا۔[1]

میرے خیال میں متعصب مشرقی اضلاع میں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ گرانٹ ان ایڈ کے قواعد اس آبادی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو موروثی طور پر ہماری حکومت سے متنفر اور ہمارے طریقہ تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر ارزاں قسم کے پچاس سکول قائم کر دیئے جائیں جن میں کم تنخواہ لینے والے مسلمان استاد ہوں اور جن کے خرچ کا بہت سا حصہ حکومت خود برداشت کرے تو ایک ہی نسل میں مشرقی بنگال کے لوگوں کے رویہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے اداروں کو شروع میں بہت کم کامیابی ہوگی مگر آہستہ آہستہ وہ مسلمان زمینداروں کے نوجوان لڑکوں ہی کو اپنی طرف نہیں کھینچیں گے[2] بلکہ اُن مسلمان استادوں کو بھی جو اب اپنے طور پر غیر معین روزی کماتے ہیں اور جن کے لئے حکومت کی طرف سے پانچ شلنگ ہفتہ کی زائد آمدنی بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی اس طرح ہم اُس جماعت کو اپنا طرفدار بنا لیں گے جو اس وقت ہماری مخالفت میں سب سے پیش پیش ہے۔

یہاں تک تو مسلمانوں کی ادنیٰ تعلیم کے متعلق تھا درمیانہ درجوں کی تعلیم میں اس سے بھی کم تبدیلیاں کرنی پڑیں گی وہابی مقدمات کے انچارج افسر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اضلاع کے گورنمنٹ سکولوں میں مولویوں کا تقرر ہونا چاہیئے۔ یہ ذرا سی تبدیلی ہی کافی ثابت ہوگی مولوی عام مضامین کو اُردو میں پڑھائیں گے اور اسے اچھی طرح سکھا بھی سکیں گے مزید براں وہ طلبا کو فارسی سے روشناس کر سکتے ہیں اور شاید تھوڑی سی عربی بھی پڑھا دیں۔ اضلاع کے گورنمنٹ سکولوں کو اختیار دے دینا چاہیئے کہ مسلمان لڑکوں میں انگریزی سیکھنے کا شوق جس طرح چاہیں پیدا کریں۔

---

[1] ۱۸۶۵-۶۶ء میں جنوب مغربی حلقہ میں ۲۸۲ سکول تھے اور ان میں طالب علموں کی تعداد ۶۰۴۳ تھی۔ [2] میری رپورٹ کے وقت ۱۸۶۵ء میں ۲۸ ہارڈنگ اور موڈل سکول جنوبی مغربی حلقہ میں تھے۔ طالب علموں کی تعداد ۱۸۶۱-۶۲ء کی ۱۱۴۸ تعداد سے ۴۳۰۴ ہو گئی۔

ان تبدیلیوں پر اگرچہ بہت ہی کم صرف ہوگا لیکن مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے ایک مکمل اور قابل تحسین نظام کے لئے حکومت کو ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنی پڑے گی۔ وارن ہیسٹنگ نے کلکتہ کے محمڈن کالج کے لئے ایک بہت بڑی رقم مقرر کر رکھی ہے۔ پھر ہُگلی کے عظیم الشان انسٹیٹیوٹ کو اگر صحیح طریقے پر خرچ کیا جائے تو یہی روپیہ اس غرض کے لئے کافی ہوگا۔ اس وقت تک ہم جو رقم بے ایمانی سے ایک انگریزی کالج کے اخراجات پر صرف کر رہے ہیں اُس کو دیانتداری سے اُس کام پر خرچ کرنا چاہیے جس کے لئے واقف نے حقیقتاً اسے وقف کیا تھا کیا ایک اچھا کالج دو کالجوں سے بہتر نہ ہوگا؟ اس کالج کو کلکتہ میں ہونا چاہیئے یا ہگلی میں جو کلکتہ سے چوبیس ۲۴ میل کے فاصلے پر ہے یہ جزئی باتیں ہیں جن کو بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ جیسا کہ اب دستور ہے تعلیم کا زیادہ حصہ مسلمان مولویوں کے سپرد ہونا چاہیئے۔ البتہ ہر کالج میں ایک ایسے مقیم انگریز پرنسپل کی موجودگی ضروری ہے جو عربی سے بھی واقف ہو اور اس قابل کہ اپنے ماتحتوں کی عزت کے ساتھ نگرانی کر سکے اُس عہدے کیلئے ۱۲۰۰ سے ۱۵۰۰ پونڈ سالانہ تنخواہ پر انگریزی یا جرمن یونیورسٹیوں سے کوئی نہ کوئی قابل آدمی مل سکتا ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم دو شعبوں پر منقسم نہ ہوگی جیسا کہ کلکتہ کالج میں دستور ہے اور جہاں اعلیٰ شعبہ میں پہنچ کر طالب علم ہر اُس شے کو بھول جاتا ہے جو اُس نے ادنیٰ شعبہ میں حاصل کی تھی اس تعلیم کے لئے ایک اچھی طرح سے ترتیب دیا ہوا مسلسل نصاب ضروری ہوگا عربی کا اعلیٰ شعبہ انگریزی عربی میں تبدیل کر دیا جائے اور وہ انگریزی فارسی کے ادنیٰ شعبہ سے ملا ہے بلکہ اُسی کا اعلیٰ شعبہ متصور ہو۔ اس طرح مسلمان طالب علم ضلع کے گورنمنٹ سکول سے نکل کر کالج کے دونوں شعبوں میں نہایت آسانی سے ترقی کرتا ہوا تعلیم کے اعلیٰ درجات تک جا پہنچے گا۔ یہ امر بیشک مشکوک ہے کہ آیا اسلامی فقہ کی تعلیم بھی باقاعدہ ہونی چاہیئے اور سب کے لئے لازمی۔ کیونکہ اسلامی فقہ کا مطلب مذہب اسلام ہے اور یہ وہ مذہب ہے جس کے پیرو تمام دنیا کو جائز طور پر اپنا مال غنیمت سمجھتے ہیں اور اُن اسلامی سلطنتوں کی ذمہ داریوں سے قطعاً نا آشنا ہیں جو عیسائی حکومتوں کے ساتھ اتحاد رکھتی یا اُن کے ماتحت ہیں۔

لیکن یہ امر بھی دانشمندی سے بعید ہوگا کہ فقہ کی تعلیم کو سرے سے اُڑا دیا جائے کیونکہ اُس کو موقوف کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ نسل کے نزدیک، کالج کی کوئی وقعت نہ رہے گی پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی فقہ کے پڑھانے کا اصلی مقصد یعنی مستند قاضی پیدا کرنا اب فوت ہو چکا ہے۔ حکومت کو اس تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور نہ اس کے پڑھنے والے کو زندگی میں کوئی

فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کی مناسب تعلیم علیحدہ لیکچروں میں دی جا سکتی ہے یعنیہ جس طرح ہندو قانون کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی میں دی جاتی ہے بالفعل فقہ کی روزانہ تعلیم کی جگہ عربی یا فارسی ادبیات کو دی جا سکتی ہے۔ جہاں تک مغربی سائنس کا تعلق ہے اسے اُردو زبان میں پڑھایا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم مسلمانوں کی ایک ایسی اضافہ پذیر نسل تیار کر لیں گے جس کا علم اپنے ہی تنگ دائرے میں محدود نہ ہوگا وہ صرف اپنے قوانین کے تلخ اصولوں سے واقف نہیں ہوگی بلکہ اُن میں سنجیدہ اور حقیقی مغربی علوم کی روح بھی پیدا ہو جائیگی اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذہبی قوانین سے بھی اتنی واقفیت ضرور ہوگی جس سے اپنی قوم میں عزت کی جگہ پا سکیں اُن کی انگریزی تعلیم اُن کو زندگی کے منفعت بخش شعبوں میں داخل ہونے کے لئے مدد دے گی۔

مسلمانوں کی ادنے اور درمیانہ درجہ کی تعلیم کے لئے ایک ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز مقرر کرنا چاہئے جو اُن کا ہم مذہب ہو اس قسم کا افسر ۲۰۰ پونڈ سالانہ پر مل سکتا ہے۔ اس کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان اسلامی مدرسوں اور کالجوں کا پتہ لگائے اور اُن کے متعلق رپورٹ کرے جو ہندوستانیوں کے زیرِ اہتمام چل رہے ہیں بہت سے ایسے مدرسے اب تک گوشہ گمنامی میں پڑے ہیں جن کا ہمارے تعلیمی انسپکٹروں کو کچھ علم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن میں سے بعض نے ابھی تک اچھا خاصا معیار قائم کر رکھا ہے۔ پھر اگر ہم اس بات کا اندازہ بھی کر سکیں کہ وہ کس لائحہ عمل پر کاربند ہیں اور اس سے ہم کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں تو اور زیادہ بہتر ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ باقاعدہ انگریزی افسروں کی نگرانی پر کبھی رضامند نہ ہوں گے پھر بھی اُن میں بہت سے مدرسے ایسے بھی نکل آئیں گے جو اپنے ہم مذہب ڈپٹی انسپکٹر کے معائنہ پر راضی ہو جائیں اور یہ گرانٹ اِن ایڈ کی ایک آسان سی شرط ہوگی اس طرح ہم بنگال کے باغیانہ اداروں کو اگر وفاداری کی طرف نہیں تو کم از کم امن و امان کی طرف ضرور مائل کر سکیں گے نئی الحال اُن طفلانہ بے وقوفیوں کے بجائے جو مسلمان اپنے مدرسوں میں پڑھتے ہیں اچھی اور عمدہ کتابوں کا سلسلہ جاری کرنا چاہیے کالجوں کو پورے اطمینان کے ساتھ اُن کے انگریز پرنسپلوں کی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ان کے لئے کافی رقم موجود ہے بشرطیکہ اُس کا صحیح استعمال ہو سکے حکومت کو بہر کیف اس میں ایک پائی بھی خرچ کرنا نہیں پڑے گی۔

اس طرح ہم مسلمان نوجوانوں کو اپنے خیال کے مطابق تعلیم دے سکیں گے۔ پھر اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت

کئے بغیر دورانِ تعلیم میں ان کو اس بات کا موقعہ دیتے ہوئے کہ وہ اپنے مذہبی فرائض سے واقفیت پیدا کریں ہم شاید اُن کے مذہب کو کم سچا ثابت نہ کرسکیں ان کے تعصب کو یقینی طور پر کم کرسکیں گے مسلمانوں کی یہ نئی نسل بھی اُسی راستہ پر گامزن ہو جائے گی جس پر چل کر ہندو جو دنیا کی متعصب ترین قوم تھی اب فراخ دل ہوگئی ہے مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کا ایمان اب اتنا راسخ نہیں ہے جتنا اُن کے آباؤ اجداد کا تھا ان کی فراخ دلی نے اُن کو بالکل آزاد کر دیا ہے بعینہٖ وہ مسلمانوں کو بھی اُن مظالم کے ارتکاب اور مجرمانہ حرکات اور تکالیف کی کوفت سے آزاد کر دے گی جو انہوں نے ایک غلط مذہب کے نام پر روا رکھی ہیں میں اُن اعمال و افعال کو بیان کرنا نہیں چاہتا جن سے لاپروائی برت کر ہی ہندو اور مسلمان اعلٰے عقیدے کو پہنچ سکتے ہیں بہر حال مجھے کامل یقین ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب ہمارا یہی طریقۂ تعلیم جس نے اب تک اُلٹے اثرات پیدا کئے ہیں اس مقصد تک پہنچنے کے لئے پہلا زینہ ثابت ہوگا گو اس کے نتائج بہت دیر میں ظاہر ہوں دراصل اب تک ہندوستان میں انگریزوں کی حیثیت صرف یہ رہی ہے کہ انہوں نے معمولی طور پر رسم و رواج کو توڑا۔

اِس دوران میں حکومت کا فرض ہوگا کہ مسلمانوں کی بد اعتمادی کو سختی کے ساتھ دور کرتی رہے اور اُن کے لئے اس کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دے اسے ان کی رعایت بھی کرنی پڑے گی نہ صرف اُس تباہی کی وجہ سے جو ہماری فتح اور حکومت کی تبدیلی کے باعث اُن پر نازل ہوئی بلکہ اس لئے بھی کہ ہماری ہمدردی کے مفقود ہونے سے اُن کی بربادی ناقابلِ برداشت اور آخری حد تک پہنچ گئی ہے مسلمانوں کی بے نا جماعت کے ساتھ اس کا رویہ اس قسم کا ہونا چاہئے کہ اُس سے نہ صرف حکومت کے انصاف کی تعریف ہو بلکہ عام رائے میں بھی اسے قابلِ توصیف گردانا جائے۔ ایک قرار واقعی مجرم[۵] کے خلاف بے سلیقہ رویہ نے روم کے فلسفی اور بہت ہی نیک نام شہنشاہ کی یاد پر صدیوں تک دھبہ لگائے رکھا تھا اب تک ہم نے میدانِ جنگ کے سوا کہیں بھی کسی کا خون نہیں گرایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہادت کے شوق نے لوگوں کو وہابیوں کی فوج میں داخل ہونے کی بجائے بہتوں کو اُن سے منحرف کر دیا اس وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں انگریزی فوج کو گوشت بہم پہنچانے والا بدنام شخص[۶] جس کو ۱۸۶۴ء میں موت کی سزا ہوئی تھی پٹنہ میں اپنے ہم مذہب بھائیوں کے خلاف شہادت دے رہا ہے اگر اس

---

[۵] جلین (Julian) کے ماتحت افریقہ کا وائسرائے۔ نوری گو ڈینبس اور مصر کا ظالم ڈیوک۔ [۶] محمد شفیع۔

کی اصلی سزا پر عمل کیا جاتا تو ہر سال ہزاروں زائرین اُس کی خانقاہ پر زیارت کے لیئے آیا کرتے۔ ہر زمانہ میں مذہب کیلئے مرنا بدکرداری کی زندگی کو نیک نام کرنے کے لیئے کافی ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمارے دہلی کے بوچڑ سے بھی زیادہ بدکردار فوج کو گوشت بہم پہنچانے والے کی قسمت حکومت کو ایسی سزا دینے پر متنبہ کر رہی ہے جس کو اُس کی مسلمان رعایا شہادت کی موت تصور کرے گی۔ حکومت اس واقعہ کو کبھی فراموش نہ کرے کہ کس طرح کیپڈ ڈیشا کا رہنے والا جارج جو مفت خوری کی ملعون زندگی بسر کرتا اور رومن فوج کو سور کا گوشت بہم پہنچانے کا وعدہ پورا نہیں کر سکتا تھا ایک بے ایمان پادری کی زندگی بسر کرتے ہوئے بن مانگی موت کے باعث پرستش کا مستحق ٹھہرا اور سرزمین انگلستان میں جارج ولی کے نام سے مشہور ہوا۔

ضمیمہ نمبر ۱

کلکتہ کے علما کا فتوے

سوال

آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ خدا آپ کے اقبال کو بلند کرے۔

کیا ملک ہندوستان جس کے حاکم عیسائی ہیں اور جو اسلام کے تمام احکامات میں مداخلت نہیں کرتے مثلاً روزانہ نماز عیدین کی نماز وغیرہ وغیرہ مگر اسلام کے بعض احکام کو چھوڑ دینے کو جائز سمجھتے ہیں مثلاً وہ اُس شخص کو اپنے مسلمان آباؤ اجداد کی جائداد کا وارث قرار دیتے ہیں جو مرتد ہو گیا ہو اور عیسائی بن گیا ہو۔ دارالاسلام ہے یا نہیں۔ مندرجہ بالا کا جواب دیں اور اللہ سے اس کا اجر پائیں۔

جواب نمبر ۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔

رب زدنی علما) خدا میرے علم کو بڑھائے۔

,, جب تک اسلام کے بعض مخصوص احکام جاری ہیں وہ دارالاسلام ہے " اللہ سب کچھ جاننے والا اور بے عیب ہے اور

سب سے بڑا ہے۔

یہ فتوے اُس شخص نے دیا ہے جو اللہ تعالے کے مخفی عنایات کا آرزو مند ہے۔ جو خدا کی تعریف کرتا ہے اور اُس کے رسول پر درود بھیجتا ہے۔

دستخط جمال ابن عبداللہ شیخ عمر الحنفی۔ مکہ معظمہ کا موجودہ مفتی۔

خدا اُس پر اور اُس کے باپ پر رحم فرمائے۔

جواب نمبر ۲

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو واحد ہے اور خدا ہمارے رسول اور اُس کی آل اور اُس کے اصحاب اور اُس پر ایمان لانے والوں پر رحمت فرمائے۔

(نحمدہ ونصلی علےٰ رسول الکریم وآلہ واصحابہ وھدیاتہ اجمعین)

اے خدا میں تجھ سے نیکی کا راستہ چاہتا ہوں۔ (اھدنا صراط المستقیم)

جہاں جب تک کہ اُس میں اسلام کی بعض خصوصیات جاری ہیں وہ دارالاسلام ہے؛

خدا ہی سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ بے عیب ہے اور سب سے بڑا ہے۔

یہ اُس شخص نے لکھا ہے جو خدائے مہربان سے نجات کا طالب ہے خدا اُس کو۔ اُس کے والدین کو اُس کے استادوں کو اُس کے بھائیوں کو۔ اُس کے دوستوں کو اور تمام مسلمانوں کو معاف فرمائے۔

دستخط احمد بن زینی دلہم مکہ معظمہ کے شافعی مذہب کا مفتی۔

جواب نمبر ۳

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو ایک ہے اور خدا میرے علم کو بڑھائے۔

یہ امر دسوکی کی شرح میں مرقوم ہے کہ دارالاسلام اُس وقت دارالحرب نہیں بن جاتا جب تک وہ کافروں کے ہاتھ میں چلا جائے بلکہ اُس وقت دارالحرب بنتا ہے جب اُس میں اسلام کے تمام یا بہت سے احکام جاری نہ رہیں"

خدا عالم الغیب ہے خدا کی رحمتیں ہمارے رسول پر اُس کی آل پر اور اُس کے صحابہ پر نازل ہوں

دستخط بقلم خود حسین بن ابراہیم مالکی مذہب کا مفتی مکہ معظمہ۔

ضمیمہ نمبر ۲

شمالی ہند کے علماء کا فتوے

استفتاء: مترجمہ سید امیر حسین پرسنل اسسٹنٹ کمشنر بھاگل پور۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس بارے میں کہ ہندوستان میں جہاد جائز ہے۔ یہ ملک پہلے مسلمان بادشاہ کے ماتحت تھا اور اب عیسائی حکومت کے زیر اقتدار ہے۔ یہ عیسائی بادشاہ اپنی مسلمان رعایا کے مذہبی فرائض میں مداخلت نہیں کرتا مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نماز جمعہ اور نماز باجماعت اور مسلمانوں کو ان فرائض کی ادائیگی کی پوری پوری آزادی ہے۔ وہ مسلمانوں کو پناہ دیتا ہے بعینہ جیسے کوئی مسلمان بادشاہ دے گا۔ یہاں مسلمان رعایا کے پاس نہ اپنے حاکموں کے ساتھ لڑنے کی طاقت ہے نہ ان کے پاس ہتھیار ہیں۔ برخلاف اس کے اگر لڑائی شروع کر دی جائے تو شکست ناگزیر ہے۔ جس سے اسلام کی عزت کو نقصان پہنچے گا۔

فتوے بتاریخ ۱۷ ربیع الثانی مطابق ۱۷ جولائی ۱۸۷۰ء اس جگہ مسلمان عیسائیوں کی امان میں ہیں اور اُس ملک میں جہاد واجب نہیں جہاں اہل اسلام کو پناہ حاصل ہو۔ جہاد کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کو پناہ اور آزادی حاصل نہ ہو لیکن یہاں یہ حالت نہیں مزید برآں یہ ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اُس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔

اس جگہ مولویوں نے ایک عربی متن درج کیا ہے جو منہاج الغفار اور فتاویٰ عالمگیری سے منقول ہے۔

مہریں: مولوی علی محمد لکھنوی۔ مولوی عبدالحی لکھنوی۔ مولوی فیض اللہ لکھنوی۔ مولوی محمد نعیم لکھنوی مولوی رحمت اللہ لکھنوی۔ مولوی قطب الدین دہلوی۔ مولوی مفتی سعد اللہ لکھنوی۔ مولوی لطف اللہ رامپوری مولوی غلام علی رام پوری۔

ضمیمہ نمبر ۳

محمڈن سوسائٹی کلکتہ کا فیصلہ

شمالی ہندوستان کے علما کے فتوے کی مخالفت کرتے ہوئے یعنی یہ کہ ہندوستان دارالاسلام ہے "

مولوی کرامت علی یوں رقمطراز ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ملک میں جہاد جائز ہے یا نہیں لیکن اس کو پہلے سوال کے ساتھ حل کر دیا گیا ہے کیونکہ دارالاسلام میں جہاد کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں۔ یہ امر اس قدر واضح ہے کہ اس کی حمایت کے لئے کوئی دلیل یا مثال پیش کرنا غیر ضروری ہے اب اگر کوئی گم کردہ راہ مجنون اپنی اُلٹی قسمت کی وجہ سے ملک ہندوستان کے انگریز حاکموں کے خلاف جنگ شروع کر دے تو اس قسم کی جنگ کو بغاوت تصور کیا جائے گا اور بغاوت اسلامی فقہ میں سخت منع ہے اس لئے یہ جنگ بھی ناجائز ہوگی اگر کوئی شخص کسی حالت میں بھی ایسی جنگ کرے گا تو مسلمان اپنے حاکموں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گے اور اُن کے ساتھ مل کر باغیوں سے جنگ کریں گے۔ مندرجہ بالا امر صاف طور پر فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے۔

اعلان

پیغام حق کا پرچہ بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء ایک خاص اشاعت ہوگا جس میں مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق " کی شرح شائع کی جائے گی۔ امید ہے کہ ناظرین حضرات اپنے رفقار کو بھی پیغام حق کی مستقل خریداری کی دعوت دے کر اس علمی و ادبی ادارہ کو دیر تک زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

مینیجر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ — لاہور

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے چھ روپے

ماہنامہ

پیغام حق

ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

عدد ۲	اگست ۱۹۴۲ء	جلد ۷

سخنہائے گفتنی — عبدالقدیر خانصاحب ایم۔ اے — ۲

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (اقبال) — پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے آنرز — ۹

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں
طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اسلام ایک تاریخی قوّت (HISTORICAL FORCE) ہے۔ ہر تاریخی قوّت کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے ترکیب و امتزاج کے لحاظ سے انسان کے داعیاتِ نفس کی عادلانہ تکمیل کرتی ہے قرآن کا یہ دعوٰے ہے کہ وہ ایک دینِ فطرت پیش کرتا ہے۔ قرآن نے دعوٰے کیا ہے کہ کائنات کے ہر ذرّے ذرّے میں اسی دینِ فطرت کے مطابق عمل ہو رہا ہے۔ انسان کو ذاتِ باری نے جو تھوڑا بہت اختیار محض امانت کے طور پر تفویض کیا ہے وہ اس لئے ہے کہ انسان ذاتِ باری عزّ اسمہ کے فرامین و نواہیں کی ضیاء میں اپنے ارادہ اور شعور کا ارتقاء کرے۔ اس مقام کو قرآن نے عبادت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعوٰے ہے کہ داعیاتِ نفس کے عادلانہ اور حکیمانہ تعاون و تعامل کا لائحہ عمل فکری اسلوب ترتیب نہیں دے سکتا فکرِ انسان کی قوتِ احاطہ بہت سست رو اور محدود ہے۔ فکر سے زیادہ تیز فہم اور دور رس تو انسان کا ذوقی تجربہ ہے۔ سوچ اور فکر حقیقت کے ادراک میں اتنی سریع السیر نہیں جتنا کہ انسان کا وجدانی احساس۔ وحی اس سے بھی کئی گنا بلند ہے۔ اس کی قوت بسط و نفوذ اپنے اندر ترقی کا جوہر مخفی رکھے ہوئے ہے۔ واقعہ معراج جو وحی کی کیفیت کا نہایت ہی ترقی یافتہ مظہر تھا اسی واقعیت کا اثبات کرتا ہے۔ آنحضرتؐ اس معین وقت میں ان تمام قوانین کی زنجیروں سے سبکدوش ہو چکے تھے جو معمولی کردار کا جزو لاینفک ہیں۔ اس بارے میں توجیہ اور تشریح کے اختلافات پیدا کئے

جا سکتے ہیں مگر اسلام کے ان محیر العقول تاریخی انقلابات کو ہم کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو تاریخ اور واقعیت کا ایک جزو لاینفک بن چکے ہیں اور جن پر اس مصرع کا اطلاق صادق آتا ہے ؎

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اسلام نے اجتماعی ارتقاء کے باب میں انسانیت کے پامال اور پژمردہ طریقوں کے استعمال سے اجتناب کیا۔ اس نے علم کے ہاتھ میں حقیقت کا سر رشتہ نہیں دیا۔ انکشاف حقیقت کے باب میں اس نے وحی ہدایت کے عروۃ الوثقیٰ کو میزان قرار دیا۔ نہ کہ علم کے ظن اور تخمین کو معیار خیر و شر کا منصب تفویض کیا۔ ہم اس وقت جو شئے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی بنیادی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ وجود اور کائنات ایک مطلق ہستی جو صاحب الارادہ ہے، کے عائد کردہ قوانین کی زنجیر عمل میں اپنے آپ کو وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کے دو اہم رخ ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حقیقت کبریٰ کا عقیدہ دو حصص پر مشتمل ہے،

ا۔ واجب الوجود ہستی کا عقیدہ وحی کے ذریعے ہم تک پہنچا۔

ب۔ اسی قوت وحی نے انسان کے داعیات نفس کے عادلانہ توازن و حکیمانہ تعامل کیلئے ایک دستور وضع کیا ہے۔ انسان کا ارتقاء معاشرت کی ہم آہنگی عمران کے مختلف اجزاء کا نشاکل معنوی، صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس ترتیب دیئے ہوئے قانون کے سامنے اپنا سر اطاعت خم کر دیں۔ ساقی ازل کے سامنے اعزاز و احترام کے استحقاق کی یہی شرط ہے کہ رسم و راہ میخانہ کا التزام کیا جاوے

اسلام بحیثیت ایک اجتماعی عمل کے آج تک دنیا سے ختم نہیں ہو سکا۔ اس بحر بیکراں میں مدوجزر کی

کیفیت ضرور وارد ہوتی رہی مگر یہ ایک ناقابل تردید اور واضح حقیقت ہے کہ اسکی قوت تخلیق اب تک برقرار ہے اور اقوام و ملل اسلامیہ پر کوئی بڑے بڑے خوفناک اور دردانگیز عوالم طاری ہوتے رہے مگر اسلام کا سمٹنا اور اضمحلال ایک عارضی اور وقتی وقفے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ وقت ملنے پر اس نے زیادہ قوت نفوذ حاصل کر کے اپنے ماحول کو متاثر کیا ہم اپنے اس کلیہ کو صرف خالی دعویٰ تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے اثبات کے لئے ہمارے پاس قطعی شواہد ہیں۔ ان شواہد کے مطالعہ سے اس حقیقت کا اثبات وایقان نہایت واضح صورت میں ہو سکے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے زوال کا باعث ہم اسلام کے اجتماعی تصور کو ہرگز قرار نہیں دے سکتے اس وجہ سے کہ تاریخ اور واقعات اس کیلئے کوئی سند ہمیں مہیا نہیں کرتے اسکے برعکس حقائق اور واقعات کی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے معاشرتی تصور سے انحراف اور وحی کی ہدایت کے عقیدہ سے اجتناب نے ملت اسلامیہ کیلئے فتنوں کے بند دروازے کھول دیئے۔

اسلام نے معاشرت کا ایک ایسا نظام پیش کیا جہاں طبقات کی کشمکش اور دولت کے اکتناز اور احتکار کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلام کا نظام ایک ایسی اجتماعیت کا تعمیر کرنے کا داعی تھا جہاں دولت کی ذاتی ملکیت کا تصور عقیدہ کی حیثیت سے مفقود تھا مگر دولت کی امانت کا تصور ضرور رائج تھا۔ انسان کو ذات باری نے تمام قوتیں بطور امانت تفویض کی ہیں اس کے لئے لازم آتا ہے کہ امانت کے تصور میں انسان اس کی مرضیات کا پابند رہے جس نے زندگی کی امانت انسان کے سپرد کی ہے مغرب نے بہت کدوکاوش کے بعد اشتراکیت کے تصور کو ترویج دی مگر چونکہ بنیادی طور پر مغرب کا نظام زندگی غلط تھا اس لئے اس کو بروئے کار لانے کے لئے مغرب کے سیاسی مصلحین نے زبردست ٹھوکریں کھائیں انہوں نے حالات کے غلط تقاضاؤں سے متاثر ہو کر ماحول اور زندگی کے بارے میں غلط تصورات قائم کر لئے۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آگے کے

واروں سے زمین سُرخ ہو رہی ہے۔ لاشوں کے ڈھیروں سے زمین کے راستے اٹے پڑے ہیں اور فضائے نیلگوں جنگ کی نہرماتیوں سے اپنی رفعت کی حفاظت نہیں کر سکی۔

اسلام ہندوستان میں اس وقت آیا جب یہ اپنے دور تغیر (TRONSFORMATION PHASE) میں داخل ہو چکا تھا اس کی صاف اور شفاف سطح پر اب ملوکیت اور استبداد کا زنگ لگ چکا تھا سلاطین اب صرف سلاطین ہی تھے، اسلام کے داعی اور نقیب کے پایہ سے ساقط ہو چکے تھے مگر اس وقت بھی اسلام میں ایک خاص طرح کی قوت حرب و ضرب تھی۔ دنیا میں اسلام کے بقا اور نمو کا منطقہ مشرق وسطے تھا اور وہ تمام آبادیاں تھیں جو بحیرہ روم کے اردگرد تین براعظموں میں پھیل گئی ہیں

اسلام کا یہ تفضل اس لئے تھا کہ ابتدا ہی سے اس میں دو اوصاف اپنی کامل صورت میں جمع کر دیئے گئے تھے :-

ا ۔ معاشرت انسانی کی تعمیر کا الہامی اسلوب۔

ب ۔۔ ایک ایسی اجتماعی زندگی کا تصوّر جو عدل اور حکمت کے تصوّر پر مبنی ہے۔

داخلی طور پر معاشرتِ اسلامی ایک ایسی ترکیب ہے جس کے اجزاء میں کامل ہم آہنگی ہے خارجی طور پہ یہ ایک زبردست قوتِ عمل ہے یہ ایک جہاد اور حرکت کا آلہ ہے۔ اسلام کا یہ تصوّر تھا جس نے ایک بالفعل اور اقتدار کی قوّت حاصل کر کے اس کو اب تک پوری معنویت سے باقی رکھا ہے۔

یورپ نے اب تک معاشرت کا کوئی ایسا تصوّر پیش نہیں کیا جو داخلی طور پر ہم آہنگ اجزاء کا مرکب ہو مسلمانوں کی تمام لڑائیاں اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار رہیں جب تک ان کی معاشرت داخلی طور پر ہم آہنگ رہی مسلمانوں نے بعد میں اس غلط تصوّر کو رواج دیا جس کا مقصد علمی مباحث کو عقیدہ قرار دے کر حرب و ضرب اور بحث و مناظرہ کی مجالس کا انعقاد تھا ورنہ اسلام حقیقت کے بارے میں صرف اسی پر اکتفا کرنا ہے جو اس نے اپنے پیروؤں کو بتلا دیا ہے! اسلام کے بارے میں فلسفہ زدہ

لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انجماد فکر کا ایک تاریک منظر ہے جو ہمارے سامنے کھلتا ہے مگر فی الحقیقت سماج کے داخلی اتحاد کی بہترین راہ یہی ہے کہ وجود مطلق کے بارے میں صرف اس حد تک اکتفا کر لیا جاوے جو اسلام نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے غیر ضروری مسائل کو اس باب میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ملت اسلامیہ کے تشتت و افتراق کا سب سے بڑا دروازہ اسی قسم کی ذہنیت نے کھولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملی اور اصطلاحی مسائل میں ہم بہت پیچھے رہ گئے۔ اسلام کا زاویۂ نظر جدید حکیمانہ محکّ عمل سے بہت قریب ہے اسلام نے اپنے فکری نظام میں یونانی تہذیب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ یونان کے تصورات اپنی اسپرٹ کے لحاظ سے فکری ہیں۔ اسلام بعض بنیادی حقیقتوں کے اعتراف و اذعان کے لئے استقراء اور استقصاء کو بہت اہمیت سے دیکھتا ہے مگر اس نے مغرب کے جدید ملحدانہ رجحانات کا علم کی حدود معین کر کے سدباب کر دیا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ ہندو تہذیب کا ہے۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ ہندوستان اور چین بھی ہمارے سامنے دو مختلف اجتماعی اعمال (SOCIAL PROCESS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام سے ان کا تصادم جاری ہے۔ فی الحقیقت اسلام ایک انقلاب انگیز انجذابی عمل ہے اس کو ازمنہ وسطیٰ کے ایک زبردست عالم دین نے اکال الامم کا لقب دیا تھا گو اس وقت قائم شدہ تہذیبوں کی قوت اپنے اصطلاحی معنوں میں بہت زیادہ ہے مگر اس سے اسلام کے غلبہ کے تصور پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ بالآخر شیطان کی مہلت ختم ہو گی اور اس کو تمام باطل قوتوں کے خاتمہ کے بعد اپنی روح کے مطابق انسانیت کے اصلاح و تزکیہ کے لئے قوت تنفیذ مہیا ہو جاوے گی ہم اس وقت صرف ہندوستان کے حالات کا مطالعہ اس زبردست اجتماعی عقیدہ کے اثر اور نفوذ کے زاویہ نظر سے کرتے ہیں۔

ا۔ ہندوستان میں اسلام کو غوری اور غزنوی ترکوں نے ایک نافذ العمل قوت کی حیثیت دلانے میں اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کیا۔ اس زمانے میں حرب و ضرب، ہجوم اور جہاد کے فرائض ان ترکوں نے ادا کئے مگر تبلیغ اور دعوت کا کام خاندان چشتیہ کے اکابر یعنی حضرت علی ہجویریؒ اور ان کے متعلقین نے کیا۔

ب۔ خاندان غلامان نے التمش، بلبن اور ناصر الدین کی شخصیتیں پیدا کیں جنہوں نے اسلام کے دونوں پہلوؤں یعنی دعوت اور جہاد کے لئے اہلیت کا ثبوت فراہم کیا۔

ج۔ علاؤ الدین خلجی نے نظم و نسق سلطنت کے باب میں کلیات کو ترتیب دیا۔ اس کو اسلام کے فولادی انسان کے نام سے یاد کریں گے۔

د۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق کو ہم دعوت اور جہاد کے مختلف مظاہر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہ۔ شیر شاہ سوری کی شخصیت نظم و نسق مملکت اور اسلام کے عادلانہ نظام کے تحفظ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

اس وقت تک ہندوستان کی اصلاح و تذکیر کے لئے صوفیائے کامل سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا چونکہ گزشتہ تمام سلاطین اسلام نے مذہب اور دیگر نوامیس شریعت کے نظام کو نہیں چھیڑا تھا اس لئے وہ علماء سے تعرض نہ کرتے مگر بعد کے واقعات ایسے رونما ہوئے کہ دور مغلیہ میں اسلام کے علماء کو اس جانب اپنی توجہ مبذول کرنا پڑی چنانچہ شیخ احمد سرہندیؒ نے دعوت اور تذکیر کے لئے علم بلند کیا۔ اکبر نے ہندو مجلسی تصور کو اسلام سے مخلوط کر کے ایک نئے مذہب کے سنگ بنیاد رکھنے کا عزم کیا یہ ایک ایسی سعی تھی جس کا قوت سے فعل میں آنا اسلام کیلئے سخت مہلک ثابت ہوتا اس وقت علمائے اسلام پوری جمعیت کے ساتھ اس مداخلت مذہبی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جہانگیر اور شاہجہان کے دور حکومت میں ہندوؤں نے اپنے شر اور فساد کا سلسلہ جاری رکھا۔

داراشکوہ کی صورت میں یہ فتنہ ایک خطرناک صورت اختیار کرنے لگا مگر اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت نے اس فتنہ کو تباہ کر دیا اور پچاس برس تک اسلام فتنوں کے سیلاب سے بچ گیا۔

(باقی آئندہ)

اس پرچہ میں علامہ ڈاکٹر اقبالؒ کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی شرح میرے محترم دوست پروفیسر محمد یوسف خان سلیم چشتی کے قلم سے شائع ہو رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کی قومی مرض کے بہترین نبض شناس تھے انہوں نے قوم کی موجودہ پستی کا نقشہ کھینچ کر اس مثنوی میں بتایا ہے کہ ان کے اندر کیا کیا خرابیاں ہیں اور وہ خرابیاں کس حد تک ان کے لئے مہلک امراض کا باعث بن گئی ہیں۔ پھر ان امراض کا علاج بھی سمجھا دیا ہے۔

سلیم چشتی کے قلم نے علامہ اقبالؒ کے فکر بلند کی شرح لکھ کر سونے پر سہاگہ کا منظر پیدا کر دیا ہے۔ یہ شرح پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو اپنی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں اور خرابیوں کا پتہ چلے گا اور پھر ان کو دور کرنے کے طریقے معلوم ہوں گے۔ اسکے پڑھنے سے آپ اقبال کے مقام بلند سے واقف ہو جائینگے اور جاننے لگیں گے کہ اقبالؒ نے آپ کے نام کیا پیغام چھوڑا ہے۔

یہ شرح ابھی نامکمل ہے۔ میں اپنے دوست سلیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ مثنوی کا باقی حصہ بھی لکھ دیں تاکہ اس شرح کو بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

احباب یہ معلوم کر کے شائد خوش ہوں گے کہ اس مثنوی کی انگریزی شرح بھی ایک دوست نے لکھ ڈالی ہے اور عنقریب اس کے شائع ہو جانے کی توقع ہے جو حضرات اردو یا انگریزی شرح "پس چہ باید" کتابی شکل میں حاصل کرنا چاہیں وہ براہ کرم اپنے نام درج رجسٹر کرا دیں تاکہ کتاب شائع ہوتے ہی ان کی خدمت میں ارسال کی جا سکے۔ فرمائش درج رجسٹر کرانے کے لئے کسی پیشگی رقم کی ضرورت نہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!

پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔ اے (آنرز)

پیش لفظ

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد" کے ابتدائی صفحات کی شرح بالاقساط مؤقر جریدہ "نوائے وقت" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے یکجائی طور پر، رسالہ 'پیغام حق' میں شائع کیا جارہا ہے اور اگر کوئی مانع پیدا نہ ہوا، تو کوشش کروں گا کہ بقیہ مباحث کی شرح بھی بہت جلد مرتب کردوں تاکہ اقبال اکیڈمی اُسے کتابی صورت میں شائع کردے۔ مجھے کلامِ اقبالؒ کو کماحقہ سمجھنے کا ادعا نہ تھا اور نہ ہے، یہ جو کچھ لکھا ہے محض اُسی عقیدت کا اظہار ہے جو اس ہیچمداں کو، علامہؒ کی ذاتِ گرامی سے ہے اور یقیناً تادمِ آخر رہے گی (انشاء اللہ) اور مقصد یہ ہے کہ اس طرح نوجوانوں کے قلوب میں، کلامِ اقبالؒ سے گرویدگی کا رنگ پیدا کیا جائے۔ اگر افرادِ ملت کے اندر یہ رنگ پیدا ہوجائے تو مجھے یقین ہے کہ ان کا خون، جو غیر اسلامی افکار کی سردی سے منجمد ہوچکا ہے، پھر تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگے گا اور وہ انقلاب جس کے برپا ہونے کی آرزو علامہؒ کو ساری عمر عاشقِ صادق کی طرح تڑپاتی رہی، اسی گردشِ خون پر منحصر ہے۔

دور زاغ و غلاموں کا نہ سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اقبال کے کلام کا مطالعہ — اور پھر اس کے ساتھ ایک شدید روحانی اُنس — مسلمانوں کے دل میں، سوزِ یقیں پیدا کر سکتا ہے اُن کے کلام میں شاعر کا سوز، فلسفی کے افکار، اور مومن کے واردات، یہ تینوں عناصر، من وجہ الکمال موجود ہیں کیونکہ ان کی شخصیت میں شاعری، فلسفہ اور ایمان، ان تینوں عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے اور کسی شخص واحد میں ان تینوں خوبیوں کا بیک وقت جمع ہو جانا، نوادرات عالم میں سے ہے اور اسی امتزاج میں اقبال کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ پس میں اقبال ہی کے الفاظ میں، نوجوانانِ ملت کو صلائے عام دیتا ہوں کہ

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

بخوانندۂ کتاب

علامہ اقبال کے دل میں اقوام شرق کی پستی اور زبوں حالی کا جس قدر شدید احساس تھا اس کا صحیح اندازہ لگانا مقصود ہو تو اس "فغان نیم شبی" کا مطالعہ کیجیے جو ۱۹۳۶ء میں مثنوی "پس چہ باید کرد" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس مثنوی کے متعلق میرے محترم پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔ اے سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڑھ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ

"جس طرح سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا دل کہا جا سکتا ہے اسی طرح بلا تشبیہ، ہم اس چھوٹی سی مثنوی کو کلامِ اقبال کا دل کہہ سکتے ہیں"

اس خیال کی تائید میں یہ کہنا خلاف محل نہ ہوگا کہ اقبالؒ نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک جو کچھ لکھا اس کا مقصد یہ ہے کہ اقوامِ شرق استیلائے غرب سے آزاد ہو سکیں۔ چونکہ اس مثنوی میں اس مقصد کی بہترین طریق پہ وضاحت کی گئی ہے اس لئے اس کو "بلاشبہ" اقبالؒ کی تمام تصانیف کا خلاصہ یا دل کہا جا سکتا ہے۔ پس ان اصحاب کی خاطر جو فارسی زبان میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے اس مثنوی کے مطالب عالیہ سے کما حقہٗ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا خلاصہ عام فہم انداز میں سپرد قلم کردوں۔

علامہؒ نے شروع میں تحت عنوانِ بالا چار شعر سپرد قلم فرمائے ہیں جن کے مطالعہ سے اس مثنوی کے لکھنے کا مقصد واضح ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ان کی تشریح درج کی جاتی ہے۔

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است
گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

پہلی چیز جو ان اشعار سے واضح ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ علامہؒ نے ان اشعار میں عشق اور عقل کا موازنہ کیا ہے اور عقل کی پوزیشن واضح کی ہے۔ اقبالؒ کے فلسفہ میں عشق کو عقل پہ تفوق حاصل ہے۔ اور بانگ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک تمام تصانیف میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

اقبال کا عقیدہ ہے کہ عقل یا خرد علوم و فنون کے حصول میں تو مدد دے سکتی ہے لیکن قوموں کی زندگی میں ان کے عروج میں اور تسخیر کائنات میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ عشق ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال عقل کو بے کار یا فضول قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اسے رہنمائے کامل نہیں سمجھتے۔

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست لیکن ایں بیچارہ را آں جرأت رندانہ نیست

یعنی عقل بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن اس میں ایک بات کی کمی ہے۔ اور وہ جرأت رندانہ ہے جس کے بغیر انسان محیر العقول کارنامے سرانجام نہیں دے سکتا۔ بانگ درا میں لکھتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اب میں ان اشعار کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

(۱) فرماتے ہیں کہ خرد نے بغاوت پہ کمر باندھی ہے۔ اور اس بغاوت کی وجہ سے حرم (مسلمانوں کی ملی زندگی) کی ہستی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یعنی دانشِ حاضر (تہذیب مغرب اور فلسفۂ مغرب) نے مسلمانوں کے عقاید اور افکار کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس لئے میں عشق کے ملک سے فوج بھرتی کرنا چاہتا ہوں جو اس باغی گروہ کا مقابلہ کرے۔ یعنی میں مسلمانوں کو عشق (حب رسولؐ) کا درس دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ "دانش حاضر" کا مقابلہ کر سکیں۔

(۲) افسوس یہ ہے کہ آج کل کے مسلمان اس حقیقت سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں کہ عشق ایسی قبا ہے جو عقل کے جسم پر بالکل فٹ (موزوں) آسکتی ہے یعنی جس

طرح انسان کا حسن لباس سے دو بالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب عشق عقل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے تو عقل صحیح طریق پہ گامزن ہو سکتی ہے یعنی عشق عقل کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

(۳) فرماتے ہیں کہ جب سے مَیں نے عشق (حب رسولؐ) کا مسلک اختیار کیا ہے میں اس بلند مقام پہ پہنچ گیا ہوں جس کے بام و در کا طواف کرنا عقل کے لئے موجب سعادت ہے یعنی عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو رہزنی سکھاتی ہے۔ (اور یورپ کی موجودہ حالت اس حقیقت پر شاہد ہے) لیکن جب ایک عقلمند آدمی عشق کا مسلک اختیار کر لیتا ہے تو اس کی عقل بھی پاکیزہ ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کو نیکی اور تقویٰ سے معمور کر دیتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جب عقل نے عشق کی غلامی قبول کی تو فاتحین کا طرزِ عمل اس قدر پاکیزہ اور مستحسن ہو گیا کہ مصر، شام اور ایران کے باشندوں نے اُن کو رحمتِ الٰہی قرار دیا لیکن جب عقل عشق کی غلامی سے آزاد ہو گئی تو فاتحین کی ذہنیت اس درجہ خراب ہو گئی کہ مہدی سوڈانی کی قبر کھود کر اس کی مقدس ہڈیاں سرِ بازار جلا دیں۔

فاتح دونوں ہیں لیکن طرزِ عمل بالکل مختلف ہے کیوں؟ اس لئے کہ عمرؓ کی خودی مسلمان تھی۔ کچنر کی خودی کافر تھی۔

(۴) اے مسلمانو! یہ مت سمجھو کہ خرد کے حساب اور میزان نہیں ہے یعنی یہ غلط ہے کہ خرد (ultimate authority) ہے۔ بلکہ نگاہِ بندۂ مومن خرد اور اس کے افعال کے حسن و قبح کے لئے بمنزلہ معیار ہے یعنی صحیح عقل وہ ہے جو ایمان کی کسوٹی پہ پوری اُترے صحیح عقل وہ ہے جسے مومن صحیح کہے یعنی صحیح عقل وہ ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ سے پیدا ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح عقل صرف قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

آج کل مسلمان خصوصاً مغرب زدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ بس جو بات عقل کے خلاف ہو وہ غلط ہے کیوں؟ اس لئے کہ عقل سے بالاتر کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ اقبالؒ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا کہ دنیا میں ایک چیز عقل سے بھی بالاتر ہے اور وہ عشق ہے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پہ کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

جس طرح یہ مثنوی اقبال کی تمام تصانیف کا خلاصہ ہے اسی طرح یہ چار شعر اس تمام مثنوی کا خلاصہ ہیں یعنی اقبال کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اگر سربلندی چاہتے ہیں تو عشق (حب رسولؐ) کو اپنا شعار زندگی بنائیں۔

طبع مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد کافر است

پیرِ رومیؒ کا فرمان

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا آغاز اس عقیدت کے اظہار سے ہوتا ہے جو علامہؒ کو مولانائے رومؒ کے ساتھ تھی۔ فرماتے ہیں:-

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خیمہ را از کہکشاں سازو طناب
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

پیرِ رومیؒ عالم خیال میں اقبال سے کہتے ہیں کہ مشرق خوابِ گراں سے بیدار ہو چکا ہے اس کے قلب میں جذبہائے تازہ پیدا ہو رہے ہیں۔ پرانی زنجیریں ٹوٹتی جاتی ہیں پس اے اقبال! تو چونکہ دانائے اسرارِ فرنگ ہے اور اس زمانہ میں مغربی حکمت اور سیاست کا مطالعہ تجھ سے بڑھ کر کسی مسلمان نے نہیں کیا ہے اس لئے اپنے اندر حضرت ابراہیمؑ

کا رنگ پیدا کر اور تمام پرانے بت خانوں (خیالات) کو توڑ ڈال اور مسلمانوں کو توحید کی شراب سے مست کر دے۔

اس کے بعد پیر رومیؒ چند حقائق کا بیان کرتے ہیں۔ اول :۔

امتاں را زندگی جذب دروں کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

ہیچ قومے زیر چرخ لاجورد بے جنونِ ذوفنوں کارے نکرد

پہلی حقیقت جس پر مسلمانوں کو یقین کرنا چاہیئے یہ ہے کہ دنیا میں قوموں کی زندگی اور ترقی جذبِ دروں (IDEAL) کے وجود پر منحصر ہے۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو اپنے سامنے کوئی آئیڈیل (IDEAL نصب العین) رکھتی ہے لیکن جو لوگ کوتاہ بین ہیں وہ اس جذب دروں (عشق) کو جنوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ دنیا میں وہی قوم کامیاب ہوئی ہے جس کے افراد کے دماغ میں جنونِ ذوفنون سمایا ہوا تھا۔

مومن از عزم و توکل قاہر است گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

خیر را او باز می داند ز شر از نگاہش عالمے زیر و زبر

کوہسار از ضربتِ او ریزہ ریزہ در گریبانش ہزاراں رستخیز

کامیابی کے لئے ایک مومن کے اندر دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک ارادہ دوسرے توکل اور اگر اس میں یہ دو صفات نہ ہوں تو وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔ کاش بیسویں صدی کے مسلمان اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

عزم اور توکل کا فلسفہ

عزم کہتے ہیں ارادہ کو۔ مومن وہ ہے جس کے اندر اپنا جہاں آپ پیدا کرنے کی آرزو ہو اقبال فرماتے ہیں :۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو کرے تو پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

پس عزم کے معنی ہیں تخلیق کی آرزو۔ یہ صفت (شرط) اس قدر اہم ہے کہ خدا تعالیٰ نے اقبال سے خود کہا:۔

ہر کہ اورا قوت تخلیق نیست نزد ما جز کافر و زندیق نیست (جاوید نامہ)

مومن کی دوسری صفت یا ایمان کی دوسری شرط توکل ہے توکل کے معنی ہیں عزم کر کے عمل کے میدان میں کود پڑنا اور کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرنا۔ کاش ہم مسلمان توکل کے معنی سمجھ لیں۔ آج کل توکل کا ایک غلط مفہوم دماغوں میں جاگزیں ہے۔ وہ یہ کہ "ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں" اور کامیابی کے منتظر ہیں۔

عزم وہ صفت ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کی بدولت وہ سرگرم عمل ہو سکتا ہے اس کا تعلق فرد کی ذات سے ہے۔

توکل وہ صفت ہے جو اگرچہ پیدا تو انسان ہی کے اندر ہوتی ہے اور اس کی بدولت وہ ان مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے جو عمل کے دوران میں پیش آتی ہیں لیکن اس کا تعلق خدا کی ذات سے ہے یعنی جو شخص خدا پر ایمان نہیں رکھتا وہ توکل بھی نہیں کر سکتا خلاصہ کلام یہ ہے کہ عزم درحقیقت اپنی خودی پر ایمان کا نام ہے۔ اور توکل درحقیقت خدا کی ذات (خودی) پر ایمان کا نام ہے۔

واضح ہو کہ توکل (ایمان علی اللہ) اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب عزم (ایمان علی النفس) پہلے موجود ہو ورنہ توکل بےکار ہے۔ قرآن مجید میرے دعوے پر شاہد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عصر تو از رمز جاں آگاہ نیست دین او جز حب غیر اللہ نیست

موجودہ زمانہ میں لوگ مادہ پرستی کی طرف مائل ہیں۔ روح اور روحانیت کے رموز سے آگاہ نہیں ہیں۔ اور چونکہ ایسا ہے اس لئے لوگوں کا مذہب صرف غیر اللہ سے محبت کرنا ہے! اور غیر اللہ کیا ہے؟ زن۔ زر۔ زمین۔

فلسفی این رمز کم فہمیدہ است فکر او بر آب و گل پیچیدہ است

خود اس زمانے کے فلاسفر اور حکماء روح کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور مادیت کی طرف مائل ہیں اور ان کی نظر آب و گل یعنی مادیات سے آگے نہیں بڑھتی۔

نوٹ :۔ یہ اشارہ ان مذاہب فلسفیانہ کی طرف ہے جو انیسویں صدی اور زمانہ حال میں یورپ میں پیدا ہوئے مثلاً POSITIVISM, AGNOSTICISM, HUMANISM, PESSIMISM, MATERIALISM, MARXISM یہ جملہ مذاہب خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اور انسان کو مادہ پرستی سکھلاتے ہیں۔

ان حقائق سہ گانہ کے اظہار کے بعد مرشد رومیؒ یہ فرماتے ہیں :۔

اے خوش آں مردے کہ دل با کس نداد بند غیر اللہ را از پا کشاد

یعنی اقبال کا فلسفہ اور ان کا پیغام جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا خالص مذہبی پیغام ہے یعنی اقبال کی نظر میں خوش نصیب وہ ہے جو غیر اللہ سے یکسر قطع تعلق کرے اور ارباب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ انسان سب سے قطع تعلق کر کے صرف ایک اللہ کا ہو رہے۔ دگر ہیچ۔ آخر میں مرشد رومیؒ اقبال کو نصیحت فرماتے ہیں کہ :۔

معنیٔ دین و سیاست باز گوے اہل حق را زیں دو حکمت باز گوے

یعنی اے اقبال! اس زمانے میں مسلمان دین اور سیاست کے مفہوم سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کو ان کی حقیقت سے از سر نو آگاہ کر دو تاکہ وہ کسی مہاتما کے سحر سامری کا شکار نہ ہو جائیں۔

آخر میں اقبال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ:

سرِّ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست

یعنی "مردِ حق" سرِّ حق سے آگاہ ہے۔ مردِ حق اور مردِ مومن دونوں مترادف ہیں یعنی اگر سرِّ حق سے آگاہی مطلوب ہے تو مومن بن جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ مومن کسے کہتے ہیں؟ اس کا جواب ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست

رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

اندر آغوشِ سحر یک دم تپید

تا بکامش غنچۂ نورس چکید

مومن کی روح کیا ہے؟ اس کو شبنم کے قطرہ سے مثال دی جا سکتی ہے۔ جو ذوقِ نمود کی وجہ سے اپنی گرہ کو اپنی قوتِ بازو سے کھولتا ہے۔ جو اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور اس ---------- مطالعہ باطنی کی بدولت اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے آسمان کی خلوت کو چھوڑ کر اس کائنات مادی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو نہ دریا کی طرف رخ کرتا ہے اور نہ صدف میں پوشیدہ ہوتا ہے بلکہ آغوشِ سحر میں چند منٹ کے لئے جلوہ گر ہوتا ہے تاکہ غنچوں کو شگفتہ کر سکے یعنی مومن وہ ہے جو (۱) ذوقِ نمود رکھتا ہو (۲) اپنی خودی پر اعتماد رکھتا ہو (۳) اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرے (۴) نہ اپنی خودی کو ہنگامہ ہائے کائنات

میں غرق کرے (۵) اور نہ ترکِ دُنیا کرے (۶) بلکہ قرآن مجید کی روشنی حاصل کرے (۷) اور انسانوں کی خدمت کرے۔

تطہیر فکر

اے امیرِ خاور۔ اے مہر منیر | می کُنی ہر ذرہ را روشن ضمیر
خوش بیا صبحِ مراد آوردہٗ | ہر شجر را نخلِ سینا کردہٗ

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں "خطاب بہ مہرِ عالمتاب" کے عنوان کے ذیل میں علامہؒ نے ابتدائی سات اشعار میں آفتاب کی (جو اللہ تعالٰی کی قدرت کاملہ کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اور فائدہ رسانی کی صفت اس درجہ رکھتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں ہندوستان۔ ایران۔ یونان اور دیگر ممالک کے باشندوں نے اس کی پرستش اختیار کرلی تھی) فیض رسانی کا ذکر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:-

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز | در ضمیرِ من چراغے بر فروز
تیرہ خاکم را سراپا نور کن | در تجلی ہائے خود مستور کن

یعنی اے آفتاب! تُو نوری ہے میں خاکی ہوں میں چاہتا ہوں کہ تُو میرے ضمیر میں ایک چراغ روشن کردے تاکہ میری تاریک مٹی منور ہو جائے کیوں؟ اس لئے

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق | بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

یعنی اے خدا جس طرح تُونے آفتاب کو یہ صفت عطا کی ہے کہ وہ اپنے وجود سے رات کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور ہر شئے کو منوّر کر دیتا ہے تو مجھے بھی یہی صفت عطا کر تاکہ میں مشرق کے افکار کی رات کا خاتمہ کر دوں۔ اور مشرقی ممالک کے باشندوں کے دل و دماغ کو حریت کے جذبات و خیالات

سے منور کر دوں۔

مقصود و مدعائے شاعر از ایں مثنوی

از نوائے پختہ سازم خام را گردش دیگر دہم ایام را

فکر شرق آزاد گردد از فرنگ از سرود من بگیرد آب و رنگ

"اے خدا! مشرقی اقوام کے خیالات کی دنیا اس وقت تاریک ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے پیغام کی بدولت ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آؤں۔ ان میں جو لوگ خام طبع ہیں میرے کلام (پیغام) کو پڑھ کر پختہ ہو جائیں۔ اے خدا! میں مشرق میں ایک انقلاب برپا کرنا چاہتا ہوں نئی دنیا پیدا کرنی چاہتا ہوں"!

میرا مقصود اس مثنوی لکھنے سے یہ ہے کہ مشرقی اقوام کے افکار اور خیالات مغرب کی گرفت سے آزاد ہو جائیں مشرقی اقوام اس وقت ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور جب تک کوئی قوم ذہنی غلامی سے رہائی حاصل نہ کرے۔ اس وقت تک اسے سیاسی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مشرقی اقوام میری تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تاکہ ذہنی آزادی حاصل ہو سکے۔

اظہار حقیقت

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس حریت از عفت فکر است و بس

یہ شعر اقبال کے مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ اور اُس کی شاعری کی ماہیت کا سمجھنا اس شعر کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

شاعری کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) قافیہ پیمائی۔ مثلاً

ہوئی حجت جو وصل غیر پہ اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوا دی شکن آلودہ بستر سے

معشوق کو "ماہ پیکر" اس لیے باندھا کہ دوسرے مصرعہ میں "بستر" لانا ضروری تھا اگر دوسرے مصرعہ میں بستر کی جگہ "قسمت" باندھنا پڑتا تو پیکر کی جگہ طلعت ہو جاتا۔

(۲) مضمون آفرینی مثلاً

جور پیہم نہ کرے شان تو ہے پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

(۳) اظہار حقائق ابدی یا پیغام حیات سرمدی مثلاً

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حریت از عفت فکر است و بس

یہ وہ شاعری ہے جو ضمیر کائنات کو انسان کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے اور اس کو اسرار و ممکنات حیات سے روشناس کر دیتی ہے جس میں معشوق کے لب و رخسار اور شکوۂ فراق یار کے بجائے زندگی کے اہم مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اسی لئے اس شاعری کا معشوق ہمیشہ دلکش اور حسین رہتا ہے اور ہر شخص کا محبوب ہوتا ہے۔ اقبال کے پیغام کو گوکل چند اور نریندر ناتھ بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جس سے ظفر علی خاں اور حسرت موہانی۔ اسی شاعری کے متعلق اقبال نے یہ لکھا ہے:-

غوطہ زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بروں آوردہ ام افکار پنہان شما

اس قسم کے شاعروں کو WORLD POETS کہا جاتا ہے مثلاً رومی۔ حافظ۔ گوئٹے۔ ڈانٹے۔ شیکسپیئر۔

اقبال کا تمام کلام اسی قسم کی بلند ترین شاعری سے معمور ہے چونکہ یہ مرتبہ بہت بلند ہے اور صدیوں میں کسی خوش نصیب کو ملتا ہے اس لئے پست فطرت اور حاسد افراد جو خود کسی اصول کے پابند نہیں ایسے شعرا پہ زبان طعن دراز کرتے رہتے ہیں۔

باز آمدم بہ سر مطلب۔

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس   حرّیت از عفتِ فکر است و بس

اس شعر میں دو لفظ قابل غور ہیں۔ ایک ذکر دوسرا فکر علاّمہ کی اصطلاح میں ذکر سے مراد عمل ہے۔ اور فکر سے مراد عقائد۔ ایمان تصوّرات یا یقین ہے چنانچہ اس کی تشریح جاوید نامہ میں خود فرماتے ہیں۔

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است   فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں؟ اختلاط ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی قرآن مجید انسان کو ایمان اور عمل دونوں کے اختلاط کا حکم دیتا ہے۔ اور جب تک عمل صالح نہ ہو محض ایمان مفید نہیں ہے۔

پس علاّمہ فرماتے ہیں کہ زندگی خواب و خورش کا نام نہیں بلکہ گرمیٔ فکر (تسلسل عمل) کا نام ہے۔ اور آزادی کی بنیاد عفتِ فکر پہ قائم ہے یعنی سیاسی آزادی ضمیر کی آزادی پہ منحصر ہے۔ وہی قوم آزاد ہو سکتی ہے جو پہلے اپنے ضمیر کو تقلید تعصب جہالت۔ اور توہمات کی غلامی سے رہا کرا سکے۔ ہندی مسلمان سیاسی غلامی میں مبتلا ہونے سے بہت پہلے ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکے تھے اس نکتہ کی تشریح اقبال نے خود کی ہے۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب   ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

میرد اندر سینہ اش قلب سلیم در نگاہ او کج آید مستقیم
بر کراں از حرب ضرب کائنات چشم او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند گوہر او چوں خزف نارجمند
پس نخستیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

یعنی جب کسی قوم کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے یا بالفاظِ دگر جب کوئی قوم ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو

(الف) کھری چاندی اس کے ہاتھ میں پہنچ کر کھوٹی ہو جاتی ہے۔

(ب) اس کے سینہ میں دل مردہ ہو جاتا ہے۔

(ج) سیدھی چیز اس کو ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔

(د) وہ کشمکش حیات سے گھبراتی ہے اور سکون کو زندگی سمجھتی ہے (حالانکہ سکون موت کا دوسرا نام ہے)

(ہ) اس کے دریا میں کہیں موج نہیں اٹھتی! اور اس کے موتی بازار میں کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔

"در نگاہ او کج آید مستقیم" کی مثال آپ کو ہندی مسلمانوں کی زندگی میں بخوبی نظر آسکتی ہے۔ ہر وہ بات جو ان کے حق میں مضر ہے ان کو مفید معلوم ہوتی ہے۔ کافر کی پیروی مسلمان پر حرام ہے لیکن آج مسلمانوں کا "امام الہند" اور "امیر الملک" جو قرآن مجید کا مفسر بھی ہے اس بات پر پھولا نہیں سماتا کہ "میری صدارت دراصل مہاتما گاندھی کی پالیسی کی فتح ہے" اور مسلمانوں کو ایک کافر پر اعتماد کرنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔

انگریزی تعلیم مسلمانوں کے لئے سخت مضرت رساں ہے لیکن آج ہماری تمام تر کوشش یہ ہے

کہ ہماری لڑکیاں بی۔اے۔بی۔ٹی کرکے مدرسوں میں نوکر ہوجائیں۔ بلکہ ہماری ذہنیت اس قدر خراب ہوچکی ہے۔ کہ جب ہم لڑکوں یا لڑکیوں کے لئے کوئی "مذبح" قائم کرتے ہیں تو اسے قومی ترقی کا معیار قرار دیتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اندریں حالات حکیم امتؒ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ سب سے پہلے اس قوم کو اپنی فکر THOUGHT کی اصلاح کرنی چاہئے۔ اور اس کے بعد صحیح ذکر پر گامزن ہوجائے۔

آزادیٔ فکر کی اہمیّت

ایک مختصر سی تمہید کے بعد علامہؒ نے مہر عالمتاب سے خطاب کے پردہ میں اس مثنوی کا مدعا بیان کیا ہے چنانچہ پہلے سات اشعار میں اس کے صفات وخواص کا ذکر کرکے اس طرح فرماتے ہیں :-

تو فروغ صبح، من پایان روز　　در ضمیر من چراغ بر فروز

اے آفتاب! تو نوری ہے اور میں خاکی ہوں پس میرے ضمیر کے اندر بھی ایک چراغ روشن کردے یعنی میرے ضمیر کو منوّر کردے۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن　　در تجلّی ہائے خود مستور کن

میرے جسم خاکی کو (جو تاریک ہے) سراپا نور کردے اور مجھے اپنے تجلیات کے دامن میں پوشیدہ کرلے (تاکہ)

تا بروز آرم شب افکار شرق　　بر فروزم سینۂ احرار شرق

تاکہ میں مشرقی اقوام کے افکار وخیالات کی تاریکی کو دور کرسکوں اور حریت پسندوں کے سینوں کو منوّر کردوں۔

جس طرح اسرارِ خودی لکھنے سے علامہؒ کا مقصد شعر گوئی نہ تھا اسی طرح اس مثنوی کا مقصد بھی شعر و شاعری نہیں ہے۔

خود علامہؒ کی حیثیت بھی واضح ہو گئی یعنی اقبالؒ کا منصب اور مقصد (MISSION) یہ ہے کہ وہ مشرقی اقوام کے تخیلات کی اصلاح کرنے والے ہیں۔ وہ ایک مصلح اور ریفارمر ہیں اور شاعری کو انہوں نے اپنے مشن میں کامیابی کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ شعر و شاعری مقصود بالغرض ہے نہ کہ بالذات۔

میں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ اس حقیقت کو بار بار پیش کیا ہے کیونکہ عموماً، لوگ اقبالؒ کو بھی ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں، اور جب اس کا کلام پڑھتے ہیں تو مقصد کی طرف اس قدر متوجہ نہیں ہوتے جس قدر نکات و رموز کی شاعری کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کلام سے کما حقہٗ مستفید نہیں ہو سکتے۔

کچھ دن ہوئے، میں نے کسی مضمون میں پڑھا تھا کہ شاعری کے اعتبار سے ضربِ کلیم ایک روکھی پھیکی کتاب ہے۔ یہ تنقید میرے خیال کی تائید کر رہی ہے۔ اگر پڑھنے والا اقبال کے مقصد سے آگاہ ہوتا تو اسے اس تبصرہ کی قیمت خود ہی معلوم ہو جاتی اور وہ اس کے اظہار سے اجتناب کرتا۔ اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ ضربِ کلیم ایسی کتاب ہے، جسے اکثر نقّادِ اقبالؒ کا شاہکار کہتے ہیں۔

اقبالؒ کے ایک مخالف نے اسے "الہامی" قرار دیا اور لکھا کہ اس کتاب کے بعد اقبالؒ کو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں تھی، غور طلب بات یہ ہے کہ جب اقبالؒ، ایک پیغامبر، ایک مصلح، اور ایک مفکّر ہے تو ضربِ کلیم کو اس نگاہ سے دیکھئے کہ اقبالؒ نے کیا کہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ضربِ کلیم میں، موجودہ دور کو چیلنج دیا گیا ہے اور عصرِ حاضر کی تمام تحریکات کا

جائزہ لیا گیا ہے۔ تو پھر اُس میں جامیؔ اور حافظؔ یا سعدیؔ اور خسروؔ کا رنگ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ آپ اس کتاب کا موازنہ نشاطِ روح، شعلۂ طور، اور باقیاتِ فانی سے نہ کریں۔ بلکہ کانٹ، ہیگل، سپنسر، برگساں، نیٹشے، کارل مارکس، ٹالسٹائے اور افلاطون کے آراء و افکار سے کریں۔ پھر آپ کو اس کی اصنافی حیثیت اور حقیقی منزلت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

باز آمدم بر سرِ مطلب

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

از نوائے پختہ سازم خام را گردشِ دیگر دہم ایام را

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ

از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

علامہ کا مقصد، اس مثنوی سے یہ ہے کہ وہ اقوامِ مشرق کی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں:-

(۱) مشرقی اقوام کے خیالات کی تاریکی کو دُور کرنا۔

(۲) حریت پسندوں کے سینوں میں روشنی پیدا کرنا۔

(۳) اپنے پیغام سے خام طبع افراد کو پختہ کار بنانا۔

(۴) دنیا میں ایک انقلاب پیدا کرنا۔

(۵) مشرقی اقوام کو مغربی افکار کی غلامی سے رہائی دلانا یعنی انہیں ذہنی غلامی سے آزادی عطا کرنا۔

(۶) اور اپنے رنگ میں رنگین کرنا۔

یہ ہیں مقاصد ستہ، اِس مثنوی کے اور آپ اس کا مطالعہ کرتے وقت انہی مقاصد عالیہ کو پیشِ نظر رکھیں۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے وہ پیغام دیا ہے، جو مشرقی اقوام کو تباہ کن مغربی خیالات کی گرفت سے رہائی دے سکتا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی کی سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ مشرقی اقوام اور علی الخصوص مسلمانوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو کسی طرح وہ مغربی خیالات اور مغربی اقوام کی گرفت سے نکل سکیں۔ لیکن سیاسی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک پہلے ذہنی آزادی حاصل نہ ہو جائے اسی لئے فرمایا:-

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس کے بعد، ایک ایسی حقیقت کا اعلان فرمایا، جو فلسفیانہ عمق کے اعتبار سے اس ساری مثنوی کی جان ہے۔

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس حریت از عفتِ فکر است و بس

مَیں چاہتا ہوں کہ شیدائیانِ اقبال اس شعر کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ فرماتے ہیں کہ زندگی، آمد و شدِ نفس کا نام نہیں بلکہ تسلسل عمل کا نام ہے۔ ذکر کے معنی زبان سے کسی لفظ یا جملہ کو ادا کرتے رہنے کے نہیں ہیں (جیسا کہ آج کل غلطی سے سمجھا جا رہا ہے) بلکہ دستورِ الٰہی کے مطابق سرگرمِ عمل رہنا۔ یہ جو مسلمان ہر جمعہ کو خطبہ میں سنتے ہیں کہ اُذکُروا اللّٰہَ یَذکُرکُم۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ تم ہر وقت فرمانِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھو اور اس فرمان (دستور یا CODE) کے مطابق زندگی بسر کرو۔ تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور اعمالِ صالح بجا لانے کی توفیق ارزانی فرمائے گا لیکن جب ہماری ذہنیت خراب ہو گئی

توجس طرح دیگر حقائق کی مٹی پلید ہوگئی، ذکر بھی دانوں سے وابستہ ہو گیا حالانکہ اس کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ دانوں سے۔

ہاں تو، زندگی، جہدِ پیہم کا نام ہے اور حریت دراصل "پراونشل آٹانومی" یا "درجۂ نوآبادیات" یا "مجلس قانون ساز" یا "مرکز میں اکثریت" کا نام نہیں بلکہ افکار و خیالات کی صحت اور پاکیزگی کا نام ہے۔ آزاد، وہ نہیں جسے قانون بنانے کی آزادی حاصل ہو، آزاد، دراصل وہ ہے جس کا ذہن اور ضمیر، اغیار کی غلامی، سے آزاد ہو مثلاً "مسلمان خواہ اُسے مرکز میں اکثریت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے، آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل و دماغ، غیر اسلامی افکار اور غیر قرآنی خیالات سے پاک نہ ہو۔ اگر اُس کے دل و دماغ پر "اہنسا" کا فلسفہ مسلط ہے، اگر وہ "گاندھی" یا کسی دوسرے مُشرک یا غیر مسلم کسی کی رہنمائی کو تسلیم کرتا ہے تو وہ ہرگز ہرگز آزاد نہیں خواہ وہ دلّی کے تخت پر ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ پھر پڑھئے اس معرکۃ الآرا شعر کو

زندگی از گرمیٔ ذکر است وبس   حریت از عفتِ فکر است وبس

اسی لئے اقبالؔ کی خواہش یہ ہے کہ "فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ"

اس ضمن میں جاوید نامہ کا ایک شعر بھی سُن لیجئے تاکہ یہ مے ناب' دو آتشہ ہو جائے۔

جُز بقرآن ضیغمی روباہی است   فقرِ قرآں اصلِ شہنشاہی است

فقرِ قرآں ؟ اختلاطِ ذکر و فکر

فکر را کامل ندیدم جُز بہ ذکر

کاش کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ذکر اور فکر کا ہم آہنگ امتزاج' از سرِ نو پیدا ہو سکے!

ذہنیت کی خرابی سے، قوم میں جو مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا نقشہ علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب — ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلب سلیم — در نگاہ او، کج آید مستقیم
برکراں از حرب و ضرب کائنات — چشم او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند — گوہر او، چوں خزف نا ارجمند

پس نخستیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

یعنی جب کسی قوم کی ذہنیت بگڑ جاتی ہے تو مفید اشیاء بھی اس کے تصرف میں آ کر، مضر بن جاتی ہیں۔ اس کا دل مُردہ ہو جاتا ہے اور وہ، چیزوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی، جو باتیں اُس کے حق میں نقصان دہ ہیں اُن کو مفید سمجھنے لگتی ہے اور مفید باتوں کو مُضر سمجھ کر، ترک کر دیتی ہے۔ کشمکشِ حیات میں حصّہ لینے سے جان چراتی ہے۔ اس کے افراد زیادہ تر اپنا وقت "ڈرائنگ روم" میں ریڈیو، سگار، اور باتوں میں صرف کرتے ہیں۔ اور بقول حافظ، صراحی، غزل اور گوشۂ عافیت، کو حقیقی زندگی یقین کرتے ہیں۔ اس کے افراد کے دل میں بلند خیالات اور ارادے پیدا نہیں ہوتے اور دنیا میں اس کو کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اُس میں جو دو چار خوبیاں ہوتی ہیں ان پر بھی پانی پڑ جاتا ہے۔

اندریں حالات، اس قوم کی ترقی کی صورت یہ نہیں کہ وہ قوم جلسے، جلوس، نعرے، جھنڈے، ریزولیوشن اور دوسرے تماشوں میں اپنا وقت صرف کرے بلکہ سب سے پہلے

اُسے اپنی فکر کو پاک کرنا چاہیے، اور تطہیرِ فکر کے بعد تعمیرِ فکر کا کام قدرتی اور منطقی طور پر آسان ہو جائے گا

مسلمان ان اشعار کو پڑھیں اور سوچیں کہ کہیں یہ اُنہی کی حالت زار کا نقشہ تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر حکیم الامتؒ کے ارشاد پر عمل کرنا اُن کا فرض اولین ہے۔ ان کی ترقی کی صورت یہ نہیں کہ سکول اور کالج قائم کریں۔ ریزولیوشن پاس کریں اور جلوس نکالیں۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ اپنے فکر (ذہنیت) کو اسلامی بنائیں۔ جب تک ذہنیت اسلامی نہ ہو گی وہ ہرگز ہرگز مسلمان نہیں بن سکتے اور جب تک مسلمان نہ بنیں گے، ترقی نہیں کر سکتے۔

ہاں غیر مسلم بن کر بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے انہیں اس تبدیلی کا اعلان کرنا ہوگا پھر طاغوتی طاقتیں اُنہیں بخوشی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں گی لیکن

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

حکمتِ کلیمی

اب کتاب شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلی بات جو حضرت علامہؒ نے بیان فرمائی ہے وہ مذہب و مقامِ نبوت کی تصریح و توضیح ہے۔

اگر آپ اس کتاب کے صفحہ ۳ پر نظر کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ نے حسب ذیل حقائق کی تشریح فرمائی ہے۔ (۱) حکمتِ کلیمی (۲) حکمتِ فرعونی (۳) لا الہ الا اللہ۔ (۴) فقر۔ (۵) مردِ حُر۔ (۶) اسرارِ شریعت (۷) اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں۔ (۸) سیاست

حاضرہ۔ (۹) حرفے چند بامت عربیہ۔ (۱۰) پس چہ باید کرد۔ (۱۱) در حضور رسالت مآب تا آخر۔

یہ اس لئے کہ آپ گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے "تطہیر فکر" ہونی چاہیے لہٰذا علامہ بھی سب سے پہلے مسلمانوں کو مقام نبوت۔ توحید۔ فقر۔ ایمان حریت وغیرہ کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں' تاکہ مسلمان ان حقائق کے متعلق صحیح علم حاصل کر کے صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔

ہمارے زمانہ میں نبوت۔ توحید۔ فقر۔ ایمان وغیرہ کا حقیقی مفہوم، جہالت کی تاریکی میں گم ہو چکا ہے۔ (اسی لئے پنجاب میں بعض لوگوں کو دعوائے نبوت کی جرأت بھی ہو سکی) پس ضروری ہے کہ پہلے ہم ان حقائق کے معنی اور مفہوم سے آگاہ ہو جائیں۔

حکمت کلیمی یعنی نبوت و رسالت کی جو خصوصیات علامہ نے اجمالاً بیان فرمائی ہیں ذیل میں انہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

(۱) سہ

تا نبوت حکم حق جاری کند ۔۔۔ پشت پا بر حکم سلطاں می زند

نبی کا منصب اور مقصد (MISSION) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام اور قوانین کو دنیا میں رائج کرے۔ اس لئے وہ لامحالہ دنیاوی حکومتوں سے متصادم ہوتا ہے اور سلاطین کے فرامین اور قوانین کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور بادشاہوں سے صاف

لہ اسلام اور مسیحیت میں نبوت رسالت کے تصور میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اسلام کسی بادشاہ کو تسلیم نہیں کرتا "لا ملوکیت فی الاسلام" لیکن مسیحیت خدا کے علاوہ قیصر کے وجود کو بھی تسلیم کرتی ہے جیسا کہ متی کی انجیل سے ظاہر ہوتا ہے۔ میری رائے میں اس انجیل کے غیر الہامی ہونے پر یہی ایک دلیل کافی ہے کہ یہ کتاب خدا کے علاوہ دوسروں کی اطاعت کا بھی سبق دیتی ہے۔

لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ میں خدا کے دستور العمل کے سامنے تمہارے دستور العمل کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے سکتا۔ اس کائنات کا حاکم خدا ہے نہ کہ زید و بکر یا قیصر و کسریٰ اور یہ اس وجہ سے کہ:-

(ا) خدا خالقِ کائنات ہے۔

(ب) اور چونکہ وہ خالق ہے اس لئے عقلی طور پر خالق اپنی مخلوقات کا مالک ہے کیونکہ اُس نے اُن کو معدوم سے وجود کیا۔

(ج) اور چونکہ وہ مالک ہے اس لئے عقلی طور پر اپنی ملک پر حکمران ہے۔

سلاطین چونکہ خالق نہیں اس لئے مالک نہیں اور چونکہ مالک نہیں اس لئے انہیں بنی آدم پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تمام سلاطین خدا کے باغی ہیں کیونکہ وہ انسانوں کو اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔

چونکہ نبی یا رسول، خدا کے علاوہ اور کسی کو حکمران تسلیم نہیں کرتا اس لئے [1]

در نگاہش قیصر و سلطاں کہنہ بُتے　　　عبرتِ او بہ نیستا بد حکمِ غیر

اس کی نگاہ میں سلطان ایک بت ہے۔ اس لئے لامحالہ، اس کا عمل ایک بت خانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی مردِ مومن (اور نبی تو مومن PAR EXCELLENCE ہوتا ہے) سلاطین

---

[1] علامہؒ نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ انقلاب برپا کرنے سے پہلے سیرت (CHARACTER) کو پختہ کرنا ازبس لازمی ہے ورنہ وہی حشر ہوگا جو ۱۹۲۱ء میں تحریکِ عصیانِ مدنی کا ہوا تھا۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے پختگیِ سیرت اسی قدر لازمی شرطِ اولین (PREREQUISITE) ہے جس قدر پانی کے لئے آکسیجن اور ہائیڈروجن

[2] با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن　　　چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن (زبورِ عجم)

پس اگر مسلمان واقعی دوبارہ سربلندی کے آرزومند ہیں تو ریزولیوشن پاس کرنے کے بجائے، انفرادی و اجتماعی سیرت کی پختگی کی طرف متوجہ ہوں۔ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔"

ع کاش اس نکتہ سے واقف ہوں مسلماں ان دنوں ✦

کے محلات سے اسی قدر دور رہتا ہے جس قدر بت خانوں سے ۔

خصوصیتِ ثانی ؎

پختہ سازد صحبتش ہر خام را تازہ غوغائے دہد ایام را

نبی کی صحبت خام (ناقص) کو پختہ (کامل) بنا دیتی ہے اور جب اس کے پیرو پختہ ہو جاتے ہیں تو قدرتی طور پر دنیا میں ایک انقلاب رونما کر دیتے ہیں ۔

تیسری خصوصیت ؎

درسِ او اللہ بس باقی ہوس تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس

نبی کی تعلیم و تلقین کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ " اللہ بس باقی ہوس " یعنی مسلمان کے لئے صرف اکیلا خدا کافی ہے (اور خود خدا بھی تو یہی کہتا ہے " الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ ؟ ") اور اس تعلیم کا فلسفہ یہ ہے کہ مردِ مومن ، کسی غیر کا مطیع نہ بن جائے ۔

انسان خدا کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جھکتا ہی اس وقت ہے جب وہ خدا کو ناکافی سمجھ کر ، دوسروں کو اپنا قاضی الحاجات اور حل المشکلات قرار دیتا ہے پس نبی ، بنی آدم کی اس اصولی کمزوری کا علاج کرتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ صرف اللہ تیرے لئے کافی ہے لہٰذا " از درِ او بر درِ دیگر مرو " ۔

چوتھی خصوصیت ؎

معنیٔ جبرئیل و قرآن است او فطرۃ اللہ را نگہبان است او

؎ اسی لئے قرآن فرماتا ہے " لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ " اے لوگو اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لئے نہایت اچھا نمونہ موجود ہے جس سے سنتِ نبویؐ کی اہمیت ثابت ہوتی ہے اور اسی لئے آپؐ نے فرمایا " ترکت فیکم امرین کتاب اللہ و سنتی " اے لوگو میں تمہارے لئے دو امر چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب دوسرا اپنی سنت پس کتاب و سنت کی پیروی ہر مسلمان پر فرض ہے اور یہی مدارِ نجات ہے ۔

اس کا طرزِ عمل، اس کی زندگی، اور اس کی گفتار و کردار، خدا کے منشاء کا آئینہ ہوتی ہے یعنی جبرئیل اور قرآن کا کیا پیغام ہے، یہ بنی آدم کو اس کے کردار سے معلوم ہو سکتا ہے یعنی اس کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہوتی ہے۔ اور وہ اللہ کی پیدا کردہ فطرت کا نگہبان ہوتا ہے یعنی انسان کو فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی سکھاتا ہے۔ اور اُسے خلافِ فطرت طریقوں سے باز رکھتا ہے مثلاً رہبانیت کہ یہ طرزِ حیات سراسر خلافِ فطرت ہے۔ اسی لئے آپؐ نے فرمایا" لارہبانیۃ فی الاسلام"۔

پانچویں خصوصیت ؎

حکمتش برتر ز عقلِ ذوفنوں ‏ از ضمیرش اُمتے آید بروں

اس کی تعلیم انسانی عقل سے بالاتر اور برتر ہوتی ہے، کیونکہ وہ عقل کی پیروی نہیں کرتا بلکہ قلب سلیم کی پیروی کرتا ہے اور اس کا قلب وحی الٰہی کے نور سے منوّر ہوتا ہے عقل جس چیز میں شکوک پیدا کرتی ہے وہ اس کو اپنی تعلیم کا بنیادی نقطہ قرار دیتا ہے (مثلاً وجود باری کہ عقل اس میں شکوک پیدا کرتی ہے) اسی لئے فرمایا کہ حکمتش برتر ز عقل ذوفنوں۔

اور وہ اپنی تعلیم کی بدولت دنیا میں ایک امت پیدا کرتا ہے۔

چھٹی خصوصیت ؎

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج ‏ بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

وہ بادشاہ تو ہوتا ہے لیکن تخت و تاج سے اور سپاہ و خراج سے بے نیاز ہوتا ہے۔

ساتویں خصوصیت ؎

بحر و بر از زورِ طوفانش خراب ‏ در نگاہِ او، پیامِ انقلاب

وہ خشکی اور تری دونوں کو اپنے وجود سے متاثر کرتا ہے اور اس کی تعلیم سے دنیا میں ایک

انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔

آٹھویں خصوصیت ؎

درسِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ می دہد — تا دلے در سینۂ آدم نہد

وہ یہ سبق پڑھاتا ہے کہ "کسی سے مت ڈرو" اور یہ اس لئے کہ بنی آدم کے اندر حریت اور شجاعت پیدا ہو۔

نویں خصوصیت ؎

من نمیدانم چہ افسوں می کند — روح را در تن دگر گوں می کند

صحبتِ او خزف را دُر کند — حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

اُس نبی کی شخصیت اس قدر مقناطیسی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیتا ہے اور اس کی صحبت سے ادنےٰ، اعلےٰ اور مفلس تونگر ہوجاتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہؓ کی زندگیوں میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگیا مثال کے طور پر حضرات عمرؓ اور بلالؓ کا نام کافی ہے۔

؎ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت صلعم نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج اُسی نبیؐ کی امت، انقلاب کے نام سے لرزہ براندام ہوجاتی ہے! اسی لئے مسٹر ایم۔ این۔ رائے نے اپنی کتاب (HISTORICAL ROLE OF ISLAM) میں اس امر پر حیرت ظاہر کی ہے کہ جس مذہب نے دنیا میں اس قدر عظیم الشان انقلاب برپا کردیا جس مذہب کی کتاب انقلاب در بغل ہے، آج اُس مذہب کے پیرو اس قدر جامد اور قدامت پرست ہیں کہ ان میں حرکت تک مفقود ہے ✤

؎ یہ اقبال کے محبوب مباحث میں سے ہے۔ انہوں نے بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک (۱۹۰۱ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک) مسلسل اور پیہم مختلف طریقوں سے، یہ نکتہ مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ مسلمان زمانہ (دہر) کا غلام نہیں ہوتا۔ وہ زمانہ کے ساتھ گھومتا نہیں بلکہ زمانہ کو اپنے ساتھ گھماتا ہے ؎

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر — ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر (ضرب کلیم)

دسویں خصوصیت ؎

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز ہر کہن معبود را کن ریزہ ریز

وہ معمولی انسانوں سے کہتا ہے کہ اٹھو اور "جو نقشۂ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو" تم معبودانِ باطلہ کو خواہ وہ انسان ہوں یا بُت، پاش پاش کر دو۔

الغرض علامہؒ نے نبی کی یہ دس خصوصیات بیان کی ہیں اور ان کی وضاحت کے بعد اب وہ مسلمان سے بجاطور پر یوں خطاب کرتے ہیں:-

(الف) مردِ حق! افسونِ این دیرِ کہن از دو حرفِ ربّی الاعلیٰ شکن

اے مسلمان، اگر تُو واقعی رسالتِ محمدیہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس دنیا کے طلسم کو "ربی الاعلیٰ" (میرا رب سب سے بلند ہے) کہہ کر توڑ دے یعنی دنیا میں کسی بادشاہ، سلطان یا حکمران کے سامنے سر مت جھکا۔ خدا کے علاوہ کسی دوسری طاقت کے سامنے سر جھکانا شرک فی الذات ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ"۔

(ب) فقر خواہی، از تہی دستی منال عافیت در حال و نے در جاہ و مال

اے مسلمان! اگر تُو فقرِ محمدیؐ کا آرزو مند ہے تو افلاس کی پرواہ مت کر کیونکہ عافیت قلبی طمانیت کا نام ہے نہ کہ مال و دولت کا۔ ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

(ج) بگذر از کاؤس و کَے اے زندہ مرد طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد

اے مسلمان! بادشاہوں سے بے نیاز ہو جا، ان کے محلات کا طواف مت کر جس طرح آج کل بہت سے مسلمان اُن کی کوٹھیوں کا طواف کرتے ہیں جہاں اربابِ حکومت قیام پذیر ہیں بلکہ

خود اپنا طواف کر یعنی تو اپنی خودی اور اس کی مخفی صلاحیتوں پر غور کر۔

(۵) تا کجا طوفِ چراغِ محفلے؟ ز آتشِ خود سوز، اگر داری دلے

دیگر این نُہ آسمان تعمیر کن بہ مرادِ خود جہاں تعمیر کن

اے مسلمان! نئی دنیا پیدا کر، ایسی دنیا جو تیری آرزوؤں کے مطابق ہو۔ اگر تو دیکھتا ہے کہ موجودہ نظام تیرے معتقدات کے خلاف ہے تو، اس نظام کو درہم برہم کر دے اور ایسا نظام قائم کر، جو قرآن کا دمساز ہو تاکہ تو اسلامی زندگی بسر کر سکے۔

(۶) اس جگہ پر یہ شبہ دل میں گذر سکتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان، نئی دنیا (زمین و آسمان) کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ تو علامہ نے دفع دخل مقدر کے طور پر فرمایا ہے ؎

چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود

چار سوئے با فضائے نیلگوں از ضمیرِ پاکِ او، آید بروں

یعنی اے مسلمان! تو میری بات سن کر متعجب نہ ہو، بے شک تو نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر سکتا ہے، اب سوال ہوگا کس طرح؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اے مسلمان، خدا کی مرضی میں، اپنی مرضی کو فنا کر دے شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو "قضائے حق" بن جائیگا تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جائے گا وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ ؎

مرضی او، مرضئ حق مے شود

ماہ از انگشتِ اوشق مے شود (جاوید نامہ)

پھر اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

در رضائے حق فنا شو چوں سلف گوہرِ خود را بروں آر از صدف

اے مسلمان! اپنے اسلاف کی طرح اپنی مرضی کو، خدا کی مرضی میں فنا کر دے اور اس

طرح اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا۔

بات یہ ہے کہ جب مومن، اپنی مرضی، اللہ کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے تو اللہ اس کا ثمرہ عطا کرتا ہے کہ ؎

درر ضائش مرضئ حق گم شود   "ایں سخن کے باور مردم شود"

(۹)   تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب

ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

اے مسلمان! جب تک تجھے اللہ کے جلال سے حصہ نہ ملے۔ اس وقت تک تجھ کو اس کے جمال سے بھی کوئی حصہ نہیں مل سکتا یعنی جب تک تجھ میں قوت اور شوکت پیدا نہ ہو اس وقت تک تو کسی پر کرم بھی نہیں کر سکتا پس تجھے سب سے پہلے اپنے اندر حکومت اور سروری کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے۔

(۱۰)   ابتدائے عشق و مستی قاہری است   انتہائے عشق و مستی دلبری است

مردِ مومن از کمالاتِ وجود   او وجود و غیرِ او ہر شئے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ

جز بکام او نہ گردد مہر و مہ

یہ آخری تین شعر بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "عشق و مستی کی ابتدا یہ ہے کہ عاشق میں قوت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق میں

؎ اقبال کے یہاں بھی "فنا" کی تعلیم ملتی ہے مگر اُپنشید (شنکر اچاریہ) اور اقبال میں یہ فرق ہے کہ شنکر انفرادی خودی کو خدا میں فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اقبال انفرادی "مرضی" کو خدا کی مرضی میں فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ والفرق بینھما ظاھرٌ۔

شانِ محبوبیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ کائنات پر رؤف الرحیم ہوجاتا ہے وہ لوگوں کے دلوں پہ حکمرانی کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس شخص میں قاہری اور دلبری دونوں صفات پیدا ہوجاتی ہیں وہ شخص نبی یا مثیلِ نبی بن جاتا ہے چنانچہ علامہؒ خود فرماتے ہیں ؎

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است (جاوید نامہ)

پھر فرماتے ہیں کہ وجود کے کمالات دراصل مردِ مومن ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دراصل وجود کا اطلاق اسی پہ درست ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے فیض حاصل کرے یعنی توحید پہ عامل ہو جائے تو پھر وہ عناصرِ کائنات پر حکمران ہوجاتا ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے لوکروڑ مسلمان توحید کے قائل تو ہیں مگر اُس پہ عامل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی زبردست تعداد کے باوجود غلام ہیں جنگِ موتہ میں ۳ ہزار مسلمانوں نے اپنے سے چالیس گنی فوج کو شکست دی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے۔ وہاں بھی ہم دوسروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں فاعتبروا یا اولوالابصار۔

حکمتِ فرعونی

علامہ اقبالؒ سے اربابِ دین کی حکمت سن چکے اربابِ کین کی حکمت کے متعلق ان کے

ارشادات ملاحظہ ہوں :۔

(۱) حکمت ارباب کیں مکر است وفن مکر و فن؟ تخریب جان تعمیر تن

ارباب کیں کی حکمت یعنی وہ دانائی یا علم جو ارباب کیں (دشمنانِ اسلام) لوگوں کو سکھاتے ہیں خالص مکر و فن سے عبارت ہے۔ سوال ہوگا کہ مکر و فن سے کیا مراد ہے۔ اس لئے علامہؒ جواب دیتے ہیں کہ مکر و فن سے میری مراد وہ ضابطۂ فکر و اخلاق ہے جس پر عمل کرنے سے روحانیت فنا ہو جائے اور انسان خالص مادہ پرست (ملحد اور منکر آخرت) بن جائے یعنی

حکمتے از بند دیں افتادۂ از مقام شوق دور افتادۂ

دشمنان دین نبیؐ، جو عقل و خرد عطا کرتے ہیں وہ، شریعت اسلامیہ کی حدود و قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ یعنی اس کی بنیاد لادینی پر ہوتی ہے۔ اس حکمت سے دماغ تو منوّر ہو جاتا ہے مگر دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں قومیّت، وطنیت، اشتراکیت اور مزدکیّت کے نظریے آہستہ آہستہ مسلمان نوجوانوں کو متاثر کر رہے ہیں یعنی اُن کو غیر محسوس طور پر لادینی اور الحاد کی طرف مائل کر رہے ہیں۔

(۲) حکمتِ فرعونی کا دوسرا عنصرِ فعال (WORKING PRINCIPLE) وہ درسی نظام ہے جو مکتبوں، مدرسوں، سکولوں اور کالجوں کی شکل میں ہمیں نظر آ رہا ہے اور سطح بین نگاہوں کو، عمارتوں، سبزہ زاروں (LAWNS) معملوں (LABORATORIES) دارالاقاموں (HOSTELS) ڈگریوں طلیلسانوں (GOWNS) اور تنخواہوں سے خیرہ کر رہا ہے۔

(ل) مکتب از تدبیر او، گیرد نظام تا بکام خواجہ اندیشد غلام

ان سکولوں اور کالجوں کے قیام اور امداد (GRANT) کا مقصد یہ ہے کہ غلاموں کی

جو فوج ہزیمت موج، ان میں تعلیم حاصل کرے وہ

(۱) اپنی ہستی سے غافل ہو جائے اور اپنے سود و بہبود سے بے خبر۔

(۲) اس کے دماغ میں صرف وہی خیالات پیدا ہو سکیں جو آقاؤں کے مفید مطلب ہوں۔

علامہؒ کے پیرو، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے صاف طور سے کالج کو "مذبح" (SLAUGHTER HOUSE) سے تشبیہ دی ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک شعر اور بھی سن لیجیے، شاید پسند آجائے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے، فقط بازاری ہے

جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے، فقط سرکاری ہے　　　(اکبر)

جو لوگ محاوراتِ زبان سے آشنا ہیں وہ "بازاری تعلیم" کی ترکیب سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے ہیں (الکنایۃ ابلغ من التصریح)

۳) ارباب کین کا تیسرا اصول یہ ہے کہ وہ شیوخ ملت کو یا اُن میں سے کسی ایک موزوں آدمی کو، اس کام پر مامور کر دیتے ہیں۔ کہ وہ دلچسپ طریقہ سے، اُن کے مطلب کے موافق، اسلام کی تجدید کر دے۔

شیخ ملت با حدیث دلنشیں　　　بر مراد او کند تجدید دیں

چنانچہ ہمارے زمانہ میں، ایک الحمد کلکٹری، آنکھوں دیکھتے دیکھتے "ظلِ نبی" بن گیا۔ اور اس نے بیک جنبش قلم، جہاد کو منسوخ کر دیا۔ تاکہ اس کے مخدوم اور مطاع ہندوستان کی طرف سے مطمئن ہو کر، اپنی پوری توجہ سرحدی پٹھانوں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے پر مبذول کر سکیں۔

از دمِ او وحدتِ قومے دو نیم　　　کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم

علامہؒ فرماتے ہیں کہ "شیخ ملت" کی تجدید کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وحدتِ ملی فنا ہو جاتی ہے۔

کیونکہ وہ شیخ خود ایک نئی ملت کا موجد ہوتا ہے جو اُس کے "خود کاشتہ پودے" کا ثمر ہوتی ہے اور اس کا مقابلہ مناظروں اور مباہلوں سے نہیں بلکہ صرف چوب کلیم سے ہو سکتا ہے ؎

اے قومِ کشتۂ تدبیرِ غیر کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر

اب علامہ اُس قوم کے حالِ زار پر آنسو بہاتے ہیں جو ارباب کین کی غلامی میں گرفتار ہو۔ اس قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ

(الف) اس قوم کے افراد، دن رات اپنی تخریب اور بربادی کا سامان کرتے رہتے ہیں اور اغیار (ارباب کین) کے مفاد کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس مصرعہ میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:-

(۱) تخریب خود۔ (۲) تعمیر غیر۔

تخریب ذاتی کے شواہد: (۱) تبرا اور مدح صحابہ۔ (۲) بریلوی، دیوبندی، نزاع۔

تعمیر غیر کے شواہد:- (۱) از پشاور تا ڈھاکہ۔ (۲) از لنڈی کوتل تا راس کماری۔

یہی منظر تو اکبر نے دیکھ پایا تھا جو یہ شعر لکھا تھا

اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

(ب) اس قوم کے افراد علم و فن میں تو بہت ماہر ہو جاتے ہیں یعنی لندن کیمبرج آکسفورڈ پیرس اور برلن سے ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔ آسمان کے ستاروں کی تعداد بتا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے ساتوں طبقوں کا حال سُنا سکتے ہیں، مریخ سے نامہ و پیام کر سکتے ہیں، روحوں کا فوٹو کھینچ سکتے ہیں۔ کرۂ ارض کا وزن بتا سکتے ہیں مختصر یہ کہ زمین اور آسمان دونوں کے قلابے ملا سکتے ہیں لیکن اپنے وجود سے بیگانہ رہتے ہیں۔

می شود در علم و فن صاحب نظر از وجودِ خود نگردد باخبر

(ج) نقشِ حق را از نگیں خود ستُرد در ضمیرش آرزو ہا زاد و مُرد

اس قوم کے افراد، اپنے دل سے خدا کے خیال کو مٹا دیتے ہیں اور جو آرزو اُن کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ فوراً فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُن میں اُس آرزو کو زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی بس اُن کے دل میں اگر کوئی آرزو ہوتی ہے تو یہ کہ "صاحب" سے ہاتھ ملا سکیں۔

مجمع میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے مجھ سے

صاحب میرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

(د) بے نصیب آمد ز اولادِ غیور جاں بہ تن چوں مردہ در خاکِ گور

یہ قوم یعنی غلام قوم، اولادِ غیور سے محروم ہو جاتی ہے یعنی اس قوم کے افراد میں غیرت کا مادہ باقی نہیں رہتا اور بے غیرتی کی بنا پر اُن کی روح، بالکل قبر کے مُردہ کی طرح بے حس ہو جاتی ہے چنانچہ اسی بے غیرتی اور بے حسی کا نتیجہ ہے کہ اس قوم کے افراد:

(۱) اپنے بھائیوں کی جاسوسی اور مخبری کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں۔

(۲) اپنے ہاتھ سے اپنے بھائیوں کا گلا بلا تامل کاٹ دیتے ہیں۔

(۳) اپنی سنگینوں کی نوکیں اپنے بھائیوں کے سینوں میں پیوست کر دیتے ہیں۔ اور اس کے صلہ میں اپنے سینوں کو تمغوں سے مزیّن کرتے ہیں۔

(۴) غیر مسلم قوم کے مجوّزہ دستور پر اپنے ہاتھوں سے دستخط کرتے ہیں اور اسلام کش تعلیمی سکیمیں خود اپنے قلم سے مرتب کرتے ہیں۔

(۵) اپنی مساجد کو مسلمانوں پر بند کرتے ہیں اور جب پولیس ان کو مقفل کر دیتی ہے تو اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اس کارنامہ پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے "وہابیوں" کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دی۔

(۸) از حیا بیگانہ پیران کہن نوجواناں چوں زناں مشغول تن

اس قوم کے سفید ریش افراد، حیا سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اور اس قوم کے نوجوان افراد، عورتوں کی طرح، جسمانی آرائش میں مشغول رہتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ہوسٹلوں میں جا کر دیکھ لیجئے۔ کمرہ میں نہ تلوار ہوگی نہ بندوق، ہاں میز پر کریم (CREAM) کی شیشیاں، اور پوڈر (POWDER) کے ڈبے رکھے ہوئے ہوں گے، لونڈر اور سینٹ کی افراط ہوگی لیکن قرآن اور مصلّی کا نشان نہ ہوگا۔

(۹) در دل شاں آرزوہا بے ثبات مردہ زایند از بطون امہات

اس قوم کے نوجوانوں کے سینے آرزو سے خالی ہوتے ہیں۔ اور اس کا سبب بالکل عیاں ہے آرزو تو زندہ قوم کے افراد میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اس قوم کے افراد تو ماں کے پیٹ سے ہی مردہ پیدا ہوتے ہیں۔

آرزو، اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو اگر پیدا، تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام (ارمغان حجاز)

(۱۰) دختران او بزلف خود اسیر شوخ چشم و خود نما، وخوردہ گیر
ساختہ، پرداختہ، دل باختہ ابرواں مثل دو تیغ آختہ
ساعد سیمین شاں، عیش نظر
سینہ ماہی بموج اندر نگر

اور اس قوم کی لڑکیاں! معاذ اللہ! خود اپنی ہی زلفوں میں اسیر ہوتی ہیں جسمانی آرائش ان کا مقصد حیات ہوتا ہے، بے باک، بے حیا، خود نما، اور خفیف الحرکات، دن رات بناؤ سنگار سے کام، دیدے کا پانی ڈھلا ہوا۔ زرق برق لباس، کنگھی چوٹی سے درست، دلوں میں ناپاک خیالات کا ہجوم، ابرو دھنویں جیسے کھینچی ہوئی دو تلواریں، بازو بالکل عریاں یا

سینہ باز، ملبوس اس قدر باریک کہ تمام جسم، اس میں سے اس طرح نظر آجائے جیسے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی نظر آتی ہے!!

(ح) ملتے خاکستر او بے شررِ صبح او از شام او تاریک تر

الغرض اس قوم کے افراد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی خاکستر میں راکھ ہی راکھ ہوتی ہے، چنگاری کا نام ونشان کہیں نہیں ہوتا۔ اور ان کی عقلوں پر حکمتِ فرعونی، ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ وہ بُرائی کو اچھائی سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اسی حماقت شعاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر آبرو باختہ ایکٹریس اُن کی نظر میں مقصودِ حیات بن جاتی ہے، اور جب خوش قسمتی سے وہ اُن کے شہر میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرنے آتی ہے، تو وہ اُس کے استقبال کے لئے، دیوانہ وار پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں، اور اس دیوانگی کے عالم میں جنکشن سے بادامی باغ تک بھاگے چلے جاتے ہیں!

(ط) ہر زماں اندر تلاشِ سازو برگ کار او فکر معاش و ترسِ مرگ

اس قوم کے افراد ہر وقت سامانِ زیست کی تلاش میں منہمک رہتے ہیں اور اُن کی تمام زندگی کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

فکر معاش اور ترسِ مرگ

(ی) منعمان او بخیل و عیش دوست غافل از مغز اند و اندر بند پوست

اور اس قوم کے دولت مند عموماً کنجوس اور عیاش ہوتے ہیں، زندگی کی حقیقت سے بیگانہ، اور محض سطحی باتوں، اور عارضی لذتوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

(ک) قوتِ فرمانروا معبود او در زیانِ دین و ایمان سود او

اس قوم کا معبود اللہ نہیں ہوتا بلکہ قوتِ فرمانروا، اور یہ قوم دین و ایمان کو ارزاں قیمت پر فروخت کرنا ہی اپنے حق میں مفید سمجھتی ہے چنانچہ اس طبقہ کے افراد (الاماشاء اللہ) آنحضور

دن جمعہ کی نماز میں کبھی شریک نہیں ہوتے لیکن "سٹی مجسٹریٹ" کے بنگلہ پہ حاضری قضا نہیں ہوتی قرآن، بھولے سے کبھی نہیں پڑھتے لیکن "سی ایم جی" کی تلاوت بلاناغہ کرتے ہیں، اور اس قوم (طبقۂ امراء) میں جو افراد، صاحب فکر ہوتے ہیں، وہ اکثر اپنے اجداد کی اس غلطی پر دست تاسف ملتے ہیں کہ انہوں نے مسجد بنانے کے عوض "بلڈنگ" کیوں نہ بنائی۔ جو اس وقت ہزار روپیہ ماہوار کی "جائداد" ہوتی! مسجد پہ تو الٹا خرچ کرنا پڑتا ہے!

(ل) از نیاگاں دفترے اندر بغل الاماں از گفتہ ہائے بے عمل

اس قوم کے افراد کے پاس، اسلاف کی تصانیف کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے اور یہ قوم دن رات باتیں بنانے میں مصروف رہتی ہے عمل سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

(م) از خدا امروز خود بیروں نجست روزگارش نقش یک فردا نہ بست

اس قوم کے افراد صرف آج کی فکر کرتے ہیں، کل کیا ہوگا؟ اس سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا ع۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

(ن) دین او، عہد وفا بستن بغیر یعنی از خشت حرم تعمیر دیر

اسلام تو اس قوم کا مذہب ہوتا نہیں، پھر سوال یہ ہے کہ آخر اس قوم کا دین کیا ہوتا ہے؟ علامہ جواب دیتے ہیں کہ اس قوم کا دین یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے عہدِ وفا باندھتی ہے یعنی حرم کی اینٹوں سے دیر کی تعمیر میں مصروف رہتی ہے۔

چنانچہ اس قوم کے افراد آئے دن، اغیار سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کے ریزولیوشن پاس کرتے ہیں اور محفلوں میں اُن کی صحت کا جام شیریں، نوش کرتے ہیں!

آخر میں علامہؒ اس قوم کی ذہنی اور اخلاقی موت کا ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں۔

آہ قومے دل ز حق پرداختہ مُرد و مرگ خویش را نشناختہ

افسوس ہے ایسی قوم پر، جو اپنے سینہ کو سچائی سے خالی کر چکی ہو۔ موت کی شاہراہ پر گامزن ہو اور اس کی حماقت کا یہ عالم ہو کہ وہ موت کو حیات یقین کرتی ہو!

توحید

توحید کے عنوان کے ماتحت علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم بیان فرمایا ہے۔ جو لوگ علامہ کے اندازِ بیان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ فلسفہ طرازی کے وقت وہ ایک بلند مقام سے گفتگو کرتے ہیں اس لئے ان کی طرز نگارش ہندی فلسفہ کے "سوتروں" کی طرح بہت مجمل اور بلیغ (CONDENSED) ہو جاتی ہے۔ تاکہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سما سکیں یہ طرز، اُن کے مشہور "خطبات مدراس" کے ہر فقرہ سے نمایاں ہے اور اس موقع پر یعنی لا الہ الا اللہ کی تفسیر میں بھی انہوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے مثنوی پس چہ باید کرد کے چار صفحوں میں اس موضوع پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کی تشریح کے لئے پچاس صفحے بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں بھی "پیغام حق" کے محدود صفحات کو مدِّ نظر رکھ کر، دل پر جبر کروں گا اور نہایت اختصار سے کام لوں گا۔ فرماتے ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال امتاں را لا جلال الا جمال

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ دو اجزاء سے مرکب ہے لا الہ یعنی کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ انسان اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور الا اللہ یعنی سوائے ایک ہستی کے جس کا نام اللہ ہے، شعر کا ترجمہ تو آسان ہے، ہر فارسی دان کر سکتا ہے لیکن مفہوم قدرے غور طلب ہے۔ اس کی تفہیم کے لئے تین لفظوں کو پہلے سمجھ لینا چاہئے اولاً "مردانِ حال" علامہ فرماتے ہیں کہ جو نکتہ میں بیان کروں گا وہ میں نے مردانِ قال سے نہیں بلکہ مردانِ حال سے سیکھا ہے پس پہلی بات ذہن نشین کرنے کے لائق یہ ہے کہ اس نکتہ سے وہی شخص کما حقہٗ

لطف اندوز ہوسکتا ہے جو صاحبِ حال ہو "مردانِ حال" سے مراد وہ لوگ ہیں جو قال (فلسفہ) سے بے نیاز ہو کر، وجدان کی بدولت، معرفت تامہ حاصل کرتے ہیں۔

یعنی توحید کی اصلیت اور حقیقت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک انسان "قال" کی منزل ادنیٰ سے گزر کر "حال" کی منزل ارفع میں داخل نہ ہو۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا توحید، اربابِ قال کے لئے نہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ضرور ہے اور اس کا ظاہری مفہوم کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اُن کے لئے کافی ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو انہیں، وہ طریقہ اختیار کرنا لازمی ہے جو اس کے لئے درکار ہے۔ مثلاً برق سے ہم سب آشنا ہیں لیکن اس کی ماہیت کا علم منحصر اس پر ہے کہ طالب علم، دفتر یا دکان سے بے نیاز ہو کر کسی عالم طبیعات کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرے۔ پانی کا آلہ پیمائش، انچ یا فٹ نہیں، نغمہ کا آلہ ناک یا آنکھ نہیں، آموں کو کانٹے میں وزن نہیں کرتے۔ اسی طرح توحید کے مفہوم حقیقی سے آگاہ ہونے کا ذریعہ قال نہیں، حال ہے، پھر اشکال کیا ہے؟

الغرض جو لوگ اس سے آشنا ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ع امتاں را لاجلال الّا جمال

دوسرا لفظ غور طلب، جلال ہے اور تیسرا غور طلب لفظ جمال ہے۔ جلال سے مراد ہے قاہری، اور جمال سے مراد ہے دلبری۔ قاہری، دل میں خوف پیدا کرتی ہے اور دلبری دل میں محبت پیدا کرتی ہے۔ اور یہ دونوں، حیات انفرادی اور حیات اجتماعی کے لئے ضروری ہیں یعنی زندگی کی دو شانیں (ASPECTS) ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی۔

قاہری اور دلبری دونوں ایک ذات میں جمع ہو جائیں تو انسان میں پیغمبری کی شان پیدا ہوتی ہے اور صرف دلبری جادوگری ہے اور صرف قاہری ابلیسیت ہے جیسا کہ علامہ خود فرماتے ہیں ؎

دلبری با قاہری پیغمبری است   دلبری بے قاہری جادوگری است

خلاصۂ کلام یہ کہ امتوں کے لئے اس کلمہ کے دونوں اجزاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لاالہ سے اُن کے اندر شانِ قاہری پیدا ہوتی ہے اور الا اللہ سے شانِ دلبری پیدا ہوتی ہے اس کلمہ کے دونوں اجزاء پر ایمان لانے سے امتوں کے اندر جلال اور جمال یہ دونوں رنگ پیدا ہو جاتے ہیں اور زندگی کی تکمیل و تہذیب کے لئے یہ دونوں رنگ ضروری ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ لاالہ اور جلال میں اور الا اللہ اور جمال میں کیا منطقی ربط پایا جاتا ہے؟

جب کوئی قوم لاالہ کا نعرہ بلند کرتی ہے یعنی جب اس کے اقوال و افعال سے "دیگرے نیست" کا رنگ عیاں ہوتا ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں اپنی خودی کی قوتوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی شخصیت کے امکاناتِ مضمرہ (HIDDEN POSSIBRLTTES) کو خارجی وجود عطا کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ "لاالہ" یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے میں سرِ تسلیم خم کر سکتا ہوں یا جو مجھ پر حکمرانی کر سکتی ہے فرد اور قوم دونوں کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ طاقت کا دوسرا نام "جلال" ہے۔

جب وہ قوم حکومت یا قاہری یا جلال کے ساتھ ساتھ، اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ الا اللہ یعنی "سوائے اللہ کے" تو اس کے اندر تقویٰ طہارت، شرافت، انسانیت، رحمدلی، فیاضی یعنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس قوم میں روحانیت پیدا ہو جائے وہ حسین و جمیل بن جاتی ہے یعنی دنیا اس کے زیرِ سایہ آنا چاہتی ہے۔ الغرض روحانیت کا دوسرا نام "جمال" ہے۔

جس قوم میں جلال اور جمال دونوں صفتیں ممزوج ہو جائیں وہ مسجودِ ملائکہ بن جاتی ہے

جلال مع جمال = حیدرِ کرارؓ

جلال بغیر جمال = مہدی سوڈانی کی استخوانِ سوختہ سے پوچھیے۔
(کچنر)

جمال بغیر جلال = مولانا محمد علی مرحوم

اس جگہ ایک شبہ دل میں پیدا ہوگا کہ اگر واقعی، امتوں کے اندر لا الہ سے جلال اور الا اللہ سے جمال پیدا ہو سکتا ہے تو یہ کلمہ نو کروڑ ہندوستان کے "فرزندانِ توحید" کی زبان پر ہے پھر وہ کیوں محکوم ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ، زبان ہی پر تو ہے۔ اس سے فائدہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر ایک مریض رات دن زبان سے یہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر عبد القوی بڑے حاذق ہیں لیکن اُن کی طرف رجوع نہیں کرتا، تو اُسے ڈاکٹر صاحب کے حاذق ہونے کا کیا فائدہ؟

اگر ایک مریض چشم دن رات زبان سے کہتا رہے کہ (PROTARGOL) واقع آشوب چشم ہے، تو کیا محض زبان سے کہتے رہنے کی بنا پہ اُسے صحت ہو جائے گی۔ کیا یہ کہتے رہنے سے کہ پانی پیاس بجھاتا ہے، کسی کی پیاس بجھ سکتی ہے؟ اگر نہیں تو محض زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے رہنے سے قاہری اور دلبری کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان بلاشبہ، لا الہ الا اللہ کا ورد رکھتے ہیں بلکہ بعض تو اس کلمہ کو دن بھر رٹتے رہتے ہیں۔ اور سبحہ شماری ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں لیکن ضرورت سمجھ کر کہنے کی ہے

لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں تا ز اندام تو آید بوئے جاں

ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست

زیستن با سوز او قہاری است

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

صرف ۳۱۳ مسلمانوں نے اس کلمہ کے معنی، ذہن نشین کر لئے تھے تو دنیا میں ایک انقلاب عظیم بپا کر دیا تھا۔ اور صرف ایک مسلمان نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تھا تو خیبر کا دروازہ اکھیڑ لیا

تھا لیکن ہندوستان میں پورے نو کروڑ مسلمان یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور پھر بھی غلام ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ انہیں مطلق علم نہیں کہ اس کلمہ کے لوازمات کیا ہیں؟

اور سچ تو یہ ہے کہ اس ملک میں غلاموں کو اس کلمہ کے پڑھنے کی اجازت بھی تو اسی لئے ملی ہوئی ہے کہ نو کروڑ فرزندانِ توحید مطلق نہیں سمجھتے کہ "لا الہ الا اللہ" کا اقتضا کیا ہے؟ یا یہ کلمہ اپنے معتقدین سے کس بات کا مطالبہ کرتا ہے؟ یا اس اعلان کا نتیجہ کیا ہے؟ یا مسلمان کیسے کہتے ہیں؟ یہ جو آپ اپنی مساجد کے میناروں سے روزانہ پانچ دفعہ لا الہ الا اللہ کی آواز بلند کر سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ اس کلمہ کا ادا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور نہ سننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ ع

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

جب کوئی قوم لا الہ کہتی ہے تو وہ کائنات کی ہر شئے کو اپنا محکوم سمجھ کر، اس کا مطالعہ کرتی ہے کہ اس سے فائدہ حاصل کرے۔ اس طرزِ تحقیق اور اس رجحان کا نام حکمت (سائنس) ہے! اور یہی قوم، کائنات پر حکمران ہوتی ہے۔ یہی شانِ قاہری ہے یعنی رنگِ جلال۔

پھر جب وہ قوم الا اللہ کہتی ہے تو وہ اس ضابطہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی ہے جو کتاب (قرآن) میں مذکور ہے اور اس لئے اس کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی شانِ دلبری ہے، یعنی رنگِ جمال۔

اسی لئے اللہ نے اپنے رسولؐ کو کتاب اور حکمت دونوں چیزیں دے کر دنیا کے لئے رحمت بنایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم ایاتہ ویعلمھم

الکتاب والحکمۃ" یعنی اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں، ایک رسول مبعوث کیا جو اُن کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ اور (ان میں رنگِ جلال اور شانِ جمال پیدا کرنے کے لئے) ان کو کتاب اور حکمت، دونوں کی تعلیم دیتا ہے۔ (سورۂ جمعہ ۱۴)

کیا خوب فرمایا ہے حکیم الامتؒ نے

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است   ایں دو قوت اعتبارِ ملت است

آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق   ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق

ہر دو انعامِ خدائے لایزال

مومناں را آں جمال است ایں جلال

حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں ایک کافر کو پچھاڑا اور سینہ پر چڑھ بیٹھے یہ رنگِ جلال تھا، لیکن جب اُس نے روئے اقدس پر تھوکا، تو فوراً تلوار نیام میں کر لی اور پلٹ آئے۔ یہ شانِ جمال تھی۔ لاالہ نے انہیں "خسروی شمشیر" عطا کی؛ الا اللہ نے انہیں "درویشی نگہ" عنایت کی۔ انھوں نے ایک ہی واقعہ میں جلال اور جمال دونوں شانوں کا مظاہرہ کیا، کیونکہ؟ اس لئے کہ لاالہ الا اللہ نے انہیں یہ دونوں شانیں عنایت کر دی تھیں۔ لاالہ نے اُن کے بازو میں زور پیدا کر دیا۔ اس لئے انہوں نے کافر کو مغلوب کر لیا۔ الا اللہ نے ان کے دل میں تقویٰ پیدا کر دیا۔ اس لئے انہوں نے اس کو (اپنے دشمن کو) معاف کر دیا (تاکہ انتقامی جذبہ انکی للّٰہیت کو ملوث نہ کر دے)

خسروی شمشیر و درویشی نگہ   ہر دو گوہر از محیطِ لاالہ

الغرض شمشیر اور نگاہ، قاہری اور دلبری، حکومت اور روحانیت، یعنی جلال اور جمال، لاالہ اور الا اللہ کا ثمر ہیں۔

اب سمجھ پڑھئے اُس شعر کو

نکتۂ می گویم از مردانِ حال   امتاں را لا جلال الا جمال

غالباً اب اس شعر کا مطلب کسی قدر واضح ہوگیا ہوگا۔ اور لا الہ اور جلال، اور الا اللہ اور جمال میں جو ربط مضمر ہے وہ بھی ذہن نشین ہوگیا ہوگا۔ آخر میں اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی زندگی میں جو نہ شانِ جلال ہے نہ رنگِ جمال اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کے مفہوم سے بیگانہ ہیں۔

اب اس قضیۂ کا عکس کر لیجئے تو صورت یہ ہوگی کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے اندر جلالی اور جمالی شان پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ اشتراکیت اور گاندھویت (اہنسا اور چرخا) دونوں سے قطع نظر کر کے، لا الہ اور الا اللہ کا مفہوم سمجھ لیں۔

چوں علیؓ در ساز با نانِ شعیر   پنجۂ مرحب شکن، خیبر بگیر

اگر دل چاہے تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے انہیں نصف صدی کے اندر اندر ربع مسکوں کا مالک بنا دیا تھا؟ کس طاقت سے انہوں نے قیصر اور کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے؟ جنگ موتہ میں پے در پے نو تلواریں خالدؓ کے ہاتھ میں کس طرح ٹوٹ گئی تھیں؟ باختر سے لے کر بحرِ ظلمات تک اُن کے نام کا سکہ کیسے رواں ہوگیا تھا؟ امیر المومنین حضرت علیؑ کیونکر اپنے ماتحت قاضی کی عدالت میں حاضر ہو سکے؟ خالدؓ نے اپنی معزولی کو کس لئے بطیبِ خاطر گوارا کر لیا؟ ملک شاہ سلجوقی نے کس وجہ سے گھوڑے سے اُتر کر ضعیفہ کی داد رسی کی؟ سلطان محمود بیگڑہ نے کیوں اپنے محبوب گھوڑے کی سواری ترک کر دی؟ عالمگیرؒ نے تیروں کی بارش میں کس طرح نمازِ عصر ادا کی؟

یعنی ان لوگوں میں جلال اور جمال کا یہ رنگ کس طرح پیدا ہو سکا؟

اس کا جواب صرف یہی ہے کہ یہ لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم سے آگاہ تھے۔ کیا خوب فرمایا ہے اقبالؒ نے ؎

تا دو تیغِ لا و الّا داشتیم ماسوا اللہ را نشان نگذاشتیم

لا الٰہ کا مفہوم

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک لا الٰہ کا مفہوم سمجھ میں نہ آجائے، انسان اپنے آپ کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد نہیں کر سکتا۔

جو قومیں اس وقت غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لا الٰہ کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہیں لا الٰہ کا مطلب یہ نہیں کہ "کوئی دوسرا خدا نہیں"، بلکہ "کوئی طاقت نہیں جو مجھ پر حکمران ہو سکے"۔ اور جب کوئی قوم اس حقیقت کو سمجھ لیتی ہے کہ کائنات میں کوئی طاقت (انسان، حیوان، کوہ و دریا، شمس و قمر، آسمان و زمین، شجر و حجر) مجھ سے بالاتر نہیں ہے تو یہ عقیدہ اس میں اس قدر قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے۔

عنوان زیر بحث (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) کے تحت علامہؒ نے اس مثنوی میں آئندہ جس قدر اشعار لکھے ہیں وہ سب شعر مذکورہ بالا کی تعریف میں یعنی انہوں نے خود، رمز لا الٰہ کی وضاحت فرمائی ہے ؎

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست ایں نخستیں منزلِ مردِ خدا است

دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز حرفِ لا سے ہوتا ہے یعنی یہ عقیدہ کہ کوئی معبود نہیں،

ایک موحد کی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ (صرف ایک خدا ہے جو معبود ہے) یہ دوسری منزل ہے، یعنی اس کی زندگی کی تمام فعالیت (ACTIVITY) اس بنیادی حقیقت پر مبنی ہے کہ کائنات میں نہ کوئی طاقت مجھ پر حکمراں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہو اس لئے نہیں سکتی کہ اس کائنات میں قوت کا مظہر اتم، انسان ہے اور سب انسان۔ میری طرح مخلوق اور محتاج الی الغیر ہیں۔ پس کسی انسان کو مجھ پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ؎

ملتے کز سوز او یک دم تپید   از گلِ خود خویش را باز آفرید

جو قوم اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتی ہے وہ از سر نو زندگی اور توانائی حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی عقیدۂ لا الٰہ، سربلندی کا ضامن ہے۔

پیش غیر اللہ لا گفتن، حیات   تازہ از ہنگامۂ او، کائنات

اگر کوئی قوم زندگی کی طالب ہو تو اُسے غیر اللہ کے سامنے لا الٰہ کا نعرہ بلند کرنا چاہیے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی قوم کے زندہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے سامنے 'لا الٰہ' کہہ سکے۔ اگر نہیں کہہ سکتی تو اُسے سمجھ لینا چاہیے کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ زندگی یا زندہ ہونے کی صورت یہی ہے کہ وہ غیر اللہ کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اس اعلان سے ہنگامہ پیدا ہونا یقینی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات از سر نو جوان ہو جائے گی، کیونکہ اس کائنات کی تمام رونق اور تازگی اسی نعرہ کے دم سے وابستہ ہے ؎

جذبۂ او در دل یک زندہ مرد   می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

اگر یہ جذبہ (کہ میں غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا) کسی ایک زندہ مرد کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ ہزاروں انسانوں کو بیدار کر سکتا ہے یعنی حرف لا الٰہ میں اس قدر طاقت پوشیدہ ہے کہ صرف ایک انسان سارے ملک میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ لا الٰہ

کا سوز دل میں جاگزیں ہو جائے ۔

۱۹۱۹ء میں، حقہ بازان فرنگ نے، ترکوں کو غلامی کی موت سے ہم آغوش کر دیا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے غیر اللہ کے سامنے لا الہ کا نعرہ بلند کیا۔ چونکہ وہ لا الہ کی قوت سے آشنا تھا اس لئے اس نے چشم زدن میں لاکھوں رہ نشینوں کو رہ نورد بنا دیا اور ۱۹۲۲ء میں، اس کی قوم نے از سر نو زندگی حاصل کر لی۔

بیشک ہزاروں بلکہ لاکھوں ترکوں نے جام فنا نوش کیا لیکن ان افراد نے اپنی جان دے کر قوم کو زندہ کر دیا۔ آئین فطرت یہی ہے ؎

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز　　تخم لا در مشت خاکِ او بریز

اگر تم غلاموں کو آقاؤں کے مقابلہ میں صف آراء کرنا چاہتے ہو تو ان کو "لا الہ" کا مفہوم سمجھا دو۔ یقیناً وہ غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے ۔

(ھ) ہندی مسلمانوں کی حالت کیا ہے ؟ ؎

از غلامی فطرتِ او، دوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نئے او، خوں شدہ

(و) یہ حالتِ زار کیوں ہے ؟ ؎

از سہ قرن ایں امت خوار و زبوں　　زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

یعنی اس لئے کہ وہ لا الہ کے مفہوم سے بیگانہ ہو چکے ہیں ۔

(ز) بیگانہ کیوں ہیں ؟

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و ملا و پیر

یعنی، اس لئے کہ ارباب اقتدار ہر وقت اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے دل میں، توحید کا حقیقی مفہوم جاگزیں نہ ہو پائے۔ کیونکہ پھر ان ارباب اقتدار کا ٹھکانا یا بحر عرب ہوگا یا خلیج بنگالہ۔

(سلہ) توحید سے مسلمانوں کو بیگانہ رکھنے کے لئے، کیا تدبیر کی گئی؟ ملاؤں اور پیروں نے انہیں فقہ اور علم کلام کی بحثوں میں الجھا دیا سہ

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

ہندوستان کی دیگر اقوام آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن نو کروڑ رسمی مسلمان، مدح صحابہؓ و تبرا، آمین بالجہر اور خفی، فاتحہ خلف الامام، تعداد رکعات تراویح، زاق الکعبین، تقبیل الابہامین، احضار صورت محمدیؐ فی القبر، امکان نظیر خاتم النبیینؐ، امکان کذب باری تعالےٰ، بشریت رسولؐ، حلت و حرمت قبہ جات، قیام در محافل میلاد، ندائے یا رسولؐ اللہ، صلوٰۃ قبل المنبر، جواز استمداد من القبور، سماع موتیٰ، جواز دلدل و ذوالجناح، وجوب تقلید شخصی، فوائد چلہ کشی، حصول فیض از ارواح رفتگاں، جواز عرس و رسوم متعلقہ، حلت و حرمت سماع۔ ضرورت بیعت، تصور شیخ، جواز سجدۂ تعظیمی، جواز چہلم، جواز ختم، جواز شیئاً للہ وغیرہ، صدہا مسائل لاطائل میں منہمک ہیں۔ تکفیر و تفسیق کا بازار گرم ہے، اور آئینہ ضمیر تاریک ہو چکا ہے

باقی نہ رہی تجھ میں وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

"کفار" جہد للبقاء میں مصروف ہیں، ملا اور پیر اسلام کی رسوائی کے درپے ہیں

دین حق از کافری رسوا تر است زانکہ ملا، مومن کافر گر است

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد دینِ ملّا، فی سبیل اللہ فساد

اس وقت مسلمانوں کے دماغوں میں مختلف اقسام کے بُت جاگزیں ہیں، قرآن مجید کا مصرف صرف اس قدر ہے کہ ع

از یٰسینِ او، آساں بمیرند

دراصل شخصیت پرستی کا بازار گرم ہے۔ عقلِ سلیم معطل ہو چکی ہے غور و فکر کا مادہ فنا ہو چکا ہے۔ پانی پت اور کرنال دونوں شہروں میں حاملِ توحید شیخ بو علی شاہ قلندر کا مزار بنا ہوا ہے اور کوئی مسلمان اتنا نہیں سوچتا بلکہ سوچ نہیں سکتا کہ ایک شخص دو مزاروں میں کس طرح مدفون ہو سکتا ہے۔ سُنا کرتے تھے کہ نصاریٰ نے ابن مریم کو خدا بنا دیا میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں نے ایک انسان کو خدائی صفات سے متصف کر دیا۔ وہ پانی پت میں بھی ہے اور کرنال میں بھی ہے

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے (اقبال)

در مقامِ لا نیا ساید حیات سوئے الّا می خرامد کائنات

محض نفی سے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی۔ طمانیت قلب کے لئے اثبات ضروری ہے۔

غور کیجئے ایک شخص صرف لا الٰہ کہتا ہے اور اسی مقام پر رُک جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی ہستی کا انکار کر دیا۔ بہت خوب۔ لیکن قلب سے قطع نظر کرکے خرد بھی تو اس حالت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ وہ سوال کرتی ہے کہ۔

(۱) منکر خود موجود ہے یا نہیں۔

(۲) کائنات موجود ہے یا نہیں۔

منکر اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سوال ہوگا کہ یہ انکار کون کر رہا ہے؟ تو ثابت ہوا کہ میں موجود ہوں۔

اگر میں موجود ہوں تو زمان و مکان کی قید میں موجود ہوں لہذا کائنات کا وجود بھی ثابت ہوگیا۔

اگر میں موجود ہوں تو اب عقل دوسرا سوال کرتی ہے کہ

تم خالق ہو یا مخلوق؟

اگر مخلوق ہو تو خالق کون ہے؟

اگر خالق ہو تو (منطقی اعتراضات سے قطع نظر کر کے) تمہارا دعوٰے باطل ہوگیا کیونکہ تم نے لا الہ کا اثبات کر دیا یعنی تم خود اللہ ہو۔

اسی طرح عقل سوال کرتی ہے کہ یہ کائنات، خالق ہے یا مخلوق؟ اگر مخلوق ہے تو اس کا خالق کون ہے؟

اگر خالق ہے تو الا اللہ کا اثبات ہوگیا یعنی وہ خود اللہ ہے۔

اب تیسرا سوال ہوگا کہ تم کائنات میں داخل ہو یا نہیں؟

اگر داخل ہو تو تمہارا پہلا دعوے کہ تم خود خالق ہو باطل ہوگیا۔

اگر داخل نہیں ہو تو تم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو، اور یہ بات بالبداہت باطل ہے۔

ابھی بہت سے قضایا مرتب ہو سکتے ہیں لیکن میرے مقصود کے اظہار کے لئے اسی قدر استدلال کافی ہے۔

اب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں معلول (EFFECT) نظر آتی ہے۔ دنیا

ہیں کسی فلسفی نے اس کائنات (دنیا) کو علت یا قدیم تسلیم نہیں کیا۔ جین دھرم میں جیو آتما اور پدگل (مادہ) کو انادی تسلیم کیا گیا ہے۔ کائنات کو وہ بھی حادث کہتا ہے۔

جب ہم اُس کے مختلف شعبوں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور اس کا چلانے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہے ؎

نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اِک اس کا بنانے والا
ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ ہے کوئی دل میں آنے والا

یعنی یہ کائنات مصنوع اور مخلوق ہے اور زبانِ حال سے صانع اور خالق کی طرف ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔

اور یہی مطلب ہے۔ ع "سوئے الا می خرامد کائنات" کا۔

الغرض جو قومیں لا کے بعد الا نہیں کہتیں، وہ بتدریج صفحہ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ دوسری توجیہہ سُنیئے۔

جو قومیں خدا کی منکر ہو جاتی ہیں وہ اپنی طاقت، انسانوں کو تباہ کرنے میں صرف کرنے لگتی ہیں اور حد سے گزرنے کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ طاغی افراد اگر برائے چندے بچ جائیں تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ قومیں کبھی نہیں بچ سکتیں ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف (اقبال)

نفی کے بعد اثبات کرنے سے ہی، زندگی کے مختلف شعبوں اعتدال اور توازن پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اعتدال بنی آدم کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ کارل مارکس۔ لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ نے ان کو ادھورا سبق

پڑھایا۔ لا الہ بجائے خود صحیح تو ہے مگر زندگی کی پہلی منزل ہے۔ لا الہ صحیح تو ہے مگر مکمل دستور العمل نہیں ہے۔ غواص کو مقصود سمندر نہیں بلکہ موتی ہے۔ اور موتی حاصل کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ لگانا بھی ضروری ہے لیکن جو غواص غوطہ ہی کو مقصود سمجھ لے وہ کبھی گوہر مراد حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے حق میں سمندر، ورطہ بن جائے گا جس میں وہ ساری عمر سرگرداں رہے گا۔

اسی طرح معبودانِ باطلہ یا غیر اللہ کی حکومت کی نفی کرنا یعنی لا الہ کہنا دل آگاہ کی پہلی اور ضروری منزل ہے لیکن مقصود حیات "الا اللہ" ہے اور الا اللہ تک پہنچنے کے لئے لا الہ کی منزل میں سے گزرنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف لا الہ پہ رک جائے وہ منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔

نفیٔ ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

معبودانِ باطلہ کا طلسم پاش پاش کرنا لازمی ہے لیکن یہ پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ اگر پہلی منزل کو مقصود حیات سمجھ لیا، تو گویا ورطہ میں پھنس گئے اور مقصود حیات حاصل نہیں ہو سکے گا۔ مرد مومن وہ ہے جو لا کی منزل سے الا اللہ کی منزل تک پہنچے ہے۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الا نرسید

اقبال کو تہذیب حاضر سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مجلس میں صرف شراب لا کا دور چل رہا ہے معبودان باطلہ کا انکار تو ہے لیکن معبود حقیقی کا اقرار نہیں اِلا اللہ کی بوتل کا کہیں پتہ نہیں ہے

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

شراب لا سے ہستی کی نفی ہوتی ہے یعنی غیر اللہ کی ہستی کی نفی ہوتی ہے لیکن اس کے بعد الا اللہ کا جام پینا چاہیے تاکہ معبودِ حقیقی یعنی اللہ کی ہستی کا اثبات بھی ہو سکے لا نقشِ باطل کو مٹاتا ہے لیکن اس کے بعد نقشِ حق بھی تو ثبت کرنا چاہیے ورنہ مقصد حیات فوت ہو جائے گا۔

اسی لئے علامہؒ فرماتے ہیں ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات

میری رائے میں یہ شعر اقبال کی عمر گرانمایہ کا حاصل ہے۔ اس سے بڑی کوئی صداقت (TRUTH) شاید اس کتاب میں کہیں نظر نہیں آ سکتی۔ اگر وہ ساری عمر میں صرف یہی ایک شعر کہہ دیتے تو بھی اُن کا نام زندۂ جاوید ہو سکتا تھا۔ جس بات کو حکمائے دہر نے ضخیم کتابوں میں بیان کیا ہے۔ اقبالؒ نے دو مصرعوں میں پیش کر دی ہے۔ یہ شعر اس قابل ہے کہ اسے موتیوں میں تولا جائے، بلکہ لوحِ دل پر ثبت کر لیا جائے۔ انسانی عقل اس سے فزوں تر یا بالاتر کسی صداقت کا اعلان نہیں کر سکتی۔ یہ صداقت انسانی عرفان کی آخری منزل ہے جس کے اوپر کوئی منزل نہیں۔

حیاتِ انسانی کی تخلیق اس نہج پر ہوتی ہے کہ وہ مقام لا میں تسلی حاصل ہی نہیں کر سکتی بعض مجبوریوں یا موانع کی بنا پر وہ کچھ عرصہ کے لئے اس منزل میں رہ سکتی ہے، اور رہی ہے لیکن جب حالات سازگار ہوئے ہیں تو وہ اس منزل سے نکل کر الا کی منزل میں سکون پذیر ہوتی ہے۔ اس دعویٰ کا ثبوت آپ کو مشرقی اور مغربی فلسفہ کی تاریخ کا

مطالعہ کرنے سے مل سکتا ہے۔

مقام لا کی توضیح کے بعد، اب علامہ فرماتے ہیں ؎

لا و الّا سازو برگِ امتاں نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

قوموں کی حیات صرف لا پر موقوف نہیں۔ بلکہ لا و الّا دونوں پر ہے۔ اور جو قومیں صرف نفیٔ بے اثبات پر اکتفا کرتی ہیں۔ وہ لا کے بعد الّا نہیں کہتیں، وہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ؎

ہر کہ را ایں سوز باشد در جگر ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

لا مقام ضربہائے پے بہ پے ایں شورِ عدلست نے آوازِ نے

ضربِ او، ہر بود را سازد نبود

تا بروں آئی زگرداب وجود

یعنی جس شخص کے سینہ میں لا الٰہ کا سوز جلوہ گر ہو، اس کا خوف لوگوں کے دلوں میں، قیامت کے خوف سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جس شخص کے سینہ میں لا الٰہ کا سوز موجود ہوتا ہے وہ باطل کے سر پہ پیہم ضربیں لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نابود ہو جاتا ہے اور پھر غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو جاتا ہے۔

اب علامہؒ خود اپنے دعوے کو عربوں کی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار ؎

با تو می گویم ز ایّام عرب تا بدانی پختہ و خام عرب

ریزہ ریزہ از ضربِ او، لات و منات در جہات، آزاد از بندِ جہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او قیصر و کسرےٰ ہلاک از دستِ او

گاہ دشت از برق و بارانش بدرو گاہ بحر از زور طوفانش بدرو

عالمے در آتش او، مثل خس

ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس

جس وقت عربوں کے دل میں لا الٰہ کا سوز پیدا ہو گیا، تو انہوں نے لات و منات اور تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا بظاہر وہ زمان و مکان کی قید میں تھے لیکن در اصل زمان و مکان دونوں پر حکمران تھے۔ انہوں نے قیصر اور کسرے دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ "لَا مُلُوکِیَّتَ فِی الْاِسْلَام" بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ اور خشکی میں جہاز چلائیے انہوں نے تمام دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ وادیٔ گنگ سے لے کر وادیٔ الکبیر تک ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ صرف لا الٰہ کے بل بوتے پر۔ پھر کیا ہوا ے

اندریں دیر کہن پیہم تپید تا جہانے تازہ آمد پدید

بانگ حق از صبح خیز یہاے اوست ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست

اینکہ شمع لا الٰہ روشن کردہ اند از کنار جوے او، آوردہ اند

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست

از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

سوزِ لا الٰہ کی بدولت عربوں نے ایک نیا جہان پیدا کیا، اور اپنی صبح خیزی کی بدولت دنیا میں صداقت کا بول بالا کیا۔ انہیں جو کچھ سربلندی اور شان و شوکت حاصل ہوئی۔ وہ سب صرف لا الٰہ کا کرشمہ تھا۔ جب انہوں نے، اپنے دل کو نقشِ غیر اللہ سے پاک کر لیا تو تاریخِ عالم شاہد ہے کہ اس عالم میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔

یہ تو عہدِ ماضی کی مثال تھی۔ اب عصرِ حاضر کی مثال ملاحظہ کیجئے ے

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردید خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ برہم زدہ ست — تیز نیشے بر رگِ عالم زدہ ست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین لا کلیسا، لا الٰہ

صدیوں سے روس کے باشندے مطلق العنان ملوکیت کی لعنت میں گرفتار تھے۔ آخر کار اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اور ۱۹۱۷ء میں، بندگی اور خواجگی میں ایک فیصلہ کن جنگ واقع ہوئی۔ روس کے باشندے غلام تھے لیکن جب انہوں نے لا الٰہ کا نعرہ بلند کیا، تو زارِ روس کا تخت و تاج جہنم زدن میں، فنا ہوگیا اور اُن کو زار زاریہ اور راسپوٹین اور دوسرے ظالموں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ فی الحال ان کا مسلک یہ ہے کہ لا سلاطین، لا کلیسا اور لا الٰہ۔ یعنی ملوکیت۔ مذہب اور خدا تینوں سے بیزار ہیں۔ مگر وہ خدا کے منکر کیوں ہیں؟ اس لئے کہ

فکر او در تُندِ بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلاّ نراند

اس قوم نے لا الٰہ ہی کی منزل کو، آخری منزل سمجھ لیا۔ حالانکہ ع
ایں نخستیں منزلِ مردِ خدا است

لا الٰہ سے طاقت ضرور آتی ہے لیکن اگر اِلاّ نہ ہو تو پھر یہ طاقت، بنی آدم کے حق میں عذاب بن جاتی ہے۔ اور یہی فرق ہے حضرت عمرؓ اور ہٹلر کی حکومت میں۔ دونوں طاقت کے مظہر ہیں لیکن حضرت عمرؓ کی زندگی لا اور اِلاّ دونوں کی جامع تھی۔ اس لئے بنی آدم کے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ ہٹلر کی زندگی میں صرف لا الٰہ کا جلوہ ہے اس لئے اس کا وجود انسانیت

کے حق میں لعنت بنا ہوا ہے۔ اور اسی پر آپ ان تمام اقوام کو قیاس کر سکتے ہیں جو سیاست لا دین کے علمبردار ہیں خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر (اقبال)

اس کا جواب حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے مل سکتا ہے ؎

در محبت پختہ کے گردد خلیلؑ
تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک تمثیل بیان کی گئی ہے کہ پہلے انہوں نے ستارہ کو دیکھا پھر سورج کو لیکن جب وہ دونوں غروب ہو گئے تو انہوں نے کہا "اِنِّی لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" یعنی پہلے لا کی منزل سے گزرے پھر انہوں نے الا کا پتہ لگایا یعنی لا اُن کے لیے الا کی دلیل بن گیا۔ انہوں نے تمام معبودانِ باطلہ کا انکار کیا لیکن اس انکار کے بعد انہوں نے سچے خدا کا اقرار بھی کیا۔

اور پھر نمرود کے سامنے جا کر اس کی خدائی کا ابطال کیا۔ اس کے منہ پر صاف کہہ دیا کہ تُو خدا نہیں ہے اور آج دُنیا میں اُن کی جس قدر عظمت ہے وہ اسی لیے کہ وہ دُنیا میں توحید کے پہلے عظیم الشان علمبردار ہیں اور انہوں نے جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیم دونوں کو آشکار کیا۔ اسی لیے علامہ آج کل کے وارثانِ مسندِ نبویؐ سے خطاب کرتے ہیں ؎

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

اے وہ لوگو کہ تم حجروں میں بیٹھے ایک غیر مسلم کی اتباع کا جواز ڈھونڈ رہے ہو باہر نکلو اور اس زمانہ کے نمرود کے سامنے نعرۂ لا الٰہ بلند کرو۔

اینکہ می بینی نبرزد باد و جو   از جلال لا الٰہ آگاہ شو

جو کچھ ظاہری طمطراق نظر آتا ہے مومن کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ پس مسلمانوں کو لا الٰہ کے جلال سے آگاہ ہونا چاہئے تاکہ وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر سکیں۔

ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست   جملہ موجودات را فرمانرواست

مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا لازمی ہے کہ جس شخص کے دل میں لا الٰہ ایک دفعہ پوری طاقت کے ساتھ جاگزیں ہو جاتا ہے وہ کائنات میں حکمران بن جاتا ہے۔ پس مسلمان نوجوانوں کو اقبال کا غیر فانی پیغام یہی ہے کہ

ایں کہ می بینی نبرزد باد و جو   از جلال لا الٰہ آگاہ شو

فلسفۂ فقر

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟   یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

علامہؒ کے کلام میں، فقر کی اصطلاح بہت مستعمل ہے اور چونکہ مسلمان اس کے معانی سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس لئے انہوں نے اس زرین اصول کی، جسے (روحِ قرآن) کہنا زیادہ مناسب ہوگا خود تشریح فرمادی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جاوید نامہ ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں بھی خاص فقر کے مضامین پائے جاتے ہیں لیکن اس مثنوی میں علامہؒ نے خاص اسی اصطلاح کی تشریح کے لئے ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے تاکہ مسلمان حقیقتِ حال سے بآسانی واقف ہو جائیں۔

فرماتے ہیں "اے لوگو! جانتے ہو، فقر کیا ہے؟ (فقر گداگری نہیں ہے) فقر کہتے ہیں نگاہِ راہ بیں، اور دلِ زندہ کو یعنی فقیر وہ ہے جس کی نگاہ اور دل دونوں مسلمان ہوں۔ نگاہِ راہ بیں سے مادی آنکھ مراد نہیں ہے بلکہ دماغ یا فکر، یا ذہنیت۔

فقیر وہ ہے جس کو یہ قوت حاصل ہو کہ وہ ہدایت اور ضلالت میں امتیاز کر سکے اور وہ بادۂ عشقِ محمدؐ سے سرشار ہو

علامہؒ کی رائے میں، دل اور نگاہ، مسلمان کی بنائے زندگی ہیں اگر یہ مسلمان نہ ہوں تو ایک شخص رسلمان، اثبات واجب الوجود پر ایک ضخیم کتاب لکھ دے یا ہستیٔ باری پر منطقی دلائل قائم کر دے یا کسی دلیلِ عقلی کی بنا پر مسلمان ہو جائے تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ، تو کیا حاصل ؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص نے مسجد میں جا کر کلمہ پڑھ لیا تو مسلمان ہو گیا، بے شک ہو گیا لیکن یہ مقام راہ ہے منزل نہیں ہے۔ ابھی اس کو ایک مرحلہ اور بھی طے کرنا ہے وہ کیا؟ دل ونگاہ کو مسلمان بنانا اور جب کسی مسلمان کا دل، اور اس کی نگاہ بھی مسلمان ہو جاتی ہے تو وہ مقام فقر پر فائز ہو جاتا ہے۔

نگاہ، راہ بین کیونکر ہو سکتی ہے ؟ مطالعۂ قرآن سے
دل، زندہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟ عشقِ رسولؐ سے

مطالعۂ قرآن کا تعلق فکرِ انسانی سے ہے اور عشقِ رسولؐ کا تعلق ذکرِ انسانی سے ہے۔ اور فقر، ذکر و فکر کے امتزاج ہی کا دوسرا نام ہے ۔

دل تو ہر مسلمان کے سینہ میں موجود ہوتا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ ؟ اگر وہ مُردہ ہے تو دل ہی نہیں ہے محض پارۂ گوشت ہے جس کی قیمت چھ پیسے سے زیادہ نہیں مل سکتی ۔

دلِ مُردہ، دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور اگر وہ زندہ ہے تو پھر واقعی دل ہے اور اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، یہ کُل کائنات بھی اُس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری

مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس صوبہ کے ایک کروڑ مسلمانوں کی موجودگی میں، دس لاکھ نفوس، نواب شرف النساء بیگم کے مزار سے "قرآن اور تلوار" کیونکر لے جا سکے؟

محض اس لئے کہ دس زندہ انسان ایک ہزار مردہ انسانوں پر غالب آ سکتے ہیں مسلمانوں کا دل مُردہ ہو چکا تھا اور ابھی تک زندہ نہیں ہو سکا ہے یقین نہ ہو تو مسجد شہید گنج سے پوچھ لو اور وہاں تک جانے کی بھی ضرورت نہیں، خود اپنے دل سے پوچھ لو۔

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ

ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

فقر، کارِ خویش را سنجیدن است   ہر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

فقر کیا ہے؟ محاسبۂ نفس کرنا اور اپنے آپ کو توحید کی ترازو میں تولنا یا اس اصول کی اتباع کرنا، یعنی فقیر وہ ہے جو موحّد ہو۔ خدا کے علاوہ اور کسی سے نہ ڈرتا ہو۔

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر   بستۂ فتراکِ او، سلطان و میر

فقر کیا ہے؟ جَو کی روٹی کھا کر، خیبر کا دروازہ اکھاڑ پھینکنے کی طاقت حاصل کرنی۔ اور اسی طاقت کی بدولت بڑے بڑے بادشاہ اور سردار، مردِ فقیر کے آگے دست بستہ حاضر رہتے ہیں۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست ما امینیم ایں متاع مصطفیٰؐ است

فقر کیا ہے؟ عشق و مستی اور تسلیم و رضا کا مجموعہ ہے یعنی فقیر وہ ہے جو خدا کا عاشق ہے اور ہر حال میں اس کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو جو اپنے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہو جو رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصود سمجھتا ہو جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو کونین کی بادشاہی سے بہتر سمجھتا ہو۔

فقر کیا ہے؟ متاع مصطفویؐ ہے۔ یہ وہ امانت ہے جو آنحضرتؐ نے ہمارے سپرد فرمائی ہے یعنی فقر وہ جوہر ہے جس پر خود آنحضرت صلعم کو ناز تھا چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں "الفقر فخری" یعنی میں اپنی فقیری پر فخر کرتا ہوں۔

متاع مصطفیٰؐ کہنے سے علامہؒ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل میں، فقر کی عظمت کا نقش جاگزیں ہو سکے یعنی جس چیز پر سرورِ کونینؐ فخر کریں وہ بلاشبہ نہایت قیمتی بلکہ بے بہا ہوگی۔

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند بر نوامیس جہاں شبخوں زند

فقر کیا ہے؟ وہ صفت ہے جس کی بدولت انسان فرشتوں کو مسخر کر سکتا ہے بلکہ کائنات کی تمام طاقتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دولت لازوال کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوگا۔

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم مرد درویشے نگنجد در گلیم

فقر کی دولت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے یعنی فقیر وہ ہے جو متمسک بالقرآن ہو۔ دنیاوی بادشاہ لشکر و سپاہ اور زر و جواہر پر ناز کرتے ہیں لیکن فقیر کا سرمایہ صرف قرآنِ عظیم ہوتا ہے۔ بظاہر مرد درویش (فقیر) ایک کمبل اوڑھے ہوتا ہے لیکن دراصل وہ ساری کائنات کو اپنے اندر لیے ہوتا ہے۔ اب مرد فقیر کی شان ملاحظہ ہو۔

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن　　یک دم او، گرمیٔ صد انجمن
بے پراں را ذوقِ پروازے دہد　　پشّہ را تمکین شہبازے دہد
با سلاطین در فتد مردِ فقیر　　از شکوہ بوریا لرزد سریر

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او، لاملوک

مردِ فقیر زیادہ گفتگو نہیں کرتا۔ اور نہ چار چار پانچ پانچ گھنٹے مسلسل تقریریں کرتا ہے اس کے باوجود، اس کے ایک سانس سے صدہا انجمنوں میں، گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہؤا، ایک لفظ صدہا انسانوں کو عمل کا خوگر بنا دیتا ہے۔

دوسرا کمال مردِ فقیر میں یہ ہوتا ہے کہ وہ سلاطین وقت سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا بلکہ علانیہ اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ انہیں چیلنج دیتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ فقیر کے بوریے کی ہیبت سے سلطان کا تخت ہمیشہ لرزہ بر اندام رہا ہے۔

امام حسینؑ، امام ابن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ یہ سب فقیر تھے اور تاریخ شاہد ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے زمانہ کے سلاطین کا مقابلہ کیا اور اُن پر غالب آئے۔ اور تو اور علامہ سید جمال الدین افغانی میں چونکہ ایک حد تک شانِ فقر پائی جاتی تھی۔ اس لئے سلاطین عالم اُن تک سے، لرزہ بر اندام رہتے تھے حالانکہ اُن کے پاس نہ دولت تھی نہ پیسہ، نہ فوج نہ سپاہ، نہ تخت نہ تاج، نہ ریاست نہ مملکت بس ایک چیز ضرور اُن کے پاس تھی یعنی دلِ بیدار + نگاہِ راہ بیں = فقر

فقیر کے دل میں، جو سلاطین وقت کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، یہ فوج و سپاہ یا مال و دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ جذب و سلوک یا عشقِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ کی بدولت پیدا ہوتی

ہے اور مرد فقیر اسی طاقت کے بل پر سلاطین کے منہ پر کہہ دیتا ہے۔ کہ میں تمہیں اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتا۔

جب امام ربانی مجدد الف ثانیؒ جہانگیر مے خوار کے دربار میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے بآواز بلند فرمایا:

"السلام علیکم!" کاسہ لیسانِ ازلی نے احتجاجاً کہا کہ "حضور خداوند عالم کو سجدہ کرو" آپ نے نہایت سختی کے لہجہ میں فرمایا: "سجدہ خدا کے علاوہ اور کسی کو سزاوار نہیں ہے اور میں خدا کے علاوہ اور کسی کو خداوند عالم یا اپنا خدا تسلیم نہیں کرتا۔"

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

اس اعلانِ حق کے دو سال بعد، اسی ہندوستان جنت نشان نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جہانگیر بایں ہمہ کرّوفر حضرت اقدسؒ کے قدموں میں گر کر، معافی کا طلبگار ہوا۔ لیکن اس وقت امر زیر بحث یہ ہے کہ ایک گدائے گوشہ نشین کے اندر یہ جرأت کہاں سے پیدا ہو گئی جو آج کل نہ کسی "آنریبل خان بہادر" میں نظر آتی ہے نہ "کے بی ای" میں۔ یہ قوت، جذب و سلوک یعنی عشق رسولؐ کی بدولت پیدا ہوتی ہے "میجری" یا "سرداری" سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو برگ حشیش ہے جس کو آج کل کے کوتاہ بین "شاخ نبات" سمجھتے ہیں۔

سوال مے نہ کروں ساقیٔ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

پہلا مرد فقیر جس نے پیشِ سلطان، نعرۂ 'لا ملوک' بلند کیا حسینؓ ابن علیؓ ہے یعنی انہوں نے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ لَا مُلُوْكِيَّتَ فِي الْإِسْلَامِ "THERE IS NO KINGSHIP IN ISLAM"

سلاطین تو در کنار، اسلام تو سلطنت ہی سے منکر ہے۔

سروری زیبا صرف اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

بر نیفتد ملتے اندر نبرد تا درو باقیست یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست سوز ما از شوق بے پروائے اوست
خویشتن را اندریں آئینہ بیں تا ترا بخشند سلطانِ مبیں
حکمت دیں، دل نوازی ہائے فقر
قوت دیں بے نیازی ہائے فقر

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک قوم میں ایک مرد درویش بھی باقی رہے وہ قوم ذلیل نہیں ہو سکتی اس کے دم سے ساری قوم دنیا کی نگاہوں میں معزز رہتی ہے اور وہ اپنی سیرت کی روحانی طاقت سے افراد کے دلوں کو گرماتا رہتا ہے پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کسی مرد فقیر کا دامن تھام لیں اور اس کی صحبت سے اپنے دل کو زندہ کریں تاکہ انہیں طاقت اور سروری حاصل ہو سکے۔

حکمت دیں اور قوت دیں، دونوں فقر کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔ جب مرد فقیر اپنی شانِ دل نوازی دکھاتا ہے تو، حقائق و معارف قرآنی کا دریا بہا دیتا ہے اور افراد قوم اس دریا سے سیراب ہو جاتے ہیں۔ اور جب مرد فقیر اپنی ادائے بے نیازی کا اظہار کرتا ہے تو بڑے بڑے سرکشوں کا سر نیچا کر دیتا ہے جس کی بنا پر دین کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

الغرض، دین کو ساری عزت اور طاقت، شہرت و ناموری فقر کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں   مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردشِ نہ آسماں   مسجدِ مومن بدستِ دیگراں
سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ آنحضرت صلعم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے۔ یعنی آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔"

اس حدیث سے دو مطلب نکلتے ہیں ایک تو ظاہری مطلب کہ دین اسلام رسوم و قیود ظاہری کا پابند نہیں ہے۔ نماز ادا کرنے کے لئے کسی خاص مقام کی قید نہیں ہے، مسلمان ہر جگہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر سکتا ہے۔ ہر جگہ، اپنے معبود کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔ دوسرا باطنی مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ خلافتِ ارضی کے حصول کے لئے کوشاں ہو تاکہ تمام روئے زمین حقیقی معنی میں مسجد بن جائے۔ ہر جگہ اللہ کا بول بالا ہو سکے، اور دنیا کے سامنے "لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ" کا نقشہ کھینچ سکے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے   (اقبال)

لیکن افسوس! صفتِ فقر سے محروم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان، جسے اس کے آقا نے تمام روئے زمین کو، مسجد کی شکل میں تبدیل کرنے کا حکم دیا تھا آج اس قدر بے کس اور محکوم ہو چکا ہے کہ جن مقامات کو اُس کے اسلاف نے مسجد بنایا تھا، جہاں انہوں نے برسوں نہیں بلکہ صدیوں نماز پڑھی تھی۔ وہ ان کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔

"مسجدِ مومن بدستِ دیگراں" ایسا مصرعہ ہے کہ اگر قوم زندہ ہوتی تو اسے پڑھ کر تڑپنے لگتی

نہیں میں نے غلط کہا۔ قوم زندہ ہوتی تو اقبالؒ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

خالصہ شمشیر و قرآں را بہ بُرد   اندراں کشور مسلمانی بمُرد

یہ شعر اقبالؒ نے ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں شمشیر و قرآن یعنی فقر سے محرومی کا نتیجہ یہ نکلا کہ فی الحقیقت مسجدِ مومن بدست دیگراں رفت اور آج اُس مسجد کے دروازہ پر جس کے میناروں سے ڈیڑھ سو برس تک اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی رہی یہ کتبہ جلی حروف میں آویزاں ہے:

"اس میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔"

قومی تذلیل کی اس سے بڑھ کر عبرت ناک تصویر شاید ہی کہیں نظر آ سکے لیکن یہ منظر فاطرِ ہستی کے ازلی دستور کے مطابق ہے۔ "گردشِ آسمان" کا ذکر حقیقت پر مبنی نہیں ہے محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی   شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

لیکن مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کریں مسجد واپس مل جائے گی۔

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی، مگو   ترک ایں دیر کہن تسخیر او

راکبش بودن از و وارستن است   از مقامِ آب و گل بر جستن است

صید مومن ایں جہان آب و گل

باز را گوئی کہ صید خود بہل؟

مسلمانوں میں تصوف کا غلط مفہوم رائج ہو جانے سے خصوصاً غیر اسلامی اقوام کے فلسفہ اور خیالات مثلاً ویدانت۔ سنیاس۔ رہبانیت اور وحدۃ الوجود سے متاثر ہو جانے کی بنا پر گزشتہ تین چار صدیوں سے ترکِ دنیا (RENUNCIATION) اور تیاگ کا گمراہ کن عقیدہ راہ

پا گیا ہے، اور وہ عام طور سے ان غیر اسلامی اصولوں کو جو سراسر قرآنی تعلیمات کی ضد ہیں، مستحسن خیال کرنے لگے ہیں۔ ان اصولوں کو اختیار کرنے سے تن آسانی پیدا ہوئی۔ اور تن آسانی، انسان کو مشکلاتِ زندگی کا مقابلہ کرنے کے بجائے، اُن سے گریز کرنا سکھاتی ہے۔ چنانچہ ہندی مسلمانوں کی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ، حقائق حیات اور مشکلات زندگی دونوں سے یکسر گریز کی ایک مسلسل اور عبرت ناک داستان ہے۔ اگر ہندی مسلمان، تن آسانی کے دلدادہ نہ ہوتے تو نہ لارڈ ولزلی اپنا محبوب "امدادی نظام" (SUBSIDIARY SYSTEM) ہندوستان میں رائج کر سکتا تھا۔ اور نہ نظام علی خان نظام حیدرآباد، اس طوقِ سعادت کو زیب گلو کرنا پسند کرتا اور نہ سلطان شہیدؒ کی امداد سے پہلو تہی کرتا۔

زندگی کی کشمکش سے گریز بظاہر بہت دلپذیر اور خوش آیند معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ابدی موت کا پیغام ہے جس طرح بخار کے مریض کو برف کا پانی بظاہر بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل سرسام کا باعث ہو کر اُسے موت کی آغوش میں سُلا دیتا ہے۔

گریزِ کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

تن آسانی اختیار کر کے انسان بظاہر زندہ بھی رہتا ہے اور بظاہر اس کا تخت و تاج بھی برقرار رہتا ہے اور اس کے ہمجنس اُسے "یور ہائینس" اور "یور مجسٹی" سے خطاب بھی کرتے ہیں، لیکن

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ (جاوید نامہ)
کورِ ذوق و نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش (زبور عجم)

یہ زندگی، یہ ساز و سامان اور یہ خطابات سب مہمل اور بے معنی اشیاء ہیں کسی زندہ فرد یا قوم کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے یقین نہ آئے تو سلطان ٹیپو شہید کی تربت سے دریافت کریجئے جس کے سنگین اور فولادی لبوں سے آج بھی یہ صدا آرہی ہے۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دم شیری بہ از صد سال میش (جاوید نامہ)

پس مسلمانوں کو "ترک دنیا" کا عقیدہ ترک کر دینا چاہیئے۔ ترک دنیا کا غیر اسلامی یا جاہلی مفہوم یہ ہے کہ جدوجہد اور کشمکش سعی پیہم اور کوشش یعنی عمل سے کنارہ کش ہو کر کسی خانقاہ میں گوشہ گیر ہو جانا چاہئے۔
لیکن قرآن اس نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ممکن نہیں تعمیر خودی خانقاہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

ترک دنیا کا اسلامی مفہوم یہ ہے کہ دنیا کو مسخر کیا جائے غایت تخلیق آدم ہی تسخیر عالم ہے تاکہ کائنات پر حکمران ہو سکے قرآن تو اسے "خلیفۃ اللہ علی الارض" کہتا ہے پس اگر وہ "ترک عالم" اختیار کرے تو تسخیر عالم کون کریگا؟

اسی لئے علامہؒ فرماتے ہیں کہ ع ترک ایں دیر کہن تسخیر او

اگر "دنیا کے پھندے" سے نکلنا مقصود ہے تو اس کو ترک مت کرو بلکہ اسے اپنا خادم یا محکوم بنا لو ترک عالم، راہ فرار اختیار کرنے کا نام نہیں، یہ تو بزدلی اور دوں ہمتی ہے یہ تو، کوتاہ بینوں اور کمزور انسانوں کا کام ہے اور ناقص العقل انسانوں کا وظیفہ ہے۔

اگر حقیقی معنی میں اس دنیا پر لات مارنا چاہتے ہو تو خواہشات نفس (مقام آب و گل) کو اپنے اختیار میں لے آؤ، ان پر غالب آجاؤ یعنی مادیات سے بالاتر ہو جاؤ، اپنا زاویۂ نگاہ روحانی (CONTRO

بنالو۔ پھر یہ ہوگا ہفت اقلیم زیرنگیں ہوگی لیکن صرف ایک بوریے اور ایک جَو کی روٹی پر قناعت کرسکو گے۔

لطف اس میں نہیں کہ انسان نعمائے عالم سے یکسر محروم ہو جائے اور گدایانہ زندگی بسر کرے جملہ نعماء کو اپنی قوتِ بازو سے اور سعی مردانہ سے حاصل کرے، پھر اُن کو حقیر اور ادنیٰ سمجھ کر ٹھکرا دے اور ہمیشہ قائم رہنے والی نعمت یعنی عشقِ الٰہی کو دل میں جگہ دے۔

مثال کے طور پر حضرت عالمگیرؒ کی پاکیزہ زندگی پر غور کیجئے۔ قندھار سے لیکر آسام تک اور کشمیر سے لیکر میسور تک اُنکے نام کا سکّہ رواں تھا خزانہ میں کروڑوں روپیہ جمع تھا لیکن اس مردِ مومن نے ہمیشہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر شکم پری اور تن پوشی کا سامان مہیّا کیا یہ ہے اسلامی اندازِ ترکِ دُنیا کا۔

مذہبی تعصبات اور قومی میلانات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ترکِ دنیا کا اسلامی اصول دیدانتی یا غیر اسلامی اصول سے بدرجہا بالا تر ہے۔ ایک پیدائشی نامرد اگر کسی شخص سے یہ کہے کہ مَیں نے ساری عمر زنا نہیں کیا تو کوئی شخص اس کو لائقِ تحسین سمجھ سکتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس میں تو اس فعل کی قابلیت ہی نہیں! ندریں حالات اگر اجتناب کیا تو کمال کیا ہے؟ لائقِ تحسین تو وہ شخص ہے جو باوجود قدرت اپنے نفس پر اسقدر قابو رکھتا ہو کہ اللہ کی خوشنودی کیلئے اس فعلِ قبیح سے احتراز کرے۔

اسی طرح ایک گدائے گوشہ نشین یہ دعویٰ کرے کہ مَیں نے کبھی تکبّر یا اسراف نہیں کیا کسی پر ظلم و ستم نہیں کیا سادہ لباس اور سادہ غذا پر اکتفا کیا ہر شخص سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا تو یہ کوئی لائقِ تحسین بات نہیں، سب جانتے ہیں کہ اس میں تکبّر اور اسراف کی قدرت ہی نہیں کسی کو ستانے کی طاقت ہی نہیں، زربفت اور کمخواب زیبِ تن کرنے اور مفرح یاقوتی یا نوشدارو سے لولوی کھانے کی صلاحیت ہی نہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب لکھا ہے ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ترک دنیا حقیقی معنی میں حضرت عمر فاروقؓ۔ عمر بن عبدالعزیزؒ، سلطان ناصرالدین محمودؒ اور حضرت عالمگیرؒ نے کر کے دکھائی کہ تخت شاہی کے باوجود، بوریہ نشینی اختیار کی۔

الغرض اس وقت مسلمانوں کو ترک عالم کے اسلامی مفہوم سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے جو یہ ہے کہ اس کائنات کو مسخر کر کے اسکی ساری نعمتوں پر اقتدار حاصل کر کے پھر انکو اللہ کی رضا جوئی کیلئے ترک کیا جائے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کائنات بنائی ہی اس لئے گئی ہے کہ وہ اسے مسخر کریں چنانچہ آیۂ قرآنی وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اس پر شاہد ہے یعنی یہ جہان آب و گل مومن کا شکار رہے اور جو شخص خواہ شنکراچاریہ ہو یا ابن عربی مسلمانوں کو ویراگ تیاگ یا رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ انکو گویا ایسی بات کی تلقین کرتا ہے جو انکی فطرت کے خلاف ہے اور اس لئے لازمی طور سے مضر اور غیر اسلامی ہے پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص باز یا شاہین کو یہ "اپدیش" دے کہ اپنی چونچ اور ناخن کٹوا ڈالو۔ اور "ساگ پات" پر گزارہ کرو ظاہر ہے کہ یہ مشورہ فاختہ اور قمری کیلئے تو قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن شاہین اور باز کیلئے تو سراسر پیغام موت ہے ؎

حل نشد ایں معنیٔ مشکل مرا   شاہیں از افلاک بگریزد چرا؟
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد   مرغکے از چنگ او نامد بدرد
در کنارے ماند زار و سرنگوں   پر نزد اندر فضائے نیلگوں

اب علامہؒ مسلمانان ہند کی موجودہ طرز زندگی پر اظہار حیرانی فرماتے ہیں کہ باوجود تفکر و تامل بسیار میں آجتک اس راز کو نہ سمجھ سکا کہ مسلمان جو اپنے نام، افتاد طبع، طریق حیات اور روایات ملی غرضیکہ ہر پہلو سے "شاہین" ہے وہ شاہینی سے کیوں کنارہ کش ہو گیا؟ اہنسا، رہبانیت، ترک عالم، تیاگ، ویراگ، مادہ اور عورت کو ناپاک سمجھنا بدی کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ بدوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا قرآن ان ساری باتوں کی مذمت کرتا ہے۔ پھر یہ گوسفندی فلسفہ یہ ویدانتی طریقہ یہ گدایانہ روش، یہ غیر اسلامی ذہنیت انہیں کہاں سے پیدا ہو گئی؟ شاہین تو پیدا ہی

اسلئے ہوا ہے کہ وہ ساری عمر فضائے کائنات میں طیران کرتا رہے اور مرغ و ماہی کو شکار کرتا رہے پرواز اور شکار یہ دونوں باتیں اسکی طبیعت ثانیہ نہیں بلکہ فطرت اصلیہ ہیں۔ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مسلمان نہ پرواز کی طرف مائل ہے نہ شکار کی طرف بلکہ حالت یہ ہے کہ امراء اور عوام، دونوں نے رقصِ عریاں مقصودِ حیات بنا لیا ہے۔ دولتمند افراد تو اپنے نفس کی عارضی تسکین کیلئے دخترانِ حوّا کو بذریعہ طیارہ لندن اور پیرس سے کرایہ پر منگواتے ہیں اور پرائیویٹ مخلوق میں ان "زندہ پریوں" کا ناچ دیکھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کو راضی کرتے ہیں اور مفلس افراد انہی ماہ وشوں کی متحرک تصاویر "پردۂ سیمیں" پر دیکھ کر اپنے قلوب بے نور کی مسرت کا سامان بہم پہنچا لیتے ہیں۔

منتہائے فکر دونوں کا ایک ہی ہے یعنی عورت۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری قوم کے افراد دانشمند ضرور ہیں اس رنگین گناہ کا کفارہ ادا کرنے کیلئے وہی دولتمند عشرۂ محرم میں اپنے یہاں مجالس حسینیؓ برپا کرا لیتے ہیں اور عوام کالانعام ان مجالس میں سینہ کوبی کر کے اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

مسلمانوں نے جنّت کو بھی کس قدر ارزاں تصوّر کر رکھا ہے نہ نماز نہ روزہ نہ فاروقیت نہ کرارّیت نہ جہاد نہ تقویٰ بس سال پیچھے ایک ذوالجناح کا جلوس اور ایک معراج النبی کا جلوس مرتب کر لیا اور جنّت کے حقدار بن گئے، حالانکہ قرآن میں اس جنس عالیہ کی قیمت اس کی دولت ہی نہیں بلکہ دولت اور جان دونوں چیزیں ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (التوبہ)

ترجمہ از حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ:۔ ہر آئینہ خدا خریدہ کردہ است از مسلماناں جان ایشاں و مال ایشاں را بعوض آنکہ ایشاں را باشد بہشت۔ جنگ می کنند در راہِ خدا پس می کشند و کشتہ می شوند وعدہ کہ لازم است بر خدا بتحقیق در تورات و انجیل و قرآن۔ و کیست وفا کنندہ تر بعہد خویش از خدا پس شادماں باشید باین فروختن خود کہ معاملہ کردید بآں و ایں است فیروزی بزرگ۔

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد (۷)	ستمبر ۱۹۴۲ء	عدد ۳

سخنہائے گفتنی	سید محمد شاہ ایم۔ اے	۲
وَمِن شَرِّ مَا خَلَقَ	ماخوذ	۹
مطالب القرآن	سید محمد شاہ ایم۔ اے	۳۳

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

جدید عربی کالج

ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک عربی کالج کا "کلیۃ اللغۃ العربیۃ" کے نام سے لاہور میں افتتاح کر دیا ہے اسی شمارہ میں آپ کسی جگہ اس کا اشتہار ملاحظہ کریں گے۔ جیسا کہ اس اشتہار سے واضح ہوگا ہم نے اس کالج کو اس لئے قائم کیا ہے کہ مسلمان حضرات عربی زبان سے کم از کم اس حد تک آشنا ہو جائیں جس حد تک کہ وہ اس کے ذریعہ سے قرآن حکیم کو بغیر کسی دوسرے کی مدد کے پوری آسانی کے ساتھ خود سمجھ سکیں۔

لیکن ہمارے عزائم کی دنیا اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہم اس سلسلۂ تعلیم کو سارے ملک کے اندر پھیلا دینا چاہتے ہیں اور اس کلیۃ اللغۃ العربیۃ کو جسے آج ہم نے نمونہ کے طور پر شہر لاہور کے اندر قائم کیا ہے جامعہ ازہر کا سا بلند پایہ "دار العلوم" بنا دینا چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ بلند پایہ عزم اپنی تکمیل کا منہ اسی وقت دیکھ سکتا ہے جبکہ ہم اپنے اس جدید طرز تعلیم کی شاخیں جا بجا طول و عرض ملک میں پھیلا سکیں، اس کے لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ کلیۃ میں ایک ایسا درجہ بھی قائم کیا جائے جس میں ایسے افراد کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جو کہ "ادارہ کلیۃ" کو اپنا مرکز مان کر اسی طرز جدید کے کلیے اکالج ہر بڑے شہر میں قائم کرتے چلے جائیں اس ضروری کام کو انجام دینے کے لئے ہم ان افراد کو دعوت

دیتے ہیں جو زبان عربی کے مبلغ بن کر ایسے کلیتوں کی پروفیسری کے امیدوار بننا چاہتے ہوں۔

ہم نے مقامی حیثیت سے جو کام اس وقت تک شروع کیا ہے وہ دو درجوں پر مشتمل ہے پہلا درجہ ابتدائی ہے اور دوسرا درجہ اعلیٰ، ابتدائی درجہ میں ایسے تمام طلبار تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جو عربی زبان کو ابتدار سے شروع کرنا چاہتے ہیں مگر اعلیٰ درجہ میں صرف ایسے طلبار کی گنجائش ہے جو عربی زبان میں اعلیٰ پایہ کی مہارت حاصل کرنا چاہتے ہوں ایسے طلبار کے لئے عربی زبان کا تھوڑا بہت جاننا پہلے سے ضروری ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس جدید کالج کے طرز طریق تعلیم کے متعلق اپنے قارئین کو مستحضر کریں ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ کالج ہم نے بڑی عمر کے اشخاص کی سہولت کے لئے قائم کیا ہے یعنی اس میں چھوٹے بچوں کی تعلیم کا انتظام فی الحال موجود نہیں ہے بلکہ ملازم پیشہ اور دیگر کاروباری مشغولیتیں رکھنے والے اشخاص کو تعلیم دینا اس کا بنائے مقصد ہے جن کی دین داری اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ اپنے اندر دین کی سمجھ پیدا کرنے کے لئے قرآن حکیم کے منشار و مقصود کو خود اس کے صفحات سے سمجھیں یا زبان عربی میں اس حد تک مہارت حاصل کریں جو آزادانہ بول چال اور تحریر و تقریر کی ضمانت کر سکے، لہٰذا اس کے قیام کے شروع ہی میں جو طلبار اس میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے تقریباً تمام کے تمام یا تو گورنمنٹ کے محکموں میں ملازم ہیں یا کاروباری مشاغل رکھتے ہیں اور اکثریت ان میں ان انگریزی داں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے جن کے متعلق نہایت غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ دین سے بے پرواہ یا بے بہرہ ہو چکے ہیں، ہم ملت کے افراد کے اندر اس احساسِ دینی کے لئے اپنے خالق و پروردگار کے شکر گذار ہیں۔

ہمارا طریق تعلیم بالکل جدید اور انوکھا ہے، ہندوستان کے اندر اب تک عربی زبان کے حاصل کرنے کا جو اصول و قاعدہ رائج ہے وہ اتنا ناقص ہے کہ سالہائے دراز کی محنت و کاوش کے بعد

بھی ایک طالب علم نہ عربی زبان بول سکتا ہے اور نہ کسی استادانہ مہارت کے ساتھ اسے ضبط تحریر میں لا سکتا ہے ہم ایسے ناقص طریق تعلیم کے حق میں بالکل نہیں ہیں۔

یوروپ کے جن مستشرقین نے عربی علوم کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے یا جنہیں اور امور کے تعلق سے عربی زبان میں واسطہ رہا ہے انہوں نے برسوں کی موشگافیوں کے بعد عربی زبان کو سیکھنے اور اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے نہایت ہی سہل الحصول گر اور اصول وضع کئے ہیں انہوں نے اس میدان میں جو کچھ تفحص و جستجو کی ہے وہ ہمارے سامنے ہے قاہرہ کے دارالعلوم "جامعہ ازہر" کا طریق تعلیم بھی اپنی انتہائی تفصیلات کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے ہم نے اس سارے مجموعہ سے استفادہ کر کے اپنے ملکی حالات کی مناسبت سے ایک ایسا طریق اخذ کیا ہے جو انشاء اللہ تعالی صرف ایک سال کی قلیل مدت میں ابتدائی درجہ کے طلباء کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ قرآن حکیم اور دیگر کتب دینی کو بغیر کسی دقت کے مطالعہ کر سکیں اور ان کے مفہوم اور مطالب کو بغیر کسی کی مدد کے خود سمجھ سکیں درحقیقت اگر ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے تو یہ ایک قسم کا تعلیمی انقلاب ہوگا۔

ہمیں اس قسم کے تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے اسلام کے منشاء و مقصود کو سمجھنا ہمارے لئے ضروری ہے ملت اسلامیہ کے وہ تمام افراد جو دین اسلام کا احساس و شعور رکھتے ہیں ان کے ذمہ یہ اولین فرض عائد ہے کہ وہ قرون اولی کی روح میں قرآن کو سمجھیں اور اسے عملی کرنے کی اس دنیا کے اندر کوشش کریں۔ اس لئے ہم آج ایسے ہی افراد سے مخاطب ہوئے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق ایک اہم اقدام کیا ہے آپ ہمارے اس اقدام میں ہماری معاونت کریں اور اپنے علاقوں سے ایسے افراد بھیجیں جو اس جدید طریق تعلیم کو یہاں آ کر ہم سے سیکھیں اور پھر اپنے مقامات کو لوٹ جائیں اور وہاں اسی طرز کے کالج یعنی کالج قائم کریں۔

آپ سے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دور کے مادی ہنگاموں میں اس کام کی تکمیل کا بیڑا جو

اٹھا سکتے ہیں وہ آپ کی ملت کے وہ غریب افراد ہیں جو دینی تعلیم و تعلم کو اپنی زندگی کا وسیلہ بنا چکے ہیں ان افراد کو آپ کی مالی معاونت کی بھی ضرورت ہوگی لہذا آپ جب "کلیۃ اللغۃ العربیہ" کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے ایسے افراد کو چنیں تو آپ ان کے کچھ وظائف بھی ساتھ ہی مقرر کر دیں تاکہ وہ اس کالج کی ٹریننگ اور اپنی مسافرت کے اخراجات کے کفیل بن سکیں۔

ہم نے ایسے درجہ کے لئے جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے صرف چھ ماہ کا کورس مقرر کیا ہے اس درجہ میں صرف وہ اشخاص لئے جائیں گے جو اپنے طور پر ملک کی مذہبی درسگاہوں میں کسی حد تک اپنی مذہبی تعلیم کا اکمال کر چکے ہوں، ایسے افراد کے لئے لازم ہے کہ وہ ہمارے اس اعلان کو پڑھ کر اپنی درخواستیں ہمارے پاس بھیج دیں اور ساتھ ہی اپنے مقامات کے اہل خیر حضرات کی طرف رجوع کریں کہ وہ براہ راست "کلیۃ" سے اپنا تعلق پیدا کر کے ان کے ماہواری اخراجات کے کفیل بنیں۔

ہم اپنی طرف سے بھی کوشش کریں گے کہ اہل خیر حضرات کو اس کار خیر کی طرف متوجہ کریں اور ہمارے پاس اس شق کے ماتحت جو فنڈ جمع ہوں گے ہم وقتاً فوقتاً "پیغام حق" کے ذریعہ سے اس کا اعلان کرتے رہیں گے اور "کلیۃ" کے اقدامات اور اس کی ترقی سے بھی اپنے قارئین کو ہمیشہ مستحضر کئے رکھیں گے

اوقات تعلیم:۔ درجہ اعلےٰ کے طلبار پانچ بجے سہ پہر سے کر مغرب کی نماز کے وقت تک تعلیم حاصل کرتے ہیں اور درجہ ابتدائی کے طلبار کی تعلیم کا وقت نماز مغرب کے بعد سے پونے نو بجے رات تک کا ہے،

فیس اور داخلہ:۔ طلبار سے داخلہ کچھ نہیں لیا جاتا ابتدائی درجہ کی فیس دو روپے ماہوار اور درجہ اعلیٰ کی فیس پانچ روپے ماہوار ہے۔

ہوسٹل:۔ درجہ اساتذہ کی رہائش کا انتظام "کلیۃ" کی طرف سے کیا جائے گا ہوسٹل کی نگرانی کے لئے کلیۃ کے سیکرٹری ذمہ دار ہوں گے، ہر طالب علم کو صرف ایک روپیہ ماہواری فیس اور مبلغ پندرہ روپیہ ہوسٹل کا خرچ ادا کرنا لازمی ہوگا دونوں وقت کا کھانا صبح کا ناشتہ اور چائے عصری مہیا کی جائے گی بستر طلبار کے اپنے ہوں گے البتہ چارپائیاں ادارہ کی طرف سے مہیا کی جائیں گی۔

کلیات البنات

لڑکوں کی عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی عربی تعلیم بھی بہت زیادہ ضروری ہے۔ ہماری بچیاں انگریزی تعلیم کے مسموم اثرات سے جس طرح متاثر ہو رہی ہیں وہ ہم سب پر عیاں ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس خصوص میں بھی پوری توجہ سے کام کریں اور بچیوں کو کم از کم اتنی عربی زبان سکھا دیں کہ وہ قرآن مجید کے مفہوم کو بلا تکلف سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔

اناث کی درسگاہوں کا مسئلہ بہت مشکل سے حل ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے سر دست یہ انتظام کیا ہے کہ جناح کالج فار گرلز کے منتظمین اپنے کالج کی تمام طالبات کے لئے عربی پڑھنا لازمی قرار نہ دیں۔ کوئی لڑکی فارسی نہ پڑھے۔ علاوہ ازیں پروفیسر محمد حسن الاعظمی ہر روز ایک گھنٹہ جناح کالج فار گرلز میں عربی پڑھایا کریں گے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس سے کلیات البنات کے کام کی ابتدا کی جائے۔

ان عربی کالجوں کے لئے ہم نصاب تعلیم تیار کر رہے ہیں اور عربی زبا ندانی پر چند ریڈریں ہم نے تیار کر لی ہیں۔ قرأۃ الاعظمیہ کے نام سے ان ریڈروں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا آسان اردو میں جو مفہوم میں نے "مطالب القرآن" کے نام سے لکھنا شروع کیا ہے اس کے تیس صفحے فروری اور مارچ ۱۹۶۲ء کے پرچوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مارچ کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رکھا جا سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر اس پرچے میں میں نے چوبیس صفحے مطالب القرآن کے شائع کر دیئے ہیں اور آئندہ انشاء اللہ العزیز پندرہ سولہ صفحے ہر ماہ شائع کرتا رہوں گا۔

گو ان مطالب کا عربی متن شائع نہیں ہو رہا تاہم آیات کے نمبر دے دیئے گئے ہیں تاکہ اگر کوئی صاحب متن سے مراجعت کرنا چاہیں تو ان کو کوئی دقت نہ ہو۔

ہم اپنے پیغام حق کے قارئین کو یہ مژدۂ جاں فزا سنا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری پرانی

مصروفیتوں کو بعض نئی مصروفیتوں سے بدل دیا ہے۔ اس سے پہلے آپ ادبی صفحات سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ ہم نے شہر لاہور میں عربی زبان کے تعلیم و تعلم کے لئے ایک عربی کالج قائم کیا ہے جس کا نام ہم نے "کلیۃ اللغت العربیہ" رکھا ہے۔ ہمارا دوسرا اقدام "پیغام حق" کی حُدی خوانی کو تیز تر کرنا ہے۔ ہم جس منزل کے مسافر ہیں ہمارے قارئین اس سے بخوبی آگاہ ہیں ہم نے آج تک پیغام حق کے صفحات کے ذریعے اقبال کے اسلامی فلسفہ کی تشریح و توضیح کی ہے مگر آج کے بعد ہمیں یہ توفیق بھی میسر آ رہی ہے کہ ہم آپ کے سامنے اسلام کی ٹھوس حقیقتوں کو ایک بالکل ہی نئے پیرائے میں پیش کریں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ دنیا کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں ہم بھی ان کی اس گفتار میں شامل ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہاں دنیا کے حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں مگر ہم اتنا اضافہ اور کئے دیتے ہیں کہ حالات کی یہ تبدیلی ایک نہایت ہی عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اس وقت دنیا کی مادی قوتوں کے درمیان جو زبردست تصادم رونما ہے یقینی طور پر اس کا ایک ردّعمل ہوگا۔ لوگ مادیت سے اُکتا جائیں گے اور کسی روحانی منزل میں پناہ ڈھونڈھنا چاہیں گے لیکن اگر کوئی ایسی منزل ان کے لئے پیشتر سے تیار نہ ہوگی جہاں وہ اپنی بیتاب روح کو تسکین دے سکیں تو یقیناً انہیں ضلالت کی پرخار وادیوں میں ابھی اور بھٹکنا پڑے گا۔ دنیائے انسانیت کو اس ضلالت سے بچانے کے لئے مدعیان اسلام کا فرض ہے کہ وہ اسلام کو اپنی اصل شکل و صورت میں اقوام عالم کے سامنے پیش کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کا تصور حیات نہایت منقح ہو کر ہمارے سامنے آجائے اور ہم بحیثیت ملت اس جدوجہد میں لگ جائیں کہ اسی تصور حیات کے مطابق ہم اپنی زندگیاں گزاریں گے اور اسی تصور کو اقوام عالم میں مقبول کرانے کی کوشش کریں گے۔

ہمارے خیال میں اگر مسلمانان ہندوستان قرآن مجید کی زبان یعنی زبان عربی کو اس غرض سے سیکھیں کہ اس کے ذریعے انہیں اسلام کا تصور حیات معلوم کرنا ہے انہیں قرآن مجید کی تعلیمات سے واقف ہو کر اس پر عمل پیرا ہونا ہے، انہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کے مطابق اپنی زندگیاں

ڈھالنا ہے، انہیں تہذیب و تمدن اسلامی کو دوبارہ ہندوستان میں زندہ کرنا ہے، تو ممکن ہے کہ وہ نہ صرف خود موجودہ قعر ذلت سے نکل جائیں گے بلکہ اقوام عالم کو بھی ضلالت کے گڑھوں سے نکال کر رشد و ہدایت کی بلندیوں پر لاکر کھڑا کر دیں گے۔ اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ آپ خود بھی عربی زبان سیکھیں اور اپنے بچوں کو بھی عربی زبان سکھائیں۔ عربی کے مقابلے پر جو زبانیں آتی ہیں ان کو نظر انداز کریں۔ عام طور پر اسکولوں میں فارسی زبان پڑھی پڑھائی جاتی ہے اس کو چھوڑ دیجئے اور اس کی جگہ عربی پڑھائیے۔ اور جا بجا اس طرح کی درسگاہیں قائم کیجئے اور عربی زبان کو یہاں تک ترقی دیجئے کہ جس طرح ہندو نے پنجاب میں ایک دس سال کے اندر جا بجا ہندی کے اخبارات، ہندی کے رسائل ہندی کے مدارس قائم کر دیئے اسی طرح آپ بھی پنجاب میں عربی زبان کا ڈنکا بجا دیجئے۔ خدا آپ کا ڈنکا بجائے گا۔

علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تصنیفات

بانگ درا	مجلد	۳ روپے ۸/	فلسفۂ عجم	بے جلد	۲/۸
ضرب کلیم	مجلد	۲/۸	اقبال کا مطالعہ	مجلد	۲/۸
مثنوی اسرار و رموز	مجلد	۲/۱۲	جوہر اقبال	مجلد	عہ/
پیام مشرق	مجلد	للعہ/	تعلیمات اقبال	بے جلد	عہ/
ارمغان حجاز	مجلد	۳ روپے ۸/	محمد عبدہ	بے جلد	۱۲/
بال جبریل	مجلد	۱ روپے ۸/	علمائے کرام کا مستقبل		۴/

ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور

وَمِن شَرِّ مَا خَلَقَ

(اقتباس از مسودہ "قرآن حکیم کا اُردو مفہوم" مؤلفہ رفیق عزیز ہندی)

یہ آیت ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے۔ پیغمبرؐ ہر اُس چیز کی بُرائی سے پناہ طلب کر رہا ہے جو یہاں خدا نے پیدا کر رکھی ہے۔ گویا خدا کی ہر پیدا کردہ چیز میں کوئی نہ کوئی شر یا بُرائی موجود ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یہ کہ خُدا نے کوئی چیز یہاں ایسی پیدا نہیں کی جس میں بُرائی یا شر کا عنصر موجود نہ ہو۔ ہاں اسلامی نظریۂ حیات یہی ہے کہ خدا خیر اور شر دونوں کا خالق ہے۔ اور ہر چیز جو اس کائنات میں جلوہ دیتی ہے اپنے اندر خیر و شر کے دونو پہلو رکھتی ہے لیکن کسی چیز کے اندر خیر اور شر کی یہ دونو صفات اس وقت تک بیکار اور معطل پڑی رہتی ہیں جس وقت تک انسان اُن کو حرکت میں نہیں لاتا۔ اور جب وہ حرکت میں آتی ہیں تو اپنی اچھی یا بُری تاثیرات کو عین اسی محل میں ظاہر کرتی ہیں جس محل میں انسان کی نیت یا غرض ہوتی ہے۔ اب اگر یہ نیت اور غرض خیر کا پہلو لئے ہوئے ہے تو جس شئے یا وجود پر عمل ہو رہا ہے وہ خیر کو پیدا کریگی اور اگر شر کا پہلو موجود ہے تو پھر اس فعل و حرکت کا نتیجہ شر کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ خود اشیا کے وجود کے اندر خیر و شر کے عناصر کا موجود ہونا خیر و شر کو اس عالم کے اندر پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی تمام تر ذمّہ داری انسان کی فعّالیّت پر ہے۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے کہ اس عالم کی ہر ایک شے انسان کے تابع کر دی گئی ہے اور ہم انسان اُس حقیقت کو روز بروز اپنے تجربوں سے نمایاں اور آشکارا دیکھ رہے ہیں۔ ایک پلے ہوئے کتے کو اگر تم غصہ دلاؤ گے تو وہ تمہیں کاٹ کھائیگا۔ اور اگر ایک جنگلی شیر کی نفسیات کا علم حاصل کر کے اُسے تم چابکوں سے بھی مارو گے تو وہ تمہیں کچھ نہ کہے گا۔ اس طرح عالم وجود کی ہر ایک شئے پر نظر ڈالتے جاؤ

وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اسی حقیقت کو پیش کریگی - انسان اس عالم میں ایک فعّال اور بالارادہ ہستی ہے اور اس حیثیت اور صفت میں کوئی اور اس کا ہمسر اور متقابل نہیں، اگر وہ یہاں اشیاء وجود سے خیر پیدا کرنا چاہے تو خیر پیدا کر سکتا ہے اور اگر شر پیدا کرنا چاہے تو شر کو وجود میں لا سکتا ہے خیر و شر کے دونوں راستے اُس کے سامنے کُھلے ہُوئے ہیں - اور وہ ان دونوں میں سے کسی کو اپنی مرضی سے اختیار کر سکتا ہے - اگر اس رعایت سے دیکھا جائے تو انسان اس عالم کے اندر ایک فاعل مختار ہستی ہے۔

فاعل مختار ان معنوں میں نہیں کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے بلکہ صرف ان معنوں میں کہ جب خیر و شر کے دونوں پہلو اس کے سامنے ہوں تو وہ کسی ایک کو اختیار کر سکتا ہے - اب اگر یہ کہا جائے کہ خیر کے ساتھ شر کو کیوں موجود رکھا گیا ہے تو اس کا نہایت سادہ جواب یہ ہے کہ جس ڈھب پر اس کائنات کو ڈھالا گیا ہے اس کا اساس اس خیر و شر کی متقابل قوتوں پر ہے - زندگی جو محض عدم سے وجود میں آئی ہے انہی متقابل قوتوں کا ایک فعل ہے اور خالق کائنات جو ان قوتوں کا فاعل اول ہے انہی متقابل قوتوں کے زور و اثر سے اسے کامل کرنے کا ارادہ کر چکا ہے +

خالق کائنات کا ارادہ اُس کے منشائے تخلیق پر موقوف ہے اور اُس کا منشائے تخلیق یہ ہے کہ زندگی کو عدم کے نقطہ سے شروع کر کے کمال کے نقطہ تک لے جائے - اگر وہ چاہتا تو زندگی کو کمال کے نقطہ سے بھی شروع کر سکتا تھا - مگر اس نے ایسا نہیں چاہا - ولو شاء لھدٰکم اجمعین - یعنی - اگر وہ چاہتا تو وہ تم سب کو ہدایت دے دیتا کمال کے نقطہ سے زندگی کو شروع کرنے کا یہ مقصد ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی منوال پر رہے اور اس میں تغیر و تبدل کا قانون جاری نہ ہو - ایسی زندگی کے لیے ایک بالکل ہی نئے عالم اور نئے ماحول کی ضرورت ہے اور ہم کو یہ خبر دی گئی ہے کہ ہمارا موجودہ عالم اور موجودہ ماحول جس میں تغیر و تبدل کا قانون جاری ہے ایک نئے عالم اور نئے ماحول میں تبدیل ہو جانے والا ہے اس نئے عالم اور نئے ماحول کو آخرت کے عالم کا نام دیا گیا ہے اور ہم زندگی کے نقطۂ کمال تک پہنچنے کے لئے اس عالم میں سے ہو کر گذرنے والے ہیں اور یہ جو آخرت کے عالم میں جنت و

دوزخ کے نقطے ہیں۔ یہ وہ مقام ہیں جہاں سے زندگی اپنے نقطہ کمال کی طرف ہو کر گذرے گی۔ آخرت کی زندگی کو محض جنت و دوزخ کے عالموں تک محدود کر لینا غالباً صحیح نہیں۔ اور اگرچہ قرآن کریم جنت دوزخ کی کیفیات کے ماورائے عالم آخرت کی وسعتوں پر ہمارے علم میں چنداں اضافہ نہیں کرتا تاہم جنتیوں کے احوال میں زندگی کے مزید درجات کا ذکر موجود ہے اور ہم نے پیچھے کسی جگہ الی ربك منتہیٰ کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ قرآن جنت و دوزخ کے عالموں کے اختتام کی طرف بھی ایک صاف اشارہ کرتا ہے اور احادیث نبوی سے بھی یہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک دن دوزخ پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ وہ اپنے اندر کچھ بھی نہ رکھتا ہوگا +

لیکن اس سوال کا حل کہ اس نے ایسا کیوں نہیں چاہا کہ زندگی کو شروع ہی سے ایک کامل صورت میں پیدا کرتا۔ اس بے انتہا وسیع کائنات کے اندر ہمارے اپنے علم و معلومات کی وسعت پر موقوف ہے اور گو ہمارا علم نہایت ہی قلیل ہے تاہم ان ظنیات کو یقین سے بدلنے کے قرائن موجود ہیں کہ اس آفاق ہستی کے دیگر کروں میں ایسی مخلوق بھی آباد ہو سکتی ہے جو ہم سے بدرجہا لطیف اور کامل تر ہو۔ کرۂ مریخ کے متعلق اگر سائینسدانوں کے افسانے صحیح ثابت ہو جائیں تو انسانی وسعت اور معلومات کا دائرہ اس حد تک وسیع ہو جا سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے دوسرے کرہ کی بھی دریافت کر سکیں۔ جہاں زندگی کرۂ مریخ سے بھی زیادہ لطیف تر موجود ہو اور چونکہ ہم کو زمان و مکان کی لامحدود وسعتوں پر کوئی عبور حاصل نہیں اس لئے ہم کسی قطعی ثبوت اور حجت کے ساتھ کہہ نہیں سکتے کہ کوئی ایسی کامل زندگی جو انسان کا آخری مقدر ہے اس پردہ کائنات پر موجود ہی نہیں۔ اور جب ہم اس اونچے تخیل سے نظر ہٹا کر خود اپنے کرۂ زمین کی طرف دیکھتے ہیں جہاں حقیر ترین حشرات الارض سے لے کر اشرف ترین انسان تک کی لکھو کھا انواع کا ایک سلسلہ قائم ہے تو ہم زندگی کے سلسلہ وار مدارج کو ایک اہتمام کے ساتھ مرتب پاتے ہیں پھر تو نہیں سکتا کہ جہاں زندگی کو ایک کھلتے ہوئے گانے سے شروع کیا گیا ہو اور اُسے بنات الارض کی طرح اُگا کر حشرات الارض حیوانات اور عالم انسانی

تک ممتد کیا گیا ہے اس کے مزید تسلسل کو یہیں ختم کر دیا جائے اور آگے بڑھنے ہی نہ دیا جائے۔

خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم ثم یُمِیتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ؀ **ترجمہ** تم کس طرح سے اُس ذات الٰہی کے منکر ہو سکتے ہو۔ حالانکہ تم محض عدم میں تھے اور اُس نے تمہیں زندہ کر دیا۔ پھر وہی تمہیں مارتا ہے اور وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم آخرکار اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

یہ اس آیت میں آخرکار اُسی کی طرف لوٹ جانا، جو ہے قرآن بار بار اس کی طرف توجہ دلاتا ہے عام طور پر اس کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک دفعہ مر کر پھر زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن اگر فکر کو تھوڑا سا اور جولان کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا، وہ نقطہ عدم ہے جہاں سے ہماری زندگی شروع ہوتی ہے" فَاَحْیَاکُمْ" ہماری زندگی کا موجودہ عالم ہے" ثُمَّ یُمِیتُکُمْ" وہ عالم ہے جہاں ہم مرنے کے بعد رہیں گے۔" ثُمَّ یُحْیِیکُمْ" وہ عالم ہے جس کو ہم قیامت کا عالم کہتے ہیں۔ اور ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ؀ زندگی کا وہ آخری عالم ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

اب زمان و مکان کی وسعتیں اگر لاانتہا ہوں تو کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے کئی عالم اب تک پیدا اور پنہاں ہو چکے ہوں اور اب اس منزل میں ہوں جس کی طرف" ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ؀ میں اشارہ موجود ہے۔

اگر اس قیاس کو صحیح تسلیم کیا جا سکے تو یہ ماننا لازم آئے گا کہ کسی بعید زمانہ میں ہماری ہی طرح کا ایک اور عالم انسانی بھی موجود تھا۔ جس پر" موت" اور" قیامت" کے عالم گذر چکے ہیں اور اب وہ آخرت کی لاتعداد وسعتوں میں اپنی منزلیں طے کر رہا ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جب ہمارا موجودہ کرۂ ارض فنا ہو جائے گا اور جب ہم پر بھی اور قیامت کے عالم گذر رہے ہوں گے تو اُس اُفق سماوی کے کسی اور کرّہ میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں پھر نمودار ہو رہی ہوگی۔ وَالسَّمَاءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ؀

ترجمہ :- اور آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور ہم اس کے کشادہ کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔
یہاں اس امر کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس کو ہم زمین کہتے ہیں وہ آسمانی فضا کا ایک کرہ ہے ہماری زمین آسمان کی وسعتوں میں ایک نقطہ ہے۔ اگر ہم آسمان کو ایک دائرہ فرض کر لیں تو ہم ایک نقطہ کی مثال اس کے اندر موجود ہوں گے۔ اب خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جو کچھ تم آسمان کی شکل میں دیکھ رہے ہو اس کی مزید وسعت پر ہم قادر ہیں یعنی ہم اور عالموں کو بھی اس کے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔
اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝ وَّ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ۝ علم ہیئت کے متخصصین ہمیں بتلاتے ہیں، کہ فضائے بسیط میں نئے ستارے بنتے رہتے ہیں، اور وہ اب تک اپنی محلل گاہوں (لیبارٹریز) سے ایسے کئی ستاروں کو دریافت کر چکے ہیں۔
اور حادثۂ قیامت جس کے متعلق قرآن ہمیں کس قدر تفصیل کے ساتھ آگاہ کرتا ہے اگر اس کی تفصیلات کو زیادہ غور کے ساتھ سمجھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضائے آسمانی میں اس کا تعلق صرف ہمارے نظام شمسی سے ہوگا۔ جیسا کہ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ یعنی جب سورج اور چاند آپس میں مل جائیں گے سے ظاہر ہے اور اس کو سَمَآءُ الدُّنْیَا بھی کہا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ آسمان کی یہ وسعت جو ہماری طرح کے ہزارہا نظام شمسی اپنی آغوش میں رکھتی ہے ہمارے حادثۂ قیامت سے ساری کی ساری متاثر نہ ہوگی بلکہ اس کا کچھ حصہ ہوگا اور یہ جو کہا گیا ہے کہ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ اور آسمان اس دن اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ تخلیق کائنات کے متعلق خدا نے انسانی آنکھ کے سامنے یہ جو طلسم بنا رکھا ہے اس دن وہ بے پردہ اور آشکار ہو جائے گا جیسا کہ لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ۝ میں ہے۔ ترجمہ :- اور بے شک تو اس سے پہلے اس حقیقت سے غافل تھا۔ آج ہم نے تیری آنکھوں سے اس پردہ کو دور کر دیا ہے پس آج دیکھ کہ تیری نگاہ کس قدر تیز ہے۔ پس اگر یہی کچھ ہو تو ہم جس چیز کو زندگی کہتے چلے آئے ہیں اسے یہاں ہم وسیع

مفہوم دیں گے۔

موت اور زندگی، یا نیستی اور ہستی ایک ہی شے کی دو متقابل صورتیں ہیں "نیستی" غیب کے سوائے یعنی جس کا ہمیں علم نہیں اور کوئی شے نہیں اور "ہستی" اس غیب کی وہ صورت ہے جو ظاہر ہو کر عالم شہود میں آجائے اس طرح ہر وہ شے جو اس عالم میں اپنا وجود رکھتی ہے خواہ وہ جمادات کی قسم سے ہو ہستی ہے اور ہر وہ شے جو اپنے شہود کی منزل کو نہیں پہنچی عدم، غیب یا عالم موت میں ہے اور یہ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ زندگی اپنا سفر نقطۂ عدم سے شروع کرتی ہے اور ارض و جمادات کی منازل طے کر کے نباتات کی طرح اگتی ہے اور پھر حشرات الارض حیوانات اور انسانی انواع کے مستقل مدارج قائم کرتی ہوئی۔ عالم موت اور آخرت میں سے ہو کر آگے کو بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہ عجیب نکتہ ہے کہ قرآن۔ زندگی شروع ہونے سے پہلے عالم کو بھی اور جب وہ اس دنیا میں اپنا سفر ختم کر چکتی ہے اس کے بعد کے عالم کو بھی "موت کا عالم" ہی کہہ کر پکارتا ہے جیسا کہ "کُنْتُمْ اَمْوَاتًا" اور "ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ" سے ظاہر ہے

پس اگر ہم "ازل" اور "ابد" کو دو نقطے فرض کر لیں اور ان دونوں کے درمیان ایک خط کھینچ دیں اور پھر اس خط پر چار نشان الف۔ ب۔ ج اور د لگائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ازل سے الف تک کا زمانہ، عدم یا غیب ہے الف سے ب تک کا زمانہ اس دنیا کی زندگی اور شہود ہے ب سے ج تک کا زمانہ اس زندگی کے بعد "عدم یا موت ہے ج سے د تک کا زمانہ "حشر و قیامت" ہے اور د سے ابد تک کا زمانہ وہ پچھلا عالم ہے جہاں زندگی کو اختتام نہیں۔

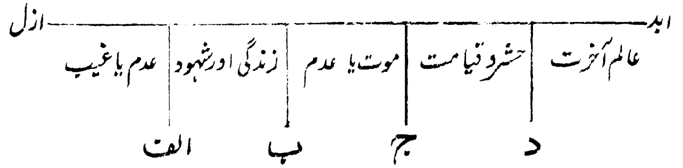

گویا زندگی جب ایک دفعہ نقطہ عدم سے وجود میں آتی ہے تو پھر اس کو فنا نہیں بلکہ وہ اپنے مختلف

مدارج کو طے کرتی ہوئی عالم آخرت کی طرف صعود کرتی رہتی ہے اور ابد کی لا انتہا وسعتوں میں اپنا سفر برابر جاری رکھتی ہے۔

اس لحاظ سے "عدم یا غیب" زندگی کی وہ منزل ہے جہاں سے زندگی کا اولین سرچشمہ پھوٹتا ہے اور پھر ایک سیل رواں بن کر عالم شہود میں آتا ہے پھر موت یا عدم کے سمندر میں جا گرتا ہے پھر حشر یا قیامت میں فلٹر ہونے کے لئے جمع ہوتا ہے اور پھر وہاں سے سبک سیر ہو کر عالم آخرت کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگ جاتا ہے۔

زندگی کا یہ عمل پیہم جاری ہے ازل اس کی ابتدا ہے اور ابد اس کی انتہا اب نہ ازل کی کوئی انتہا ہے اور نہ ابد کی کوئی حد۔ یہ ایک خط مستقیم ہے جو ایک طرف سے دوسری طرف چلا گیا ہے اور جو دوسری طرف ہے اس کو پہلی طرف لوٹنا نہیں۔ یہ کوئی آواگونی چکر یا سلسلہ تناسخ نہیں جو پھر پھر کر اپنے دائرہ ہی میں رہتا ہو۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ بلکہ یہ تو اس زبردست حکمت والے خدا کا ایک اندازہ ہوا قاعدہ ہے

زندگی جو اس طرح سے شروع ہوتی ہو اور جس کا اتنا بلند بام نصب العین ہو۔ اسے عالم شہود میں آتے ہی یہ انتباہ ملتا ہے کہ یہاں ہر چیز کے اندر خیر و شر کی دونوں صفتیں موجود ہیں پس ایسا نہ ہو کہ شر کی فسوں کاریاں زندگی کی منزل کو کھوٹا کر دیں اور اسے اپنی سیدھی راہ سے بھٹکا دیں کیونکہ اگر وہ ایک دفعہ راہ سے بھٹک گئی تو اُسے کوئی بجز اُس ذات کے جس نے اسے پیدا کیا ہے پھر سیدھی راہ پر لانے والا نہیں۔ اور اس ذات الٰہی کا قانون یہ ہے کہ جو اس کی طرف رجوع نہ کرے اور اس کی مدد و اعانت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھے وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور اسے بھٹکتے رہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہے۔

پس اے پیغمبر تو اپنے خدا سے جو "نور کے تڑکے" کا پروردگار ہے استعانت طلب کر اور ہر اُس شر سے پناہ ڈھونڈ جو اُس نے اشیا کے اندر خلق کر رکھا ہے۔

خوشخبری

جدید عربی کالج کا افتتاح

كُلِّيَّةُ اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّة

مسلمانوں کی عربی تعلیم ناقص ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کے سمجھنے اور ممالک عربیہ سے مراسم و روابط پیدا کرنے اور قائم رکھنے روز بروز مشکل ہو رہے ہیں۔ مسلمانان عالم کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط رکھنے نیز تعلیمات قرآنیہ کو سمجھنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ ہم عربی تعلیم کو ہندوستان میں منظم کریں اور جدید تعلیمی اصولوں پر جا بجا مدرسے قائم کریں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک مسلمانوں نے اس طرف سے مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے جامعہ ازہر قاہرہ اور مصری یونیورسٹی کے ایک ہندوستانی فاضل جنہوں نے ادب عربی میں بہرہ وافر حاصل کیا ہے اس وقت ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ میری مراد جناب پروفیسر محمد حسن الاعظمی سے ہے۔ ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خدا کے بھروسے پر ایک عربی کالج کا افتتاح کر دیا ہے۔ کالج کا نام "کلیۃ اللغۃ العربیۃ" رکھا گیا ہے۔ داخلہ ابھی تک جاری ہے۔ وقت ۷ بجے شام کے بعد سے شروع ہوتا ہے تاکہ دفاتر کے ملازمین اور مدارس اور کالجوں کے طلبہ بھی اس "کلیۃ" میں داخل ہو سکیں۔

ابتدائی تعلیم بذریعہ اردو اور اعلیٰ تعلیم بذریعہ عربی دی جاتی ہے۔

باقی حالات معلوم کرنے اور داخل ہونے کے لئے دفتر اقبال اکیڈیمی ۴۵ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ۲ بجے دوپہر سے ۷ بجے شام تک کسی وقت تشریف لائیں۔

المشتہر:۔ سید محمد شاہ ایم۔ اے سیکرٹری کلیۃ اللغۃ العربیۃ لاہور

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو سوچنے سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی جو سوچنے سمجھنے اور نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو سورہ قمر آیت ۱۷

مطالبُ القرآن

یعنی

قرآن پاک کا سلیس اُردو مفہوم

جلد اوّل

جسمیں قرآن پاک کی پہلی منزل یعنی سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے مطالب بیان ہوئے ہیں،

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

دفتر پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور

(۱) سُورہ فاتحہ (۵)

یہ سورت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اور ایک رکوع اور سات آیتوں پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت احسان والا مہربان ہے ○

تمام حمد و ثنا اور ہر قسم کی تعریف و توصیف کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے اور وہی اسکا مستحق ہے کیونکہ صرف وہی تمام مخلوقات کا رازق، مربی اور نگہبان ہے ○ اُس کے انعامات و اکرامات اور فیضان و رحمت کا حلقہ ایسا وسیع ہے جس کی انتہا نہیں وہ ہر لحظہ و ہر آن تازہ بتازہ نو بنو احسانات کرتا رہتا ہے۔ اس کے انعامات و اکرامات اور فیضان و رحمت عارضی نہیں ہوتے، بلکہ مستقل اور دائمی ہیں ○ وہی اس دن کا مالک ہے جب لوگوں کو اُنکے نیک و بد افعال کی جزا یا سزا دی جائیگی اور جس دن تمام گردنیں اسکے آگے جھک رہی ہونگی ○ اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی امداد و اعانت چاہتے ہیں ○ اے اللہ! تو ہمیں سیدھی راہ پر لگادے ○ اُن لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے فضل و کرم کیا اُن کی راہ پر نہیں جنہوں نے معرفتِ حق اور فہم صداقت کے بعد حق و صداقت کو ٹھکرایا، شریعتِ الٰہیہ اور دعوتِ دینِ الٰہی اُن تک پہنچی باوجود اسکے اُنہوں نے حق سے منہ موڑا، باپ دادا کے گمراہ طریقوں کی پیروی کی اور آباؤ اجداد کی اُن بدعملیوں اور بداخلاقیوں کی اندھی پیروی کی جن کی وجہ سے وہ تیرے غضب کے مستحق بنے تھے، اور اے اللہ! اُن گمراہوں کی راہ پر بھی ہمیں نہ چھوڑ۔ جن پر حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا اور وہ راستہ ہی میں ناکام و نامراد مقصود سے بھٹک کر رہ گئے ○

(۲) سُورہ بقرہ (۸۷)

یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس میں ۴۰ رکوع اور ۲۸۶ آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت احسان والا مہربان ہے

الٓمٓ (۱) یہ وہ کتاب ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی بات نہیں ہے، جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے یہ کتاب ہر معاملے میں اُن کی راہنما ہے۔ (۲) اللہ کے خوف والے وہ لوگ ہیں جو غیر محسوس[۱] اور ماورائے عقل حقائق کو بھی قرآن کی تعلیم کے مطابق تسلیم کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دے رکھا ہے اسمیں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں (۳) نیز وہ لوگ اللہ کے خوف والے ہیں جو اس کتاب پر جو اے پیغمبر اسلام تجھ پر نازل کی گئی ہے ایمان لائے ہیں اور اُن کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تجھ سے پہلے نازل کی گئی تھیں اور آخرت پر بھی یقین و ایمان رکھتے ہیں (۴)

---

[۱] غیب سے مراد وہ ہے جس کا مقام اس دنیائے محسوسات سے پرے ہو۔ اور جو محض عقل وادراک سے دریافت نہ کیا جاسکے۔ جیسا کہ قیامت، دوزخ، بہشت وغیرہ ایک نظام اور کائنات وہ ہے جیسے ہم سمجھتے اور دیکھتے ہیں مگر اسکے علاوہ ایک نظام اور ایک کائنات اور بھی ہے جو ہمارے فہم وادراک اور حس وقوت سے بہت بالاتر ہے اور جب تک اس نظام کو بنانے والا جو خود بھی غیب ہے ہمیں بذریعہ وحی والہام نہ بتائے ہم نہ اس نظام کو سمجھ سکتے اور نہ اس کائنات کو دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن پاک اسی قسم کے نظام اور اسی کائنات کو غیب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدائی تعلیمات کی رہنمائی میں اپنا تعلق اس دوسرے نظام سے جوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان بالغیب کی اس اہمیت کو ابتداہی میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور بتادیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس نظام کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کو قرآن کی راہنمائی کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی راہنمائی نصیب ہے[1] اور یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ⑤ (اسکے برعکس،
جو لوگ انکار کرتے ہیں یعنی غیب پر ایمان نہیں لاتے نماز نہیں پڑھتے بندگانِ خدا پر اپنا مال
و متاع خرچ نہیں کرتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے
پہلی الہامی کتابوں اور گذشتہ پیغمبروں کو تسلیم نہیں کرتے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے
تم اُن کو اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ اُن کے لئے برابر ہے۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لائینگے کیونکہ
انہیں ایمان کی خواہش ہی نہیں ⑥ اُنکے اس کفر و انکار کی وجہ سے اللہ نے اُن کے دلوں پر
اور اُن کی سماعت پر مہر لگادی ہے اور اُن کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑ گیا ہے۔ آخرکار اُنکے
لئے سخت عذاب ہوگا۔ ⑦ ع اور (ان دو قسم کے انسانوں مومنوں اور کافروں کے علاوہ جن کا ذکر ع
اوپر ہوا ہے) لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے
دن پر ایمان رکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں (منافق ہیں) ⑧ یہ لوگ اللہ
کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں اپنے سوا کسی کو دھوکہ نہیں
دیتے اور اس بات کو نہیں سمجھتے[2] ⑨ اُن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے، سو اللہ اُنکے مرض کو

---

[1] مختصر یہ کہ ہدایت یافتہ اور متقی لوگ وہ ہیں۔ جو (۱) خدا، ملائکہ، بہشت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں۔ (۲) اپنے خالق کی عبادت، اطاعت اور فرمانبرداری بجالاتے ہیں۔ (۳) اپنے بھائی بندوں اور دیگر مخلوق انسانی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے اور اپنا مال و متاع اُن پر خرچ کرتے ہیں (۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں (۵) تمام سابقہ آسمانی کتابوں کو اور تمام پہلے رسولوں کو مانتے ہیں۔ (۶) اور آخرت پر دل سے یقین رکھتے ہیں۔ ان چھ شرطوں کو پورا کرنے والے لوگ متقی اور مومن کہلاتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو قرآن کی یا بالفاظِ دیگر خدا کی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

[2] پہلے رکوع میں لوگوں کی دو قسموں کا ذکر ہوا تھا یعنی مومنوں اور کافروں کا اس رکوع میں ایک اور قسم کا ذکر ہے جو حقیقت میں کافروں ہی کی ایک قسم ہے ان کو منافق کہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ مکہ میں نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں بکثرت موجود تھے یہ عجیب و غریب قسم کے لوگ زبان سے اسلام کو تسلیم کرتے اور بڑی وفاداری اور سرگرمی کا دعوے رکھتے تھے مگر حقیقتاً وہ دل سے کافر ہی نہ تھے۔ بلکہ اسلام پیغمبر اسلام اور پیغام اسلام کے جانی دشمن تھے بدقسمتی سے آج بھی مسلمانانِ عالم کی ایک بڑی جماعت اس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے اور مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کو ختم کرنے میں سب سے پیش پیش ہے۔

بڑھنے دیتا ہے نتیجۃً اُن کو دردناک سزا ملیگی کیونکہ وہ جھوٹ[1] بولنے کے عادی ہیں - (۱۰) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی منافقت سے) دنیا میں فساد برپا نہ کرو. تو کہتے ہیں کہ ہم تو محض اصلاح کرنے والے ہیں (۱۱) لوگو! خبردار رہو یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن نہیں سمجھتے[2] (۱۲) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے ہیں تم بھی ایمان لے آؤ یعنی ایک خُدا کو مانو، اس کی عبادت کرو، غریبوں کی مدد کرو، قرآن کی تعلیمات کو سچ جانو اور اُن پر عمل کرو، سابقہ الہامی کتابوں اور پہلے پیغمبروں کو مانو اور آخرت پر یقین رکھو، تو یہ جواب دیتے ہیں - کہ کیا ہم بھی بے[3] وقوفوں کی طرح (بلا سوچے سمجھے) ان باتوں کو مان لیں؟ سنو یہی لوگ در اصل بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے (۱۳) یہ منافق لوگ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں مگر جب یہ اپنے جیسے شیطانوں کے پاس علیحدگی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں مسلمانوں کے ساتھ تو ہم محض مذاق کرتے ہیں (۱۴) اللہ اُن کو اس مذاق کی سزا مذاق ہی سے دے گا اور اُن کو انہی کی سرکشی میں حیران و پریشان ادھر ادھر پھرنے کے لئے چھوڑ دے گا (اور سیدھی راہ نہیں دکھلائے گا-) (۱۵) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی کو خرید لیا ہے اس لئے اُن کا سودا نفع بخش ثابت نہیں ہوا اور نہ انہوں نے کبھی ہدایت پائی ہے (۱۶) یہ لوگ دُنیا کے حقیر فائدوں اور اُن آسانیوں کو دیکھتے جو مسلمانوں کو بظاہر حاصل تھیں تو دل سے سچے مسلمان بن جانا چاہتے مگر جب اُن پابندیوں مشقتوں اور قربانیوں سے واقف ہوتے ہیں

---

[1] جھوٹ نفاق کا لازمہ ہے - منافق کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جاتی ہے جس سے وہ دنیا میں لوگوں کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں خدا کے عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے۔

[2] یہ لوگ یا تو عقل و ہوش نہیں رکھتے، یا نیکی اور اصلاح کا مفہوم اُنکی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ عین اُس چیز کو جو گناہ ہے یہ اُسے نیکی سمجھتے ہیں، جو فساد اور موجب فساد ہے یہ اُسے اصلاح اور موجب اصلاح خیال کرتے ہیں

[3] سچے مسلمانوں کو یہ لوگ بے وقوف کہتے تھے اور کہتے ہیں۔

کا مطالبہ اسلام ہر سچے مسلمان سے کرتا ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتے، ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آجاتا اور یہ اپنا رویہ متعین کرنے میں پس وپیش سے کام لینے لگتے۔ ان کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی شخص نے (اندھیرے میں) آگ سلگائی پھر جب آگ نے اس کے ارد گرد کی تمام چیزوں کو روشن کر دیا، تو اللہ نے اُن کی روشنی کو بجھا دیا۔ اور اُن کو سخت اندھیرے میں چھوڑ دیا۔ جہاں اُن کو کوئی چیز نظر نہیں آتی، بالکل اسی طرح پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو سن کر ان کو لائحہ عمل کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اسلام وایمان کے فوائد سے آگاہ ہو کر ان کے دل روشن ہونے لگتے ہیں۔ اور حقیقی مسلمان کی راہ ان کو نظر آنے لگتی ہے تو اچانک دل میں شکوک وشبہات کی تاریکی جس کے یہ عادی ہو چکے ہیں اور فطرت کی کمزوری جو ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے آکر درمیان میں حائل ہو جاتی ہے اور پھر پہلے کی طرح اسلام کے فوائد سے محروم اور سچے مسلمانوں کی منفعتوں سے خائف ہو کر کفر وجاہلیت پر ہی اڑے رہتے ہیں (۱۷) وہ بہرے ہیں کہ حق کی پکار کو نہیں سنتے وہ گونگے ہیں کہ حق بات نہیں کہہ سکتے وہ اندھے ہیں کہ راہ حق نہیں دیکھتے لہٰذا اس قسم کے لوگوں سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ یہ کبھی اپنے طرز عمل کو چھوڑ کر لوٹ آئینگے اور سچے مسلمانوں میں شامل ہو جائیں گے (۱۸) یا پھر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب وہ اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کے دبدبے کو دیکھتے ہیں اور مخالفین اسلام کی آئندہ بدحالی کا اندازہ لگاتے ہیں تو ڈر کے مارے جھٹ سے مسلمانوں میں اپنا نام لکھوا دیتے ہیں۔ ان مردم شماری کے مسلمان منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ جیسے موسلا دھار مینہ بادلوں سے برس رہا ہو گھنگھور گھٹا چھائی ہو، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو، بادلوں کی گرج سے دل دہل رہے ہوں اور بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوں۔ اُس وقت بادلوں کی گرج کو سن کر لوگ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم بچے رہیں گے۔ اس طرح جب یہ بزدل منافق مسلمانوں

کا جذبۂ جہاد اور راہِ حق میں اُن کی شدّت وسخت گیری کو دیکھتے ہیں تو اپنے اندر مقابلہ کی تاب نہ پا
کر از راہِ منافقت، اُن کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگتے ہیں اور گو دل سے کفر وجاہلیت پر اڑے
رہتے ہیں مگر زبانی دعووں کے ذریعے اپنی ہمدردیاں جتا کر مسلمانوں کی شدت سے بچے رہنا
چاہتے ہیں لیکن اللہ کی گرفت اور عذاب سے کون اس طرح بچ سکتا ہے۔ وہ کفر وانکار کرنے
والوں کو خواہ وہ منافقت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہوئے ہوں سزا دئے بغیر نہیں چھوڑے گا ⑲
مسلمانوں کی شان وشوکت نے بجلی کی چمک کی طرح اُن کی آنکھوں کو بہت حد تک چُندھیا
دیا ہے جب اُن کو اسلام کے فوائد کی کشش کھینچتی ہے تو یہ چند دنوں کے لیے مسلمانوں کیساتھ
ساتھ چلتے ہیں یوں سمجھو کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگتی ہے اور وہ چند قدم آگے بڑھتے ہیں مگر
جب ان کو رسم ورواج کی پابندیاں، اعزا واقارب کے طعنے اور بعض مالی فوائد کا نقصان نظر آتا ہے
تو وہیں رُک جاتے ہیں اور ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا اُن پر ایک اندھیرا سا چھا گیا
ہے اور راہ نظر نہیں آتی بس ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا، تو ان کی سماعت اور بصارت
کو بالکل زائل کر دیتا۔ پھر نہ ان کو حق کی آواز سنائی دیتی اور نہ راہ حق نظر آسکتی۔ خوب یاد رکھو کہ
ع اللہ ہر چیز پر قادر ہے ⑳ ع اے انسانو! اپنے اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور اُن
کو جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں سب کو پیدا کیا۔ یاد رکھو اگر تم نے کماحقہٗ عبادت کی تو ہو سکتا ہے
کہ تمہارے اندر تقوے یعنی خدا کا خوف، ماسوا سے بیزاری اور اللہ سے محبت کے جذبات پیدا
ہو جائیں ㉑ وہ اللہ جس کی عبادت کرنے کے لئے تمہیں کہا گیا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے اس
رُوئے زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا، آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا اور بادلوں
سے مینہ برسایا جس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل اگائے۔ لوگو! تم اللہ کی اس قدرت
اور اس کے احسانات کو خوب جانتے ہو لہٰذا تمہیں یہ چاہیئے کہ اس کی عبادت کرکے اس کی

عظمت کو تسلیم کرو، اس کی نعمتوں کا شکریہ بجا لاؤ اور کسی کو اس عبادت میں اس کا شریک نہ ٹھہراؤ ﴿۲۲﴾ اور اگر تمہیں اس کلام میں کوئی شک ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے تو تم بھی اس کلام کی مانند کوئی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے ماسوا تمہارے جس قدر معاون و مددگار ہیں اُن سے بھی اعانت طلب کر دیکھو اگر تم سچے ہو۔ ﴿۲۳﴾ اگر تم ایسی کوئی سورت نہ بنا سکو اور ہمارا دعوےٰ ہے کہ تم نہیں بنا سکو گے تو تمہیں چاہیئے کہ دوزخ کی اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن پتھر[1] ہونگے اور وہ لوگ ہونگے جو اس کلام میں کوئی شک کریں اور اسے نہ مانیں۔ دیکھو یہ آگ اُن کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ کی عبادت قرآن کی تصدیق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کریں ﴿۲۴﴾ اور جو لوگ ایمان لے آویں اور ایمان کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے وہ عمل کریں جو ایمان کا تقاضا ہیں اُن کو تم خوشخبری سنا دو کہ اُن کے ایمان و عمل کے بدلے میں انہیں اُخروی زندگی میں ایسے باغات دئے جاویں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ جب اُن کو وہاں کوئی پھل کھانے کے لئے دیا جاوے گا تو کہیں گے کہ یہ تو ہم پہلے بھی کھایا کرتے تھے یعنی وہاں بھی انہیں دنیاوی اشیاء سے ملتی جلتی اشیاء ہی دی جاوینگی اور اُن کے لئے وہاں پاک، صاف اور ستھری بیویاں بھی ہونگی۔ مزید برآں یہ جگہ اُن کا عارضی مقام نہیں ہوگا بلکہ اُن کو ہمیشہ وہیں رہنا ہوگا ﴿۲۵﴾ اُخروی زندگی کی کیفیت کا ہلکا سا اندازہ کرانے کے لئے دنیاوی اشیاء کو جو بمقابلہ اُخروی اشیاء کے بہت ہی حقیر ہیں بطور مثال کے پیش کیا گیا ہے تاکہ ذہن کو معلوم سے نامعلوم کی طرف منتقل کیا جائے۔ اگر اس بات پر کسی کو اعتراض ہو کہ اللہ نے کیسی حقیر اشیاء کا ذکر کیا ہے تو اُس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ اس بات سے مطلق نہیں شرماتا

---

[1] مشرکین پتھروں کے بت بنا کر رکھا کرتے ہیں اور اُن کو اپنا قبلۂ حاجات بنا کر اُن کی عبادت کرتے ہیں اللہ تعالےٰ ان مشرکوں کو، اُن کے بتوں کو اور وہ چیز جس سے وہ بت بنایا کرتے تھے دوزخ کی آگ کا ایندھن بنائینگے اور جب مشرکین دیکھیں گے کہ اُن کے معبود بھی اُنکے پہلو بہ پہلو جل رہے ہیں تو انکی تکلیف اور بھی کئی گنا بڑھ جاویگی۔

کہ وہ ایک مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی مثال بیان کرے (اگر اُس سے کسی حقیقت کی کیفیت کا واضح کرنا مقصود ہو) ہاں جو لوگ خدا کو، رسُول کو، اس قرآن کو اور یوم آخرت کو مان چکے ہیں وہ تو فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے بہت مناسب اور ٹھیک ہے مگر جو لوگ خدا، رسول، قرآن اور یوم آخرت کو نہیں مانتے وہ پوچھنے لگتے ہیں۔ کہ اللہ نے اس مثال کو کیوں بیان کیا ہے۔ اسی قرآن سے اللہ بہتوں کو اُلٹی راہ پر ڈال دیتا ہے اور اسی سے بہتوں کو راہ راست دکھلا دیتا ہے مگر الٹی راہ پر صرف انہی لوگوں کو ڈالتا ہے جو عادی نافرمان، بدکار اور سرکش ہوتے ہیں۔ (۲۶) یہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ (تسلیم و رضا کا) معاہدہ[1] پختہ کرنے کے بعد بھی اُسے توڑ دیتے ہیں (یعنی ایمان لا چکنے کے بعد بھی کفر و جاہلیت کے عقائد و رسوم پر قائم رہتے یا منافقانہ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں) اور اللہ نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُن کو توڑتے اور رُوئے زمین پر فتنہ و فساد[2] برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں (۲۷) (لوگو) تم اللہ پر ایمان لانے سے کس جرأت پر انکار کر سکتے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ تم نیست تھے اور اس نے تم کو ہست کیا۔ اس کے بعد وہ پھر تمہیں نیست کریگا اور بعد ازاں پھر ہست کریگا اور سب سے آخر میں تمہیں پھر اسی کی طرف لوٹایا جائے گا جس نے اوّل مرتبہ تمہیں ہست کیا تھا۔ (۲۸) وہی ہے جس نے نہ صرف تمہیں پیدا کیا بلکہ ہر وہ چیز جو تم روئے زمین پر دیکھتے ہو اُس نے

---

[1] معاہدہ سے مراد یہاں ایمان کا لانا ہے اور ایمان تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے جب ایک انسان منہ سے یہ الفاظ پکارتا ہے کہ میں اللہ، اُس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آیا ہوں اور مانتا ہوں کہ میری بھلائی اور برائی پر سوا خدا کے کوئی قادر نہیں" تو گویا وہ خدا سے معاہدہ کرتا ہے کہ ایمان و یقین کا یہ درجہ وہ کسی دوسرے کے لئے روا نہ رکھے گا۔

[2] فساد سے مراد وہ (Corruption) اور بدنظمی بھی ہے جو باطل اعتقادات، بےدینی اور بداخلاقی کا پروپیگنڈا کرنے سے پھیلے اور وہ منافقت بھی جس سے نقضِ امن اور خونریزی کا بازار گرم ہو۔

تمہارے لئے پیدا کی اسکے بعد وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہؤا اور سات آسمان بنا دئے۔ یہ
بات خوب سمجھ لو کہ اُس کو تمہاری ہر ضرورت کا علم[1] ہے۔ (۲۹) اور سنو یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ع ۳
جب اللہ نے تمہیں پیدا کیا تو اس نے ملائکہ سے کہا کہ میں رُوئے زمین پر اپنا ایک نائب
مقرر کرنا چاہتا ہوں (جو میرے احکام کو وہاں نافذ کرے اور اس کے لئے میں نے اپنی
مخلوق میں سے انسان کو منتخب کیا ہے) ملائکہ (جو انسان کی سرشت، ہیئت اور ترکیب سے
واقف تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان کو ایک طرفہ معجون مرکب بنایا گیا ہے اور اس کو فطرت
سلیمہ کے ساتھ ساتھ آزادی اور اختیار بھی حاصل ہے لہٰذا یہ ضرور سرکشی اور نافرمانی کا ارتکاب
کرے گا) کہنے لگے کہ اے اللہ! کیا تو اُسے زمین پر اپنا نائب مقرر کرنا چاہتا ہے جو تیری نافرمانی
اور حکم عدولی کے ذریعے وہاں فتنہ و فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا۔ برعکس اس
کے ہم ہیں کہ تیری حمد و ثنا کہتے اور تیرا بول بالا کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ اے ملائکہ جو کچھ
میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ (۳۰) اس کے بعد اللہ نے آدم کو علم[2] اشیاء مکمل عطا کر دیا۔ پھر
اُن اشیاء کو فرشتوں کے سامنے رکھا اور اُن سے پوچھا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں کہ انسان سے
تم افضل ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ (۳۱) انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ! تیری ذات
عیب سے خالی ہے، تیرا فیصلہ درست ہے ہم کچھ نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو صرف اس قدر جو تو نے
بتا رکھا ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تجھے ہر چیز کا ٹھیک ٹھیک علم ہے اور تیرا کوئی کام مصلحت[3] سے

---

[1] اس سے معلوم ہؤا کہ زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں سب حضرتِ انسان کے لئے بنایا گیا ہے

[2] علم اشیاء سے مراد وہ سمجھ، عقل، قوتِ دریافت اور قوتِ اظہار ہے جس کی بدولت انسان تمام کائنات سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور یہ علم اشیاء ہی وہ چیز ہے جس نے انسان کو مرتبہ میں ملائکہ سے بھی فائق تر کر دیا۔

[3] مطلب یہ ہے کہ تو جسے جس قابل دیکھتا ہے اُسے وہی دیتا ہے اور اتنا ہی دیتا ہے جتنا اُسے درکار ہو اور اور اس کی صلاحیتوں کے لئے مناسب ہو۔

خالی نہیں ہوتا (۳۲) اللہ نے کہا کہ اے آدم تم ان اشیاء کے نام انہیں بتاؤ۔ پھر جب وہ انہیں اُن کے نام بتا چکا تو اللہ نے ملائکہ سے پوچھا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ زمین و آسمان کے وہ رازہائے سربستہ جو سب سے پوشیدہ ہیں وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں میں انہیں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم زبان سے کیا کہتے ہو اور تمہارے دلوں کی گہرائیوں میں کیا خیالات چھپے ہیں (۳۳)
اور یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو (جسے ہم نے زمین پر اپنا نائب مقرر کر دیا ہے ازراہ تعظیم) سجدہ کرو تو، سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کر دیا۔ اُس نے انکار کیا اور بڑا بننا چاہا اور کافر و نافرمان ہو گیا۔ (۳۴) پھر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ہم نے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی تم دونوں جنت میں رہو اور وہاں جس چیز کو چاہو، جتنا چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالم، نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے ہو گے (۳۵) پھر شیطان نے (جو اُن کا جانی دشمن بن چکا تھا) اُن کو درخت کے معاملہ میں پھسلا دیا اور جس امن و سلامتی اور خوشی کے مقام میں وہ تھے وہاں سے اُن کو نکلوا دیا اور ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ۔ تم (آج سے) ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اب زمین پر تمہارے لئے ایک مقررہ وقت[1] تک کے لئے جائے رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کر دیا گیا ہے (۳۶)
اس کے بعد آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ (بذریعہ وحی والقاء) سیکھے جن کے ذریعے اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور نادم ہوا اور یہ ارادہ پختہ کر لیا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ لہٰذا اللہ نے آدم کی توبہ[2] کو قبول کر لیا۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے اور بخشنے والا مہربان ہے (۳۷) حکم دیا کہ تم یہاں سے سب کے سب اتر جاؤ لیکن اگر میری

---

[1] ہر شخص کی خوراک اور جائے رہائش کا تکفل آخیر عمر تک خود اللہ تعالیٰ ہے۔

[2] توبہ کے معنی غلطی اور گناہ کا اعتراف کرنا اور نادم و پشیمان ہو کر آئندہ کیلئے ارادہ کر لینا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کرونگا

طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت یا حکم پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت یا میرے اُس حکم پر عمل
کریگا اُس کو نہ دنیا میں کوئی ڈر ہوگا نہ اُس کے بعد اُس کو غم کھانا پڑے گا (۳۸) اور وہ لوگ
جو اُن احکام کے ماننے سے انکار کریں گے اور اُن کو جھوٹ سمجھیں گے وہی اہلِ دوزخ ہونگے
وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۹) ع اے یہودیو! میرے اُن انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر ع ۴
کئے اور مجھ سے تم نے جو عہد[1] باندھا تھا اُسے پورا کرو میں اپنے عہد کو پورا کروں گا۔ اور حق بات
کے کہنے اور اس کے ماننے میں صرف مجھی سے ڈرو (۴۰) اور اس قرآن پر جو تمہاری کتاب کو سچا
بتا رہا ہے ایمان لے آؤ اور تم ہی سب سے پہلے اس سے انکار نہ کر بیٹھو۔ نیز میرے الہامات کو دنیا
کے حقیر فوائد اور ذاتی اغراض و مصالح جیسی تھوڑی سی قیمت کے عوض نہ بیچتے پھرو بلکہ حق بات
کے کہنے اور ماننے میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اور محض مجھی سے ڈرو۔ (۴۱) اور سچ کو جھوٹ
میں نہ ملاؤ اور نہ سچ کو چھپاؤ جب کہ تمہیں معلوم ہو کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ (۴۲) اور نماز پڑھو
زکوٰۃ دو اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جھکو (۴۳) یہ کیا بات ہے کہ تم لوگوں کو تو نیک
کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپکو بھلا رکھا ہے حالانکہ تم توراۃ پڑھتے ہو کیا تم اس صریح جرم
کو نہیں سمجھتے (۴۴) اور دیکھو اگر قبولِ حق اور اظہارِ حق میں تم پر سختی آئے تو اللہ سے مدد مانگنے
کا طریقہ یہ ہے کہ صبر و استقلال سے کام لو اور نماز پڑھو۔ بلاشبہ یہ چیز بہت مشکل اور کٹھن ہے
مگر عاجز مزاج لوگوں کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ (۴۵) جو جانتے ہیں کہ وہ (ایک دن) اپنے رب
کے سامنے پیش ہونے والے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ (دنیا کا یہ سفر ختم کرنے کے بعد)
وہ اُسی کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں (۴۶) ع ع ۵

---

[1] توراۃ میں کتاب خروج باب ۱۹ آیت نمبر ۵، ۶ میں آیا ہے۔ اے اولادِ یعقوب! اگر تم نے میری آواز پر کان دھرا اور اس معاہدہ کو پورا کیا جو مجھ سے باندھا ہے تو تمام لوگوں سے بڑھکر تم میرے نزدیک ایک عجیب خزانہ سمجھے جاؤ گے .... اور ایک مقدس قوم تصور کئے جاؤ گے۔

اے یہودیو! میرے اُن انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور اس بات کو یاد کرو کہ میں
نے تم کو تمام دنیا پر ترجیح دی تھی (۴۷) اور جزا سزا کے اُس دن سے ڈرو جب کوئی شخص
بھی کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول کی جائیگی نہ کسی سے فدیہ یا معاوضہ
لیا جاوے گا اور نہ اُن کو کسی اور طرح مدد دی جائیگی (۴۸) اور (آؤ اگر تمہیں وہ انعامات یاد
نہ رہے ہوں۔ تو ہم تمہیں یاد کرا دیں) اُس واقعہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاؤ جب ہم نے تمکو
فرعون کے کنبے سے نجات دلائی جبکہ انہوں نے تمہیں سخت مصائب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ
(تمہاری کثرت کے خوف سے) تمہارے بیٹوں کو مار دیتے اور تمہاری عورتوں کو (لونڈیاں بنانے
کی خاطر) زندہ رکھتے اور یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ایک بڑی سخت آزمائش تھی[۲]۔ (۴۹)
اور اس واقعہ کو یاد کرو جب (مصر سے خروج کے وقت) ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑا[۳]
اور اس طرح تمہیں بچایا اور فرعون (اُسکے کنبہ، اُسکی قوم اور اُسکے متبعین) کو ڈبو دیا اور
تم اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے (۵۰) اور (اس کے بعد اُس وقت کو بھی یاد کرو)
جب ہم نے (فرعون کی ہلاکت کے بعد) موسیٰ کو چالیس راتوں کے لئے کوہ طور پر بلا کر تورات
دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر (جب وہ کوہ طور پر گیا تو) تم نے (اہل مصر کی طرح) اُس کے بعد گائے

سلہ عیسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے سے یہودیوں کو کچھ خاندانی غرور اور کچھ صحیح تعلیمات کے فقدان کی وجہ سے اپنے متعلق غلط فہمی سی ہوگئی تھی۔ قیامت اور روز جزا سزا کا اُن کو مطلق ڈر نہ رہا تھا اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ہم نبیوں عالموں اور بزرگوں کی اولاد ہیں اگر موت کے بعد جزا سزا کا دن آیا بھی تو ہمارے بزرگ ہمیں بچا لینگے۔ اُنکے اس زعم باطل کی یہاں تردید کی گئی ہے۔ افسوس کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے بھی یہی خیالات ہیں اور یہ بھی یہود کی طرح اپنے متعلق بعض غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ گو اس مقام پر خطاب تو یہود سے ہے مگر ایک عالمگیر اور دائمی صداقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی اسی طرح سبق لینا چاہیئے جیسے یہود کو۔

سلہ۲ اس واقعہ کی تفصیل تورات میں کتاب الخروج باب ۱ آیت ۱۵ تا ۲۲ اور آیت ۸ تا ۱۴ میں ملاحظہ کیجیے

سلہ۳ دریا کے پھاڑنے کی حقیقت کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ مگر اسکی تاریخی حیثیت بالکل مسلّم ہے تورات میں کتاب الخروج باب ۱۴ آیت ۱۶ تا ۳۱ میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے۔

کے بچھڑے کی پوجا[1] شروع کر دی اور بڑی ہی بے انصافی کی (۵۱) پھر بھی ہم نے اس کے بعد تمہارا قصور معاف کر دیا تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔ (۵۲) (اس کے بعد یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور معجزات عطا کئے تاکہ تم اُن سے راہنمائی حاصل کرتے رہو (۵۳) اور (ہمارے اس انعام کو بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے میری قوم! تم نے گائے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کیا ہے لہٰذا تمہیں چاہئیے کہ تم اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور تم میں سے وہ جنہوں نے گائے کے بچھڑے کی پوجا نہیں کی وہ اُن کو جنہوں نے اُسکی پوجا کی تھی اپنے ہاتھ سے قتل کریں۔ تمہارا ایسا کرنا تمہارے خالق کے نزدیک بہت بہتر ہے چنانچہ جب تم اس حکم کو بجا لائے تو اللہ تم پر پھر مہربان ہو گیا اور درحقیقت وہ سب سے بڑھکر قصور معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (۵۴) اور پھر وہ وقت[2] بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا۔ کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے جب تک ہم ان آنکھوں سے اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ (چونکہ تمہارے اندر اُس کو دیکھنے کی تاب و تواں نہ تھی، لہٰذا بجلی کی ایک ہی کڑک نے تمہیں آلیا اور تم دیکھ رہے تھے (۵۵) پھر تمہارے مر چکنے کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کر دیا تاکہ تم شکر بجا لاؤ (۵۶) پھر وہ وقت یاد کرو جب (تم خانہ بدوش جنگلوں میں پھر رہے تھے تو تمہیں گرمی کی شدت سے بچانے کے لئے) ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا اور من[3] و سلویٰ

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل توراۃ میں کتاب الخروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۸ میں دیکھ لیجئے۔

[2] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہود کے سرداران قوم کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کو حضرت موسیٰ کے ساتھ ہمکلام ہوتا دیکھنے گئے تھے مگر یہ ہمکلامی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے لئے مخصوص تھی انکی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور مطالبہ کیا کہ ہم کو اللہ دکھائی دے اور ہم سے کلام کرے تب ہم مانیں گے چنانچہ اللہ کے نور کی تجلی بجلی کی ایک کڑک کی شکل میں ظاہر ہوئی اور یہ کڑک اتنی شدید تھی کہ وہ سننے کے ساتھ ہی ایسے حواس باختہ اور بیہوش ہو گئے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعائیں اور التجاؤں کو اللہ تعالیٰ نہ سنتا تو وہ مر چکے تھے۔ مگر اللہ نے اُن کے قصور کو معاف کیا اور اُس صدمہ سے بچا کر زندہ کر کے کھڑا کر دیا۔

[3] من اوس کے قطروں کی شکل میں شہد جیسی میٹھی اور لذیذ ایک چیز تھی اور سلویٰ بٹیر یا بٹیر کی قسم کا پرندہ یا کوئی اور ایسی چیز جس سے انکو تسلی ہو

تمہارے لئے بھیجا (اور کہا کہ) ان حلال و پاک چیزوں کو جو ہم نے تمہیں دی ہیں کھاؤ۔ (انہوں نے
کچھ عرصہ کے بعد ناشکری کی اور اُن چیزوں کے کھانے سے انکار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا) اور
گو ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا مگر اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے وہ عادی ہو چکے تھے ﴿۵۷﴾
اور وہ بھی یاد کر جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس گاؤں (اریحا) میں داخل ہو جاؤ اور وہاں
سے جو کچھ چاہو آزادانہ کھاؤ پیو اور (اس فتح و ظفر مندی کے وقت نہایت عاجزانہ طور پر)
دروازہ میں سے جھکتے ہوئے گذرو اور یہ کہتے ہوئے گذرو کہ "اے اللہ! ہماری لغزشوں کو
معاف کر دے"۔ ہم تمہاری غلطیوں کو ضرور معاف کر دینگے اور ہمارے احکام بجا لانے اور ہماری
ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے والوں کو ہم اور بہت کچھ دینگے ﴿۵۸﴾ لیکن جنہوں نے زیادتی
اور بے انصافی سے کام لیا انہوں نے اُس (دعا و التجا کے) لفظ کو جو انہیں بتایا گیا تھا
ایک دوسرے گستاخی اور مضحکہ کے لفظ سے تبدیل کر دیا لہذا جنہوں نے بے انصافی
اور زیادتی کی تھی اُن پر ہم نے آسمانوں سے عذاب نازل کیا۔ (اور وہ طاعون میں مبتلا ہو کر
ہلاک ہو گئے) کیونکہ وہ نافرمانی اور زیادتی کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ﴿۵۹﴾ع اور اس امر ع ٦
واقعہ کو یاد کر جب موسیٰ نے اللہ سے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا۔ ہم نے کہا کہ اپنے عصا
کو پتھر پر مار۔ سو (اُس کا عصا سے پتھر کو مارنا تھا کہ) اُس میں سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ کر
بہنے لگے۔ (اور یہود کے بارہ ہی قبیلے تھے۔) ہر ایک قبیلہ نے اپنا اپنا گھاٹ نشان کر لیا (ہم نے
اُن سے کہا کہ لو) اللہ کے رزق کو کھاؤ اور پیو اور روئے زمین پر فساد نہ کرتے پھرو ﴿۶۰﴾ اس
کے بعد تم وہ واقعہ بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم سے ایک ہی کھانے
(منّ اور سلویٰ) پر صبر نہیں ہوتا۔ لہذا اپنے رب سے کہہ کہ وہ ہمارے لئے (اس صحرا میں) وہ
چیزیں اگا دے جو زمین میں اُگتی ہیں مثلاً سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں کھیرے، گیہوں، دال

اور تھوم۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم اُس چیز کے بدلے جو بہت بہتر ہے وہ چیز لینا چاہتے ہو جو بہت
ادنیٰ ہے اچھا نچہ جب انہوں نے اپنے مطالبہ پر اصرار کیا۔ تو موسیٰؑ نے کہا کہ اچھا تم کسی شہر
میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں وہی کچھ ملیگا جو تم مانگتے ہو (اور اس دن سے) ذلّت اور محتاجی کا ٹھپّہ
اُن پر لگا دیا اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہر گئے۔ یہ ذلّت و محتاجی کا ٹھپّہ اُن پر اس لئے لگا
اور غضب کے مستحق اِس لئے ہوئے کہ انہوں نے پے در پے اللہ کے احکام کو ماننے سے انکار
کیا اور کئی نبیوں کو بلا حق شرعی جان سے مار دیا۔ یہ کفر و انکار اور یہ قتلِ انبیاء کا ارتکاب اُن
سے اسلئے ہوا کہ انہوں نے پے در پے نافرمانیاں کیں اور حد سے گذرنے کے عادی ہو چکے
تھے۔ ع (۶۱) اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جو لوگ مسلمان[۱] ہوئے ہیں اور جو یہودی بنے ہیں اور ع

[۱] الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی فہرست مردم شماری میں نام لکھا دیا ہو جو مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہوں۔ اسی طرح الذین ھادو سے مراد بھی وہ لوگ ہیں جو یہود کے گروہ میں شامل ہیں۔ مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک گروہ بندیوں اور جماعتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اُس کے ہاں قدر جو کچھ بھی ہے وہ ایمان و عمل کی ہے محض مسلمان کہلا لینے یا یہود میں شامل ہو جانے سے نجات نہیں مل سکتی۔ جب تک ایک سچے مُسلمان، یا ایک سچے یہودی کا ایمان دل میں موجود نہ ہو اور وہ عمل نہ کئے جائیں جن کا مطالبہ ایمان کرتا ہے گو اس مقام پر روئے سخن تمام تر یہود کی طرف ہے مگر قرآن پاک کی تعلیمات خواہ وہ اشارہ کنایہ میں ہوں خواہ بالتصریح اور خواہ وہ حدیث دیگران کی شکل میں ہوں خواہ براہِ راست مُسلمانوں پر فرض ہے کہ اُن پر عمل پیرا ہوں۔

اِس آیت اور اس قسم کی اور متعدد آیات میں جو قرآن پاک میں آئی ہیں یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اللہ کا کسی گروہ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ نجات پر کسی قوم کا اجارہ ہے کوئی شخص مجرد اس بنا پر کہ وہ فلاں قوم میں پیدا ہوا ہے یا فلاں جماعت سے منسوب ہے کسی خاص اور امتیازی برتاؤ کا حق نہیں رکھتا۔ خدا کی نگاہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کوئی قوم نہ بجائے خود مقبولِ بارگاہ ہے اور نہ کوئی قوم صرف اس لئے راندۂ درگاہ ہے کہ فلاں نام سے موسوم اور فلاں طبقہ سے منسوب ہے۔ خدا کے ہاں اصل وزن انتسابات اور نسبتوں کا نہیں ہے بلکہ اصول اور حقائق کا ہے۔ سچے دل سے ایمان لاؤ گے اور نیک عمل کرو گے تو اچھا بدلہ پاؤ گے اور اگر ایمان و عمل صالح سے خالی رہو گے۔ تو کوئی چیز تمہیں بُری جزا سے نہ بچا سکے گی خواہ تم کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو ۔

جو نصاریٰ اور بت پرست ہیں انہیں سے جو کوئی بھی صدقِ دل سے اللہ پر اور یوم آخرت پر
ایمان لائے اور نیک کام کرے اُسکے لئے اور ایسے تمام لوگوں کے لئے اُنکے رب کے ہاں اجر
ہے اِنکے لئے نہ دنیا میں ڈرنے کی کوئی بات ہے نہ آخرت میں اِنکو حزن وملال اٹھانا پڑیگا
اور اُس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم تورات کے قانون پر عمل پیرا ہوگے
اور (جب تم نے تورات کے احکام پر عمل سے انکار کر دیا تو) ہم نے تمہارے سروں پر
کوہِ طور کو لٹکا دیا اور (کہا کہ) ہم نے تم کو جو کتاب دی ہے اُس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس
میں جو کچھ لکھا ہے اُسے یاد رکھو اور اُس پر عمل کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے اندر تقویٰ کا پیدا
ہو جانا بہت یقینی ہے (۶۳) اسکے بعد پھر تم پھر گئے اور اگر تم پر اللہ کا احسان اور اُسکی مہربانی
نہ ہوتی تو تم خسارہ میں پڑ چکے تھے (۶۴) اور تم کو اُن لوگوں کا حال بھی خوب معلوم ہے جنہوں نے
تم میں سے یوم سبت[1] کے حدود سے تجاوز کیا تھا اور ہم نے اُن سے کہا تھا کہ جاؤ ذلیل بندر
ہو جاؤ (۶۵) اور اس واقعہ کو ہم نے اُس زمانہ کے لوگوں نیز اُن کے بعد آنے والوں کیلئے
ایک عبرت بنا دیا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ایک نصیحت قرار دیا (۶۶) اور اس
واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ دیکھو خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ ایک گائے
کو ذبح کرو اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ اے موسیٰ! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے؟ موسیٰ نے کہا
کہ (مذاق کرنا جاہلوں کا کام ہے اور) میں جاہل بننے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں (۶۷) انہوں
نے کہا "تو اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو" موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے

---

[1] سبت ہفتہ کے روز کو کہتے ہیں۔ موسوی شریعت میں ہفتہ کا دن عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس دن دنیا
کاروبار کرنا بالکل ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ مگر یہود ——— نام کے یہود، مردم شماری کے یہود، نہ کہ سچے ایمان
اور نیک اعمال والے یہود ——— نے اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل تورات میں
کتاب الخروج باب ۳۱ آیت ۱۴-۱۵ میں ملاحظہ کیجئے۔

کہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ جوان۔ درمیانی عمر کی ہو۔ سو تمہیں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ بجا لاؤ ۞۶۸ انہوں نے کہا "تو اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو" موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد رنگ کی گائے ہو۔ جس کا رنگ خوب گہرا ہو۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو بہت اچھا لگتا ہو ۞۶۹ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ! تو اپنے رب سے کہہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے کیونکہ یہ گائے جس کی شکل و شباہت تو نے بیان کی ہے اسکا ہمیں پتہ نہیں چلتا اور اگر اللہ نے چاہا تو ہمیں ضرور اس کا پتہ چل جائے گا ۞۷۰ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جسے ابھی ہل میں جوتا نہ گیا ہو جو نہ زمین جوتتی ہو اور نہ کھیتی باڑی کو پانی دیتی ہو کسی قسم کا عیب نہ رکھتی ہو اور ہر قسم کے داغ دھبے سے خالی ہو۔ انہوں نے کہا کہ اب تو نے صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک بتایا ہے اسکے بعد انہوں نے اُسے ذبح کیا گو وہ پہلے ایسا کرتے نظر نہ آتے تھے ۞۷۱ اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا اور الزام ایک دوسرے پر تھوپنے لگے تھے اور اللہ کو وہ چیز ظاہر کرنی تھی جو تم چھپا رہے تھے ۞۷۲ لہٰذا ہم نے کہا کہ اس مُردہ پہ گائے کا ایک ٹکڑا مارو (چنانچہ اُن کا ایسا کرنا تھا کہ وہ شخص جسے قتل کیا گیا تھا زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔ لوگو! خوب یاد رکھو کہ) اللہ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرے گا۔ اور وہ تم کو اپنے نشانات دکھاتا رہتا ہے ہو سکتا ہے کہ تم سمجھ جاؤ ۞۷۳ (اس واقعہ سے تمہارے دلوں میں کچھ عرصہ کے لئے اللہ کا خوف پیدا ہو گیا مگر) پھر اُس کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے۔ بلکہ سختی میں پتھر سے بھی زیادہ بُرے۔ کیونکہ پتھروں میں سے بعض ایسے پتھر بھی ہیں۔ جن سے دریا نکلتے ہیں اور اُن میں ایسے پتھر بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اے یہود! اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے ۞۷۴ (مسلمانو! تم یہود کی سنگ دلی اور نافرمانیوں کی طویل حکایت سن چکے ہو) کیا اب بھی تم طمع رکھتے ہو

کہ وہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے جبکہ ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہو چکا ہے جو اللہ کے کلام کو سنا کرتے تھے۔ پھر جب وہ سوچ سمجھ چکتے تو اسے بدل ڈالتے اور خوب جانتے ہوتے کہ کیا کر رہے ہیں ﴿۷۵﴾ اور اب ان کی یہ حالت ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں سے وہ باتیں کیوں کہتے ہو جنکا علم اللہ نے تمہیں دیا ہے کیا اسلئے کہ وہ اللہ کے سامنے تم پر اتمام حجت کریں کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے ﴿۷۶﴾ کیا انکو معلوم نہیں ہے کہ جن صداقتوں کو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سب اللہ کو معلوم ہیں ﴿۷۷﴾ اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا کوئی علم نہیں۔ انکو صرف جھوٹی اور خوش آئند تمناؤں اور خود ساختہ قصوں اور افسانوں کے سوا کسی چیز کا علم نہیں اور وہ جو بات بھی کرتے ہیں قیاس اور تخمینے سے کرتے ہیں ﴿۷۸﴾ اسی طرح بُرا ہو اُن کے عالموں کا جو اپنے ہاتھوں سے تورات کو لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اسطرح وہ اُسے بیچکر کچھ مالی فائدے حاصل کر سکیں۔ بُرا ہو اُنکا اس تحریر کی وجہ سے جو اُنہوں نے لکھی اور بُرا ہو اُن کا اُس چیز کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل کی ﴿۷۹﴾ اور ان تمام بداعمالیوں، نافرمانیوں اور سرکشیوں کے نہ ختم ہونیوالے سلسلے کے باوجود) وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہم کو نہ چھوئیگی اور اگر اس نے چھُوا بھی تو صرف چند گنے چنے روز۔ تم ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے اگر عہد لے رکھا ہے تو اللہ ہرگز اُسکی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ یا تم اللہ کے متعلق یونہی ایسی باتیں کہتے رہتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ﴿۸۰﴾ سنو جو کوئی بھی بُرے کام کرے گا اور اُس کو گناہوں نے گھیر رکھا ہو گا (وہ خواہ کوئی یہودی ہو یا غیر یہودی) ایسے سب لوگ دوزخ میں جائیں گے اور دوزخ ہی میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ

جو سچے دل سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ وہی لوگ اہل جنت ہونگے اور وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے (۸۲) اور وہ واقعہ یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کروگے، والدین، قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کروگے۔ حسن اخلاق اور حسن معاملت کی تعلیم دوگے، نماز پڑھوگے اور زکواۃ دوگے لیکن چند ایک کو چھوڑ کر باقی تم سب نے اس معاہدہ کی طرف سے منہ پھیرا اور اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور تم ہو ہی اُلٹے راستے جانے والے (۸۳) اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم آپس میں خون نہ کروگے اور نہ ایک دُوسرے کو اپنے شہروں سے نکالوگے۔ تم نے اس معاہدہ پر قائم رہنے کا اقرار کیا اور (اے یہود) تم اس بات کو مانتے ہو (۸۴) اس کے بعد تم لوگ وہ ہو جو آپس میں خون کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک فریق کو اُن کے شہروں سے نکال دیتے ہو۔ اُن کے خلاف، اُن کے دشمنوں کو ناجائز اور سراسر ظالمانہ مدد دیتے اور اُن سے مدد لیتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو تم معاوضہ[1] دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ اُن کا شہروں سے نکالنا ہی سرے سے تمہارے اوپر حرام قرار دیا گیا تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ تم تورات کے بعض احکام پر ایمان لاتے انہیں مانتے اور اُن پر عمل کرتے ہو اور بعض سے عملاً انکار کر دیتے ہو۔ خوب سن رکھو کہ تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا۔ اُس کی سزا دنیا میں ذلّت و رسوائی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتی اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب میں پہنچایا جاوے گا۔ اور خوب یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں (اُس کو تمہاری حیلے سازیاں، تمہاری فریب کاریاں تمہارا اخلاص اور تمہاری منافقت سب چیز کا پورا پورا

---

[1] موسوی شریعت میں اس امر کی بڑی تاکید تھی کہ اگر کوئی یہودی قید ہو کر آئے تو اُسے معاوضہ دے کر چھڑا لیا جائے اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم لوگ اکثر احکام الٰہی کو تو چھوڑ دیتے ہو مگر وہ چند ایک احکام جن پر تم بوجہ رسم و رواج پابند ہو انہیں بجا لاتے ہو حالانکہ یہ بھی ایک جرم ہے ؎

حال معلوم ہے) ﴿۸۵﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو دے کر دُنیا کی زندگی کو خرید لیا ہے لہٰذا اُن کی سزا کو (خواہ وہ دُنیا میں دی جائے یا آخرت میں) ہلکا نہ کیا جاوے گا اور نہ کسی طرح اُن کی مدد کی جاسکے گی ﴿۸۶﴾ اور بلا شبہ ہم نے موسیٰ کو تورات دی اور اس کے بعد پے درپے کئی رسُول بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے صریح معجزات دئے اور جبریل کے ذریعے اسکی امداد کی۔ لیکن اسکے باوجود کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کبھی کوئی رسُول وہ احکام اور ہدایات لیکر تمہارے پاس پہنچا جو تمہارے ذوق پر گراں تھیں تو تم نے اپنی اہمیت اور اپنی معلومات کو بڑا ثابت کرنا چاہا اور اسطرح بعض نبیوں کو تم نے کہا کہ تم جھوٹے ہو اور بعض کو جان سے ہی مار دیا ﴿۸۷﴾ (یہود کے گذشتہ حالات و واقعات تم سن چکے اب جبکہ اسلام اُنکے سامنے پیش کیا گیا ہے) انہوں نے کہہ دیا ہے کہ ہمارے دِلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے (ہم پر اب اسلامی تعلیمات کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ سنو یہ بات نہیں ہے، بلکہ اُنکے پیہم کفر و انکار کی وجہ سے اللہ نے اُن پر لعنت کر دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاسکتے ﴿۸۸﴾ اور جب اُنکے پاس اللہ کی طرف سے قرآن آیا جس نے اس کتاب کی تصدیق کی جو اُن کے پاس ہے ﴿۸۹﴾ اور اس سے قبل وہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ! ان کافروں کے خلاف جو تورات کو نہیں مانتے۔ نبی آخر الزمان کو بھیجکر ہماری مدد کر — تو جب اُنکے پاس وہ رسول آیا جسے انہوں نے تورات کے بتلائے ہوئے نشانات کی مدد سے پہچان لیا، تو انہوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کر دیا (ایسے ضدّی، غیر معقول اور بد ذوق منکروں پر اللہ کی لعنت ہو ﴿۹۰﴾ کس قدر بری ہے وہ قیمت جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچا کہ اللہ نے جو کلام نازل کیا ہے اُس سے وہ انکار کریں (اور وہ بھی محض) اس حسد کی بنا پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کسی پر چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے اپنا کلام نازل کر دیتا ہے۔ بدیں وجہ وہ اپنے اوپر

غضب پر غضب لے آئے اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا (۹۱) اور جب اُن سے
کہا جاتا ہے کہ (اے یہود!) اللہ نے اب جو کلام نازل کیا ہے اُس پر ایمان لے آؤ۔ تو وہ کہتے ہیں
کہ جو کچھ ہم پر نازل ہؤا ہے ہم اُسے مانتے ہیں۔ اور اُس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اُسے نہیں مانتے
حالانکہ یہ (قرآن) کلام حق ہے۔ اور اُس کتاب کی جو یہود کے پاس ہے تصدیق کرتا ہے (ذرا
اُن سے) پوچھو کہ اگر تم واقعی اپنی کتاب کو مانتے ہو۔ تو (بتاؤ کہ) اس سے قبل تم نے نبیوں کو قتل
کیوں کیا (۹۲) مُوسیٰ تمہارے پاس صریح احکام اور کھلے نشانات لیکر آیا۔ لیکن اس کے باوجود
تم نے اُس کے پیچھے گائے کے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور تم تو قوم ہی ایسی ہو جو عادۃً ظالم
و نافرمان ہو (۹۳) اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے سروں کے اُوپر
طور کو لٹکا دیا تھا۔ (اور کہا تھا کہ) جو کچھ ہم نے دیا ہے اس کو قوت سے پکڑے رہو اور فرمانبردار
بن کر سنو۔ (تمہارے بڑوں نے جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا) کہا کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا
اور (وُہ سنتے اور مانتے بھی کس طرح کیونکہ) پیہم کفر و انکار کی وجہ سے اُن کے دلوں میں گائے کے
بچھڑے کی محبت رچا دی گئی تھی (اے پیغمبر اسلام اِن کو) بتاؤ کہ تمہارا ایمان جس بات پر تمہیں لگا
رہا ہے وہ بہت ہی بُری ہے تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے اگر تم ایمان والے لوگ
ہو (۹۴) (اے پیغمبر! یہودیوں سے) تم کہدو کہ تمام لوگوں میں سے آخرت کی آسائشیں اور اُس کی
نعمتیں تنہا تمہارے ہی لئے ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو (۹۵) تم خوب یاد رکھو کہ اپنے
اعمال کے پیش نظر وہ ہرگز کوئی ایسی تمنا نہ کرینگے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے (۹۶) (اے
پیغمبر اسلام) تم ان یہودیوں کو تمام لوگوں سے بڑھکر جان کے پیارے دیکھو گے حتیٰ کہ یہ اُن
مشرکوں سے بھی زیادہ اس جان کو عزیز رکھتے ہیں جن کو آخرت پر کوئی ایمان نہیں۔ ان میں
سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ وہ ایک ہزار سال تک جیتا رہے (سنو اور اس حقیقت کو یاد

رکھو کہ) کوئی شخص عذاب الٰہی سے محض اس لئے نہیں بچ سکتا کہ اس نے لمبی عمر پائی ہے اللہ
تمہارے اُن اعمال کو دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۹۷﴾ (اے پیغمبر) کہہ دو کہ جو کوئی جبریل کا محض اس لئے
دشمن ہے کہ اُس نے اللہ کے حکم سے تیرے دل پر اُس کلام کو اتارا ہے جو اُس کتاب کی تصدیق
کرتا ہے جو اُنکے پاس ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے راہ دکھانے اور خوشخبری دینے
والا ہے ﴿۹۸﴾ (سو) جو کوئی اللہ کا، اس کے ملائکہ کا، اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائیل
کا دشمن ہے تو وہ یاد رکھے کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۹﴾ اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھے بالکل
کھلے کھلے اور واضح احکام دئے ہیں اور اُن کی تعمیل کرنے سے ماسوا اُن کے جو عادی بدکار
اور نافرمان ہیں کوئی انکار نہیں کر سکتا ﴿۱۰۰﴾ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے جب کبھی (اللہ
اور اُس کے رسُول کی اطاعت کا) عہد باندھا تو اُن میں سے ایک فریق نے اُسے دے پھینکا
بلکہ اکثروں نے تو سروں سے اُس عہد کو مانا ہی نہیں ﴿۱۰۱﴾ اور جب بھی اللہ کی طرف سے اُن
کے پاس کوئی رسول آیا ہے جس نے تورات کی جو اُن کے پاس ہے تصدیق کی، تو انہیں
سے جو تورات کے علم سے واقف تھے اِن میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو ایسا پسِ پشت
ڈالا کہ گویا اُن کو اُس کا کوئی علم ہی نہیں ﴿۱۰۲﴾ اور (بجائے تورات کے ٹھوس علم کے) وہ اُن
خرافات کے پیچھے ہو لئے جن کی اشاعت شریر النفس جہلاء سلیمان پیغمبر کے زمانہ میں کیا کرتے تھے اور
سلیمان پیغمبر کافر نہیں تھا (کہ وہ خرافات اور بے سر و پا سنی سنائی باتوں کے پیچھے ہو لیتا)
ہاں کافر تھے وہ شریر النفس جہلاء جو لوگوں کو جادوگری، شعبدہ بازی، ہپناٹزم مسمریزم اور
اسی قسم کی دُوسری خرافات سکھاتے تھے اور وہ (علمائے یہود بجائے کلام الٰہی کے) اُن تعلیمات
کو سیکھنے اور ماننے لگے جو البقول اُن کے) بابل کے دو فرشتوں ہاروت ماروت پر نازل

لے نجات کا دارومدار عمر کے لمبا یا چھوٹا ہونے پر نہیں ہے بلکہ اُس کا دارومدار اعمال کے اچھا یا برا ہونے پر ہے

کی گئی تھیں۔ یہ ہاروت و ماروت کسی کو یہ خرافات نہ سکھاتے تھے جب تک (تہذیبِ قلوب کے خاطر)
یہ نہ کہہ لیتے تھے کہ دیکھو ہم تو محض مصیبت اور عذاب میں پڑے ہوئے ہیں تو تم بھی کلامِ الٰہی کو چھوڑ
کر اور ان خرافات کے پیچھے وقت ضائع کر کے) کافر نہ بن لیکن وہ اس کے باوجود اُن سے ایسی
ایسی باتیں سیکھتے جن سے وہ میاں بیوی تک میں جدائی ڈلوا دیتے ـــــ اور یاد رکھو کہ یہ لوگ
کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہو ـــــ اور وہ
لوگ (کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر) وہ وہ خرافات سیکھتے جن سے اُن کا وقت ضائع ہوتا اور انہیں نقصان
پہنچتا اور فائدہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ اُن کو خوب معلوم ہے کہ جو کوئی کتابِ الٰہی کے بدلے کسی اور
چیز کو حاصل کریگا آخرت میں اُس کا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ اور کتنی بُری ہے وہ قیمت ـــــ
دنیاوی فوائد اور لذاتِ نفس ـــــ جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے۔
اے کاش اُن کو اس بات کا علم ہوتا۔ (۱۰۳) اے مسلمانو! اپنے نبی کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے
لفظ "رَاعِنَا" کا استعمال نہ کیا کرو (کیونکہ یہود اس لفظ کے تلفظ میں تھوڑا سا تصرف کر کے
اسے گالی اور تضحیک کا کلمہ بنا لیتے ہیں) تم "اُنْظُرْنَا" کے لفظ سے نبی کو مخاطب کرو اور جو
کچھ وہ کہے اُسے (ادب سے) سنو۔ یاد رکھو نہ ماننے والے بے ادب اور گستاخ لوگوں کے لئے
دردناک عذاب تیار ہے (۱۰۴) دیکھو ان اہلِ کتاب میں سے جو لوگ ایمان لا کر مسلمان نہیں
ہوئے۔ نہ یہ اور نہ مشرکین اس بات کو پسند کرتے ہیں۔ کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے
کوئی اچھی چیز (خواہ وہ علم و معرفت ہو اور خواہ برکاتِ نبوّت) نازل ہو لیکن اللہ جسے چاہتا ہے
اپنی رحمت کیلئے چُن لیتا ہے (وہ کسی ایک قوم یا کسی ایک قبیلہ کے لئے مخصوص ہو کر نہیں
رہ گیا) یاد رکھو اللہ بڑے فضل و کرم اور بڑی بلند شان والا ہے (۱۰۵) (اے پیغمبرِ اسلام!) یہود
جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تورات کو تم اللہ کا کلام مانتے ہو اور قرآن کو بھی حالانکہ قرآن کے بعض

احکام صریحاً تورات کے احکام کے خلاف ہیں پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ تورات میں اللہ نے جو کچھ حکم دیا ہے قرآن میں اُسکے خلاف کچھ اور کہے، تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ) اگر ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اُس جیسا اور حکم (بمقتضائے وقت) دے دیتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۶) کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے (اور اس بادشاہت کو چلانے کے لئے وہ جیسے اور جب چاہتا ہے احکام بھیجتا رہتا ہے اور اس کے احکام کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ سنو، لوگو! اگر تم اللہ سے بغاوت کرو اور اس کے احکام کے ماننے میں پس و پیش کرو تو یاد رکھو کہ) اللہ کے ماسوا کوئی نہیں ہے جو تمہیں اُس کے عذاب سے پناہ دے سکے اور اُس کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکے (۱۰۷) (اے مسلمانو! یہود کے اکسانے پر) کیا تم بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسُول سے سوالات پوچھو جیسا کہ اس سے قبل موسیٰ سے سوالات پوچھے گئے (اور اُسے پریشان کیا گیا۔ سنو، اس طرح شک و شبہ میں پڑ کر سوالات کا پوچھنا یا پیغمبر کے لئے پریشانی کا موجب بننا، ایمان کو ضائع کرنا ہے) اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر حاصل کرے، تو سمجھ لو کہ وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستہ پر ہو لیا (۱۰۸) اے مسلمانو! بعد اس کے کہ یہود کو حق بات معلوم ہو چکی ہے اُن میں سے اکثر از راہ حسد دل سے چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلمان ہو جانے کے بعد وہ تمہیں پھر کافر بنا ڈالیں۔ مگر سر دست تم اِن شرارتوں کو معاف کرو اور ان سے در گذر کرتے رہو حتیٰ کہ (اس بارہ میں) اللہ تمہیں کوئی حکم دے۔ خوب یاد رکھو کہ (یہ یہود تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے) گو علم و فضل واثر و رسوخ، مال و دولت اور کثرت افراد کے لحاظ سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر قوی اور مضبوط ہیں مگر) اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے (وہ جو کچھ کرنا چاہے اُس کے لئے مشکل نہیں) (۱۰۹) اے مسلمانو! یہود کی شرارتوں سے بچنا چاہتے ہو۔ تو اپنے اندر اخلاقی

قوت پیدا کرو اور منظم ہو جاؤ اور وہ اسطرح کہ) تم پابندی سے نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور (اسکے
علاوہ) قوم کے لئے جو کچھ تم از راہ خیرات وصدقات دوگے یا انفرادی و اجتماعی نیکی کا کوئی کام
کروگے۔ اُس کا اجر تم اللہ کے پاس پاؤگے خوب ذہن نشین کر رکھو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ
اُسے دیکھتا ہے (۱۱۰) (اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ "جنت میں صرف وہی جائیگا جو
جو یہودی ہو یا نصرانی"۔ یہ اُن کی خوش عقیدگیاں اور جھوٹی آرزوئیں ہیں۔ ان سے کہدو کہ اگر تم سچے
ہو تو اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل لاؤ (۱۱۱) مسلمانو! یہود و نصاریٰ کا یہ دعوے بالکل غلط
ہے سنو جنت میں صرف وہی داخل ہوگا جس نے اپنے آپ کو اللہ پر چھوڑ دیا، اُسی کا ہو رہا اور
دل سے مخلص ہو کر نیکی کے کام کرنے والا ہو۔ ایسے شخص کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور
ایسوں کے لئے نہ دنیا میں کوئی ڈر ہے نہ آخرت میں اُن کو غم کھانا پڑے گا ع (۱۱۲) اور سنو ع
یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ حق پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود حق پر نہیں ہیں حالانکہ
دونوں ایک ہی کتاب[1] پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ[2] بھی کرتے ہیں جن کو کچھ معلوم
نہیں۔ یاد رکھو کہ ان جھگڑا کرنے والوں کے درمیان قیامت کے روز اللہ اُن تمام باتوں کا
فیصلہ کردے گا جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں (۱۱۳) (مسلمانو!
یہود، نصاریٰ اور مشرکین جو اس وقت تمہارے مدمقابل ہیں، تم اُن کی اخلاقی حالت، اُنکی
مذہبیت اور اُن کی سیاہ کاریوں سے واقف ہو چکے ہو۔ یہ لوگ وعظ و نصیحت سے راہ راست
پر آنے والے نہیں ہیں۔ یہ تمہیں مسجدوں میں جانے سے روکتے اور تمہاری عبادت میں مخل
ہوتے ہیں) اور اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اسلئے بند
کردے کہ انہیں اللہ کا نام لیا جا رہا ہے اور انکی خرابی اور بے آبادی کے لئے کوشش کرے

---

[1] بائیبل [2] مشرکین جن کے پاس کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے

حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کی مسجدوں میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے (چہ جائیکہ یہ گستاخانہ وہاں آئیں اور عبادت گذاروں کو تنگ کر کے وہاں سے نکال دیں) ان لوگوں کے لئے دُنیا میں ذلّت و رسوائی[1] ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہوگا (۱۱۴) (مسلمانو!) تمہیں مسجدوں میں نماز گذارنے سے روکا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کھلے میدانوں میں، گھروں میں یا جہاں تمہارا جی آئے نماز گذارو یاد رکھو کہ) یہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں، سو تم جدھر منہ کرو گے اُدھر ہی اللہ کو پاؤ گے۔ یہ یاد رکھو کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے وہ کسی خاص جگہ میں گھرا ہؤا نہیں اور اُسے ہر چیز کا علم ہے کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا (۱۱۵) (مسلمانو! یہ یہود و نصارٰی اور یہ مشرکین[2] خدائے واحد کی عبادت نہیں کرتے) یہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد (بھی) رکھتا ہے (سو یہ اُس مزعومہ اولاد کو اپنا قاضی الحاجات بنائے بیٹھے ہیں) مگر خبردار مسلمانو! اللہ ان عیوب سے پاک اور بالاتر ہے، اُس نے کسی کو اولاد نہیں بنا رکھا (اور اس کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے) یہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور ہر چیز اس کی مطیع اور فرمانبردار ہے (۱۱۶) ان آسمانوں کا اور زمین کا وہی خالق ہے اور ایسا خالق کہ اُس نے ان کو کسی سابقہ نمونہ پر نہیں بنایا اور نہ پہلے سے موجود کسی مادہ سے اِن کو تخلیق کیا ہے بلکہ یہ اُس کی صنعت و کاریگری کا بے مثال، لاجواب اور حیرت زا نمونہ ہے اور اُسکے لئے اس میں مشکل ہی کیا ہے وہ جب کسی کام کو سرانجام دینے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اُسے صرف اتنا کہتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتا ہے (۱۱۷) اور وہ لوگ[2] جو کچھ نہیں جانتے وہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی (کہ ہم پیغمبر اسلام کو سچا مانیں) ——— اسی طرح کی باتیں وہ لوگ بھی کیا کرتے تھے جو ان سے پہلے ہو گذرے

---

[1] یہ پیشگوئی تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حرف بحرف پوری ہو کر رہی اور تاریخ اب تک اس پر شاہد ہے۔

[2] مشرکین عرب۔

ہیں ان سب کے دِل ایک جیسے ہیں ـــــ ایک کیا ہم نے کئی نشانیاں[1] واضح کردی ہیں لیکن اُنکو دیکھتے وہی لوگ ہیں جو یقین لانے کا ارادہ رکھتے ہوں (۱۱۸) یہ بات شک و شبہ سے بہت بالا ہے کہ ہم نے تجھے مذہب حق دے کر بھیجا ہے تاکہ تو ایمان لانے والوں کو اُنکے نیک انجام کی خوشخبری دے اور نہ ماننے والوں کو اُن کی بدانجامی کے نتائج و عواقب سے ڈرائے اور (ایمان لانا یا نہ لانا لوگوں کا اپنا کام ہے) تجھ سے ایسے لوگوں کے متعلق کوئی بازپرس نہ ہوگی جو دوزخ کے مستحق ہیں (۱۱۹) اور یہ یہود و نصاری تجھ سے اُس وقت تک ہرگز خوش نہیں ہو سکتے جب تک تو اُن کے دین کا تابع نہ ہو جائے ـــــ ان کو کہدو کہ اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے ـــــ اور اگر تو نے اب اُن کی خواہشات کی پیروی کی جبکہ تجھے دین کا صحیح صحیح علم پہنچ چکا ہے تو (یاد رکھ لے کہ) تجھے اللہ سے نہ کوئی پناہ دے سکیگا اور نہ کوئی تیری مدد کر سکے گا (۱۲۰) وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے (اور) وہ اُسے پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے (یعنی نہ اُسکے معنیٰ و تاویل میں تحریف کرتے ہیں اور نہ عمل سے جی چراتے ہیں) حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اُس کتاب کو مانتے ہیں اور جو کوئی اسے نہیں مانتا وہ اور ویسے سب لوگ خسارہ میں رہنے والے ہیں (۱۲۱) ع اے اسرائیل کی اولاد! تم میری اُن مہربانیوں ع

کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو تمام اہلِ جہاں پر ترجیح دے رکھی تھی (۱۲۲) اور پھر اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی متنفس کسی دوسرے کے کام نہ آسکے گا، نہ کسی کی سفارش کام دیگی اور نہ ایسے لوگوں کو کہیں سے مدد پہنچ سکے گی (۱۲۳) اور یاد کرو اُس واقعہ کو جب تمہارے مورثِ اعلےٰ حضرت ابراہیم کو اُسکے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن میں پورا اترا تھا، تو اللہ نے کہا کہ اے ابراہیم میں تجھے تمام لوگوں کا پیشوا بنانے

[1] قرآن جیسا بےمثال کلام جس کی نقل اتارنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

والا ہوں - ابراہیم نے کہا اے اللہ! میری نسل میں سے بھی بعض کو لوگوں کا پیشوا بنا دے اللہ
نے کہا (کہ بہت اچھا مگر یاد رکھ) کہ میرا یہ اقرار اُن سے نہیں ہے جو نافرمان، بد کار، بدعمل
اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے والے ہونگے ﴿۱۲۴﴾ اور یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ
کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن و امان سے محفوظ رہنے کا مقام بنایا ——— تم اے
مسلمانو! مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ ——— اور ابراہیم اور اسماعیل دونوں سے ہم نے اقرار
لیا۔ کہ دیکھو تم دونوں نے میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں، یہاں ٹھہرنے والوں، اور
رکوع سجود کرنے والوں کیلئے صاف ستھرا رکھنا ہوگا ﴿۱۲۵﴾ یاد کرو اس دُعا کو جب ابراہیم نے کہا تھا
کہ اے میرے رب! اس شہر مکہ کو امن و امان کا ایک شہر بنا دے اور اس شہر میں رہنے والوں میں
سے جو کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے انکو کھانے کیلئے پھل اور میوے دے۔ اللہ نے کہا کہ جو
کوئی ایمان نہ لائیگا۔ اسکو بھی ایک قلیل عرصہ تک (یہاں رہنے کا) فائدہ اٹھانے دونگا پھر اس کو
دوزخ کے عذاب کی طرف کھینچ لاؤنگا ——— بہت بری جگہ ہے دوزخ ﴿۱۲۶﴾ اور اے یہود یاد
کرو اُس واقعہ کو (جب ابراہیم اور اسماعیل (دونوں باپ بیٹا) بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے
(اور زبان سے کہہ رہے تھے کہ) اے ہمارے رب! (ہماری اس محنت، کوشش اور خلوص کو)
ہماری طرف سے قبول فرما۔ اے اللہ! تو ہماری التجا کو سننے اور ہماری نیت اور خلوص کو جاننے
والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے ہمارے رب! تو ہم دونوں کو اپنا مخلص فرمانبردار بنا لے اور ہماری نسل میں سے ایک
ایسی جماعت بنا لے جو تیری فرمانبردار ہو اور (اے رب!) ہمیں اپنی عبادت کے راستے دکھا دے اور
بالخصوص حج کے طریقے بتا دے اور ہم پر (ہمیشہ) مہربان رہ۔ صرف تو ہی (اے رب) توبہ قبول کرنیوالا
رحم کرنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اے ہمارے رب! اس فرمانبردار جماعت (اُمّت مسلمہ) میں ایک ایسا
رسُول پیدا کر جو انہیں میں سے ہو جو انہیں تیرے احکام اور تیری وحی پڑھ کر سنائے۔

اور اُنہیں قرآن اور (اس کے) حکمت و فلسفہ کی تعلیم دے اور انہیں شرک اور نافرمانی کی نجاست سے پاک کرے ——— تو ایسا غالب ہے کہ جس بات کا ارادہ کرے اُس سے تجھے کوئی روک نہیں سکتا اور ایسا دانا ہے کہ تیری حکمت و دانائی تمام عیوب سے پاک ہے (۱۲۹) اور ابراہیم کے اعتقاد اور طریقے سے کون مُنہ موڑ سکتا ہے ماسوائے اس کے جو خود بخود بے وقوف بن بیٹھے ——— ہم نے تو اُسے دُنیا میں منتخب کر لیا ہے اور آخرت میں بھی یقیناً وہ صلحاء کے زمرہ میں ہوگا (۱۳۰) (اگر تم چاہتے ہو کہ ابراہیم کو تمہارا پیشوا بنائے جانے کی وجہ تمہیں معلوم ہو، یا یہ معلوم ہو کہ ہم نے اُسے اتنے بڑے اعزاز اور انعام کے لئے کیوں منتخب کیا تو اس وقت کو یاد کرو) جب اسکے رب نے اس سے کہا تھا (کہ اے ابراہیم!) اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے اور میرا فرمانبردار بن جا تو اس نے (جھٹ سے) پکار دیا تھا کہ ہاں میں نے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیا اور اس کا فرمانبردار بن گیا جو تمام کائنات کا خالق، مربّی اور نگہبان ہے (صرف اسی ایک واقعہ سے تم اندازہ کر لو کہ ابراہیم ہمارا کس قدر مخلص فرمانبردار تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے ہماری نگاہ میں عزت کا وہ مقام پایا جو کسی دُوسرے کو کم نصیب ہوگا) (۱۳۱) اور اسی موحدانہ اعتقاد اور مخلصانہ فرمانبرداری (دینِ ابراہیمی) کی وصیّت[1] ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب کو، کی (اُن سے کہا کہ) اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو منتخب فرمایا ہے لہٰذا تمہاری موت نہیں ہونی چاہیئے اِلّا محض ایسی حالت میں جبکہ تم اس دین پر پوری طرح قائم ہو یا بالفاظِ دیگر پکے موحّد، خدا پرست خداشناس اور خدا کے پُورے پُورے مطیع و فرمانبردار ہو (۱۳۲) (اے یہود! تم غلط کہہ رہے ہو کہ یعقوب نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو "یہودیت" پر قائم رہنے کی وصیّت کی تھی سنو) جب یعقوب کی موت کا وقت قریب آیا، جب اس نے اپنے بیٹوں سے

[1] دین سے مراد دینِ ابراہیمی یعنی کامل اطاعت اور موحدانہ اعتقاد کا دین جو حضرت ابراہیم کا دین تھا اور خواہ عبرانی وغیرہ زبانوں میں اسکا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو عربی زبان میں اسکا نام "اسلام" ہے۔

پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے، تو تم حاضر نہ تھے۔ (معلوم ہے انہوں نے کیا جواب
دیا) انہوں نے جواب دیا تھا کہ (ابا!) ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادوں، ابراہیم، اسماعیل اور
اسحاق کے معبودِ واحد، کی عبادت کرینگے اور اُسی کے فرمانبردار اور عبادت گذار ہم اب ہیں (۱۳۳)
(دیکھو یہود! فرمانبرداروں اور خدائے واحد کے پرستاروں کی) یہ جماعت تھی جو گذر چکی ہے
وہ اپنا بویا[1] کاٹیں گے اور تم اپنا بویا کاٹو گے (نہ تم کو اُنکے نیک اعمال کا کوئی فائدہ اور
نہ اُن کو تمہاری بداعمالیوں سے کوئی نقصان) اور نہ تم سے اُن اعمال کے متعلق باز پرس
کی جاوے گی جو وہ کرتے رہے ہیں (۱۳۴) یہود اور نصاریٰ کی تنگ ظرفی دیکھو) یہ کہتے ہیں کہ یہودی
یا نصرانی بن جاؤ گے تو دین کی سیدھی راہ پاؤ گے تم ان سے کہدو کہ نہیں تمہارا یہ خیال غلط
ہے۔ سیدھی راہ یہودی یا نصرانی بننے سے نہیں ملتی وہ ملتی ہے۔ دینِ ابراہیمی کی پیروی سے
لہٰذا) ہم تو دینِ ابراہیم کے متبع ہیں جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے متبع کو ہمیشہ باطل سے
حق کی طرف مائل رکھتا ہے اور ہم چلتے ہیں ابراہیم کے نقشِ قدم پر جو تمام معبودانِ باطل سے
مُنہ موڑ کر ایک اللہ کا ہو رہا تھا اور مشرکوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا (برعکس اسکے تم ابراہیم
کے متبع بھی بنتے ہو اور پورے پورے مشرک بھی ہو) (۱۳۵) (اے مسلمانو! تم کہدو کہ ہم ایمان
لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُن صحیفوں پر جو ابراہیم اسمٰعیل
اسحٰق یعقوب اور اولادِ یعقوب پر اترے تھے اور مانتے ہیں اُن کتابوں کو جو موسیٰ عیسیٰ اور
دیگر انبیاء کو اُنکے رب کی طرف سے دی گئی تھیں، ہم ان نبیوں میں سے کسی کو دوسروں سے
جدا نہیں کرتے (اور تمہاری طرح نہیں ہیں کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) اور ہم تو

---

[1] یہود کا عقیدہ تھا کہ بعض کو تو اس بات کا فائدہ پہنچ جاتا ہے کہ اُنکے بڑے نیکوکار اور خدا پرست تھے اور بعض کو اس بات کا کہ اُن کی اولاد اور نسل میں نیکوکار اور خدا پرست لوگ ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہود اور تمام اقوام دنیا کے اِس زعم کو باطل قرار دیا ہے۔

صرف اللہ ہی کے فرمانبردار اور اطاعت گذار ہیں (وہ جس کو ماننے کے لئے کہتا ہے ہم مانتے ہیں اور جس سے روک دیتا ہے اُس سے ہم رُک جاتے ہیں) (۱۳۶) اب (جبکہ اسلام کا نظریۂ اعتقاد و عمل انکے سامنے صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے) اگر یہ لوگ[1] اللہ پر اسی طرح ایمان لائیں جیسا کہ تم لائے ہو تو وہ ہدایت پا جائینگے اور اگر مُنہ موڑ لیں تو سمجھ لو کہ وہ ضد اور مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں (مگر تم تسلّی رکھو کہ) اس کے بعد اُنکی مخالفت کے شر سے تمہیں بچانے کے لئے اللہ کافی ہوگا وہ اُن کی معاندانہ سرگوشیوں کو سننے اور اُنکی خفیہ سازشوں کو جاننے والا ہے (۱۳۷) (کہدو کہ اعتقاد و عمل کا یہ جذبہ جو ہم کو اللہ نے دیا ہے یہ) اللہ کا رنگ ہے اور اُسکے دِئے ہوئے بپتسمہ کا اثر ہے) اور اللہ کے رنگنے یا بپتسمہ دینے سے کس کا رنگنا یا بپتسمہ دینا بہتر ہو سکتا ہے (محض رسمی طور پر کسی کا بپتسمہ لے لینا کوئی معنے نہیں رکھتا اپنے اوپر رنگ چھڑک لینے یا کسی خاص رسم کو بجا لانے، یا کسی خاص جگہ خاص طریقہ سے نہا لینے سے نجات نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا ایمان، صادق اور عمل، صالح نہ ہوں۔ اللہ نے ہمارے اوپر جو اپنا رنگ چڑھایا ہے، تو دیکھ لو کہ اُس کا اثر یہ ہے کہ) ہم محض اسی کے عبادت گذار ہیں (اور اسکی عبادت میں نہ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں اور نہ ہوائے نفس، ریا اور ظاہریت کو دخل دیتے ہیں) (۱۳۸) ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رب (پس مخلوق ہونے کے لحاظ سے ہم سب اسکے بندے ہیں اور اسکی رحمت کے ایک جیسے حقدار ہیں پھر تمہیں یہ کیوں اعتراض ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر اہل عرب میں سے ایک پیغمبر مبعوث کر دیا ہے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ انعامِ نبوّت کے حقدار صرف وہی لوگ ہیں جو فرمانبرداری اور

---

[1] یہود اور نصارٰی بالخصوص اور عامۃ الناس بالعموم۔

خلوص عمل سے اپنے رب کو خوش کریں تو اس لحاظ سے بھی دیکھ لو) ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا اور تمہیں تمہارے اعمال کا۔ اور (اتنا فرق تو بالکل ظاہر ہے کہ ہم تمہاری طرح مشرک نہیں) اُس کے مخلص فرمانبردار بندے ہیں (۱۳۹) (اور اگر تم اللہ کے بارے میں جھگڑا نہیں کر رہے تو پھر) کیا تم یہ دعوےٰ کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور اولادِ یعقوب سب یا یہودی تھے یا نصرانی؟ (اگر وہ "ہاں" میں جواب دیں تو) تم اُن سے پوچھو کہ اللہ کا علم زیادہ ہے یا تمہارا (ہمیں اللہ بتا رہا ہے کہ یہ جملہ حضرات نہ یہودی تھے نہ نصرانی انہیں کسی فرقہ یا گروہ سے کوئی دلبستگی نہ تھی اُنکی دلبستگی جو کچھ بھی تھی وہ دینِ حق سے تھی جبکہ جابجا تم کہہ رہے ہو کہ وہ یا یہودی تھے یا نصرانی اور جماعتی اور فرقہ وارانہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے دیکھو اے یہودیو! تم اس بات سے پوری طرح واقف ہو کہ ابراہیم ایک موحد، بے لاگ اور حق پرست نبی تھا اور تم اس بات کے بھی شاہد ہو کہ وہ یہودی نہ تھا۔ اسکے باوجود تم آج اس شہادت کو چھپا رہے ہو) اور اس شخص سے بڑھکر کون ظالم ہوگا جو اس شہادت کو جو اسکے پاس ہے اللہ سے چھپائے اور (حق نہ کہے) کیا تمہارا ایسا کرنے سے واقعات و حقائق چھپ جائینگے؟ سنو! تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے (۱۴۰) (اے یہودیو! اپنے بڑوں پر کچھ فخر و ناز نہ کرو) یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ہے وہ اپنا بویا کاٹیں گے اور تم اپنا بویا کاٹو گے اور تم سے اُن کے اعمال کی باز پرس نہ کی جاوے گی (۱۴۱)

پارہ سیقول (۲)

(مسلمانو! تم اب تک تو بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے ہو مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرتِ ابراہیم نے اپنی اُمّت کے لئے جو عبادت گاہ تجویز کی تھی وہ وہ ہے جسے تم خانہ کعبہ کہتے ہو اور جو مکّہ میں واقع ہے یہ خانہ کعبہ اس بات کا سب سے زیادہ حقدار ہے کہ اُمّت مسلمہ اس کو اپنی عبادت گاہ اور قبلہ قرار دے لہٰذا تم آج ماہِ رجب ۲ ھ سے نماز کے وقت اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف کرلیا کرو) لوگوں میں سے وہ جو بے سمجھ ہیں فوراً کہہ اٹھیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے جس کی طرف وہ رُخ کرکے پہلے نماز پڑھتے رہے ہیں کس بات نے پھیر دیا ہے ان لوگوں سے کہہ دو کہ یہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں (کسی سمت اور جگہ کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں اصل بات جو ہے وہ حکم الٰہی کی بجا آوری ہے اطراف و مقامات کی پرستش نہیں۔ اللہ کی حکمت اپنے بندوں کی سعادت جس چیز میں دیکھتی ہے اللہ تعالےٰ اسی کا حکم دے دیتا ہے اور) جس کسی کو وہ چاہتا ہے سیدھی راہ پہ لگا دیتا ہے (۱۴۲) اور (اے مسلمانو! جس طرح ہم نے تمہیں اپنے محبوب ترین گھر کو قبلہ بنانے اور اپنے خلیل ابراہیم کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے) اُسی طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین گروہ بھی قرار دیا ہے — ایسا گروہ جو افراط و تفریط سے بچکر پوری طرح اعتدال پر قائم رہے — تاکہ (جزا سزا کے روز) تم اقوامِ عالم کے خلاف شہادت دو (کہ خدا نے اپنا کوئی حکم بندوں سے اٹھا نہیں رکھا۔ بلکہ ہر چیز بلا کم و کاست واضح کردی پھر اگر کسی نے غلط روش اختیار کی ہے یا شیطان کے پھندے میں پھنسا ہے تو اس نے اپنے اختیار اور اپنی آزادی سے ایسا کیا ہے) اور یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارا نگران ہوگا۔ اور (سنو) جس قبلہ کی طرف منہ کرکے تم اب تک نماز پڑھتے رہے ہو اُسے (کچھ عرصہ کے لئے) محض اس لئے مقرر

کر دیا تھا کہ (آگے چل کر) معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور اگرچہ اُن لوگوں کے لئے جو پہلے سے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہیں اور اسکی محبّت کے جذبات دل میں رکھتے ہیں یہ تبدیل قبلہ ایک مشکل کام ہے مگر اُن (سعادت مندوں) کے لئے اسمیں کوئی مشکل نہیں جن کو اللہ سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے (اور وہ اسی کی خوشنودی کے جویاں رہتے ہیں) اور دیکھو اللہ کی رضا یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے خوب یاد رکھو کہ اللہ لوگوں پر بہت شفقت اور رحم کرنے والا ہے (لہٰذا وہ کسی کے عمل صالح کو جو اسکی رضا کے مطابق کیا جائے ضائع نہیں کرتا) (۱۴۳) (اے پیغمبر!) ہم نے تیرے منہ کا آسمانوں کی طرف اٹھنا بارہا دیکھا سو (تو تسلی رکھ) ہم تجھے اسی قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دے دینگے جسے تو پسند کرتا ہے (اور جس کی طرف تیری نگاہِ شوق اٹھ رہی ہے) لے اب مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) ہی کی طرف رُخ کرلے اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں ہُوا کرو (نماز پڑھتے وقت) اپنے منہ مسجدِ حرام ہی کی طرف کر لیا کرو۔ سنو وہ لوگ جن کو کتاب تورات دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ تحویلِ قبلہ کا امر اُن کے رب کی طرف سے بالکل برحق اور بجا ہے لیکن اس جاننے بوجھنے کے باوجود جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل و بے خبر نہیں (۱۴۴) اِن اہلِ کتاب کے پاس اگر تم ہر قسم کے دلائل لے آؤ تو بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کرینگے اور وہ تو آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں ہیں۔ اور اب جبکہ تمہیں قبلہ کا صحیح صحیح علم پہنچ چکا ہے تم اُن کی خواہشات پر چلو تو بلا شبہ تمہارا نام بھی ظالموں کی فہرست میں شامل ہو جائیگا (۱۴۵)

وہ لوگ جن کو ہم نے تورات کا علم دیا ہے وہ اس حقیقت کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچان لیا کرتے ہیں۔ اور خوب یاد رکھو کہ اِن میں ایک گروہ ایسا

بھی ہے جو امرِ حق کو باوجود اس کو خوب جاننے کے چھپاتا ہے (۱۴۶) (بہر حال) یہ معاملہ تیرے رب
کی طرف سے ایک امرِ حق ہے لہٰذا تجھے اس بارے میں کبھی شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو
جانا چاہیئے (۱۴۷) دیکھو ہر کسی نے ایک سمت مقرر کر رکھی ہے جس کی طرف وہ منہ کر کے عبادت ع
گذارتا ہے (مسلمانو!) تم نیکیوں کی طرف لپکو اکہ مسلمان کا اصل قبلہ نیکی ہی ہے ا ور اس بات کو
ہر وقت ذہن نشین رکھو کہ) تم جہاں کہیں ہو گے اللہ تم سب کو (حشر کے میدان میں) اکٹھا کر
دیگا۔ یاد رکھو کہ اللہ کو ہر بات پر قدرت حاصل ہے (۱۴۸) اور تم جہاں کہیں سے بھی نماز پڑھنے
کے لئے نکلو اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کر لیا کرو اور خوب یاد رکھو کہ یہ حکم تمہارے رب کی
طرف سے بالکل حق پر مبنی ہے (اور اگر تم دل میں کوئی شک وشبہ رکھو یا لیت ولعل یا رواداری
سے کام لینا چاہو تو خوب یاد رکھو کہ) اللہ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں (۱۴۹) اور تو جہاں
کہیں سے بھی نماز ادا کرنے کے لئے نکلے اپنا مُنہ مسجد حرام ہی کی طرف کر لیا کر۔ دیکھو اس تحویل
کعبہ سے لوگوں کا وہ اعتراض بھی اٹھ جائیگا جو وہ تم پر کرتے ہیں۔ ماسوائے اُن لوگوں کے
اعتراضات کے جن کا شیوہ ہی حدود کو توڑنا اور اعتدال کو فنا کر دینا ہے سو تم ان لوگوں سے
اب مت ڈرو۔ ڈرنا ہے تو مجھ سے ڈرو اور دیکھو یہ تحویل کعبہ ہمارے انعامات میں سے تم پر ایک
انعام ہے ہو سکتا ہے کہ تم اس طرح ہدایت پا جاؤ (۱۵۰) تمہارے لئے ہم نے جو علیحدہ اور انتہائی
قبلہ مقرر کر دیا ہے تو یہ بھی ویسا ہی ایک انعام ہے جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہاری
ہی قوم میں سے بھیج دیا ہے جو تم کو ہماری آیات اور ہمارے احکام پڑھکر سناتا ہے اور تمہارے
دلوں کو نفاق، کفر اور شرک کی پلیدیوں سے پاک کرتا ہے اور تم کو قرآن پڑھاتا اور اُس کی

سلہ یہود کہتے تھے کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی عجیب ہیں کہ قبلہ تو ہمارا مانتے ہیں اور دین ہمارے سے اختلاف
کرتے ہیں ادھر مشرکین عرب کہتے تھے کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کے مدعی ہیں مگر قبلہ یہود کا مانتے
ہیں ؎

حکمتوں سے آگاہ کرتا ہے اور تم کو وہ وہ حقائق سکھاتا ہے جن کا تمہیں اس سے پہلے کوئی علم
نہ تھا (۱۵۱) سو تم کو چاہیئے کہ تم میرا ہی ذکر کرو اور میرا شکر بجا لاؤ (کہ تم پر ایسے ایسے انعامات
کئے ہیں) اور میری ناشکری[1] نہ کرو (۱۵۲) ع

اے مسلمانو! (راہ حق کی اتباع میں تم پر جو سختیاں آئیں تم اُن سے گھبراؤ نہیں بلکہ) صبر و
استقامت اور نماز کے ذریعے اللہ سے مدد طلب کرو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ صبر کرنیوالوں کیساتھ
رہتا ہے (۱۵۳) اور دیکھو جو لوگ دین حق کی راہ میں مارے جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو
وہ (درحقیقت) زندہ رہتے ہیں لیکن انکی زندگی کی کیفیت کو تم نہیں سمجھتے (۱۵۴) اور ہم تمہیں
خطرات کا کسی قدر خوف دلا کر، کبھی بھوکا رکھ کر، کبھی تمہارے مال، تمہاری جان اور پھل کو
نقصان پہنچا کر امتحان میں ڈالینگے (تاکہ معلوم ہو کہ کون ہے جو مصائب میں بھی اللہ پر پورا
ایمان رکھتا ہے اور صبر و شکیبائی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کون ہے جو گھبرا کر مایوس
و متذبذب ہو جاتا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے) اور تم (ایسے) صبر کرنے والوں کو خوشخبری
دے دو (۱۵۵) جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ (بے ساختہ) کہہ اٹھتے ہیں کہ
ہم تو اللہ ہی کے ہیں (وہی ہمارا مالک ہے اور اسی کے قبضے میں ہماری باگ ڈور ہے)
اور (یہ چند روزہ دنیاوی زندگی گزارنے کے بعد) ہم سب کو اُس کی طرف جانا ہے (۱۵۶)
ان (صبر آزما بہادر مسلمانوں) پر اللہ کی عنائتیں اور اُس کی رحمتیں (نازل ہوتی) ہیں اور
یہی لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر لگے ہوئے ہیں (۱۵۷) (دیکھو مسلمانو! خوب یاد رکھو کہ صفا اور
مروہ (جن کے درمیان تم حج کرتے وقت دوڑتے ہو) اللہ کے مقرر کردہ نشانات اور اُسکے
دین کی یادگار ہیں۔ لہذا جو کوئی خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ بجا لائے اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے

---

[1] اللہ کے احکام کو نہ ماننا۔ اُن پر عمل نہ کرنا اور اس کا خوف دل میں نہ رکھنا اللہ کی ناشکری کرنا ہے۔

کہ وہ ان دونوں کے درمیان چکر کاٹے اور جو کوئی حج اور عمرہ کے علاوہ بھی اپنی خوشی سے
کوئی کارِ خیر (مثلاً یہی سعی مابین صفا و مروہ) بجا لائے تو خوب یاد رکھو کہ اللہ قدر دان ہے۔ وہ
اپنے بندے کے کسی قابل قدر فعل کو اکارت نہیں جانے دیتا بلکہ انعام و اکرام سے سرفراز
کرتا ہے اور) وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے (اس لئے کوئی اس کو ظاہر داری کا فریب نہیں دے
سکتا۔ بلکہ وہ اخلاص عمل سے خوب واقف ہے) (۱۵۸) جو لوگ ہمارے کھلے کھلے نشانات
اور ہماری بتلائی ہوئی راہِ حق کو اُس وقت بھی چھپا رہے ہیں جب کہ ہم نے ہر چیز کو لوگوں
کی خاطر کتب قدیمہ میں صاف صاف بیان کر دیا ہے تو یہی لوگ وہ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے
اور جن پر ہر کوئی لعنت بھیجتا ہے (۱۵۹) مگر جو لوگ اس رویہ کو چھوڑ کر آئندہ کے لئے توبہ
کریں اپنی اصلاح کرلیں اور حق بات کو صاف صاف بیان کرنے لگیں اُنکی توبہ قبول کر لیتا
اور اُن پر مہربان ہو جاتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا ہوں (۱۶۰)
جو لوگ ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور اسلام نہ لائے اور مر گئے درآں حالیکہ کافر ہی تھے۔ تو
وہ لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ کی ملائکہ کی اور تمام لوگوں کی لعنتیں برستی ہیں (۱۶۱) یہ لوگ ہمیشہ
اُسی حالت میں رہیں گے۔ نہ اُن سے عذاب ہلکا ہونے پائے گا اور نہ اُن کو کوئی مہلت
دی جائے گی (۱۶۲) اور (دیکھو) تم سب کا معبود ایک ہی ہے (جو تمہارا خالق، رب اور
حاجت روا ہے) بجز اُس کے جو بڑا مہربان اور تازہ بتازہ نو بنو احسانات کرنے والا
ہے کوئی معبود نہیں ہے ع (۱۶۳) ان آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات ع
دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں سمندر میں لیکر
چلتے ہیں اور مینہ میں جس کو اللہ بادلوں سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین
کو اس کے خشک اور بنجر ہوئے پیچھے پھر شاداب اور زرخیز کرتا اور ہر قسم کے جانور اسمیں پھیلا

دیتا ہے اور ہواؤں کے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان
اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں (غرضیکہ کائنات کی ہر چیز میں) اُن لوگوں کے لئے
جو عقل رکھتے ہیں طرح طرح کی نشانیاں[ف] موجود ہیں (۱۶۴) اور (اس کے باوجود) لوگوں میں
سے بعض وہ بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو بھی اُس کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں اور اُن سے
ایسی محبّت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیئے ــــــ اور جو صاحب ایمان ہیں اُنکے
دلوں میں اللہ ہی کی محبت سب سے زیادہ ہوتی ہے ــــــ اپنی آنکھوں کے سامنے عذاب
کو دیکھکر ان مشرکوں کو معلوم ہوگا۔ کہ طاقت تمام تر اللہ ہی کے لئے ہے اور وہی اس کا
مالک ہے اور یہ کہ اللہ کی سزا سے بڑھکر کوئی سزا نہیں۔ اے کاش یہ چیز ان کو ابھی معلوم
ہو جاتی (۱۶۵) اللہ کی اس قوت و طاقت اور اُس کی ناراضی و سزا کا یہ اندازہ اُن کو اس
وقت ہوگا جب وہ معبودان باطل جن کی پیروی کی گئی تھی اپنے پیروی کرنے والوں سے
اظہار بیزاری کرینگے اور ان کو اپنی سزا آنکھوں کے سامنے نظر آجائے گی۔ اور ان کے
تمام وسائل و اسباب ٹوٹ کر رہ جائیں گے (۱۶۶) پیروی کرنے والے لوگ کہیں گے کہ
اگر ہمیں ایک مرتبہ اور دُنیا میں جانا ہو تو جس طرح آج انہوں نے ہم سے بیزاری کا اظہار
کیا ہے ہم بھی ان سے اس طرح کریں۔ اسی طرح اللہ ان مشرکوں کے اعمال کو انہیں
دکھا دکھا کر شرمندہ و نادم کریگا۔ اور وہ کبھی دوزخ کی آگ سے نکلنے نہیں پائیں گے (۱۶۷) ع
اے لوگو! زمین پر جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ (اور خدا کا شکر بجالاؤ) اور
شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو (کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے لگو) وہ تمہارا کھلا
ہوا دشمن ہے (اور تمہیں ہمیشہ الٹے مشورے دیتا اور قانون الٰہی توڑنے کی ترغیب دیتا رہتا

ف فِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

ہے) (۱۶۸) وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی ترغیب دیگا۔ اور (چاہیگا) کہ تم سے وہ
باتیں کہلوائے جن کا تمہیں کوئی علم ہی نہیں (۱۶۹) اور جب اُن (لوگوں) سے (جو شیطان
کے پیچھے لگنے والے ہیں) کہا جاتا ہے کہ اُس حکم پر چلو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں
کہ (نہیں ہم اُس پر نہیں چلینگے بلکہ اُن رسوم پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو
پایا ہے (ان سے پوچھو کہ) کیا اگرچہ اُن کے باپ دادا دین کی سمجھ نہ رکھتے تھے۔ اور نہ راہِ
ہدایت پر تھے (پھر بھی وہ انہیں کی پیروی کرینگے؟) (۱۷۰) وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے
اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے انکار کرتے ہیں اُن کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی
شخص کسی ایسے جانور کے پیچھے چلّا رہا ہو جس کے کانوں میں بجز پکار اور آواز کے کوئی
چیز نہیں پڑتی۔ یہ (ایسے جانور ہیں جو) کانوں سے بہرے ہیں (کہ حق کی آواز کو نہیں سن سکتے
زبان سے گونگے ہیں (کہ حق کا اقرار نہیں کر سکتے) آنکھوں سے اندھے ہیں (کہ خود اپنے
نفع نقصان کو نہیں دیکھ سکتے) لہٰذا انکے ذہن میں کوئی صحیح بات نہیں اترتی (۱۷۱) اے
مسلمانو! (تم اس راہ سے بچو تمہیں چاہیئے کہ) ہم نے جو پاک چیزیں تمہیں کھانے کو دی ہیں
وہ تم کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر بجا لاؤ اگر تم خالص اُسی کی بندگی کرنے والے ہو (۱۷۲) (دیکھو)
اللہ نے تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں (۱) مردار (۲) خون (۳) خنزیر کا گوشت (۴)
اور اُس جانور کا گوشت جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر چھوڑا یا ذبح کیا گیا ہو۔ لیکن جو
کوئی بھوک سے بے قرار یا مجبور ہو جائے اور حکم عدولی کرنے یا حد سے تجاوز کرنے کا خیال
نہ رکھتا ہو تو (ان چیزوں میں سے کسی کو بقدرِ حاجت استعمال کر لیتے ہیں) اُس پر کوئی گناہ
نہیں۔ یاد رکھو کہ وہ لوگ جو اللہ کی اُن تعلیمات اور اُن احکام کو جو اُس نے کتاب کی شکل
میں نازل کئے ہیں چھپاتے ہیں اور (اُن کے بجائے اُلٹی سیدھی خود ساختہ باتوں

کی اشاعت کرتے اور) اُس کے عوض دُنیا کے حقیر فائدے حاصل کرتے ہیں ایسے لوگ اور
کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ نہ ان سے کلام کرے گا اور
نہ اِن کو گناہوں سے پاک کریگا اور اُن کو دردناک سزا دی جاویگی (۱۷۳) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں
نے ہدایت کو دے کر گمراہی کو مول لیا ہے اور بخشش کو دے کر عذاب کو خرید لیا ہے۔ دیکھو تو
دوزخ کی آگ پر ان کا صبر کرنا کتنا بڑا صبر ہے! (۱۷۴) یہ سزا اُن کو اس لئے ہوگی کہ اللہ
نے اپنی کتابوں کو وضاحتِ حق کے ساتھ نازل کیا۔ اور یہ لوگ جو یکے بعد دیگرے ان
کتابوں کے وارث ہوئے ہیں ہمیشہ بدترین قسم کی ضد پر اڑتے آئے ہیں (۱۷۵) (دیکھو
مسلمانو! یہ ظاہری اعمال و افعال ہی صرف مقصود بالذّات نہیں اصلی اور حقیقی چیز جو تمہارا
نصب العین ہونی چاہیئے وہ اللہ کی رضاجوئی اور مخلوق کی خیر خواہی ہے جس کے لئے
بطورِ مشق یہ ظاہری افعال و اعمال مقرر کئے گئے ہیں مثلاً) یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنا منہ
مشرق کو کرلو یا مغرب کو (جیسا کہ گمراہ قومیں سمجھتی ہیں) بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے
اللہ پر، یومِ آخرت پر، ملائکہ پر، اللہ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر۔ اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں
یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور سائلوں کو مال دے اور غلامی کے پھندے سے گردنوں
کو آزاد کرانے کے لئے مال خرچ کرے۔ علاوہ ازیں (اللہ کی فرمانبرداری اور اس کی عظمت
کا اقرار کرتے ہوئے) نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ دے اور نیکی یہ ہے کہ عہد کرنیوالے
جب عہد کرلیں تو اس کو پورا نبھائیں اور نیکی اُن صبر آزماؤں کی ہے جو تنگدستی، بیماری اور
اعدائے دین کے مقابلہ میں جنگ کرتے ہوئے بھی اللہ پر ایمان رکھیں یہی وہ لوگ ہیں۔ جو
(قول و فعل) کے سچے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں (یعنی اللہ سے حقیقتاً یہی لوگ محبّت
کرنے اور اسکی حکم عدولی سے صرف یہی ڈرنے والے ہیں) (۱۷۶) اے مسلمانو! اگر کوئی شخص

کسی کو جان سے ہلاک کردے تو تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ تم مقتول کا بدلہ[1] لو۔ آزاد کے[2] بدلہ میں آزاد، غلام کے بدلہ میں غلام، اور عورت کے بدلہ میں عورت۔ ہاں اگر مقتول کے کسی قریب ترین وارث (ولی الدم) کی طرف سے کچھ تخفیف ہو جائے (اور وہ قاتل کی سزائے موت کے مطالبہ سے دستبردار ہو جاویں بشرطیکہ مقتول کے ورثاء کو کچھ نقد رقم وغیرہ ادا کردی جائے اور اگر اس پر فریقین کا سمجھوتہ ہو جائے) تو چاہیئے کہ معقول و مناسب مطالبہ کیا جاوے اور جو چیز طے ہو جائے چاہیئے کہ (اس میں تنگ دلی اور بخل سے کام نہ لیا جاوے بلکہ) اُسے خیر و خوبی سے ادا کردیا جائے (یہ معاف کر دینے اور زرِ دیت قبول کر لینے کی اجازت) تمہارے رب کی طرف سے ایک تخفیف اور اس کی رحمت ہے۔ پھر اس کے بعد جو شخص کسی طرح کی زیادتی[3] کرے، اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا (۱۷۸) اے عقلمندو! اس قانونِ قصاص کے اندر تمہاری زندگی[4] ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح تم قتل و خونریزی سے

---

[1] مراد یہ نہیں ہے کہ ہر شخص اٹھ کر بدلہ لینا شروع کردے۔ یہ ایک اجتماعی قانون ہے جس پر عمل درآمد کرنا حکومت کا کام ہے۔ ہر شخص اٹھکر اپنی اپنی مرضی سے قانون ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔

[2] اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں عربوں میں عام طور پر یہ دستور تھا کہ اگر کوئی غلام کسی کو قتل کر دیتا۔ تو مقتول کے ورثاء اگر طاقتور ہوتے تو قسم کھاتے۔ کہ ہم اس غلام سے بدلہ نہیں لینگے۔ غلام کو مارنا کونسی بہادری ہے ہم اسکے مالکوں میں سے کسی سے قصاص لینگے۔ اسی طرح اگر عورت قاتل ہوتی تو وہ کہتے کہ عورت سے کیا بدلہ لیں اُسکے خاوند یا اُسکے رشتہ داروں میں سے کسی مرد کو قصاص میں قتل کرینگے۔ یہ ایک صریح ظلم تھا اور زیادتی۔ اسلام نے آکر اس ظلم کو مٹا دیا اور حکم دیا کہ اگر آزاد آدمی قاتل ہے اور اُس نے خواہ آزاد کو قتل کیا ہے خواہ غلام کو، مقتول کے بدلے میں وہی قتل ہوگا اور اگر قاتلہ عورت ہے تو اُسنے خواہ عورت کو قتل کیا ہے خواہ مرد کو، مقتول کے عوض میں وہی عورت ماری جائیگی نہ کہ اسکے بجائے کوئی اور بیگناہ مرد۔

[3] مثلاً بدعہدی کرے یا زرِ دیت لے چکنے یا معاف کر دینے کے بعد بھی قتل کردے یا کسی اور طرح ظلم و تعدی کا مرتکب ہو

[4] یعنی اس قانون کے ذریعے تمہاری انفرادی اور قومی زندگیوں کو محفوظ کر دیا گیا ہے یہ قانون نہ بنایا جاتا تو جس کی لاٹھی اسی کی بھینس والا معاملہ ہوتا کمزوروں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے اور دنیا میں فساد و خونریزی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا۔

ڈرنے لگو (۱۷۸) (دیکھو اس انسانی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں لہٰذا) تم پر فرض قرار دیا جاتا ہے
کہ جب تم میں سے کسی پر موت کی علامات ظاہر ہونے لگیں اور اگر وہ بہت سا مال و دولت
چھوڑ کر مرنے والا ہو، تو چاہیئے کہ والدین اور قرابت داروں کے لئے مناسب وصیت کر جاوے
دیکھو اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لئے اس پر عمل در آمد کرنا ضروری ہے (۱۷۹) پھر جو کوئی
اس وصیت کو سن لینے کے بعد اُسے تبدیل کر دے گا سو اس کا گناہ انہیں کو ہوگا۔ جو
اُسے تبدیل کرینگے۔ خوب یاد رکھو کہ جو کچھ تم منہ سے بولتے اور بیان کرتے ہو اللہ اُسے سنتا ہے
اور جانتا ہے کہ حق کیا تھا اور اب اُسے کس طرح غلط ملط کیا جا رہا ہے (۱۸۰) ہاں جس کسی کو
وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی غلطی یا ارادی نافرمانی کے ارتکاب کا علم ہو اور
وہ ورثاء کے درمیان مصالحت کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ خوب یاد رکھو کہ نیک
نیتی سے اگر تم غلطی بھی کر بیٹھو تو اللہ اس کو بخش دیتا ہے اور وہ بڑا مہربان ہے (۱۸۱) ع
اے مسلمانو! جس طرح اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں روزے فرض کئے گئے تھے
اُسی طرح تم پر فرض کر دئے گئے ہیں ہو سکتا ہے کہ تم اس طرح اللہ کا خوف رکھنے والے
بن جاؤ (۱۸۲) (یہ روزے) گنتی کے صرف چند روز ہیں پھر (اس پر بھی یہ آسانی کہ)
جو کوئی بیمار ہو یا سفر کر رہا ہو تو (اُسے اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے مگر) اُتنے دِن کے روزوں
کا شمار دُوسرے ایّام میں رکھ لے۔ اور جو لوگ اتنے بوڑھے اور ضعیف ہوں کہ انہیں روزے
کے لئے تمام طاقت خرچ کر دینی پڑے اُن پر لازم ہے کہ وہ فدیہ دیں (یعنی) ایک مسکین
کو کھانا کھلا دیا کریں۔ لیکن جو کوئی اس مقرر کردہ فدیہ سے زیادہ اپنی خوشی سے دے تو وہ
اُس کے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کو روزہ کی حقیقت کا پورا پورا علم ہو جائے (تو تم روزے رکھنا
ہی پسند کرو گے) (۱۸۳) (یہ گنتی کے چند گنے چنے دن جن میں روزہ رکھنا تم پر فرض کیا گیا ہے

ان سے مراد) رمضان کا مہینہ ہے ـــــ وہ مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانی زندگی
کا ایک مکمل دستور العمل اور انسان کا رہبرِ کامل ہے اور جس کے احکام بالکل صاف، واضح
اور غیر مبہم ہیں اور جو حق کو باطل سے ممتاز کرنے میں حدِ کمال کو پہنچا ہوا ہے ـــ پس تم میں
سے جو کوئی اس مہینہ میں موجود ہو وہ ضرور مہینہ بھر روزے رکھے۔ اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر
کر رہا ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ جتنے روزے نہ رکھ سکے اُتنی گنتی وہ بعد میں پوری کرے (دیکھو)
اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے وہ تمہیں تنگی دینا نہیں چاہتا اور دیکھو کہ رمضان کے
مہینے میں تم جو روزے بوجہ بیماری یا سفر کے نہ رکھ سکو اُن کی گنتی بعد میں ضرور پوری کر لیا
کرو اور اللہ نے تم کو جو سیدھی راہ پر لگا دیا ہے تو چاہیئے کہ تم اس پر ضرور اس کی عظمت
و کبریائی کا بیان کرو اور چاہیئے کہ تم اسکے شکر گذار بنو (۱۸۴) (دیکھو) جب میرے بندے تم سے
میرے متعلق پوچھیں (کہ وہ کہاں ہے تو ان کو بتا دو کہ) میں اُن سے بہت قریب ہوں (اتنا
قریب کہ) ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں چاہیئے کہ وہ بھی میری پکار کا جواب دیں۔ (میرا حکم مانیں)
اور مجھ پر ایمان لائیں ہو سکتا ہے کہ اِس طریقے سے وہ سیدھی راہ پر لگ جائیں (۱۸۵) (دیکھو
مسلمانو!) روزہ کی رات کو اپنی عورتوں سے مشغول ہونا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔
(اگرچہ اس سے قبل موسوی شریعت میں یہ امر جائز نہ تھا اور تم بھی کچھ عرصہ اُسی کے مطابق عمل
کرتے رہے ہو) تم عورتوں کے لئے اور عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں (تم ایک دوسرے
کا اوڑھنا بچھونا ہو تمہارا چولی دامن کا ساتھ ہے پھر اتنے باہمی اور گہرے تعلق اور پیار و محبت
کے بعد تمہارا اُن سے اور اُن کا تم سے الگ رہنا ایک امرِ محال ہے) اللہ کو معلوم ہے کہ
(جب تمہارے لئے اِس امر کی صراحت نہ کی گئی تھی اور تم موسوی شریعت کے مطابق بعد
عشاء عورتوں کے پاس جانا ممنوع سمجھتے تھے اور اس کے باوجود بامرِ مجبوری کبھی اس کا ارتکاب

کر بیٹھے تھے تو) تم اپنے آپ کو خیانت کا مرتکب خیال کرتے تھے۔ سو اللہ تم پر مہربان ہو گیا ہے اور اُس نے تم کو معاف کر دیا ہے۔ اب تم اُن سے مباشرت کر سکتے ہو اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے لکھ دیا ہے اس کے چاہنے[1] کی تمہیں اجازت ہے اور جب تک صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے تمہیں صاف صاف نظر نہ آنے لگے اُس وقت تک تمہیں کھانے پینے کی بھی) اجازت ہے پھر (صبح صادق ہو جانے کے بعد سے) سرِ شام تک روزہ کو پورا کرو (یعنی نہ اس دوران میں کھاؤ پیو اور نہ کسی اخلاقی کمزوری کا اظہار کرو۔ بھوک اور پیاس کی شدت کو خدا کی رضا جوئی کے لئے خوشی برداشت کرو اور اخلاق عالیہ کی مشق کرو) اور مسجدوں میں اعتکاف کے دوران میں (کسی وقت) تم مباشرت نہ کرو یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں انکے قریب تک نہ جاؤ۔ اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لئے اسی طرح کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ متقی بن جائیں) اور خدا کے عذاب سے ڈر کر نافرمانی سے باز رہیں) (۱۸۹) (مسلمانو! منجملہ دیگر اجتماعی قوانین کے جو تم کو بتائے جا رہے ہیں اس قانون کو بھی یاد رکھو کہ) تمہیں ایک دوسرے کا مال (یا وہ مال جس میں تم ایک دوسرے کے شریک ہو یا وہ مال جو کسی نے تمہارے سپرد کر رکھا ہے) ناحق (ناجائز اور مکر و فریب کے حیلوں سے نہ خود کھانا چاہیئے اور نہ اُسے حکام تک پہنچانا چاہیئے تاکہ کہیں یہ نہ ہو کہ تم جان بوجھ کر لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جھوٹ بول کر، یا جھوٹی قسمیں کھا کر یا دیگر ناروا ذرائع

---

[1] ان الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو بیوی کے پاس جانے کی اجازت محض طلب اولاد کی نیت سے ہے بیوی اس لئے نہیں ہے کہ اس سے حیوانی خواہشات کو پورا کیا جاوے باشروا اور وابتغوا کے دو الفاظ پر کوئی جس قدر غور کریگا۔ اسی قدر زیادہ اُسے ازدواجی مسائل کے سمجھنے میں مدد ملیگی مباشرت کس طرح ہونی چاہیئے اور کیوں یہ دو سوال آج کل یورپ سے متاثر لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں انکا جواب اسی ایک آیت میں آگیا ہے۔

ع

طریقوں سے کھا جاؤ (۱۸۷) ع لوگ تجھ سے چاند اور اس کی مختلف حالتوں کے متعلق سوال کرتے
ہیں۔ ان سے کہدو کہ چاند کی مختلف شکلیں اوقات کی شناخت کا آلہ ہیں لوگوں (کی
اپنی دنیوی ضروریات) کے لئے بھی اور (عبادات کے لئے بھی خصوصًا حج کے لئے[1] (ان
جاہلی عربوں سے یہ بھی کہدو کہ تم جو حج کے لئے احرام باندھ چکنے کے بعد کسی ضرورت کے
لئے گھر جانا چاہتے ہو تو بجائے دروازے سے گھر میں داخل ہونے کے پچھواڑے سے
مکان کی دیوار پھاڑ کر داخل ہوتے ہو یہ کوئی نیکی نہیں ہے یاد رکھو! نیکی یہ نہیں ہے کہ تم
گھروں میں پچھواڑے سے داخل ہو ہاں البتہ نیکی یہ ہے کہ تم خدا سے ڈرو اور اُس کی حرام
کی ہوئی چیزوں کے پاس نہ جاؤ (دیکھو) گھروں میں دروازوں سے ہی داخل ہُوا کرو
اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو ہو سکتا ہے کہ اس طرح تم (مقاصدِ حیات میں) کامیاب ہو جاؤ (۱۸۸)
(مسلمانو!) وہ لوگ جو تم سے لڑتے ہیں تم بھی اُن کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑو[2] اور (اس طرح
لڑو کہ تمہاری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو (یاد رکھو کہ) اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی
کرنے والے ہوتے ہیں (۱۸۹) (دیکھو، یہ دشمنانِ دین جن سے تمہاری لڑائی ٹھن گئی ہے) تم اُن

---

[1] دنیا میں قمر پرست ہمیشہ سے چلے آئے ہیں اور آج بھی کہیں کہیں موجود ہیں یہ لوگ عام بت پرستوں کی طرح چاند کو ایک دیوتا مانتے اور اسکی پوجا کرتے ہیں قرآن نے اس ایک جملہ میں چاند کے دیوتا اور قابلِ پرستش سمجھے جانیکی غلطی پر ایک کاری ضرب لگادی ہے اور بتا دیا ہے کہ چاند کو تو خود اپنی ذات کا ثبات حاصل نہیں۔ وہ گھٹتا اور بڑھتا ہے اور اسکی زندگی کا مقصد محض اتنا ہے کہ انسان اُسکی مدد سے اپنے اوقات کی تعین کر سکے نیز عباداتِ الٰہی مثلاً حج وغیرہ کے اوقات معین کئے جا سکیں۔

[2] یعنی اے مسلمانو! تم کسی خود غرضی کیلئے نہیں لڑ سکتے، حلقۂ اثر کی توسیع، نو آبادیات کے تحفظ اور شاہنشاہیت کے لئے کسی سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ زمین کے جھگڑے اور عورتوں کے معاملات تمہاری تلواروں کو نیام سے نہیں نکلوا سکتے۔ تم لڑ سکتے ہو اللہ کی راہ میں لڑ سکتے ہو دینِ حق کی حمایت میں لڑ سکتے ہو شرک کے خلاف، الحاد کے خلاف، ظلم کے خلاف، مظلوم اور مجبور ہو کر لڑو، ظالم اور مغرور بن کر نہ لڑو۔ حاصل کلام خدا کے لئے لڑو نفس اور نفسانیت کے لئے نہ لڑو۔

کو جہاں کہیں (اپنے خلاف نبرد آزما) پاؤ وہیں اُن سے لڑو اور اُن کو وہاں سے نکال دو۔ جس طرح اُنھوں نے تم کو نکالا تھا۔ یہ (آئے دن کی) شرارتیں باقاعدہ لڑائی کی نسبت بہت زیادہ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہیں (مگر یہ یاد رکھو کہ) اُس واجب الاحترام رقبہ کے اندر (جو "مسجدِ حرام" کے نام سے مشہور ہے تم اُن سے پہلے) نہ لڑو جب تک وہ اس رقبہ میں تم سے لڑائی (کی ابتدا) نہ کریں۔ اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی اُن سے لڑو۔ ان کافروں کی (جو حدودِ حرم کا اتنا بھی ادب ملحوظ نہیں رکھتے) یہی سزا ہے (۱۹۰) اگر وہ (کفر و شرک کو چھوڑ کر لڑائی سے) باز آجاویں تو (تم بھی اُن کو معاف کر دو یاد رکھو کہ) اللہ بڑا بخشنے والا بہت مہربان ہے (۱۹۱) اور (دیکھو کہ جب ایک دفعہ لڑائی ٹھن جائے تو) اُن سے لڑتے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ و شرارت کی جڑیں کٹ جائیں اور اللہ ہی کی اطاعت (تسلیم) ہو جائے اگر وہ باز آجاویں تو (یاد رکھو کہ) ظلم و زیادتی کرنے والوں کے سوا کسی پر تشدد نہ کیا جائے (۱۹۲) جن مہینوں میں لڑائی کرنا رسماً ممنوع چلا آرہا ہے یعنی محرم، رجب، ذی القعدہ اور ذی الحجہ ان میں اگر فریقِ مخالف لڑائی نہیں کرتا تو تم بھی لڑائی نہ کرو اگر وہ لڑتا ہے تو تم بھی لڑو اور (یاد رکھو کہ) اگر کوئی حرمتوں کی بے حرمتی کرے تو اس سے قصاص ضرور لینا چاہیئے اور جو کوئی (ان مہینوں کی حُرمت نہ منائے اور) تم پر زیادتی کرے تو جس طرح اُس نے (حرمت نہیں منائی تم بھی حرمت نہ مناؤ اور جس طرح اُس نے) زیادتی کی ہے تم بھی اس کی زیادتی کا جواب ویسا ہی دو۔ (مگر ہر وقت) اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب یاد رکھو کہ وہ جو اُس سے اور اُسکی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اللہ اُن کے ساتھ رہتا ہے (۱۹۳) اور (مسلمانو) اللہ کی راہ میں (جان و مال) خرچ کرتے رہو اور (ان میں بخل کر کے) تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

لہ کوئی قوم اُس وقت تک بحیثیت قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب وہ قربانی کرنا نہیں سیکھتی۔ دورِ حاضر کے مسلمانوں کو دیکھو۔ وہ جان و مال کے معاملہ میں جتنا بخل کر رہے ہیں۔ اُتنے ہی زیادہ ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں۔

اور جو کچھ بھی کرو حسنِ نیت، اخلاص اور یقین محکم سے کرو خوب یاد رکھو کہ اللہ انہیں کو پسند کرتا ہے
جو حسنِ نیت، اخلاص اور یقین محکم سے اپنے کام سرانجام دیتے ہیں (۱۹۴) اور دیکھو اللہ کی راہ
میں حج اور عمرہ کو پورا کرو اور اگر تم راستہ ہی میں محصور ہو جاؤ (اور احرام کھولنا چاہو) تو
جیسا کچھ میسر آئے ایک جانور کی قربانی دو اور جب تک قربانی (حرم میں) اپنی جگہ پر نہ پہنچ
جائے تب تک سر کے بال نہ منڈواؤ۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار پڑ جائے یا اس کے
سر میں کوئی تکلیف ہو جائے (اور بال منڈوانے ضروری ہو جاویں تو بیشک منڈوا لے) مگر اسکے
معاوضہ میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے لیکن جب تمہیں امن نصیب ہو جائے
تو جو کوئی عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ حاصل کرنا چاہیے تو اس پر لازم ہے کہ اُس سے
جیسا کچھ بن آئے قربانی کا جانور دے اور جسے قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو وہ دورانِ ایام
حج میں تین روزے رکھے اور سات روزے اس وقت رکھے جب تم گھر کو واپس جاؤ
اِس طرح یہ دس روزے ہو جاوینگے۔ یہ قاعدہ اُن لوگوں کیلئے ہے جن کے اہل و عیال
حدودِ حرم کے اندر نہ رہتے ہوں۔ اور (دیکھو ہر وقت) اللہ سے اور اللہ کی نافرمانی سے
ڈرتے رہو بالخصوص دورانِ ایامِ حج میں اور (اگر تم نافرمانی سے باز نہ آئے تو خوب یاد
رکھو کہ) اللہ سخت سزا دینے والا ہے (۱۹۵) ع حج (کے موسم کے) چند مہینے ہیں جو (ہر ع
کسی کو) معلوم[۱] ہیں۔ سو جو شخص ان میں اپنے اُوپر حج فرض کرلے وہ دورانِ ایامِ حج میں
نہ کوئی فحش بات کرے نہ حدودِ شریعت سے تجاوز کرے نہ کسی سے لڑائی جھگڑا پیدا کرے
اور تم جو نیک کام کروگے وہ سب اللہ کے علم میں ہونگے (جن کے مطابق وہ صلہ دیگا)
اور زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو اور یاد رکھو کہ سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اے عقل مندو!

۱؎ حج کے مہینے شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔ شوال سے قبل احرام حج باندھنا مکروہ ہے۔

مجھی سے ڈرتے رہو کہ اصل تقویٰ یہی ہے اور میرے سوا ہر چیز سے بیزار رہو) (۱۹۷) (دیکھو حج کے سفر کے دوران میں) یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ تم (بذریعہ تجارت) اپنے رب کے فضل کی تلاش کرو پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعرالحرام کے پاس اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے تمہیں (اپنے رسُول کے ذریعے) بتا رکھا ہے اور یقین جانو اس سے پہلے آج تک تم بھولے ہی رہے ہو[1] اور حج کے مقصد کو نہیں سمجھے اور سمجھے ہو تو غلط) (۱۹۸) اور دیکھو تم وہاں سے لوٹو جہاں سے دُوسرے لوگ ہو کر لوٹتے ہیں (یعنی عرفات پہنچو اور وہاں سے لوٹو نہ یہ کہ تم قریش عرب کی طرح عوام الناس کے ساتھ عرفات میں جانا کسرِ شان سمجھو اور مزدلفہ ہی سے واپس لوٹ آؤ) اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ بخشنے والا بہت مہربان ہے (۱۹۹) پھر جب تم حج کی تمام رسوم کو ادا کر چکو (اور منیٰ میں پہنچو) تو جس طرح تم اپنے بڑوں کے تفاخر کا ذکر کرتے ہو اُسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اللہ کو یاد کرو (اور اُسکے احسانات کا ذکر کرو)۔ دیکھو بعض لوگ تو ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ "اے رب! ہمیں دُنیا ہی میں دے (جو کچھ دینا ہے)" ان لوگوں کیلئے آخرت میں کوئی حصّہ نہ ہوگا (۲۰۰) اور بعض اُن میں سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ "اے رب! ہمیں دنیا میں وہ چیز دے جسے تو ہمارے لئے اچھا سمجھتا ہے اور آخرت میں بھی ہمیں وہی چیز دے جسے تو ہمارے لئے بہتر جانتا ہے اور ہمیں دوزخ[2] کی آگ سے بچالے (۲۰۱) یہ وہ لوگ ہیں جنکو اُن کے اعمال کا بہت اچھا ثمرہ ملیگا اور اللہ بہت جلد حساب چکا دیتا ہے (۲۰۲) اور ان معدودے چند دنوں میں (جو تم منیٰ میں گزارتے ہو)

---

[1] مقصود یہ ہے کہ حج ایک عبادت کا نام ہے یہ کوئی سالانہ جشن یا میلہ یا ہنگامہ نہیں ہے۔ جس دن سے حج کا ارادہ کرلیا جاوے اُس دن سے ضبط نفس، یاد الٰہی اور پرہیزگاری کو خاص طور پر اختیار کیا جاوے اور ہر قسم کے ہنگاموں جشنوں، میلوں اور تفریح بازیوں سے الگ تھلگ رہا جاوے۔ اسلام سے قبل جاہلی عرب بھی حج کیا کرتے تھے۔ مگر اُن کا حج کیا ہوتا تھا؟ اُسے ایک سالانہ میلہ کہئے تو زیادہ درست ہے اس میں وہ تمام خرافات ہوتی تھیں جو آج بھی ہندوستان کے میلوں میں ہوتی ہیں۔ اسلئے فرمایا ہے کہ تم اس سے پہلے حج کو غلط سمجھے بیٹھے تھے +

[2] یعنی ہمیں اُن تمام گناہوں اور لغزشوں سے بچنے کی توفیق دے جنکے ارتکاب سے انسان سیدھا دوزخ میں جاتا ہے +

اللہ کو خصوصیت سے بہت) یاد کرو پھر جو کوئی دو دنوں (گیارہ اور بارہ ذی الحجہ) کے بعد جلدی (گھر لوٹ آنا) چاہے تو اُس پر ایسا کرنے میں کوئی گناہ لازم نہیں آتا اور جو کسی نے (ایک دن) تاخیر کرلی تو پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سارے احکام اُنہیں کیلئے ہیں جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے ہوں ——— اور (لوگو!) تم اللہ سے ڈرو اور اس بات کو خوب جان لو کہ تم (ایک دن) اُس کے سامنے جمع کئے جاؤ گے (۲۰۳) اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ دُنیاوی زندگی سے متعلق بڑی مزیدار باتیں کرتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ لاتے ہیں حالانکہ وہ (حقیقتاً) سخت ترین دشمنِ حق ہوتے ہیں (۲۰۴) ایسے شخص کو جب کبھی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، لوگوں کے کھیت جلائے اور جانیں ہلاک کرے۔ اور اللہ ہے کہ وہ ایسے فساد کو پسند نہیں کرتا (۲۰۵) ایسے شخص سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو جھوٹی عزت اور حمیّت جاہلیت اُسکو گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے (اور اللہ کا خوف اُسکے دل میں پیدا نہیں ہونے دیتی) ایسے شخص کے لئے جہنّم کافی ہے اور وہ ایک بہت ہی بُری جگہ ہے (۲۰۶) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ ایسے بندوں پر بہت مہربان ہوتا ہے (۲۰۷) اے ایمان لانے والو! اسلام میں پُورے پُورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین رکھو کہ وہ تمہارا کُھلا دشمن ہے (۲۰۸) اب جبکہ حق و باطل کی راہیں تمہیں معلوم ہو چکی ہیں اور ایک طرف ایمان و اسلام اور دوسری طرف کفر و نافرمانی کی سرحدات سے تم واقف ہو چکے ہو اگر تمہارے پاؤں (جادۂ مستقیم سے) پھسل گئے تو خوب جانے رہو کہ اللہ بہت غالب اور حکیم و دانا ہے (اُس کا کچھ نہیں بگڑیگا تم اپنا ہی نقصان کرو گے وہ تمہارے بجائے اپنی عنایات اُن پر کریگا جو اُسکے فرمانبردار ہونگے اور اُنکو تم پر مسلّط کر دیگا) (۲۰۹) کیا یہ لوگ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ بادلوں کے سایے میں اللہ (کے دستِ قدرت) کا ظہور ہو، فرشتے آئیں اور ہر چیز کا ایک ہی

دفعہ فیصلہ ہو جائے۔ یاد رکھو (ایک دن) تمام امُور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے (۲۱۰) ع تم بنی اسرائیل
سے پُوچھو کہ ہم نے ان کو کس قدر صاف صاف احکام[1] دیئے تھے (جنکی خلاف ورزی وہ کرتے چلے
آتے ہیں) اور جو کوئی اللہ کے کسی حکم کا اُلٹ کرے جبکہ وہ اُسے دیا جا چکا ہے تو اُسے یاد رکھنا
چاہیئے کہ اللہ (ایسے نافرمانوں کو) سخت عذاب دینے والا ہے (۲۱۱) کافروں کو دُنیاوی زندگی بہت
خوبصورت اور دلکش نظر آتی ہے اور یہ لوگ ایمان لانے والے لوگوں پر (جنکی نگاہ میں دنیاوی زندگی
دُوسرا درجہ رکھتی ہے) ہنستے ہیں مگر حقیقت میں یہی لوگ (جنکا مطمح نظر دنیاوی زندگی کی دلفریبیاں
نہیں ہیں بلکہ) جو اللہ سے ڈرتے ہیں قیامت کے روز ان کافروں سے کہیں بلند درجہ ہونگے ۔
(یاد رکھو کہ رزق اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے) اللہ جسے چاہتا ہے (خواہ وہ مومن ہو یا کافر) بغیر
حساب کے روزی پہنچاتا ہے (۲۱۲) تمام نسل انسانی ابتدا میں ایک ہی جماعت تھی۔ بعد میں
اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ جنہوں نے ایمان لانے والوں کو بشارت دی اور انکار کرنے والوں کو اللہ
کے عذاب سے ڈرایا اور ان نبیوں (میں سے اکثر) پر کتابیں نازل کیں جن میں امر حق کی وضاحت
کر دی گئی تھی تاکہ لوگوں میں جو اختلافات رُونما ہو گئے ہیں وہ اُن کا فیصلہ چکا دیں۔ (قابل
افسوس امر یہ ہے کہ) صرف اُنہیں لوگوں نے امر حق میں اختلافات پیدا کئے جن کو کتاب دی گئی
تھی۔ اور وہ بھی اُس وقت جب اُن کو ہر ایک امر کی روشن دلیل پہنچ چکی تھی۔ علاوہ ازیں اُن
کے یہ اختلافات محض باہمی ضد پر مبنی تھے ۔ لہذا اللہ نے اُن لوگوں کو جو ایمان لے آئے تھے
اپنے لطف و کرم سے اُن باتوں میں جنمیں اور لوگ طرح طرح کے اختلافات رکھتے بالکل سیدھی راہ

---

[1] اللہ نے اپنے احکام کو اس مقام پر "نعمت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور درحقیقت انسان پر اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے بھی یہی۔ کیونکہ اللہ ہی کے احکام سے انسان کو صحیح رہنمائی ہوتی ہے اور انہی احکام کی بدولت وہ کفر و ضلالت سے بچتا اور اس کے انعامات اور خوشنودی کا مستحق ہوتا ہے ۔

پر لگا دیا۔ اور (خوب یاد رکھو) اللہ جس کسی کو چاہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے (۲۱۳) مسلمانو! راہ حق کا
دعوی رکھنے والوں اور اس پر چلنے والوں کو جن جن سختیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے تم نے ابھی تک وہ
سختیاں دیکھی ہی نہیں۔ پھر کس طرح تم ابھی سے کامیابی کا منہ دیکھ سکتے ہو) کیا تم خیال کرتے ہو
کہ تم سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارا حال اُن لوگوں ایسا نہیں ہوا جو
تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے لڑائیاں لڑیں اور سختیاں سہیں اور کپکپا دیئے گئے حتٰی کہ رسول
اور جو لوگ اُسکے ساتھ ایمان لائے تھے کہہ اُٹھے کہ اللہ کی طرف سے نصرت و امداد کب آئیگی (تب
کہیں جا کر ان کو جواب ملا تھا کہ) ہاں اللہ کی نصرت بہت قریب ہے (۲۱۴) (اے پیغمبر) لوگ پوچھتے ہیں
کہ وہ خرچ کیا کریں۔ تم اُن سے کہہ دو کہ یہ تمہاری مرضی پر ہے کہ تم اپنے مال و دولت میں سے کچھ خرچ
کرو (یا نہ کرو مگر اتنا یاد رکھو کہ جو کچھ بھی خرچ کرنا چاہو) اُسمیں تمہارے ماں باپ کا تمہارے اعزا و اقارب کا
یتیم بچوں کا، مفلوک الحال لوگوں کا اور رہ گزر مسافروں کا حصہ ہونا چاہیئے اور یہ بھی یاد رکھو کہ تم نیکی کا
جو کام بھی کروگے (ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے علم میں نہ آئے۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ کو تمہارے ہر
کار خیر کا علم ہوتا ہے (۲۱۵) (دیکھو لوگو! دین حق کی خاطر اعدائے دین سے لڑنا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے
اور یہ امر تمکو بہت گراں، مشکل اور ناگوار گزر رہا ہے۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور
اُسے محبوب رکھو اور وہ تمہارے لئے ہزاروں فتنوں کا موجب ہو۔ دیکھو اللہ ہی) جانتا ہے کہ تمہارے
حق میں درحقیقت کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر اور تم نہیں جانتے ع (۲۱۶) (اے پیغمبر) تجھ سے پوچھتے ع
ہیں کہ حرمت کے مہینوں (یعنی رجب، ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم) میں جنگ و جدال اور لشکر کشی کے
متعلق کیا حکم ہے۔ انکو سنا دو کہ ان مہینوں میں لشکر کشی اور جنگ و جدال بہت برا کام ہے۔ لیکن
اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا، اللہ کے احکام سے روگردانی کرنا، زائرین کو خانہ کعبہ سے روکنا اور
وہاں کے رہنے والوں کو گھروں سے نکال دینا اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہے۔ اور یہ آئے دن کی سازشیں

اور شرارتیں باقاعدہ جنگ و جدل کی نسبت بہت زیادہ بُری ہیں۔ (اور ان اعدائے دین کی شرارتوں
کا کیا پوچھنے ہو اگر ان کا بس چلے تو یہ تمہارے ساتھ لڑتے چلے جائیں حتیٰ کہ وہ تمہیں تمہارے دین،
تمہارے اعتقادات اور تمہارے مسلک سے ہٹا دیں۔ لیکن تم بھی اتنا یاد رکھو کہ تم میں سے جو کوئی
مُسلمان ہوئے پیچھے اپنے دین کو چھوڑ دیگا اور اسی حالت میں مرجائے گا وہ کافر قرار دیا جاویگا۔
ان لوگوں نے جو کچھ کیا وہ سب اکارت گیا۔ نہ دُنیا میں اُس کا کوئی فائدہ ہوا نہ آخرت میں کوئی
ثواب ملیگا۔ یہ لوگ اہل دوزخ ہونگے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے (۲۱۷) جو لوگ اللہ پر ایمان
لائے ہیں اور جنہوں نے اعدائے دین سے تنگ آکر دین حق کی خاطر گھر بار چھوڑ دیئے ہیں اور جو دین
حق کی خاطر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں یہ سب لوگ بلاشبہ اللہ کی رحمت کے امّیدوار ہیں۔
(نفسانی اغراض سے انکو کوئی سروکار نہیں) اور اللہ ایسے لوگوں کی لغزشوں کو معاف کردینے والا
ہے (۲۱۸) لوگ تجھے پُوچھتے ہیں کہ شراب نوشی اور قمار بازی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ ان
کو بتا دیجئے کہ یہ دونوں سخت گُناہگاری کے کام ہیں اور ان سے لوگوں کو کچھ فائدے بھی حاصل
ہوتے ہیں مگر ان افعال کے ارتکاب سے جس قدر گناہ لازم آتا ہے وہ اُن منافع کے مقابلے پر جو ان
سے حاصل ہوتے ہیں بہت زیادہ اور سخت نوعیّت کا ہوتا ہے۔ اور (بعض) لوگ تجھ سے پُوچھتے ہیں کہ
"وہ خدا کی راہ میں کیا خرچ کریں" اُن سے کہہ دیجئے کہ (وہ اپنے جائز اور ضروری اخراجات سے)
جو کچھ بچا سکیں (اُسے خرچ کریں) اللہ اس طرح تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے تاکہ
دُنیا اور آخرت کے معاملات پر یکساں غور کرسکو۔ اور (سوائے بعض) لوگ یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں۔
اُن سے کہہ دیا جائے کہ جس بات میں یتیموں کا بھلا ہو وہی کرنی چاہیئے اور اگر تم اُن کو اپنے سے
جُدا نہ رکھو بلکہ اُن سے مل جل کر رہو تو (اسمیں بھی کوئی مُضائقہ نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی بند
ہی ہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ کون بگاڑ پیدا کرنے والا ہے اور کون بھلا چاہنے والا (یعنی تم اپنے

ایسے لوگوں کو تو دھوکا دے سکتے ہو مگر خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے لہٰذا اگر یتیموں کے بارے میں تم نے کوئی خیانت کی تو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑیگا) اگر خدا چاہتا تو اس معاملہ میں تم پر سختی کرتا مگر وہ جہاں غالب و مختار کُل ہے وہاں دانا و بینا بھی ہے ﴿۲۱۹﴾ اور (اے مسلمان مردو!) تم اُن عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو جو مشرک ہیں حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور یاد رکھو کہ ایک مومن لونڈی ایک مُشرک شریف زادی سے کہیں بہتر ہے خواہ تمہیں کتنی ہی پسند کیوں نہ ہو۔ اور مشرک مردوں کو اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور (جان لو کہ) ایک مومن غلام ایک مشرک شریف زادہ سے کہیں بہتر ہے خواہ وہ مشرک تمہیں کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو ——— یہ مشرکین تمہیں آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ تمہیں اپنے حکم سے جنّت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں کے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۰﴾ اور لوگ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ عورتیں جب حیض کی حالت میں ہوں تو مسلمانوں کو اُن سے کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے ان کو کہہ دیجئے کہ حیض کی حالت عورت کیلئے ایک تکلیف دہ حالت ہے۔ لہٰذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور جبتک وہ حیض سے پاک ہو کر نہا نہ لیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ جب وہ حیض سے پاک ہو جائیں تو جس فطری طور سے عورتوں کے پاس آنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس طور سے اُن کے پاس آؤ۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بُرے کاموں سے بچیں اور پاکیزگی کو پسند کریں ﴿۲۲۱﴾ تمہاری عورتیں تمہارے لئے ایسی ہی ہیں جیسے کسان کیلئے کھیت لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ اپنے کھیت میں بایں طور آؤ کہ تمہیں پیداوار حاصل ہو اور چاہیئے کہ تم اپنے مستقبل کے لئے پہلے ہی کچھ جمع کر لو اور اللہ کی نافرمانی سے ڈرو اور جانے رہو کہ تمہیں ایک روز اُس سے ملنا ہے اور (ہاں اے ہمارے پیغمبر) اُن لوگوں کو مُژدہ سُنا دو جو ان احکام کو مان لیں (اور ان پر عمل پیرا ہو جائیں) ﴿۲۲۲﴾ اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں میں ڈھال کے طور پر اس مقصد کے پیش نظر

استعمال نہ کرو کہ لوگوں میں اپنے زہد و تقوی اور اصلاح و خدمت کا ڈھونگ رچا سکو اور جان رکھو کہ اللہ تمہاری ساری باتیں سنتا ہے اور تمہاری ذرہ ذرہ سے بات سے واقف ہے (۲۲۳) جو بے معنی قسمیں تم دوران گفتگو میں بلا ارادہ کھا لیتے ہو خدا اُنپر کوئی گرفت نہیں کرتا۔ ہاں وہ تمہاری اُن قسموں پر مواخذہ کرتا ہے جو تم دل سے کھاتے ہو (تمہاری ان بد اعتدالیوں کے باوجود) اللہ بڑی درگزر کرتا ہے اور بڑی بُردباری سے کام لیتا ہے (کیونکہ وہ غفور اور حلیم ہے) (۲۲۴) جو لوگ اپنی عورتوں کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لیتے ہیں اُنکو چار مہینے انتظار کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے ارادہ سے باز آجائیں تو یہ بہت اچھی بات ہے کیونکہ اللہ درگزر کرنے اور رحم کرنے والا ہے (اور اُنہی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو درگزر کریں اور رحم سے کام لیں) (۲۲۵) اور اگر وہ طلاق ہی کا تہیہ کر لیں (تو پھر بیوی کو طلاق دیکر جُدا کر دیا جائے) مگر (یاد رکھیں کہ خُدا سمیع و علیم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، (لہذا اس جُدائی کے عمل میں کوئی فریق دُوسرے کے ساتھ ظلم و ناانصافی سے پیش نہ آئے) (۲۲۶) اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو اُنہیں چاہیئے کہ وہ ماہواری ایام کے تین ماہ تک صبر سے بیٹھی رہیں اور اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیز اُنکے رحم میں پیدا کر دی ہے اُسکو وہ چھپائیں۔ اور اگر وہ اصلاح حال کیلئے آمادہ ہو جائیں تو اُن کے خاوند اس دوران میں اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ اُن کو پھر اپنی زوجیت میں لے لیں۔ اور یاد رکھو کہ عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں کے اوپر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں کے اُوپر ہیں اور وہ یہ کہ وہ ایک دُوسرے کے ساتھ حُسن سلوک سے پیش آئیں البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے (لہذا جہاں ایک فریق اپنے حقوق کا خیال کرتا ہے وہاں اُسے فریق ثانی کے حقوق کا لحاظ بھی رکھنا چاہیئے تاکہ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہو، یاد رکھو کہ خدائے غالب و دانا کے بتائے ہوئے قاعدوں ہی

ع ہیں تمہاری فلاح ہے) (۲۲۷) ع طلاق (جسکے بعد رجوع کیا جا سکتا ہے) دو مرتبہ کر کے (دو مہینوں
میں دو دفعہ دینی چاہیئے) اُس کے بعد یا تو صُلح وصفائی سے (بیوی کو) روک لیا جائے یا خوش اسلوبی
سے اُسے الگ کر دیا جائے۔ اور تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم اُن کو دے چکے ہو
اُس میں سے کوئی چیز واپس لو اِلّا یہ کہ میاں بیوی کو اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس طرح اللہ کے ٹھہرائے
ہُوئے حقوق ادا نہ ہو سکیں گے تو وہ باہمی رضامندی سے واپس لے دے سکتے ہیں۔ لہذا اگر
ایسی صُورت پیدا ہو جائے کہ تمہیں اندیشہ ہو کہ اللہ کے ٹھہرائے ہُوئے حقوق وواجبات پُورے
نہ ہو سکیں گے تو پھر اس میں میاں بیوی پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا اگر بیوی اپنا پلہ چھڑانے
کے لئے بطور معاوضہ اپنے حقوق میں سے کچھ دیدے۔ دیکھو، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدّیں ہیں
اِن سے باہر نہ نکلو اور یہ بھی یاد رکھو کہ جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حدُود سے باہر نکل جاتا ہے، تو
ایسے لوگ ظالم قرار پاتے ہیں (۲۲۸) اگر مرد نے (تیسری طلاق دیکر) بیوی کو جُدا کر ہی دیا، تو پھر
وہ اُس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک وہ دُوسرے کسی شخص سے نکاح نہ
کر لے۔ اُسکے بعد اگر ایسا ہو جائے کہ وہ دُوسرا شخص اُس کو اپنی رضامندی سے طلاق دے
کر جُدا کر دے تو پھر اُن پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا اگر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجُوع
کر لیں بشرطیکہ اُن کو یقین ہو کہ وہ اللہ کی قائم کردہ حدُود کو قائم رکھ سکیں گے (یعنی ایک دوسرے
کے حقوق وواجبات کو ادا کر سکیں گے اور مودّت ورحمت کا ثبوت دے سکیں گے جو رشتہ زوجیت
کا اصل اصُول ہے) اور یاد رکھو کہ یہ اللہ کی قائم کردہ حدُود ہیں جو اللہ نے اُن لوگوں کے لئے
واضح کر دی ہیں جو نکاح وطلاق کی مشکلات کا علم رکھتے ہیں (۲۲۹) اور جب ایسا ہو کہ تم عورتوں
کو طلاق دیدو اور اُن کی عدّت پُوری ہونے کو آئے تو پھر تمہیں چاہیئے کہ یا تو تم ان کو صلح وصفائی
سے روک لو یا خوش اسلوبی سے طلاق دے کر جُدا کر دو لیکن یہ نہ ہونا چاہیئے کہ تم انہیں ایذا

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی

۱۔ یادِ اقبال — علامہ اقبال کی وفات پر ہندوستان کے جلیل القدر شعراء نے مرحوم کو جو خراج تحسین ادا کیا تھا اسے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک گرانمایہ اضافہ ہے۔

قیمت ۔ ۱/۴

۲۔ حیات مفتی محمد عبدہ — علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید اور دست راست مفتی محمد عبدہ مصری کے حالات زندگی اور شاندار کارناموں کی تفصیل۔ اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

قیمت ۔ ۱۲/۔

۳۔ تعلیمات اقبال — علامہ اقبال نے اپنی قوم کو جن باتوں کی تلقین کی ہے انکا ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب در اصل علامہ کی تمام کتابوں کا نچوڑ اور تشریح ہے۔

قیمت ۔ ۱/۔

۴۔ شرح اسرار خودی — علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کو سمجھے بغیر علامہ کے کلام کو سمجھنا از حد مشکل ہے علامہ نے اس فلسفہ کو مثنوی اسرار خودی میں پیش کیا ہے۔ فارسی زبان اور فلسفیانہ انداز میں ہونے کی وجہ سے یہ کتاب عوام کی دسترس سے بہت دور تھی۔ اس شرح کے مطالعہ سے فلسفہ خودی کے دقیق سے دقیق مسائل آپ کے لئے بالکل آسان ہو جائینگے۔

قیمت ۱/۸/۔

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ ۔ لاہور

مسرت سرور تی پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا